خطباتِ حکیم الامت

ادارۂ تالیفاتِ اشرفیہ
چوک فوارہ ملتان پاکستان فون 4540513-4519240

بسم الله الرحمن الرحیم

حقوق وفرائض

بسلسلہ خطبات حکیم الامت جلد ۴

حقوق فرائض

(جدید ایڈیشن)

حکیم الامت مجدد الملت حضرت مولانا محمد اشرف علی تھانوی نور اللہ مرقدہ

عنوانات و ترتیب

منشی عبدالرحمٰن خان رحمہ اللہ

تصحیح و تزئین

صوفی محمد اقبال قریشی مدظلہ

تخریج احادیث

مولانا زاہد محمود قاسمی

اِدارۂ تالیفاتِ اشرفیہ

چوک فوارہ ملتان پاکستان

(061-4540513-4519240

حقوق فرائض

تاریخ اشاعت.....................رجب المرجب ۱۴۳۰ھ

ناشر.........................ادارہ تالیفات اشرفیہ ملتان

طباعت....................سلامت اقبال پریس ملتان

انتباہ

قارئین سے گذارش

ادارہ کی حتی الامکان کوشش ہوتی ہے کہ پروف ریڈنگ معیاری ہو۔ الحمدللہ اس کام کیلئے ادارہ میں علماء کی ایک جماعت موجود رہتی ہے۔ پھر بھی کوئی غلطی نظر آئے تو برائے مہربانی مطلع فرما کر ممنون فرمائیں تاکہ آئندہ اشاعت میں درست ہو سکے۔ جزاکم اللہ

ملنے کے پتے

ادارہ تالیفات اشرفیہ...چوک فوارہ...ملتان — مکتبہ الفاروق مصریال روڈ چوہڑ ہڑپال، راولپنڈی

ادارہ اسلامیات.........انارکلی.........لاہور — دارالاشاعت...... اردو بازار......... کراچی

مکتبہ سید احمد شہید.........اردو بازار.....لاہور — مکتبۃ القرآن.....بنوری ٹاؤن.......... کراچی

مکتبہ رحمانیہ.......اردو بازار .... لاہور — مکتبہ دارالاخلاص...قصہ خوانی بازار......پشاور

ISLAMIC EDUCATIONAL TRUST U.K
(ISLAMIC BOOKS CENTERE

119-121- HALLIWELL ROAD
BOLTON BL1 3NE. (U.K.)

عرض ناشر

اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم اور اپنے اکابرین کی دعاؤں کے طفیل ''خطبات حکیم الامت'' مکمل ۳۲ جلدوں میں شائع کر چکا ہے۔

بہت سے بزرگوں کی تمنا تھی کہ خطبات میں آنے والی احادیث مبارکہ کی تخریج ہو جائے اور فارسی اشعار وغیرہ کا ترجمہ ہو جائے۔

الحمد للہ ادارے نے زر کثیر خرچ کر کے یہ کام کیا۔ محترم جناب مولانا زاہد محمود صاحب نے تخریج احادیث اور حضرت صوفی محمد اقبال قریشی صاحب مدظلہ نے فارسی اشعار کے ترجمہ وغیرہ کے کام انجام دیئے۔ اس طرح الحمد للہ یہ جدید ایڈیشن آپ کے ہاتھوں میں ہے۔

اللہ تعالیٰ اس خدمت کو قبول فرمائے آمین۔

احقر: محمد اسحٰق عفی عنہ

رجب المرجب ۱۴۳۰ھ بمطابق جولائی 2009ء

اجمالی فہرست

فہرست مضامین

☆☆☆☆☆

حقوق القرآن

ترغیب تکمیل تعلیم وقرآن کے متعلق یہ وعظ ۱۳ ربیع الثانی ۱۳۲۳ھ یوم دوشنبہ کو مدرسہ خادم العلوم شہر میرٹھ میں ہوا جسے حکیم محمد مصطفیٰ بجنوری نے قلمبند کیا۔

تلاوت قرآن مجید کے تین مرتبے ہوتے ہیں۔ایک مرتبہ الفاظ ظاہری کا ہے یعنی ہر ہر حرف کو علیحدہ علیحدہ صاف صاف اور اپنے مخرج سے ادا کرنا اور ایک مرتبہ معنی کا ہے یعنی مدلول الفاظ کو سمجھ لینا یہ مرتبہ حق باطنی کا ہے اور ایک مرتبہ اس سے بھی ابطن ہے وہ اس کے احکام پر عمل کرنا ہے جب یہ تینوں باتیں جمع ہونگی تب کہا جائے گا کہ حق تلاوت ادا ہوا۔

خطبہ ماثورہ

بسم الله الرحمن الرحيم

الحمد لله نحمده ونستعينه ونستغفره ونومن به ونتوكل عليه ونعوذ بالله من شرور انفسنا ومن سيئات اعمالنا من يهده الله فلا مضل له ومن يضلله فلا هادى له ونشهدان لا اله الا الله وحده لا شريک له ونشهدان سيدنا ومولانا محمداً عبده ورسوله امابعد فاعوذ بالله من الشيطٰن الرجيم. بسم الله الرحمن الرحيم اَلَّذِيْنَ اٰتَيْنٰهُمُ الْكِتٰبَ يَتْلُوْنَهٗ حَقَّ تِلَاوَتِهٖ اُولٰٓئِکَ يُؤْمِنُوْنَ بِهٖ وَمَنْ يَّكْفُرْبِهٖ فَاُولٰٓئِکَ هُمُ الْخٰسِرُوْنَ (البقرہ آیت نمبر ۱۲۰)

تمہید:۔ یہ آیت سورۃ بقرہ کی ہے، ترجمہ اس کا یہ ہے:۔

''کہ جن کو ہم نے کتاب دی ہے وہ اس کی تلاوت کرتے ہیں جیسا کہ حق ہے تلاوت کا، ایمان والے یہی ہیں اور جو کتاب پر ایمان نہ لائے وہ خسارہ والے ہیں۔''

اس کی دو تفسیریں ہیں مگر دونوں میں یہ قدر مشترک ہے کہ تلاوت کرنے والوں کی مدح ہے، اس آیت میں ہر چند کہ کتاب سے مراد توریت ہے مگر ظاہر ہے کہ توریت کی تلاوت کے قابل مدح ہونے کا سبب توریت کا کتاب اللہ ہونا ہے محض کتاب ہونا نہیں ہے اور چونکہ قرآن پاک افضل کتاب ہے تو اس کی تلاوت اور زیادہ قابل مدح ہوگی۔ اور اسی آیت سے اس کی فضیلت بطریق اولیٰ ثابت ہوگئی، چونکہ اس مدرسے کے متعلق کچھ عرض کرنا ہے اس لئے بیان کے لئے یہ آیت زیادہ مناسب معلوم ہوئی۔ اس آیت سے قرآن مجید کی تلاوت کرنے کی اور اس کے حقوق ادا کرنے کی فضیلت ثابت ہوتی ہے، اور یہ بات بدیہی ہے کہ تلاوت بلا سیکھے اور پڑھے ہوئے کیسے ہوسکتی ہے۔ سیکھنا اور پڑھنا اس کا موقوف علیہ ہے اور مقدمہ ضروری کا ضروری ہوتا ہے اگر آپ باورچی کو حکم دیں کہ کھانا پکاؤ اس کا مطلب صرف یہی نہیں کہ ہانڈی چولھے پر رکھ کر آنچ دے۔ بلکہ

بازار سے گوشت لا اور مصالحہ اور اناج لا اور پکانے کے برتن مہیا کر اور آگ جلا تب ہانڈی کو آنچ دے، چنانچہ کھانا پکانے کے حکم کے بعد باورچی کا ان سامانوں میں لگا رہنا آپ کے نزدیک اور کاموں کے نہ کرنے کا عذر سمجھا جاتا ہے اور ان کاموں میں اس کا لگا رہنا پکانے ہی کے حکم کی تعمیل سمجھا جاتا ہے۔ اگر اناج مثلاً نہ ہو اور وہ بیٹھا رہے اور عین وقت پر عذر کرے تو یہ عذر اس کا آپ ہرگز نہ سنیں گے کہ حضور آپ نے مجھے صرف پکانے کا حکم دیا تھا یہ نہیں فرمایا تھا کہ اناج بھی منگانا۔ اس عذر کے نہ سننے کی وجہ کیا ہے؟ یہی کہ کسی چیز کا حکم اس کے اسباب و مقدمات کا بھی حکم ہے۔

الشیٔ اذا ثبت ثبت بلوازمہ

ترجمہ:۔ جو چیز ثابت ہوتی ہے تو اپنے لوازم کے ساتھ ثابت ہوتی ہے۔

بناء بریں تلاوت کتاب کا مطلوب ہونا اس کے سیکھنے اور پڑھنے کا بھی مطلوب ہونا ہے، جو فضیلت تلاوت کی ہوگی اسی قدر ضرورت سیکھنے کی بھی ہوگی۔ غرض قرآن شریف کا سیکھنا ضروری ہوا۔ اور دیکھئے حق سبحانہ وتعالیٰ نے صرف "یتلون" نہیں فرمایا۔ بلکہ حق تلاوتہ کی قید بھی بڑھادی۔ اور اس میں بڑا فرق ہے۔ مثلاً ایک تو یوں کہیں کہ یہ کام کرلاؤ اور ایک یہ کہ یہ کام خوب سمجھ کر لاؤ۔ اس دوسرے لفظ کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ نفس کام کرنے سے عہدہ برآ نہیں ہوسکتے تاوقتیکہ من کل الوجوہ مکمل نہ ہو۔ اس سے نفس امر کی اور زیادہ تاکید ہوجاتی ہے تو آیت میں نفس تلاوت کی اور زیادہ تاکید ہوگئی پھر نفس تلاوت میں تشدد ہوجانے سے اس کے مقدمہ یعنی سیکھنے کے حکم میں بھی تشدید ہوگئی۔ غرض قرآن شریف کا سیکھنا ضروری ہوا۔ پھر اتنا سیکھنا بھی کافی نہیں ہوگا کہ نفس تلاوت کا ذریعہ ہو۔ بلکہ اتنا سیکھنا چاہئے کہ حقوق تلاوت ادا ہوں۔

تلاوت کی حقیقت:۔

اب سمجھئے کہ حق تلاوت کیا ہے، ہمیشہ یاد رکھئے کہ جس چیز کی فضیلت بیان ہو، اور جس چیز کی برائی بیان ہو اس کی حقیقت سمجھ لینا چاہئے، اگر وہ چیز اپنی حقیقت پر ہو تو قابل فضیلت یا برائی ہے ورنہ نہیں۔ یہاں تلاوت کتاب اللہ کی فضیلت بیان ہوئی لہٰذا اس کی حقیقت سمجھ لیجئے کہ حق سبحانہ وتعالیٰ نے اپنی کتاب اتاری جو مجموعہ ہے اوراد کا اور قصص اور حکایات کا اور احکام کا اور جامع ہے تمام بھلائیوں کا۔ قطع نظر تمام خوبیوں سے محض کلام اللہ ہی ہونا اس کا مقتضی اس امر کا ہے کہ ہم جیسے ناچیز بندوں کی

اس تک رسائی بھی نہ ہوتی کہاں وہ کلام مقدس کہاں ہم حقیر بندے۔ دیکھ لیجئے دنیا کے ذرا ذرا سے بادشاہوں کے دربار کی حاضری کے لئے لوگ کتنی کوششیں کرتے ہیں اور عمریں گذار دیتے ہیں تب کہیں سلام کرنے کا موقع ملتا ہے اور جس کو ایک دو بات کرنے کا موقع مل گیا وہ اپنے آپ کو کتنا کچھ سمجھنے لگتا ہے اور تمام سلطنت بھر میں اس کی کیا عزت ہو جاتی ہے۔ جب کلام شاہان دنیا کی یہ عزت ہے تو شاہ شاہاں اور احکم الحاکمین کے کلام کی کیا کچھ عزت ہونی چاہئے۔ شاہان دنیا کا کلام دو چار برس کی تمنا اور کوشش کے بعد میسر ہوتا ہو تو کلام الٰہی کچھ بھی نہیں تو دو چار برس کی محنت کے بعد تو نصیب ہونا چاہیے مگر نہیں کس درجہ رحمت ہے اللہ میاں کی ہمارے ہاتھوں میں اپنی کتاب دے دی اور اذن عام دے دیا کہ جس کا جس وقت جی چاہے ہم سے باتیں کرے پھر صرف اذن ہی نہیں بلکہ مطالبہ بھی ہے بندوں سے کہ باتیں کرو اب ہم بندے اپنی ذلت اور احکم الحاکمین کی عزت کو پیش نظر کر کے دیکھیں کہ یہ باتیں کرنے کی فرمائش کیا چیز ہے سوائے اس کے کچھ نہیں کہا جا سکتا کہ محض فضل ہے۔

حقوق کی حقیقت:۔

معلوم ہو گیا ہوگا کہ تلاوت کتاب اللہ کی حقیقت اللہ میاں سے باتیں کرنا ہے اب اس آیت میں فرماتے ہیں کہ تم ہم سے باتیں تو کرو گے مگر قاعدے اور ادب کے ساتھ کرنا۔

یتلو نہ حق تلاوتہ

ترجمہ:۔ اسکی تلاوت کرتے ہیں جیسا تلاوت کا حق ہے۔

ترکیباً تو اخبار ہے مگر مقصداً انشاء ہے۔ یعنی تلاوت کرنے والوں کو چاہیے کہ تلاوت کے حقوق ادا کریں، جب تلاوت کی حقیقت معلوم ہو گئی تو اب سمجھ لیجئے کہ حقوق دو طرح کے ہوتے ہیں باطنی اور ظاہری۔ قربان جایئے تعلیم شریعت کے کہ اعمال میں صرف بناوٹ نہیں سکھلائی بلکہ ظاہری حقوق بھی بتائے اور باطنی بھی اور باطنی کو ظاہری سے زیادہ ضروری رکھا مثلاً ماں باپ کے حق ظاہری کو فرمایا۔

وَاخۡفِضۡ لَهُمَا جَنَاحَ الذُّلِّ

(کہ ان کے سامنے پستی اختیار کرو) وضع میں، قطع میں، تکلم میں، نشست و برخواست میں غرض ہر چیز میں ان سے تذلل برتو۔ کسی بات میں ان پر ترفع مت کرو یہ تو حق ظاہری ہے، اور حق باطنی کو سبحان اللہ کیسے ذرا سے لفظ سے ادا فرمایا۔ ”من الرحمۃ“ یعنی ان کے سامنے نری ظاہری پستی پر اکتفا نہ کرو اس کا کچھ اعتبار نہیں بلکہ اس ظاہری پستی کا منشاء رحمت ہو۔ رحمت رقت

قلب کو کہتے ہیں۔یعنی ان کی خدمت دل سے کرو جیسا کہ ظاہر ان کے سامنے پست کیا ہے باطن کو بھی پست کرو۔دل کے اندر خشوع بھی ہو خضوع بھی ہو۔قرآن میں کوئی ضروری بات چھوڑی نہیں جاتی۔یہی خوبی ہے کلام اللہ کی تعلیم کی۔کسی حکیم یا کسی فلسفی کی تعلیم میں یہ بات نہیں پائی جاتی اوراس پر بھی اکتفا نہیں کیا۔آگے فرماتے ہیں۔

قُلْ رَّبِّ ارْحَمْهُمَا كَمَا رَبَّيٰنِيْ صَغِيْرًا

اوپر تو ان حقوق کا حکم تھا جن کی ادا کا علم والدین کو وقت ادا ہو جائے گا۔اوراس میں فرما دیا تھا کہ صرف ظاہری بناوٹ نہ ہو۔ان کو بھی دل سے ادا کرو یہاں حکم ہے ان حقوق کو بھی ادا کرو جن کی اطلاع بھی نہ ہو۔ قُلْ رَّبِّ ارْحَمْهُمَا ۔یعنی ان کے لئے دعا بھی کرو۔یہ بھی ایک حق باطنی ہے۔ بلکہ یوں کہنا چاہئے کہ حق تین ہیں۔ظاہری اور باطنی اور ابطن اور تینوں قسموں کے ادا کا حکم ہے۔اسی طرح حق تلاوت بھی مختلف ہوتے ہیں۔میں اس کی ایک مثال دیئے دیتا ہوں۔جس سے اچھی طرح توضیح ہو جائے گی۔فرض کیجئے کہ بادشاہ کسی کے ہاتھ میں شاہی قانون دے کر کہے کہ اس کو پڑھو تو اس کی حالت پڑھنے کے وقت یہ ہوگی کہ ہر ہر لفظ کو صاف پڑھے گا کہیں ایسا نہ ہو کہ اس کا پڑھنا بادشاہ کے ناپسند ہو۔اوراس کے معنی اور مفہوم کو بھی سمجھتا جائے گا۔ایک تو اس خیال سے کہ عبارت کا لہجہ بلا معنی سمجھے ہوئے ٹھیک نہیں ہوسکتا اور ایک اس خیال سے کہ شاید کہیں بادشاہ پوچھ بیٹھے کہ کیا مطلب سمجھا تو خفت نہ ہو اور ایک حالت پڑھنے والے کی یہ ہوگی کہ دل میں اس قانون کے احکام کی تعمیل کا بھی عزم ہوگا۔اور یہ کسی قرینہ سے ظاہر نہ ہونے دے گا کہ میں اس کی پابندی میں کچھ کوتاہی کرتا ہوں۔بلکہ حال وقال سے یہی ظاہر کرے گا کہ میں سب سے زیادہ تعمیل کرنے والا ہوں۔بس اس مثال کو ذہن میں حاضر رکھئے اور سمجھئے کہ قرآن مجید کی تلاوت میں بھی اسی طرح کے تین مرتبے ہیں ایک مرتبہ الفاظ ظاہری کا ہے یعنی ہر ہر حرف کو علیحدہ علیحدہ صاف صاف اوراپنے مخرج سے ادا کرنا اور ایک مرتبہ معنی کا یعنی مدلول الفاظ کو سمجھ لینا۔یہ نہیں کہ خیال کہیں ہے صرف طوطے کی طرح لفظ ادا کردیئے یہ مرتبہ حق باطنی کا ہے اور ایک مرتبہ اس سے بھی ابطن ہے وہ اس کے احکام پر عمل کرنا ہے۔جب یہ تینوں باتیں جمع ہونگی تب کہا جائے گا کہ حق تلاوت کا ادا کیا۔غرض کل تین حق ہوئے۔ایک حق ظاہری یعنی تلاوت،دوسرا حق باطنی یعنی معنی سمجھ لینا،تیسرا عمل کرنا یہ بمقابلہ دوسرے کے بھی باطن ہے تو اس کو ابطن کہہ سکتے ہیں۔کیونکہ یہ معاملہ فی مابینہ و بین اللہ ہے۔

ان تینوں میں وجوداً سب سے مقدم حق ظاہری ہے اور موکد سب سے زیادہ تیسرا درجہ ہے یعنی عمل، ان دونوں میں حقیقت اور صورت کا فرق ہے۔ اصل چیز حقیقت ہی ہوتی ہے لیکن وجود اس کا لباس صورت میں ہوتا ہے، اسی وجہ سے صورت مقدم ہوتی ہے اور ضروری دونوں ہیں پس حقیقت بلا صورت کے باطل ہے اور صورت بلا حقیقت کے عاطل ہے۔ یعنی بے کار لہٰذا ثابت ہوا کہ عمل بھی ایک حق ضروری ہے۔ یہ نہیں کہ مرتبہ مستحب ہی میں ہے۔ دیکھئے اللہ میاں نے آگے فرمادیا۔

اولئک یومنون به.

ترجمہ:۔ یہی لوگ ایمان والے ہیں۔

"جو لوگ تلاوت کا حق ادا کرتے ہیں وہی ایمان رکھتے ہیں" یعنی کامل ایمان انہی کا ہے پس عمل موقوف علیہ ہے کمال ایمان اور کمال ایمان کی تحصیل واجب ہے۔ ضرور عمل بھی واجب ہو گا۔ کمال ایمان کا وجوب اس آیت میں صاف مصرح ہے۔

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ حَقَّ تُقٰتِهٖ

ترجمہ:۔ اے ایمان والو خدا تعالیٰ سے ڈرو جیسا کہ ڈرنا چاہئے۔

اس میں صیغہ امر کا ہے اور امر وجوب کے لئے ہوتا ہے۔ اگر کوئی صاحب کہیں کہ آیت اتقو اللہ حق تقته دوسری آیت فَاتَّقُوا اللّٰهَ مَا اسْتَطَعْتُمْ سے منسوخ ہے تو سمجھ لیجئے کہ نسخ فرع ہے تعارض کی اور ان دونوں میں خود تعارض نہیں بلکہ دوسری آیت پہلی کی موضح ہے کیونکہ جب اتقو اللہ حق تقته اتری تو صحابہ کو شبہ ہوا کہ امر پر عمل کرنا فی الفور واجب ہے اس آیت میں کہیں یہی مراد نہ ہو اور ایسے امر عظیم میں فی الفور عمل کرنا دشوار تھا اس لئے دوسری آیت میں مراد بیان فرمادی کہ تکلیف بقدر استطاعت ہے تدریجاً مامور بہ کو حاصل کرلو۔ اس کو بعض روایات میں نسخ سے تعبیر کیا گیا ہے کیونکہ سلف کی اصطلاح اس لفظ میں اصطلاح مشہور سے عام تھی اور ہر چند کہ امر سے فور کا مفہوم ہونا موقوف قرینے پر ہے لیکن صحابہ کو بوجہ غلبہ خشیت کے اس کا احتمال ہوا۔ کسی نے خوب کہا ہے۔

باسایہ ترا نمی پسندم عشق ست و ہزار بدگمانی

(یعنی یہ بات مجھ کو گوارہ نہیں کہ تیرے سایہ کے ساتھ کوئی کھڑا ہو۔ کیونکہ عشق و محبت میں ہزاروں بدگمانیاں پیدا ہو جاتی ہیں۔)

اس توجیہ سے دونوں آیتوں میں تطبیق ہوگئی اور نسخ لازم نہ آیا۔

غرض حق تلاوت کا تیسرا درجہ مستحب نہیں بلکہ واجب ہے۔ ہاں وجوب فی الفور نہیں تدریجاً ہے۔ مسلمان ہوتے ہی یہ فرض نہیں ہو جاتا کہ جملہ فروع ایمان پر ابھی عبور ہو جائے اور نہ ہی یہ فرض ہو جاتا ہے کہ قرآن شریف کے تینوں حق فوراً ہی ادا کرے بلکہ مہلت دی گئی ہے کہ اس میں سیکھ لینا چاہئے البتہ یہ جائز نہیں کہ بالکل بیٹھ رہے اور کمال کی طرف توجہ نہ کرے۔

ترتیل کے معنی:۔

غرض حق ظاہری تو یہ ہے کہ ترتیل کے ساتھ پڑھا جائے حضرت علی کرم اللہ وجہہ سے ترتیل کی یہ تفسیر منقول ہے:۔

تجوید الحروف و معرفة الوقوف

ترتیل اس کو کہتے ہیں پھر ہم آج کل کی حالت دیکھتے ہیں کہ ہمارے امام جن کو بڑی بڑی جماعت میں منتخب کر کے مقرر کرتے ہیں وہ بھی قرآن صحیح نہیں پڑھتے اس سے تمام مسلمانوں کے پڑھنے کا اندازہ ہو سکتا ہے کہ جب امام لوگ اقل الناس اور منتخب ہیں وہی غلط پڑھتے ہیں تو عام لوگ کیا صحیح پڑھتے ہوں گے اس ظاہری حق کے ادا کی یہ کیفیت ہے حالانکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ترتیل سکھائی ہے اور وہی آج تک چلی آ رہی ہے اور حضور کا سکھانا باری تعالیٰ کی تعلیم ہے۔ اسی کو کہا ہے۔

گفتہ او گفتہ اللہ بود   گرچہ از حلقوم عبداللہ بود

(ترجمہ:۔ یعنی ان کا کلام خدا ہی کا کلام ہے اگرچہ بظاہر خدا کی بندہ کی زبان سے ظاہر ہو رہا ہے)

اور حق تعالیٰ فرماتے ہیں:۔

وما ينطق عن الهوىٰ

''یعنی آپ کی زبان سے کوئی بات اپنی طرف سے نہیں نکلتی'' اس دلیل سے ترتیل باری تعالیٰ کی سکھلائی ہوئی ٹھہری۔ پھر اس نعمت عظمٰی کی یہی قدر ہے کہ اس کو اس طرح سے غارت کیا جائے۔ حق سبحانہ وتعالیٰ کو تو اس کا اتنا اہتمام کہ حدیث میں ہے۔

لا يزال طائفة من امتي منصورين على الحق لا يضرهم من خذلهم. (سنن ابن ماجہ:۱۰)

''میری امت میں ایک گروہ حق پر ہمیشہ کامیاب رہے گا۔ کہ اس کو کسی کے ساتھ چھوڑ دینے

سے نقصان نہ پہنچے گا۔''

اس گروہ میں تمام وہ لوگ داخل ہیں جو دین کی کسی قسم کی علمی یا عملی خدمت کر رہے ہیں۔ اسی میں علوم قرآن کی خدمت بھی آ گئی۔ پس اس میں خادمان قرآن کے قائم رکھنے کا وعدہ ہے اور خود قرآن میں بھی وعدہ فرمایا گیا ہے۔

وَاِنَّا لَهٗ لَحٰفِظُوْنَ۔ (ترجمہ:۔'' کہ ہم خود اس کے محافظ ہیں۔'')

اور یہ بدیہی بات ہے کہ اللہ میاں نے کسی تالے میں بند کر کے تو اسکی حفاظت نہیں کی۔ اللہ میاں کی حفاظت کی صورت یہی ہے کہ اپنے چند بندوں کو اس کام پر تعینات رکھیں گے۔ معلوم ہوا کہ ہمیشہ ایک گروہ ایسا رہے گا کہ تصوف پڑھے پڑھائے گا۔ اور ایک گروہ ایسا بھی رہے گا کہ فقہ سکھائے گا۔ اور ایک گروہ ایسا بھی رہے گا کہ حدیث شریف کی خدمت کرے گا۔ اور ایک گروہ ایسا بھی رہے گا کہ تفسیر کا مشغلہ رکھے گا۔ اور ان کے ساتھ ایک گروہ ایسا بھی رہے گا کہ قرآن شریف پڑھے گا اور قرأت کا محافظ ہوگا۔ غرض حق سبحانہ وتعالیٰ کو تو اس کا اتنا اہتمام اور ان کے بندوں کو اتنی بے پروائی کہ مسلمانوں میں فی ہزار بھی ایک قاری نہیں افسوس کہ اس طرف توجہ ہی نہیں رہی اور اگر کوئی توجہ بھی کرتا ہے تو اس کی بڑی دوڑ یہ ہوتی ہے کہ ضاد اور ظاء کا مباحثہ شروع کر دیا، اس میں رسالے لکھے جا رہے ہیں اور کتابیں تصنیف ہو رہی ہیں اور علماء کے پاس استفتاء بھیجے جاتے ہیں اور اکثر تو یہی دیکھا ہے کہ اکثر اس پوچھنے سے اصلی غرض صرف اپنی بات اونچی کرنی ہوتی ہے، تحقیق کسی کو مقصود نہیں ہوتی، چنانچہ یہی وجہ ہے کہ اس قسم کے جھگڑا کرنے والے دور ہی سے استفتاء بھیجتے ہیں، یہ توفیق نہیں ہوتی کہ تھوڑا خرچ گوارا کر کے دونوں کسی ماہر کے پاس چلے جائیں اور اس حرف کو صحیح طور پر سیکھ لیں۔ میں کہتا ہوں اس استفتاء کے جواب میں مجیب کیا لکھے سوائے اس کے کہ مخرج بیان کر دے سو یہ تو کتابوں میں لکھا ہے پھر جو اختلاف اور نزاع باوجود کتاب میں مخرج لکھے ہونے کے ہوا ہے وہی اس فتویٰ کے بعد بھی ہوگا۔ کیونکہ مفتی ضاد کی صورت کو کاغذ پر نہیں لکھ سکتا۔

گر مصور صورت آں دلستاں خواہد کشید — لیک حیرانم کہ نازش را چساں خواہد کشید

(ترجمہ:۔ یعنی اگر یہ تسلیم کر لیں کہ مصور اس دلبر کی تصویر واقعی اتارے گا تو یہ بات سمجھ میں نہیں آتی کہ اسکے ناز و ادا کی عکاسی کیسے کرے گا۔)

علم موسیقی اور قرأت میں تو سننے ہی کی ضرورت ہے لکھ بھیجنے سے کیا ہوتا ہے صوت کی صورت کاغذ پر

کیسے آ سکتی ہے، بعض لوگ فن قرأت کو حاصل نہ کرنے کا یہ عذر پیش کرتے ہیں کہ قاری تو ہونے سے رہے پھر اس کے پیچھے کیوں پڑتے ہو۔ کام ہو تو پوری طرح ہو نہیں تو چھیڑنا فضول۔

صاحبو! یہ محض حیلہ نفس ہے مانا کہ قرأت میں عاصم اور حفص نہیں ہو جاؤ گے تو اچھا فقہ میں بھی تو ابو حنیفہ نہیں ہو جاتے پھر فقہ کیوں پڑھتے ہو اور دنیا میں بھی ہر شخص بادشاہ نہیں ہو جاتا پھر دنیا کی طلب کیوں کرتے ہو اس میں یہ قاعدہ جاری نہیں کرتے کہ کام ہو تو پوری طرح ہو ورنہ چھیڑنا فضول ہے۔

تجوید قرآن کی مقدار:۔

صاحبو! قرأت میں عاصمؒ اور حفصؒ ہونے کی اور فقہ میں ابو حنیفہؒ ہونے کی تکلیف آپ کو نہیں دی جاتی صرف اس قدر تکلیف دی جاتی ہے کہ بقدر وسعت کوشش کرو اور بقدر ضرورت قرآن شریف کو صحیح کرلو۔ اگر آپ اپنی حیثیت کے مطابق کوشش کریں تو قدر ضروری تو حاصل ہو جائے گا۔ بالفرض اگر کوشش پر کامیابی بھی نہ ہو تب بھی کچھ غم نہیں، اللہ میاں کے یہاں تو زمرہ قراء میں لکھ لئے جاؤ گے۔ کسی کا قول ہے۔

ہمینم بس کہ داند ماہ رویم   کہ من نیز از خریداران اویم

(ترجمہ:۔ یہ ہی ہمارے لئے بہت ہے کہ اسے یہ معلوم ہو جائے کہ میں اس کے ساتھ ہوں اور میں اسکے خریداروں میں سے ہوں۔)

میں نے اپنے ایک بزرگ سے سنا کہ فرماتے تھے طلب مقصود ہے وصول مقصود نہیں۔ اور ظاہر بھی ہے کہ اللہ میاں نے تکلیف مالا یطاق نہیں دی صرف امور اختیاریہ کی تکلیف دی ہے اور مقصود تک پہنچ جانا بندے کے اختیار میں ہے۔ نہیں تو اس کی تکلیف کیوں ہوگی۔ کیا اچھا ہے۔

گر مرادت را مذاق شکر ہست   بے مرادی نے مراد دلبر ہست

اور صاحبو! ضروری قرأت کچھ مشکل بھی نہیں کل اٹھائیس حرف ہیں اگر ایک ایک دن میں ایک ایک حرف سیکھے تب اٹھائیس دن میں بقدر ضروری قاری بن سکتا ہے مگر بات یہ ہے کہ شیطان نے رہزنی کر رکھی ہے جب کوئی اس کا ارادہ کرتا ہے تب ہی وہ کہہ دیتا ہے میاں قرأت کہیں تمہارے بس کی ہے، جب کسی سے کہا جاتا ہے قرآن شریف صحیح کرو تو کہتے ہیں، ہم بڈھے طوطے ہیں بھلا اولاد نے کیا قصور کیا ان کو کیوں نہیں سکھاتے؟ یاد رکھو جیسے اولاد کے اور حقوق آپ پر ہیں ویسے یہ بھی حق ہے اگر آپ نے یہ

حق ادا نہ کیا اور وہ تمام عمر قرآن شریف غلط پڑھتے رہے تو اس کی جواب دہی آپ کے ذمہ ہوگی۔

لوگوں کے حیلے:۔

لیکن قرآن کی طرف توجہ ہی نہیں قرأت تو درکنار اس کا تو پڑھنا بھی بہت کم ہوتا جاتا ہے بعضے کہتے ہیں اس سے دماغ خراب ہوتا ہے انگریزی کے قابل نہیں رہتا۔ بعض کو میں نے یہ کہتے ہوئے سنا ہے کہ جب سمجھ میں نہ آیا تو نرے پڑھنے سے کیا فائدہ۔ میں کہتا ہوں کیا فائدہ سمجھنے ہی میں منحصر ہے۔ بس فائدے کا ایک ہی مصداق ہے کیا اور کوئی مصداق نہیں۔ یاد رکھو اس کے بلا سمجھے ہوئے پڑھنے میں بھی فائدہ ہے جس کی خبر حدیث شریف میں ہے کہ ہر حرف پر دس نیکیاں ملتی ہیں۔ کیا نیکیاں ملنا فائدہ نہیں اور دوسرا فائدہ وہ ہے جو دوسری حدیث شریف میں ہے۔

ما اذن الله لشیٔ ما اذن لنبی یتغنی بالقران۔ (سنن الدارمی، ۲: ۳۴۷۳)

''یعنی اللہ میاں کسی چیز کو ایسا کان لگا کر نہیں سنتے جیسا کہ قرآن شریف کو سنتے ہیں۔''

اس میں نبی کی تخصیص اتفاقی ہے اور تغنی کی تفسیر خود روایات میں آئی ہے کہ خشوع سے پڑھتا ہو۔ تو کیا خدا تعالیٰ کا متوجہ ہونا بندہ کی طرف یہ فائدہ نہیں ہے۔

ایک قصہ یاد آیا۔ میرے مرشد علیہ الرحمتہ فرماتے تھے۔ کہ ایک بار دہلی میں ایک دوکان پر گذر ہوا تو کیا دیکھتے ہیں ایک ہجوم ہو رہا ہے اور درمیان میں ایک شخص بیٹھا ہوا رسالہ دردنامہ جو حضرت مرشد کا کلام ہے ذوق شوق سے پڑھ رہا ہے۔ حضرت بھی اس کو سننے کے لئے کھڑے ہو گئے اور خوش ہوئے۔

ایسا ہی واقعہ ایک بار پانی پت کو جاتے ہوئے راہ میں پیش آیا۔ غرض قاعدہ ہے کہ مصنف جب کسی کو اپنی تصنیف پڑھتے دیکھتا ہے تو خوش ہوتا ہے اور اس طرف متوجہ ہوتا ہے.........قرآن شریف کیا ہے حق سبحانہ کی تصنیف ہے۔ جب یہ پڑھا جاتا ہے تو حق تعالیٰ متوجہ ہوتے ہیں کہ میرا بندہ میری تصنیف پڑھ رہا ہے اگر کچھ بھی نہ ہو تو یہ کیا کم ہے کہ اللہ میاں کی خوشنودی ہوتی ہے۔ ذرا ذرا سے حکام کی خوشنودی کے لئے لوگ کیا کیا کلفتیں گوارا کرتے ہیں اور کتنے کتنے خرچ کے متحمل ہوتے ہیں کہیں ڈالیاں بھیجی جاتی ہیں کہیں دعوتیں ہوتی ہیں اپنے بہت کام حرج کئے جاتے ہیں کیا حق سبحانہ وتعالیٰ کا اتنا بھی حق نہیں اس غلطی میں بہت سے لوگ مبتلا ہیں کہ فائدہ کو منحصر جان لیا ہے معانی کے سمجھنے میں اسی

وجہ سے کہہ دیتے ہیں کہ بچوں کو قرآن شریف پڑھانے سے کیا فائدہ۔بس پڑھانا ہی چھوڑ دیا اگر کسی نے پڑھا بھی لیکن حفظ کرنے کا رواج چھوڑ دیا اکثر دیکھا گیا ہے کہ قرآن کو چھوڑ کر لوگ وظیفوں پر مرتے ہیں۔کوئی کہتا ہے تسخیر کا کوئی عمل بتایئے کوئی کہتا ہے دست غیب کی ترکیب بتا دیجئے کوئی کہتا ہے اولاد ہونے کے لئے کوئی نقش کر دیجئے۔غرض وظیفوں کو بہت سہل پالیا ہے۔ساری دنیا کے کام وظیفوں ہی سے بیٹھے بیٹھے ہو سکتے ہیں۔میں کہتا ہوں اگر یہی بات ہے تو کھاؤ پیو بھی مت،نکاح بھی نہ کرو نوکری چاکری کے جھگڑے میں بھی مت پڑو۔وظیفوں ہی سے پیٹ بھی بھر جائے گا اور انہی سے اولاد بھی ہو جائے گی۔اور انہی سے گھر بیٹھے روپے مل جایا کریں گے۔آپ یہ کہیں گے کہ اللہ میاں کے نام میں تو بڑے بڑے اثر ہیں اس کے جواب میں میں کہتا ہوں کہ غور کر کے دیکھ لیجئے کہ آج کل وظیفوں کی طرف زیادہ میلان کا سبب اللہ میاں کے نام کی عظمت نہیں ہے بلکہ اس کا سبب صرف کم ہمتی ہے۔جو لوگ اپنی عمر ابتداء میں لہو ولعب میں برباد کر دیتے ہیں۔جب بار اپنے سر پر پڑتا ہے اس وقت حسرت و ندامت ہوتی ہے کہ اس عمر میں کوئی کمال حاصل نہیں کیا جواب کام دیتا ہے اور ضرورت سر پر آ ہی پڑتی ہے۔اس لئے چاروں طرف نظر دوڑتی ہے اور ہر کام مشکل اور اختیار سے خارج نظر آتا ہے بس اگر کوئی چیز سہل اور اپنے اختیار میں دیکھ پڑتی ہے تو وہ عمل ہے کہ اس میں نہ کسی کی خوشامد ہے نہ کوئی امتحان دینا ہے نہ کچھ خرچ ہے،زبان کا کام ہے تھوڑی سی تکلیف گوارا کر کے پڑھ سکتے ہیں۔پس یہ وجہ ہے عمل کی طرف میلان کی۔اور اگر اس کی وجہ عظمت اسم اللہ ہوتی تو سب سے بڑا وظیفہ اور سب سے مفید عمل وہ سمجھتے جس کو اللہ میاں نے نازل فرمایا یعنی قرآن پاک

وَشِفَآءٌ لِّمَا فِی الصُّدُوْرِ۔ (اس میں دلوں کی شفاء ہے)

وَّرَحْمَةٌ لِّلْمُؤْمِنِیْنَ۔ (اور ایمان والوں کیلئے رحمت)

خود باری تعالیٰ نے ہی اس کی شان میں فرمایا ہے،مگر نہیں وجہ وہی ہے جو میں نے عرض کی۔ اسی واسطے ان عملیات سے بھی اجتناب نہیں ہوتا جو خلاف شرع ہیں۔خوب یاد رکھئے کہ عملیات میں زیادہ پڑنے میں بہت سے مفاسد ہیں جس کو دست غیب کہتے ہیں اس طریق سے روپیہ حاصل کرنا حرام ہے۔تحقیق سے ثابت ہوا کہ اس عمل کی حقیقت یہ ہے کہ جن تابع ہو جاتے ہیں اور روپیہ چرا چرا کر لا دیتے ہیں یہ ایسا ہے جیسے چند بدمعاش کوئی نوکر رکھے اور ان سے چوری کرایا کرے۔اور اگر کوئی ایسا عمل ہو کہ اس میں وہ اپنے ہی پاس سے لاتے ہوں تو یہ جبر اور غضب ہے

کہ ان کا مال جبراً عامل لوگ لے لیتے ہیں اسی طرح بہت سے عملیات میں خرابیاں ہیں۔ سب سے بہتر اور سہل عمل دعا ہے اسے کیوں نہ اختیار کیا۔ حق تعالیٰ کی اجازت ہے کہ جس کام کے لئے چاہو دعا کرو (بشرطیکہ وہ کام ناجائز نہ ہو) بلکہ دعا نہ کرنا باعث عتاب ہے۔ اگر وظیفوں ہی کا شوق تھا تو قرآن شریف پڑھ پڑھ کر حق تعالیٰ سے دعا مانگی ہوتی سب سے بڑا وظیفہ یہ تھا، جس میں کوئی محذور لازم نہیں آتا مگر افسوس جو لوگ قرآن مجید بھی پڑھتے ہیں ان کی نیت درست نہیں ہوتی۔

ایک شخص نے خواب میں دیکھا کہ میں مسجد میں قضائے حاجت کر رہا ہوں یہ خواب ایک بزرگ سے بیان کیا فرمایا معلوم ہوتا ہے کہ تم کوئی عمل دنیا کے لئے مسجد میں پڑھتے ہو۔ غرض ہر کام کے لئے وظیفوں کو بہت سہل پالیا ہے۔ اس کی وجہ صرف کم ہمتی ہے دنیا کے لئے بڑی ہمت کی تو وظیفے پڑھ لئے اور دین کے لئے بہت کی تو کہتے ہیں کہ صاحب کچھ سینے میں سے دلوایئے سینہ کوئی خرجین ہے اس میں ہاتھ ڈالا اور جو چاہا نکال کر دے دیا اور اگر دیا بھی جائے تو اسے رکھے گا کون۔ جو چیز بے محنت ملتی ہے اس کی قدر نہیں ہوتی۔

ہر کہ او ارزاں خرد ارزاں دہد — گوہرے طفلے بقرص ناں دہد

(ترجمہ:۔ جو شخص آسانی وارزانی سے کوئی چیز حاصل کرتا ہے اسے اونے پونے فروخت بھی کر دیتا ہے، بچہ ایک روٹی کے بدلہ موتی دے دیتا ہے۔)

جو طریقہ ہے حاصل کرنے کا اس طرح حاصل کرو، دنیا حاصل کرو تدبیر مشروع سے دین حاصل کرو علم و عمل سے جس کی فرد اعظم قرآن ہے جس کو چھوڑ ہی دیا۔

آج کل قرآن کا مصرف:۔

ایک اس کام کے لئے قرآن شریف رہ گیا ہے کہ جب کسی کے یہاں بچہ ہوا تو اس میں سے نام نکال لیا کہ سات ورق الٹ کر ساتویں سطر میں دیکھ لیا۔ اگر شروع میں الف ہوا تو اللہ بخش اور (خ) ہوا تو خدا بخش اور (ر) ہوا تو رمضان اور (ع) ہوا تو عیدو نام رکھ لیا کہ بڑا متبرک نام ہے، اللہ میاں کے کلام میں نازل ہوا ہے۔

ایک اس کام کیلئے رہ گیا ہے کہ جب کوئی مرا تو تیجہ میں پڑھوا دیا۔ مٹھی مٹھی بھر چنوں کے لالچ میں کیسی گت قرآن شریف کی بنتی ہے۔ بہت سے پڑھنے والے بے وضو ہو جاتے ہیں بہت سے صرف پابندی

رسم کی نیت سے شریک ہوتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اگر کوئی نہ آئے شکایت ہوتی ہے اور اگر آجائے اور عذر کر کے جائے تو شکایت نہیں رہتی۔ معلوم ہوا کہ پڑھنا غرض نہیں۔ صرف رفع شکایت منظور ہے۔ بہت جگہ نقد اجرت دے کر پڑھوایا جاتا ہے حالانکہ اجرت علی العبادت حرام ہے۔

آپ شاید کہیں گے کہ یہ مولوی لوگ ایصال ثواب سے منع کرتے ہیں میں کہتا ہوں کہ بعض اوقات آپ بھی تو نماز سے منع کرتے ہیں حالانکہ افضل اعمال ہے میں آپ سے استفتاء کرتا ہوں کہ عین دوپہر کے وقت نماز پڑھنا کیسا ہے اور قبلہ کی طرف پشت کر کے نماز پڑھنا کیسا ہے؟ اور حیض کے زمانہ میں نماز پڑھنا کیسا ہے؟ اور جنابت کے ساتھ نماز پڑھنا کیسا ہے؟ سب کا جواب یہ ہے کہ **لایجوز لایجوز** جائز نہیں۔ میں کہتا ہوں آپ نماز سے منع کرتے ہیں بس ایسے ہی ہم بھی رسموں سے منع کرتے ہیں۔ جانتے سب ہیں کہ رسموں میں یہ خرابیاں ہیں مگر کسی بات کا رواج پا جانے کے بعد چھوڑنا مشکل ہوتا ہے۔ نیز رسموں میں ظاہری رونق بھی ہے اور ان کے چھوڑنے سے سادگی رہتی ہے اس لئے چھوڑنا مشکل ہے۔ شادی میں ناچ گانا نہ ہو تو کہتے ہیں چلو بھائی چنے پڑھ آدیں۔ یہ اللہ والوں کی شادی ہے۔ یہ خطاب ہم کو تو بسر چشم قبول ہے۔

ما اگر قلاش وگر دیوانہ ایم　　　مست آں ساقی وآں پیمانہ ایم

(ترجمہ:۔ ہم اگر حاجت مند اور دیوانہ نظر آتے ہیں تو کیا ہوا ہمارے لئے یہ بات بھی قابل فخر ہے کہ ہم ساقی الست کہ نگاہ کیف بار کے امیدوار اور پیمانہ شریعت کے جرعہ نوش ہیں۔)

اور آپکے اس طعن کا جواب اور بھی ہے مگر تہذیب سے خارج ہے میں دینا نہیں چاہتا۔

شرط تبلیغ:۔

بلکہ بجائے ان لوگوں کو جواب دینے کے اپنے ہی لوگوں کو کہتا ہوں کہ منکرات کو منع تو کریں مگر اس طرح کہ نفسانیت کو دخل نہ ہونے پائے پھر ان شاء اللہ ضرور اثر ہوگا کسی پر انکار کرنے کا مضائقہ نہیں ہاں اتنا ہو کہ خلوص ہو۔ ہم میں یہ مرض ہو جاتا ہے کہ تقویٰ کی صورت میں نفسانیت کو ادا کرتے ہیں۔ علماء کو چاہئے اس سے محفوظ رہیں۔

آج کل دیکھا جاتا ہے کہ جس طرح منع کرنے والے تقویٰ کی صورت میں نفسانیت کو برتتے ہیں اسی طرح تداعی الی الخیر میں خوشامد کی جاتی ہے مدرسے میں جس کا چندہ داخل ہے اس کا مدرسین

اور طلبہ سب دباؤ مانتے ہیں، سلام اور مزاج پرسی کے لئے جاتے ہیں بات بات پر ان کی بے جا مدح کی جاتی ہے حالانکہ اس خوشامد کی ضرورت نہیں، یہ کچھ مدرسین کا ذاتی کام تو نہیں ہے، یہ کام تو ہوگا ہی، یہ نہ کریں گے تو کوئی اور کرے گا، وہ نہ کریں گے کوئی اور کرے گا۔

میں سچ عرض کرتا ہوں علماء کو استغناء برتنے کی ضرورت ہے کسی کی خوشامد کی ضرورت نہیں، کوئی اس خیال میں نہ رہے کہ ہم ہاتھ کھینچ لیں گے تو یہ کام بند ہو جائے گا۔

وَاِنْ تَتَوَلَّوْا يَسْتَبْدِلْ قَوْمًا غَيْرَكُمْ.

''اگر تم منہ پھیرو گے تو تمہاری جگہ دوسری قوم کو کھڑا کریں گے۔''

میں یہ نہیں کہتا کہ علماء کو احتیاج نہیں ہاں اس احتیاج کو کسی کے سامنے لے جانے کی ضرورت نہیں، یہ کام دین کا ہے اور دین کے اللہ میاں کفیل ہیں میں بد خلقی نہیں سکھاتا ہوں، خلق ضروری چیز ہے اور ہر شخص سے نرمی کے ساتھ پیش آئیں مگر ان کے اموال پر نظر نہ رکھیں اور کسی خاص شخص کی اعانت کو دین کا موقوف علیہ نہ سمجھیں، البتہ ترغیب اور اظہار ضرورت کا مضائقہ نہیں۔ یہ طریقہ مسنون ہے۔

اس میں راز یہ ہے کہ فی الحقیقت کام کے کفیل اللہ میاں ہیں اور ظاہری صورت اس کی تکمیل کی یہ رکھی گئی ہے کہ چند بندے ایک دوسرے کی اعانت کریں اور اس کو انجام دیں اگر بندوں کو اطلاع نہ ہوگی تو وہ کیوں کر شریک ہوں گے یہ ضرورت ان کو اطلاع دینے کی ہے۔ اطلاع نہ کرنے میں صورت کام کو بگاڑ دینا اور خوشامد کرنے میں بندوں پر تکیہ لازم آتا ہے، اس میں حقیقتہ کام کو بگاڑنا ہے اس وجہ سے خوشامد سے منع کیا جاتا ہے، غرض محض اگر کوئی ظاہراً معین ہوتا ہے وہ اعانت بھی درحقیقت کارساز حقیقی ہی کی اعانت ہے۔

کار زلف تست مشک افشانی اما عاشقاں مصلحت را تہمتے بر آہوئے چیں بستہ اند

(ترجمہ:۔ درحقیقت مشک جیسی خوشبو دارشئی تیری زلف نگہت بیز ہی کی پیداوار ہے عاشقوں نے کسی مصلحت کے پیش نظر آہوئے ختن کی جانب غلط نسبت کر دی۔)

بد خلقی اور استغناء کا فرق:۔

اس لئے کہا جاتا ہے کہ خوشامد نہ کرو اور یہ بد خلقی نہیں، بد خلقی اور چیز ہے اور استغناء اور چیز، بد خلقی تو دوسرے کے حقوق ادا نہ کرنا ہے اور استغناء اپنے حقوق دوسرے کے سامنے نہ لے جانا،

آج کل اس کی احتیاط بہت کم لوگ کرتے ہیں اپنی احتیاج لوگوں کے سامنے لے جاتے ہیں اور اس کا بھی لحاظ نہیں رکھتے کہ وہ لوگ اس کے اہل ہیں یا نہیں۔ بہت سے امراء فاسق و فاجر ہوتے ہیں ان اہل غرض کو ان کا فسق و فجور دیکھنا پڑتا ہے۔ اور چونکہ حاجت مند بن کر گئے ہیں کان نہیں ہلا سکتے، یاد رکھو کہ باوجود قدرت کے منکر کی تغیر نہ کرنا اور سکوت کرنا اس میں شامل ہوتا ہے۔ حدیث شریف میں قصہ آیا ہے کہ حضرت جبرئیل علیہ السلام کو ایک گاؤں کی نسبت حکم ہوا کہ اس گاؤں کو الٹ دو۔ عرض کیا یا اللہ! اس میں ایک ایسا آدمی بھی ہے جس نے کبھی گناہ نہیں کیا، کیا مع اس کے الٹ دوں؟ حکم ہوا ہاں۔ اگرچہ اس نے گناہ نہیں کیا لیکن

لم یتعمر فی وجهه قط.

''یعنی ہماری نافرمانی دیکھتا تھا اور کبھی اس کی پیشانی پر بل نہیں پڑا۔''

یہ وبال ہے منکر پر سکوت کرنے کا، اس پر بعض پڑھے لکھے لوگ کہہ دیا کرتے ہیں کہ سکوت میں مصلحت ہے اس سے چندہ لینا ہے کیوں صاحب! کیا اس کے چندے پر اللہ میاں کا کام موقوف ہے۔ اللہ میاں خود ذمہ دار ہیں۔ چھوڑو مصلحت کیا ہے۔

خلیل آسا در ملک یقین زن   صدائے لا احب الافلین زن

(ترجمہ:۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی مانند عزم و یقین کی دنیا میں قدم رکھتے ہوئے نعرہ **لا احب الافلین** (میں ڈوبنے والوں کو پسند نہیں کرتا)

ان کے ام تو اللہ میاں بناتے ہیں یہ اللہ کا کام کیا بنائیں گے۔ میں یقین کے ساتھ کہتا ہوں کہ علماء کو استغناء کی ضرورت ہے اسی کو چھوڑ کر اپنی وقعت کھو دی ہے۔ اور طرح طرح کی خرابیاں مول لے لی ہیں۔ جب اہل دنیا ان سے کھینچتے ہیں تو یہ ان کی طرف کیوں جھکیں۔

میں نے مولویوں کو خطاب کیا حالانکہ وہ خود زیادہ جانتے ہیں اس واسطے کہ اس کی ضرورت محسوس ہوتی ہے۔ مولویوں کو چاہئے کہ اہل دنیا سے استغناء برتیں ہاں اس کی بناء پر نفسانیت اور ترفع نہ ہو اور اپنے کام کو خلوص سے کریں۔ اور کسی کو دخل نہ دیں دخل نہ دینے کا یہ مطلب نہیں ہے کہ قاعدے کے بھی پابند نہ ہوں بلکہ ان قواعد کے انضباط میں ہر کس و ناکس کی رائے محض اس وجہ سے کہ چندے میں شریک ہے۔ لینے کی ضرورت نہیں۔ آج کل یہ بھی ایک خبط ہو گیا ہے کہ ہر چندہ دینے والے کو یہ حوصلہ ہے کہ میری رائے کیوں نہیں لی جاتی۔ میں انضباط قواعد کا راز بتائے دیتا ہوں جس سے ان شاء اللہ بخوبی واضح

ہو جائے گی کہ ہر شخص کی رائے لینا کیوں مناسب نہیں۔ سنئے دو قسم کی چیزیں ہوا کرتی ہیں ایک آلات وذرائع، دوسری مقاصد۔ مقاصد مقصود بالذات ہوتے ہیں اور آلات صرف میں "من وجهة الایصال الی المقصود" (ایک وجہ سے مقصود تک پہنچانے والے) مقصود ہوتے ہیں، خود مقصود نہیں ہوتے۔

اب میں کہتا ہوں کہ مدرسوں کے لئے جو قواعد ضبط کئے جاتے ہیں، یہ قواعد مقاصد نہیں ہیں۔ یہ صرف اس واسطے ہیں کہ درس کا انتظام رہے۔ تو گویا یہ درس کے لئے آلات ہیں اور مقصود اصلی درس ہے اب میں ایک مثال میں پوچھتا ہوں کہ بڑھئی کا کام جاننے والا بڑھئی کے اوزاروں کی تعداد اچھی طرح جان سکتا ہے یا اور کوئی پڑھا لکھا قابل آدمی؟ اس کا جواب یہی ہے کہ بڑھئی ہی جان سکتا ہے بس افسوس ہے کہ بڑھئی کے آلات کے انتخاب کے لئے تو بڑھئی ہی کی ضرورت ہے اور دیگر بڑے بڑے علوم کی قابلیت کچھ کام نہیں آتی اور علم دین کے آلات کے انتخاب کے لئے علماء کی ضرورت نہیں اور ہر چھوٹے سے چھوٹے علم اور پیشہ کی قابلیت اس میں رائے دینے کے لئے کافی ہے۔ علماء کو ان کے کام میں ان کی رائے پر چھوڑ دو۔ وہی درس کرتے ہیں اور وہی اس کی ضروریات کو سمجھ سکتے ہیں بلکہ تم ان سے یہ کام لو کہ پڑھنے کا طریقہ سیکھو۔ دین کی جو باتیں بتائیں اسکے موافق عمل کرو۔ جس طرح قرآن شریف پڑھائیں اس طرح پڑھو جو حق اس کے بتائیں ان کو ادا کرو۔

قرآن مجید کی بے قدری:۔

ایک کام عورتوں نے قرآن مجید سے لیا ہے کہ چادر میں رکھ کر دو عورتوں نے اس چادر کو پکڑ لیا اور بچے کو اسکے نیچے سے نکال دیا کہ جملہ بلاؤں کی حفاظت ہو جاتی ہے اب نہ اس پر جادو چل سکتا ہے نہ نظر لگ سکتی ہے اور نہ کوئی اور آفت آ سکتی ہے یوں کہتی ہیں کہ اللہ میاں کے نام کی برکت سے جو کچھ ہو کم ہے جیسے دعائے گنج العرش جو کوئی بازو پر باندھ لے نہ اس پر تلوار اثر کرے نہ پانی میں ڈوبے نہ آگ میں جلے نہ سولی پر چڑھے۔ دعائے گنج العرش باندھ کر چوری کیا کرو۔ خوب بے دھڑک ہو کر جو چاہو سو کیا کرو۔ کیونکہ کوئی آفت تو آنے ہی کی نہیں

اِنَّا لِلّٰهِ وَ اِنَّآ اِلَيْهِ رٰجِعُوْنَ

ایک کام قرآن شریف سے چھاپہ خانہ والوں نے لیا ہے کہ اس کو فوٹو کے ذریعہ سے اتنا چھوٹا کرالیا کہ بلا شیشے کے پڑھا نہیں جا سکتا۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے چھوٹا قرآن شریف ایک شخص

کے پاس دیکھا تواس کو درے سے مارا کہ قرآن شریف کی توہین کرتا ہے اور فرمایا کہ ایک ایک حرف الگ الگ لکھو اور صاف صاف چمکتا ہوا لکھو اور اس کو بڑا کمال سمجھ کر شائع کیا جاتا ہے کہ لو اب تو تمام عملیات اور تعویذوں کا اصل اصول ہی ایک تعویز کی صورت میں آ گیا۔ ہر شخص کو بازو پر باندھنا چاہئے یہ گت بنی قرآن شریف کی کہ تماشے کے طور پر شیشے سے دیکھا جا رہا ہے اور جب تمام عملیات کا اصل اصول ہی پاس ہے تو کسی آفت کا خوف نہیں رہا۔ اعمال سیئہ کی جرات بڑھ گئی گھر میں بیٹھے ہیں تب بازو سے بندھا ہے، پاخانہ میں ہیں تب پاس ہے عورت کے پاس جائیں تب ساتھ ہے۔ جنابت کی حالت میں ہوں تب لئے ہوئے ہیں یہ حق قرآن شریف کا مطبع والوں نے ادا کیا۔ حضرت قرآن شریف وہ چیز تھی کہ دروازے سے آتا ہوا دیکھتے تو ہیبت ہوتی بے اختیار کھڑے ہو جاتے نہ یہ کہ شیشے سے اس کا تماشہ بنائیں۔ اس میں جیسے کہ دلی تعظیم اور توقیر کو دخل ہے جسامت کو بھی دخل ہے بڑی چیز کو دیکھ کر خواہ مخواہ بھی قلب میں ایک اثر ہوتا ہے۔

ایک کام قرآن شریف سے یہ لیا گیا کہ فوٹو گراف میں سورتیں بند کی جاتی ہیں اور دو دو پیسے لے کر سنائی جاتی ہیں، یہ اس آیت پر عمل ہے۔

وَلَا تَشْتَرُوْا بِاٰيٰتِ اللّٰهِ ثَمَنًا قَلِيْلًا۔ (ترجمہ:۔اللہ تعالیٰ کی آیات کا حقیر معاوضہ نہ لو)

اللہ میاں کی آیتوں کی یہ قدر کہ کوڑیوں پر بازار میں ماری پھریں، فقہاء اس میں زیادہ کلام کر سکتے ہیں، میں تو کچھ نہیں جانتا ہوں اتنی بات تو ظاہراً معلوم ہوتی ہے کہ یہ محض لہو ولعب ہے جیسا کسبیوں کے راگ بھرے ہوئے ہیں قرآن شریف بھی ہے تاکہ جو لوگ راگ گانے سے احتیاط کرتے ہیں وہ اس ذریعہ سے لہو میں شامل ہوں، کہاں کسبیوں کے راگ اور کہاں قرآن شریف بہاں برہمن وہیں قصائی۔

غرض قرآن پاک سے بجائے اس کے کہ اس کو پڑھا جاتا اور قرأت سیکھی جاتی آج کل یہ کام لئے جاتے ہیں اور قرأت کو بہت مشکل سمجھ رکھا ہے حالانکہ بقدر ضرورت صحت کے لئے صرف اٹھائیس دن محنت کی ضرورت ہے جیسا کہ میں اوپر عرض کر چکا ہوں۔

تجوید کی ضرورت:۔

مسلمانوں سے میں یہ نہیں کہتا کہ سب کے سب قاری بن جائیں ہاں یہ سب کے ذمہ ہے کہ

بقدرِ ضرورت قرآن کو صحیح کرلیں اور یہ جب ہی ہوسکتا ہے کہ ایک استاد سکھانے والا ہو اور تجربہ سے ثابت ہوتا ہے کہ سیکھنے والا خواہ کسی حد تک کوئی فن سیکھنا چاہے مگر سکھانے والا پورے فن کا ماہر ہونا چاہئے۔ حاصل یہ کہ قرآن شریف صحیح کرنے کے لئے ایک قاری کی ضرورت ہے مگر کام تو باتوں سے نہیں ہوتا۔ جب قاری رہے گا تو اس کے اخراجات کی کفالت آپ کے ذمہ ہے اور ہر فن کے لئے کچھ آلات کی ضرورت ہوتی ہے قاری کے لئے کچھ کتابیں بھی مہیا کی جائیں۔ اور جتنے امور ضروری ہیں ان سب کی کفالت آپ کو کرنی چاہئے پھر اس کی کفالت کے دو طریقے ہیں ایک تو یہ کہ ہر ہر شخص کے یہاں ایک ایک قاری رہے اور ہر جگہ کتابیں اور دیگر ضروری سامان منگایا جائے۔ اور ایک یہ کہ ایک جگہ اس کا انتظام کافی طور سے کرلیا جائے اور سب اس سے مستفیض ہوں۔ اس میں بہت سہولت ہے آپ کو اطلاع دی جاتی ہے کہ اس مکان میں جہاں آپ بیٹھے ہیں یہ انتظام کیا گیا ہے کہ قرأت سکھائی جائے اور اس کے لئے جتنے سامان کی ضرورت ہے سب یکجائی ہیئت سے جمع کیا جائے۔ قرأت سیکھنے اور قرآن شریف کے صحیح کرنے کی ضرورت تو ہر شخص کے لئے ثابت ہوگئی پھر اس ضرورت کے پورا کرنے کے لئے جو بھی طریق ہوتا خواہ کیسا ہی مشکل ہوتا اختیار کرنا ضرور تھا۔ مگر حق تعالیٰ نے اپنے فضل سے آسانی کردی کہ اپنے کچھ بندوں کو اس طرف متوجہ کردیا۔ اور اللہ میاں کا نام لے کر اس کام کو شروع کیا ہے میں کہتا ہوں کہ دین میں عجب خوبی ہے کہ تھوڑی رقم میں بے بہا دولت ملتی ہے کاش اس دولت کی ضرورت لوگوں کو محسوس ہوجائے۔ تجربے سے ثابت ہوتا ہے کہ جب تک کسی چیز کی ضرورت ثابت نہیں ہوتی اس وقت تک اس میں دیر ہوتی ہے اور جہاں ضرورت ذہن نشین ہوئی پھر کہیں نہ کہیں سے اس کا سامان ہو ہی جاتا ہے ان آدمیوں کو دیکھئے جن کی اوقات بہت ہی تھوڑی ہے اگر ان سے کہا جائے کہ مسجد یا مدرسے میں چندے کی ضرورت ہے تو عذر کریں گے کہ ہم خود مفلس ہیں اور جب شادی ہو تو انہیں کے پاس کہیں نہ کہیں سے مال آجاتا ہے وجہ کیا ہے کہ شادی کے خرچہ کی ضرورت ان کے ذہن میں ثابت ہوگئی کہ برادری میں ناک کٹی ہوگی اور مسجد اور مدرسے کے چندے کی ضرورت ثابت نہیں ہوئی اور مسجد اور مدرسے کی بھی جہاں ضرورت ثابت ہو جاتی ہے تو بحمد اللہ مسلمان اس کام کو بھی انجام دیتے ہیں مسلمانوں میں جوش تو ہے مگر

لوگ کہتے ہیں چاہ مشکل ہے　　　　سب غلط ہے نباہ مشکل ہے

ایسے لوگ کم ہیں کہ اپنی بات کو نباہ دیں۔

چندہ دہندگان کو مشورہ:۔

چندہ دینے والوں کیلئے دو باتیں ہیں جو کہ خیال رکھنے کے قابل ہیں ایک یہ کہ اپنی وسعت سے کم مت دو اور خواہ تھوڑا دو مگر نباہ دو۔

احب الاعمال الی اللہ ادومھا و ان قل ۔ (صحیح مسلم ص ۲۱۸) (ترجمہ:۔اللہ تعالیٰ کو وہ عمل محبوب ہے جو ہمیشہ ہو خواہ مختصر ہو۔)

دوسرے یہ کہ چندہ دے کر مدرسے کو اپنی ملکیت مت سمجھو، اور مہتممین کی رائے میں دخل مت دو۔آج کل یہ مرض بکثرت ہو گیا ہے کہ ذرا سا چندہ دے کر حکومت کرتے ہیں۔ایک پیسہ بھی جس کا مدرسے میں شامل ہے وہ مدرسے کے ہر کام میں دخل دینے کو تیار ہے اور اپنی ہی رائے کو ترجیح دینا چاہتا ہے اور اگر بلا رائے ان کے کوئی انتظام کر لیا جائے تو چندہ بند کر لیتے ہیں۔بعض لوگوں کو تو یہاں تک عادت ہے کہ خواہ مخواہ اعتراض کیا کرتے ہیں خود کوئی تدبیر اصلاح کی نہیں کرتے اور دوسروں کی تجویزوں میں عیب چھانٹا کرتے ہیں۔ان کی وہ حالت ہے کہ ایک لڑائی میں کشت وخون زیادہ ہوا تھا۔ میدان جنگ میں صدہا مردے پڑے ہوئے تھے، مگر زخم ایسے لگے تھے کہ اٹھ نہیں سکتے تھے۔اتفاقاً لشکر کا بنیا ان کے پاس کو ہو کر نکلا، انہوں نے آواز دی کہ بھائی ذرا سنتے جاؤ تمہارے کام کی بات ہے۔ بنئے نے تھوڑی دور کھڑے ہو کر پوچھا، کیا ہے کہا میں تو اب مرجاؤں گا۔میری کمر میں ہمیانی ہے وہ تو کھول لو۔تمہارے ہی کام آئے گی مبادا کسی اور کے ہاتھ پڑ جائے بنئے لالچی ہوتے ہی ہیں۔بنیا آگے بڑھے جب خوب قریب پہنچ گئے۔تو ان مجروح صاحب نے اپنے پورے زور سے ان کی ٹانگ میں ایک تلوار ماری کہ ہڈی ٹوٹ گئی۔بنئے نے کہا کمبخت تو نے یہ کیا حرکت کی؟ تو کہا کہ ہمیانی تو کہاں رکھی ہے، کوئی ہمیانی بھی باندھ کر لڑائی میں آتا ہے۔اس میدان میں رات کو اکیلے پڑے رہتے، دوسرا ایت کے لئے تمہیں بھی بلا لیا۔وہ بنیا کیا کہتا ہے کہ ادت کے اوت نہ آپ چلے نہ اور کو چلنے دے بس یہی حال ان معترضین کا ہے کہ نہ خود چلیں نہ دوسروں کو چلنے دیں۔ایسے لوگوں سے یہ التماس ہے کہ ہم نے آپ کے چندے سے دست برداری دی۔ہمارے کام میں رخنہ مت ڈالو۔

مرا بخیر تو امید نیست بد مرساں

(ترجمہ:۔مجھے تجھ سے بھلائی کی امید نہیں اتنا کافی ہے کہ مجھے شر نہ پہنچانے)

ہم لوگوں کی خاصیت چھوکی سی ہوگئی ہے، اس کی خیر یہی ہے کہ شر نہ پہنچائے سو خود مدد نہ دیں مگر دوسروں کے کام تو نہ بگاڑیں۔ رہا اعتراض کرنا اور عیب نکالنا، سو بے عیب تو خدا کی ذات ہے۔ جن کو عقل دی گئی ہے وہ نرے عیب پر نظر نہیں کرتے۔ جہاں عیب و ہنر دونوں پاتے ہیں، ہنر کی طرف دیکھتے ہیں اور عیب کو چھپا دیتے ہیں یا اصلاح کر دیتے ہیں اور عناد کی تو بات ہی دوسری ہے، مدرسوں میں اعتراض پیدا ہونے کیا مشکل ہیں جبکہ مدرسوں کے اصل اصول بھی نہیں چھوٹے۔ چنانچہ یہود نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا کہ آپ پر وحی کون لاتا ہے آپ نے جواب دیا جبرئیل علیہ السلام لاتے ہیں، کہنے لگے جبرئیل تو ہمارا دشمن ہے، اگر میکائیل علیہ السلام لاتے تو ہم بھی ایمان لے آتے۔ یہ بھی تو اعتراض ہی تھا، ایسے اعتراضوں سے تو کوئی بھی نہیں بچا۔ اہل مدرسہ پر اگر کئے جائیں تو کیا بعید ہے۔

صاحبو! آپ کو دل و جان سے امداد کرنی چاہئے نہ کہ عیب نکالنا، ہاں اگر کوئی عیب آپ کے نزدیک ثابت ہو تو اس کو اس طور سے دفع کیجئے جو اس کا طریقہ ہے حدیث میں ہے (قربان جایئے شریعت کی تعلیم کے) فرماتے ہیں۔

المؤمنين مرأة المؤمن۔ (سنن ابی داود: ۴۹۱۸۔ کنز العمال: ۶۷۲، ۶۷۳، ۶۷۶، ۶۷۷)

لوگوں نے اس کی تفسیر کئی طرح سے کی ہے جو ہمارے مشائخ کے نزدیک ہے وہ یہ ہے کہ مؤمن کو مؤمن کے لئے آئینہ کے ساتھ تشبیہ دی گئی ہے اس بات میں کہ آئینہ دیکھنے والے کا راز دار ہوتا ہے اس کے عیب کو اسی کے سامنے ظاہر کرتا ہے دوسروں سے ہرگز نہیں کہتا، اسی طرح جو کوئی بھی [illegible]ے کے عیب چھانٹا کرے ہماری عین خوشی ہے، اس سے اصلاح ہوتی ہے مگر ایسے آدمی کم ہیں آج کل تو یہ مرض ہے کہ چندہ دے کر یہ خیال ہو جاتا ہے ہم مدرسے کے مالک ہیں اور جو لوگ اس خیال سے بچنا بھی چاہتے ہیں بسا اوقات ان کو بھی رائے دیتے وقت اشتباہ ہو جاتا ہے کہ عیب جوئی کو نصیحت سمجھتے ہیں پھر نصیحت کی صورت میں عیب جوئی میں پڑ جاتے ہیں اس سے بچنے کا طریقہ میں بتائے دیتا ہوں کہ آپ کے نزدیک جو بات قابل اعتراض ہو۔ اس کو علی الاعلان پھیلاتے نہ پھریئے، خلوت میں مہتمم یا کسی مدرس پر ظاہر کیجئے اور پھر یہ انتظار نہ رکھیے کہ ہمارے کہنے کے موافق ہی ہو جائے۔ اس طرح آپ ناصحین میں شمار ہوں گے اور عیب جوئی سے بچ جائیں گے خلاصہ یہ کہ رائے دو اور انتظام میں دخل نہ دو، مدرسے کو اللہ میاں کا سمجھ کر کام

کرو، اپنا مت سمجھو، یہ وہ گر ہے کہ اگر اس کا سب خیال رکھیں تو کوئی بھی خرابی پیدا نہ ہو، چندہ دینے والے اس کا خیال اسی طرح رکھ سکتے ہیں جیسے میں نے عرض کیا اور مہتممین یوں رکھ سکتے ہیں کہ اس کی رقم کو امانت سمجھیں اور اپنی اپنی خدمات منصبیہ کو حق اللہ سمجھیں اور ان کو نہایت خلوص کے ساتھ بجالائیں اور خلوص کے دو جزو ہیں ایک ظاہری اور ایک باطنی۔ باطنی تو یہ ہے کہ اپنے آپ کو عبد اور حق تعالیٰ کو مولیٰ سمجھ کر احکام کی تعمیل کریں۔ اور ظاہری یہ ہے کہ اپنے آپ کو عالم نہ کہیں بلکہ وہ خادم کہیں وہ نام تک اختیار نہ کریں جن سے حکومت اور ترفع پایا جائے۔

ہوس جاہ:۔

آج کل یہ بھی ایک خبط ذہنوں میں سما گیا ہے کام چاہے کتنا ہی ذرا سا شروع کریں، مگر عہدے اور خطابات بڑے بڑے اختراع کر لیتے ہیں۔ کوئی سیکرٹری بنتا ہے کوئی جنٹ ہوتا ہے ایک صاحب کا خط میرے پاس آیا، جس پر کاتب صاحب ہی کے قلم کا لکھا ہوا تھا، راقم فلاں، گورنر یتیم خانہ مقام فلاں، میں نے کہا کہ بہتر تھا کہ ''خادم یتیم خانہ'' لکھتے، بہت جگہ یہ تجربہ ہوا کہ جہاں یہ خطابات لمبے چوڑے ہوتے ہیں وہاں کارروائی صرف رجسٹر ہی تک محدود رہتی ہے۔ خارجی وجود کی نوبت نہیں آتی، چند روز کے لئے عہدے البتہ مل جاتے ہیں۔ سو یہ بچوں کا کھیل ہوا یا کچھ اور، ان الفاظ کو اختیار مت کرو۔ اس سے برکت نہیں رہتی۔ یہ غیر قوموں کی تقلید ہے۔

من تشبه بقوم فهو منهم ۔ (سنن ابی داؤد: ۴۰۳۱۔ مسند الامام احمد، ۲: ۵۰، ۹۲)

(ترجمہ:۔ جس نے کسی قوم کی مشابہت اختیار کی پس وہ انہی میں سے ہے۔)

یہ حدیث لباس اور وضع کے ساتھ ہی خاص نہیں ہے، جس بات میں مشابہت پائی جائے سب اسی کے اندر داخل ہیں، یہ اچھا ہے کہ تم اپنے آپ کو خادم کہو اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تسلیماً تمہارا نام سردار رکھیں۔

سید القوم خادمهم ۔ (الحاوی للفتاویٰ۔ ۲: ۱۰۱۔ مشکوٰۃ المصابیح: ۳۹۲۵)

(ترجمہ:۔ قوم کا سرداران کا خادم ہوتا ہے۔)

یہ کتنی برکت کا سبب ہے، آج کل لوگوں نے اس کے برعکس کر رکھا ہے کہ بڑے بڑے خطابات لے لیتے ہیں۔ خواہ ان کی اہلیت ہو یا نہ ہو۔ حدیث شریف میں ہے

اذا مدح الفاسق غضب الرب تعالیٰ واهتزله العرش۔(مشکوٰۃ المصابیح:۴۸۵۹)

(ترجمہ:۔یعنی جب فاسق کی تعریف کی جاتی ہے تو عرش کانپ اٹھتا ہے)

اور آج کل اکثر مدرسے فساق کے ہاتھوں میں ہیں اور ان کی مدح ہوتی ہے۔ پھر زمین کانپ اٹھتی ہے تو کیوں تعجب کیا جاتا ہے زلزلہ کو بہت لوگ پوچھتے ہیں کہ یہ کیا چیز ہے اس کی حقیقت کیا ہے اور کیوں آتا ہے زلزلہ کے متعلق لوگوں کے خیالات عجیب طرح مختلف ہیں۔کوئی کہتا ہے گائے سینگ بدلتی ہے یہ وہ حرکت ہے،کوئی کچھ کہتا ہے اور کوئی کچھ۔آج کل جو مدعیان تحقیق ہیں ان کی بڑی دوڑ یہ ہے کہ مسامات ومنافذ بند ہونے سے زمین کے بخارات زور کرتے ہیں اس سے یہ حرکت ہوتی ہے میں کہتا ہوں۔یہ صرف تخمینا ہے اس پر کوئی دلیل قطعی نہیں ہے اور اگر کبھی بخارات سے بھی یہ حرکت واقع ہو تو ہم انکار نہیں کرتے لیکن اس کی کیا دلیل ہے کہ ہمیشہ یہی سبب ہوتا ہے ممکن ہے کہ یہ حرکت کبھی بخارات سے ہوتی ہو اور کبھی کسی اور سبب سے۔لیکن کسی سبب سے بھی ہو یہ بات تو مسلم ہے کہ سبب میں تاثر بالذات نہیں۔پھر اگر سبب کو صحیح طور پر معلوم بھی کر لیا تو کیا نتیجہ،مسبب ہی کی طرف کیوں نہ رجوع کیا جائے۔تاکہ بلا ٹلے۔مگر مرض یہ ہے کہ سبب کی تحقیق میں لگ جاتے ہیں اور جو واہی تباہی سمجھ میں آجائے اسی کو یقینی سبب جان لیا ہے میں کہتا ہوں اگر قیامت آجائے اور اس کے بعد ایک اور قیامت آجائے اسی طرح قیامت ہزار قائم ہو جائیں،مگر انحصار کی دلیل نہ لاسکیں گے،کہ سوائے نجات کے اور کوئی سبب زلزلہ کا نہیں ہوسکتا۔اور کوئی دلیل ہے کسی کے پاس تو میں بھی سننا چاہتا ہوں۔

غرض ان خرافاتوں کا لوگوں کو بہت شوق ہے اور اپنی تخمین کو یقینی دلیل سمجھ لیتے ہیں صاحبو!تمام آفتیں گناہوں سے آتی ہیں،گناہوں کو چھوڑو،منجملہ گناہوں کے فاسق کی مدح و ترفع بھی ہے جس سے عرش کو زلزلہ ہو جاتا ہے اگر کبھی زمین کو بھی ہو جائے تو کیا تعجب ہے اور ان بڑے بڑے خطابات میں یہ مدح لازم آتی ہے لہٰذا یہ لفا۔۔ مت اختیار کرو۔انکسار اختیار کرو۔

اہل علم کے لئے یہ الفاظ زیبا نہیں ہیں سچ کہتا ہوں کہ اگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اس وقت میں تشریف رکھتے ہوتے تو ان الفاظ سے ضرور منع فرماتے۔لفظ''راعنا'' تک سے نہی قرآن شریف میں موجود ہے صرف اس وجہ سے کہ مشابہت کفار لازم آتی ہے چہ جائیکہ یہ الفاظ ان میں علاوہ مشابہت کے ترفع اور تکبر بھی ہے اگر فرض کر لیجئے کہ مشابہت کفار بھی نہ ہوتی تب

بھی وجود ترفع وتکبر کے ان کے منع کے لئے کافی تھا کیا ممبر اور گورنر ہی لفظ رہ گئے ہیں اگر ضرورت ہے تو اپنے قرآن شریف میں سے تلاش کرلو۔ فرماتے ہیں

وَشَاوِرْهُمْ فِي الْأَمْرِ ۔ (ترجمہ:۔ اور ان سے اہم کاموں میں مشورہ لیجئے)

اس سے رائے دہندگان کا نام مشیر اور مکان کا نام مجلس شوریٰ اخذ کیا جاسکتا ہے یہ الفاظ ممبر اور کمیٹی کا کام بخوبی دے سکتے ہیں پھر کیوں دوسروں کی شاگردی کی جائے، اور صاحبو! تجربہ سے تو یہ ثابت ہوتا ہے کہ ان الفاظ کی بھی چنداں ضرورت نہیں پورا کام چاہئے جہاں خطابات اور ضوابط بڑے بڑے دیکھے وہاں کام خاک بھی نہیں پایا، وہاں کی کارروائی صرف رجسٹر ہی تک محدود رہتی ہے۔ ان زوائد کو چھوڑو اور اصل کام خلوص اور تندہی کے ساتھ کرو۔ مدرسے میں صرف ممبر یا مشیر ہی مت بنو بلکہ لڑکوں کو بھیجو اور جو اصل کام ہے یعنی قرآن شریف کی تصحیح اس کو کمال تک پہنچا کر دکھاؤ۔

ترجمہ کی اہمیت:۔

اللہ میاں یہ نہیں پوچھیں گے کہ ممبری یا گورنری کا خطاب بھی حاصل کیا تھا یا نہیں، ہاں یہ پوچھیں گے کہ قرآن کو قرآن ہی کی طرح پڑھا تھا یا نہیں اس کا حق ادا کیا تھا یا نہیں، یہ خدمت الفاظ کی ہوئی اور دوسری خدمت قرآن شریف کی یہ ہے کہ الفاظ کے مفہوم کو سمجھیں۔ جب تصحیح الفاظ سے فراغت ہو تو اس کا ترجمہ پڑھیں تاکہ احکام سے آگاہی ہو۔ آج کل اس میں بھی لوگوں نے خبط کر دیا۔ اول تو محبت کا منتہا صرف عبارت ہی پڑھنے تک رہتا ہے اور اگر کسی نے شوق کیا اور ترجمہ دیکھنا شروع کیا تو ترجمہ بھی کسی بڑے آدمی کا تلاش کیا جائے گا جیسا کہ دنیاوی امور میں تمول اور جاہ مابہ الامتیاز قرار دیا گیا ہے ایسے ہی دین میں بھی بڑا آدمی ہونا دیکھا جاتا ہے خیال یہ ہے کہ ڈپٹی صاحب کا ترجمہ بھی ڈپٹی اور تحصیلدار صاحب کا ترجمہ بھی تحصیلدار ہی ہوگا۔ حالانکہ

لکل فن رجال ۔ (ترجمہ:۔ ہر کام کے لئے کچھ آدمی ہوتے ہیں۔)

کسان کسان ہی کا کام کرسکتا ہے اور بڑھئی بڑھئی ہی کا کام اور لوہار لوہار ہی کا کام کرسکتا ہے۔ میں پوچھتا ہوں ڈپٹی صاحب تحصیلدار صاحب کا کام مولوی لوگ بھی کرسکتے ہیں؟ اور ان کو ان کے کام میں دخل دینا زیبا ہے؟ جواب یہی ہے کہ نہیں کرسکتے اور ان کو دخل دینا نازیبا ہے پھر ڈپٹی صاحب اور تحصیلدار صاحب کو یہ جرأت کیسے ہوئی کہ ان کا کام کرنے لگے۔ ان سے اپنا ہی کام خوب ہوتا ہے اس خدمت کو انہی کے لئے چھوڑ دیا ہوتا یہ ان کا کام نہیں ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان لوگوں نے فاحش غلطیاں کی ہیں قرآن

شریف کے ترجمہ کے لئے علماء ہی کا مذاق موزوں ہے، کتاب اللہ میں جیسے کہ اصل کتاب میں شان سلطانی برستی ہے ایسے ہی ترجمہ میں بھی ہونی چاہئے زبان میں بناوٹ نہ ہو، زنانہ پن نہ ہو، جب پڑھا جاوے تو یہ معلوم ہو کہ شاہی حکم رعایا کو سنایا جاتا ہے کوئی لفظ آداب شاہی کے خلاف نہ ہو۔ قرآن شریف کا ترجمہ ایسا نہیں ہوسکتا۔ کہ ذَهَبْنَا نَسْتَبِقُ کے معنی لکھے ہیں (ہم کبڈی کھیلنے لگے) حالانکہ قطع نظر اس کے کہ یہ لفظ رکیک ہے خود لغت کے بھی خلاف ہے کیونکہ استباق سبق سے ہے، سبق سے مراد آگے بڑھنا۔ استباق سے مراد یہ ہے کہ ہم اس لئے دوڑے کہ دیکھیں کون آگے نکلے، اور کبڈی میں یہ مراد مقصود نہیں پھر خود عقل کے بھی خلاف ہے۔ کیونکہ کبڈی میں "حافظ متاع" نظر سے غائب نہیں ہو جاتا کہ بھیڑیے کے لئے جانے کا عذر ہو سکے۔ لیجئے یہ ترجمہ ہے۔ بات یہ ہے کہ صرف عربی زبان جاننے سے ترجمہ نہیں ہوسکتا۔ قرآن مجید کے ترجمے کے لئے مختلف علوم کی ضرورت ہے اور لوگ صرف نیا رنگ دیکھ کر ڈھلتے ہیں اتنا مادہ نہیں کہ بھلے برے کو پہچانیں۔ پس خود گمراہ ہوتے ہیں اور اوروں کو گمراہ کرتے ہیں جنہوں نے اپنی اولاد کو قرآن شریف پڑھایا بھی تو اکثر تو یہ ہے کہ بس صرف الفاظ پڑھا دیئے اور اس کے لہجے اور آواز کو سن کر خوش ہوتے ہیں کہ بچہ طوطے کی طرح پڑھتا ہے، سو اطمینان رکھئے طوطا ہی رہے گا، ان شاءاللہ آدمی نہیں ہوگا، آدمی ہوتا ہے علم سے، اور علم صرف الفاظ ہی کا نام نہیں ہے۔

صاحبو! اس کو آدمی بنایئے، وہ علوم پڑھایئے کہ الفاظ کے مفہوم کو سمجھے اور صحیح اور غلط ترجمہ میں تمیز کر سکے تا کہ گمراہی سے خود بھی بچے اور اوروں کو بھی بچائے مگر اس کی تو ضرورت ہی ذہنوں سے نکل گئی اور عام لوگوں کو اعتراض ہے کہ اگر تمام عمران علوم میں صرف کی جائے تو نہ بڑھئی، بڑھئی رہے گا اور نہ لوہار لوہار۔ پھر دنیا کا کام کیسے ہو۔ معاش کی کیا تدبیر ہے، جواب یہ ہے کہ یہ تو نہیں کہا جاتا کہ سب کے سب متبحر عالم ہی بن جاؤ، عربی ہی میں تکمیل کرو، بلکہ ضرورت کے موافق احکام الٰہی سیکھ لو اور اس سیکھنے کی صورتیں مختلف ہیں۔ جس کو جس طرح آسان ہو، عربی میں ممکن ہو عربی ورنہ چھوٹے چھوٹے اردو کے رسالے پڑھ لو۔

مختصر نصاب کی ضرورت:۔

اس ضرورت کو دیکھ کر نصاب تعلیم کا اختصار کیا گیا ہے کہ جہاں پہلے دس برس صرف ہوتے تھے، اس میں صرف اڑھائی برس لگتے ہیں۔ اس کو نئی بات سمجھ کر آپ چونکیں نہیں اور یہ نہ کہیں کہ جب اڑھائی برس میں وہی کام ہوتا ہے جو دس برس میں ہوتا تھا تو کیا پہلے علماء نے وقت ضائع کرنے کو یہ مدت رکھی تھی کیونکہ میرا مطلب یہ نہیں ہے کہ بعینہ وہی تعلیم جو دس برس میں ہوتی تھی اب اڑھائی برس میں ہوا کرے گی بلکہ ضروریات کو منتخب

کرلیا گیا ہے کہ ان کو معلوم کر کے اپنے دین کو مستحکم کرسکتا ہے اور متوسط استعداد کا مولوی ایک گونہ جامعیت کے ساتھ بن سکتا ہے اگرچہ تجربہ نہ ہو مگر اتنی استعداد ہو جائے گی کہ اگر چاہے تو اپنی لیاقت بڑھا سکتا ہے۔

یہ نصاب کم فرصت لوگوں کے لئے تو ضروری ہی ہے، اگر وہ لوگ بھی جو نصاب قدیم کی تکمیل چاہتے ہیں پہلے اس کو پورا کر کے نصاب قدیم کو پورا کرلیں تو نہایت مفید ہو، مجھے تجربہ سے ثابت ہوا کہ کار آمد شے میں دھوکہ نہیں دیتا ہوں، میں نے ایک عرصے تک پہلے اپنے عزیزوں پر تجربہ کیا، جب پورا اطمینان ہو گیا تب شائع کیا ہے۔ اس کے شائع کرنے سے یہ غرض نہیں کہ نصاب قدیم عبث ہے اور اس کو بالکل چھوڑ دیا ہے بلکہ جس کو فرصت و ہمت ہو نصاب قدیم کی تکمیل کرے اور جن کو کم فرصتی کا عذر ہو اسے اختیار کریں، کام نکالنے کیلئے کافی ہے، چونکہ یہ شکایت عام طور سے زبان زد ہو گئی ہے کہ اگر علم دین حاصل کریں تو اور کوئی کام نہیں ہو سکتا، اس لئے بعض اہل رائے کی تجویز ہے کہ دیگر علوم کی گنجائش دینے کو نصاب جدید پڑھایا جائے اور اس کے لئے ہر شہر میں ایک مدرسہ ہو۔ چنانچہ یہاں بھی ایک شاخ اس مدرسے میں اس کے لئے بڑھائی گئی ہے۔ اب آپ صاحبان کو کوئی عذر علم دین حاصل نہ کرنے کا باقی نہ رہا، لیکن یہ سب اس وقت ہے کہ دین کی ضرورت آپ کے ذہن میں ہو۔ اگر ضرورت ہی آپ کے ذہن میں نہ ہو تو تھوڑی مدت اور بہت، سب برابر ہیں مگر میں کہتا ہوں جس کی ضرورت دلیل سے ثابت ہو چکی اس کے ذہن میں نہ ہونے کی کیا وجہ ہے، کوئی صاحب عقل ایسا نہیں ہو سکتا کہ اس کی ضرورت کو تسلیم نہ کرے، پھر باوجود ضرورت کے اگر کوئی اس کو پورا نہ کرے تو اس کو غفلت کہتے ہیں۔ جس کا انجام حسرت و ندامت ہے۔

صاحبو! اس حسرت سے بچئے، دین کی ضروریات دنیا سے زیادہ ثابت ہوتی ہیں۔ اس بناء پر تو دنیا کے علوم میں جتنا وقت صرف ہوتا ہے اس سے زیادہ دین کے علوم میں صرف کرنا چاہئے۔ اگر زیادہ نہ ہو تو برابر تو ہو۔ لیکن اب تو برابر کو بھی نہیں کہا جاتا ہے صرف اتنا وقت تجویز کیا گیا ہے جس میں دیگر علوم کی بھی گنجائش رہے اس مدت میں بچے کو جملہ کاموں سے برطرف کیجئے، صرف علم دین میں مشغول رکھئے پھر اختیار ہے جو فن چاہے سکھایئے، پھر ان شاء اللہ دین میں اس کے کبھی خلل نہ آئے گا، اگر ڈاکٹر کسی بچے کی نسبت کہہ دے کہ تین برس تک انگریزی نہ پڑھاؤ ورنہ دماغ خراب ہو جائے گا تو آپ مان لیں گے خواہ یہی زمانہ اس کے امتحان اور پاس ہونے کا ہو۔ اور آپ جانتے ہیں کہ اگر یہ تین برس خالی رہے گا تو پہلا پڑھا ہوا سب بھول جائے گا اور آئندہ پڑھنے کی عمر نہ رہے گی مگر اس خیال سے ڈاکٹر کا کہا مان لیں گے کہ

تندرستی مقدم ہے اگر پاس بھی ہو گیا اور تندرستی نہ رہی تو نوکری کیسے کرے گا۔ بس اسی طرح سمجھ لو کہ اڑھائی برس کے لئے ہم نے بچے کو ہسپتال میں یعنی دینی مدرسے میں بھیج دیا ہے۔ پہلے اپنی روحانی صحت کو درست کر لے پھر جسمانی صحت بھی درست کر لے گا اول تو اڑھائی برس میں دنیا کا کچھ نقصان نہیں۔ اتنا وقت بسا اوقات لہو لعب میں غارت ہو جاتا ہے اور اگر کچھ نقصان بھی ہو تب بھی مسلمان کے لئے تو دین ہی مقدم ہے، احکام خداوندی کے سامنے تو کسی چیز کی بھی وقعت نہیں، پہلے ان کی تعمیل چاہیے پھر اور کام، ان کی تعمیل جب ہی ہو سکتی ہے کہ "کتاب اللہ" کو پڑھے اور کتاب اللہ کو پڑھنے کے معنی یہ نہیں کہ صرف لفظ پڑھ لے بلکہ اس کے مفہوم کو سمجھے جو کہ موقوف ہے تحصیل علوم دین پر۔

تلاوت اور عمل:۔

تیسرا حق تلاوت و عمل ہے اور سب سے زیادہ اہم اور مقصود یہی ہے، پہلے دونوں حقوق کو اس کیساتھ ذریعہ کو مقصود کیساتھ جیسی نسبت ہے، میں یہ نہیں کہتا طالب علموں سے کہ عمل کی نیت نہ ہو تو پڑھو ہی مت، پڑھو تو ضرور ہی لو گو جرأت کی بات ہے، مگر میں تجربہ سے کہتا ہوں کہ علم دین شروع کرتے وقت اگر نیت عمل کی نہ بھی ہو تو پرواہ مت کرو۔ علم دین وہ چیز ہے کہ نیت کو بھی ٹھیک کر لے گا۔ ایک بزرگ کا قول ہے۔

تعلمنا العلم لغیر اللہ فابی العلم الا ان یکون للہ ۔

(یعنی ہم نے علم پڑھا تو تھا غیر اللہ کے لئے لیکن علم خود ہی نہ مانا اور اللہ میاں ہی کا ہو کر رہا)

مطلب یہ ہے کہ ابتداء میں چنداں خلوص نہ تھا مگر انتہاء میں خلوص پیدا ہو ہی گیا۔ اس لئے میں کہتا ہوں کہ اگر عمل کی توفیق نہ بھی ہو تب بھی علم پڑھے جاؤ ان شاء اللہ ضرور عمل نصیب ہو گا۔ جب آدمی ہمیشہ فقراء و اہل اللہ کے قصے اور حالات پڑھے گا تو کب تک اثر نہ ہو گا۔ ہاں یہ خیال رکھو کہ معصیت کا بھی عزم مت کرو۔ کیونکہ معصیت سے نور علم مٹ جاتا ہے۔ ابتداء میں اگر علماء حق کا سا خلوص نہ ہو تو پرواہ مت کرو لیکن بالقصد معصیت کے پیچھے بھی مت پڑو اور بے باک مت ہو جاؤ۔ امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کا قصہ ہے کہ انہوں نے اپنے استاد سے اپنے حافظ کی شکایت کی تو انہوں نے جواب دیا اس کو اس طرح نقل فرماتے ہیں۔

شکوت الی وکیع سوء حفظی   فاوصانی الی ترک المعاصی

فان العلم فضل من اللہ   وفضل اللہ لا یعطی لعاصی

(یعنی میں نے اپنے استاد وکیع سے سوء حفظ کی شکایت کی تو انہوں نے مجھ کو نصیحت کی کہ گناہوں کو چھوڑو کیونکہ علم اللہ میاں کا فضل ہے اور اللہ میاں کا فضل گناہ گار کو نہیں نصیب ہوتا۔

تجربہ کر لیجئے کہ معصیت سے کھانے تک کا مزہ مٹ جاتا ہے طبیعت کو عجب طرح کی پریشانی ہوتی ہے کہ سونے کا لقمہ بھی ہو تو مٹی سے بدتر ہو جاتا ہے اور اس سے زیادہ میں کیسے سمجھاؤں معصیت سے اس نور کو مت مٹاؤ اس نور کو حاصل کرو پھر پڑھو، دوسروں کو پڑھاؤ، اس میں مدد کرو علماء کے زمرے میں شامل رہو۔

الدال علی الخیر کفاعلہ ۔ (المعجم الکبیر للطبرانی ۶:۲۳۰، ۱۷، ۲۲۷، ۲۲۸)

(نیک کام کا بتا دینے والا بھی کرنے والے کے حکم میں ہوتا ہے) بتا دینا ذرا سی امداد ہے جب اس کا حکم یہ ہے تو پوری امداد دینے والے کا حکم ظاہر ہے روپے سے مدد کرو، ہاتھ پاؤں سے مدد کرو، بہت سے کام ایسے ہیں کہ روپے سے ہوتے ہیں اس میں روپے سے شریک ہو، اگر کسی کے پاس روپیہ نہ ہو اور ہاتھ پاؤں سے بھی مدد نہ دے سکے تو دعا سے مدد کرو کہ اللہ میاں اس میں سعی کرنے والوں کی مدد فرما دیں یہ تو کہیں نہیں گیا اس سے تو کوئی بھی معذور نہیں۔ غرض ہر طرح مدد کرو اور اس کا خیال رکھو کہ آپس میں اختلاف نہ کرو سب مل کر خلوص سے کام کرو یہ قرآن شریف کی خدمت ہے اگر آپ ہمت کریں گے تو قرآن شریف کے تینوں قسم کے حقوق ادا ہو جائیں گے اور سب ہی کچھ ہو جائے گا۔

خلاصہ وعظ:۔

قال اللہ تعالیٰ اَلَّذِیۡنَ اٰتَیۡنٰہُمُ الۡکِتٰبَ (الایۃ) (ترجمہ:۔ جن کو ہم نے کتاب دی ہے)

اس آیت میں توریت کی تلاوت کی مدح ہے اور یہ مستلزم ہے مدح تلاوت قرآن کو اور یہ ظاہر ہے کہ تلاوت سیکھنے پر موقوف ہے اور مقدمہ ضروری ہوا کرتا ہے تو آیت میں مدح ہوئی قرآن شریف کے سیکھنے کی بھی اور سیکھنا ضروری ہوا۔ اور صرف اتنا سیکھنا نہیں جس سے قرآن شریف فقط پڑھ ہی سکیں۔ بلکہ اتنا کہ اس سے تلاوت کے پورے پورے حقوق ادا کر سکیں۔ حقوق تلاوت تین قسم کے ہیں، ظاہر اور باطن اور ابطن۔ سب سے مقدم ظاہری ہے اور سب سے مؤکد ابطن۔

"فان الحقیقۃ بدون الصورۃ باطل والصورۃ بدون الحقیقۃ عاطل"

حق ظاہری ترتیل ہے اور حق باطنی معانی کا سمجھنا اور ابطن عمل۔ اب لوگ حق اول کو بھی جو سب سے سہل ہے چھوڑ بیٹھے۔ نفس کے اس کہنے سے کہ تم قراۃ میں عاصم یا حفص تو ہو نہیں سکتے پھر سیکھنے سے

کیا فائدہ۔ جواب یہ ہے۔ یہ دنیا میں بھی سب کے سب بادشاہ تو ہونے سے رہے۔ پھر تدبیر کیوں کرتے ہو، اور نفس کے اس کہنے سے کہ صرف الفاظ بدوں معنی سمجھے کیا فائدہ؟ جواب یہ ہے کہ فائدہ کے فہم معنی میں منحصر ہونے کی کیا دلیل ہے؟ لوگ بجائے قرآن شریف کے وظیفوں اور عملیات پر جھک پڑے اور قرآن شریف سے صرف یہ کام لیتے ہیں کہ بچوں کا نام اس میں سے نکالا جائے یا تیجے وغیرہ میں پڑھا جائے اور ایسی رسموں سے منع کیا جائے تو کہتے ہیں کار خیر سے روکتے ہو۔

جواب یہ ہے کہ تم بھی تو بعض وقت نماز سے روکتے ہو جیسے نماز بحالت جنابت (مگر ہم ان کو جواب دینے سے اسکو بہتر جانتے ہیں کہ اپنے گروہ سے کہیں کہ خلوص اختیار کریں اور استغناء برتیں۔)

ایک یہ کام لیتے ہیں کہ بذریعہ عکس پورے قرآن شریف کو ایک تعویذ کی صورت میں کر لیتے ہیں اور ایک یہ کہ چادر میں رکھ کر بچے کو نیچے سے نکال دیتے ہیں اور ایک یہ کہ گراموفون میں بند کر کے پیسے کماتے ہیں اور حق تلاوت یعنی قرأت کو مشکل سمجھ کر چھوڑ دیا۔ میں کہتا ہوں بقدر ضرورت مشکل نہیں، ہاں تھوڑے سے اہتمام اور مجمع کی ضرورت ہے، یہ مدرسہ اسی کا مجمع ہے اس میں سعی کرو اور خیال رکھو کہ اپنی وسعت سے کم نہ دو۔ اس کو نباہ دو اور انتظام میں دخل نہ دو۔ سب کے سب اللہ میاں کا کام سمجھ کر کرو۔ چندہ دینے والے تو اس طرح جیسا کہ ابھی کہا گیا ہے اور اہل مدرسہ سے اس طرح کہ اس کے مال کو امانت سمجھیں اور خدمات کو اللہ میاں کا کام اور انکسار کو شعار رکھیں، تکبر آمیز الفاظ نہ اختیار کریں کہ بسا اوقات فساق کی مدح لازم آتی ہے، اس سے عرش کانپ اٹھتا ہے اور زمین میں زلزلہ آجاتا ہے۔

دوسرا حق تلاوت فہم معانی ہے اس میں لوگوں کی حالت یہاں تک ہے کہ صحیح وغلط کو تمیز نہیں کر سکتے۔ ترجمے بھی ڈپٹیوں اور تحصیلداروں ہی کے بڑے سمجھے جاتے ہیں وجہ وہی ہے کہ علم دین صرف بچوں کو ناظرہ قرآن شریف پڑھا دینے تک محدود کر دیا ہے، آگے کم فرصتی کا عذر ہے (اب آپ کو واضح ہوا کہ نصاب قدیم کا اختصار کر دیا گیا صرف اڑھائی برس صرف ہوں گے۔ اب یہ عذر نہیں چل سکتا)

تیسرا حق تلاوت عمل ہے، یہ سب سے زیادہ موکد ہے، اس کی ہمت کرو۔ اور اس کے ذریعہ یعنی علم کو اختیار کرو۔ علم کو کسی طرح نہ چھوڑو۔ حتیٰ کہ اگر اول میں عمل کا عزم بھی دل میں نہ پاؤ تب بھی پڑھے جاؤ۔ علم خود دل کو درست کر لے گا۔ ہاں قصداً معاصی میں مت پڑو کہ اس سے نور علم مٹ جاتا ہے۔ غرض علم کے لئے کوشش کرو، مال سے، ہاتھ پاؤں سے اور کچھ بھی نہ ہو تو دعا ہی سے۔ تمہارے ذرا سے ارادے کی دیر ہے سب حقوق قرآن ادا ہو سکتے ہیں۔

آداب المساجد

مسجد میں دنیا کی باتیں کرنا اور دنیا کے کام کرنا معصیت اور ظلم ہے مسجد کا موضوع لہ اصلی ذکر اللہ ہے پس اس میں ذکر الدنیا کرنا اس کو شر البقاع (بازار) بنانا ہے جو اس کی ویرانی ہے۔

آداب مساجد کے متعلق یہ وعظ ۲ محرم ۱۳۲۹ھ کو جامع مسجد تھانہ بھون میں بیٹھ کر بیان فرمایا، جو ڈھائی گھنٹہ میں ختم ہوا۔ اور مولوی نور حسین صاحب نے قلم بند کیا۔

خطبہ ماثورہ

الحمدللہ نحمدہ ونستعینہ ونستغفرہ ونؤمن بہ ونتوکل علیہ ونعوذ باللہ من شرور انفسنا ومن سیئات اعمالنا من یھدہ اللہ فلا مضل لہ ومن یضللہ فلا ھادی لہ ونشھدان لا الہ الا اللہ وحدہ لا شریک لہ ونشھدان سیدنا ومولانا محمداً عبدہ ورسولہ صلی اللہ تعالٰی علیہ وعلٰی وآلہ واصحابہ وبارک وسلم۔

اما بعد فاعوذ باللہ من الشیطان الرجیم، بسم اللہ الرحمٰن الرحیم، قال اللہ تعالٰی ومن اظلم ممن منع مساجد اللہ ان یذکر فیھا اسمہ وسعٰی فی خرابھا اولئک ما کان لھم ان یدخلوھا الا خائفین۔ لھم فی الدنیا خزیٌ ولھم فی الاخرۃ عذاب عظیم۔ (سورۃ البقرہ آیت نمبر۱۱۴)

ترجمہ:۔ اور اس شخص سے زیادہ ظالم کون ہوگا جو خدا تعالٰی کی مسجدوں میں عبادت کیے جانے سے بندش کرے اور ان کے ویران اور معطل ہونے میں کوشش کرے ان لوگوں کو کبھی بے ہیبت ہوکر قدم بھی نہ رکھنا چاہئے تھا بلکہ جب جاتے ہیبت اور آداب سے جاتے ان لوگوں کو دنیا میں بھی رسوائی نصیب ہوگی اور آخرت میں بھی سزائے عظیم ہوگی۔

عمومیت کی حقیقت

شان نزول میں گو اختلاف ہو مگر قدر مشترک اتنا ضرور ہے کہ آیت عام ہے اور شامل ہے تعطل مساجد کے بارے میں مسلم اور غیر مسلم کو جیسا آگے آتا ہے اور جملہ مابعد۔

اولئک ما کان لھم ان یدخلوھا۔ الخ

(ترجمہ:۔ ان لوگوں کو بے ہیبت ہوکر ان میں قدم بھی نہ رکھنا چاہیے تھا۔)

دلیل ہے ماقبل کے لئے گویا یہ فرمایا گیا ہے کہ ان کو تو چاہئے تھا کہ خود بھی جب مساجد میں

داخل ہوئے تو خاشع وخاضع ہو کر داخل ہوتے، نہ یہ کہ اور دوسرے آنے والوں کو جو ذاکرین مخلصین ہیں ان کو بھی روکتے ہیں، کیونکہ یہ فعل تو بخوف ہونے کی اور بھی زیادہ علامت ہے، اس لئے ایسا شخص بہت زیادہ ظالم ہوگا۔ یہاں پر ایک طالب علمانہ شبہ ہوتا ہے کہ یہ آیت تو کفار کے حق میں ہے اس کا مصداق اور مخاطب مسلمانوں کو کیوں بنایا جاتا ہے تو اس کا جواب بطور اصولیین کے یہ دیا جاسکتا ہے کہ:

العبرة لعموم اللفظ لا لخصوص المورد.

ترجمہ:۔ اعتبار عموم لفظ کا ہے نہ خصوص مورد کا۔

اور اس کی نظیر شرعی مسئلہ لعان وحد زنا ہے اور تمثیل عقلی یہ کہ اگر کوئی شخص اپنے کسی نوکر کو کسی بات پر سزا دے اور کہے کہ جو ایسی حرکت کرے گا اس کو ایسی سزا ہوگی تو اس کہنے کا سبب اس وقت یہ خاص نوکر ہے، مگر چونکہ الفاظ عام ہیں اس لئے دوسرے نوکر بھی اپنے لئے اس کو عبرت سمجھتے ہیں اور وہ کام نہیں کرتے مگر میرے نزدیک یہ قاعدہ اصولیہ کہ **العبرة لعموم اللفظ** اسی عموم کے ساتھ مفید ہے۔ جہاں تک مراد متکلم کی ہو، اس کے آگے تجاوز کر کے زائد عموم کو شامل نہیں ہوسکتا اس کی نظیر

حدیث: **ليس من البر الصيام في السفر.** (سنن ابی داؤد، الصیام باب: ۴۳، سنن النسائی ۴: ۱۷۷، ۱۷۷)

(ترجمہ:۔ سفر میں روزہ رکھنا نیکی نہیں ہے) کہ باوجود لفظ کے عموم کے چونکہ مطیق (طاقت رکھنے والا) کو عام ہونا مراد نہیں اس لئے ہر مسافر کو شامل نہیں، بلکہ صرف اسی کو جس کو خوف ہلاکت و ازدیاد مرض ہو۔ دوسری نظیر یہ ہے کہ آج کل کوئی شخص کسی عالم سے رہن کا مسئلہ پوچھے تو وہ عالم بوجہ اطلاع عرف متعارف کے حکم منع ہی کر دے گا۔ کیونکہ عرف رہن مع الانتفاع ہی کے لئے ہے اس لئے مراد بھی رہن خاص ہوگا، گو فتویٰ کا لفظ یہ ہوگا کہ رہن جائز نہیں۔

پس محض کسی لفظ کا عام ہونا مراد ہر عموم کی نہیں ہے، تاوقتیکہ قرائن متعلقہ سے اس عموم کا مراد متکلم ہونا ثابت نہ ہو جائے۔

مسجد کی اہمیت

حاصل یہ کہ آیت میں لفظاً تعمیم نہیں مسلم وغیر مسلم کو، بلکہ آیت تو کفار ہی کے حق میں ہے کیونکہ جو منع خاص یہاں مراد ہے ایسا منع مخصوص ہے کفار سے مگر مسلمان کو یہ ذم دوسری طرف سے شامل ہے، وہ یہ کہ منع کے بعد:

سعیٰ فی خرابھا. (ترجمہ:۔ان کی ویرانی میں کوشش کریں۔)
فرمانا بطور تعلیل کے ہے اور خراب مقابل ہے عمارت کا اور عمارت مسجد کی ذکر وصلوٰۃ سے ہے۔بس خراب یعنی ویرانی ایسے امر سے ہوگی جو منافی ہو ذکر وصلوٰۃ کے پس اگر مسلم سے مسجد میں کوئی فعل خلاف ذکر وصلوٰۃ ہو تو وہ بھی اس ملامت کا مورد ہوگا بوجہ اشتراک علت کے، رہا یہ کہ قیاس ظنی ہوتا ہے تو ذم یقینی نہیں، جواب اس کا یہ ہے کہ قیاس ظنی جب ہوتا ہے کہ اس کی علت بھی ظنی ہو اور اگر علت منصوص علیہ قطعی ہو جیسا کہ یہاں ہے تو قیاس بھی قطعی ہوگا۔
رہا یہ مسلمان اگر ایسا فعل بھی کرے تو قصد خرابی مسجد کا تو نہ ہوگا جو متبادر ہے سعی سے پھر اس کو کیسے شامل ہوا۔جواب یہ ہے کہ اگر سعی خاص ہوتی مباشر کے ساتھ تو اس شبہ کی گنجائش تھی۔غور کرنے سے معلوم ہوتا کہ سعی عام ہے مباشر اور مسبب کو دلیل اس کی یہ ہے کہ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مدینہ میں خواب دیکھا (انبیاء علیہم السلام کا خواب بھی وحی ہے) کہ عمرہ کرنے کے لئے مکہ تشریف لائے اور صحابہؓ سے یہ خواب بیان کیا، گو اس میں یہ نہ تھا کہ اس سال ہوگا، مگر شدت اشتیاق میں صحابہؓ نے سفر کی رائے دی اور آپ نے خوش خلقی سے قبول فرمایا تو کفار قریش نے آپ کو دخول مکہ سے روک دیا، تو اللہ تعالیٰ نے اس روکنے کو مسجد کی ویرانی کا سبب دے کر ان کو

وسعیٰ فی خرابھا. (ترجمہ:۔اور ان کی ویرانی میں کوشش کریں۔)
کا مصداق بنایا، حالانکہ کفار مکہ نہ صرف مسجد حرام بلکہ تمام حد حرم کی غایت تعظیم کرتے تھے اور عمارت کی بھی، مگر بایں ہمہ ان کو **وسعیٰ فی خرابھا.** کا مصداق بنایا گیا صرف اس لئے کہ انہوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم وصحابہ کرام جو کہ ذاکرین مخلصین تھے روکا۔اب بدلالۃ النص یہ بات ثابت ہوگئی کہ کوئی ایسا کام کرنا مسجد میں جس سے ذکر اللہ سے اس کا تعطل ہو علی سبیل التسبب ہی کیا۔

ومن اظلم ممن منع مساجد اللہ ان یذکر فیھا اسمہ وسعیٰ فی خرابھا.
(ترجمہ:۔اور اس سے بڑھ کر کون ظالم ہوگا جو خدا تعالیٰ کی مسجدوں میں عبادت کئے جانے سے بندش کرے اور اس کی ویرانی میں کوشش کرے۔)
کا مصداق بنتا ہے ورنہ کفار نے کوئی مسجد میں قفل نہیں ڈالا تھا اور نہ مسجد کی بے تعظیمی کی تھی اور نہ عمارت میں کوئی خرابی کی تھی اور ظاہر ہے کہ مسجد میں بلاضرورت دنیا کی باتیں کرنا دنیا کے کام کرنا نہ ذکر ہے نہ ذکر کے متعلق ہے، اس لئے بلاشبہ معصیت اور ظلم ہے پھر ''ان یذکر'' کی

تقریب سے فضیلت ذکر کے متعلق متعدد واقعات بیان کئے گئے ہیں، اس میں یہ بھی بیان تھا کہ بعضے آدمی ذکر تلاوت پر عوض دنیوی لیتے ہیں حالانکہ اللہ کا نام ایسا گرانمایہ ہے کہ دونوں عالم بھی اس کی قیمت نہیں ہوسکتے اور یہ شعر پڑھا ؎

قیمت خود ہر دو عالم گفتۂ — نرخ بالا کن کہ ارزانی ہنوز

(ترجمہ:۔ تو نے اپنی قیمت دونوں جہان بتلائی ہے نرخ بڑھاؤ ابھی ارزانی ہے۔)

مگر اس کا ذوق وہی پاسکتا ہے جو شناسا ہو۔

گفت لیلی راخلیفہ کاں توئی — کز تو مجنوں شد پریشان و غوی

از ہمہ خوباں تو افزوں نیستی — گفت خامش چوں تو مجنوں نیستی

دیدہ مجنوں اگر بودے ترا — ہر دو عالم بے خطر بودے ترا

ترجمہ:۔ لیلیٰ سے خلیفہ نے پوچھا وہ تو ہی ہے جس سے مجنوں پریشان اور عقل گم کردہ ہوگیا دوسرے حسینوں سے تو کسی بات میں زیادہ تو ہے نہیں اس نے جواب دیا جب تو مجنوں ہی نہیں تو خاموش رہ اگر مجنوں کی آنکھ تجھ کو میسر ہوتی تو اس جنت دونوں عالم تیرے نزدیک بےقدر معلوم ہوتے۔

عجب داری از سالکان طریق — کہ باشند در بحر معنی غریق

(ترجمہ:۔ سالکین طریق سے تم کو تعجب ہے کہ حقیقت کے دریا میں ڈوبے ہوئے ہیں۔)

عشق مولے کہ کم از لیلی بود — کوئے گشتن بہراو اولے بود

(ترجمہ:۔ خدا تعالیٰ کا عشق لیلیٰ سے کیا کم ہو کہ اس کیلئے کوچہ گردی اولیٰ ہے۔)

رشوت کی صورت

اس تقریب میں ختم کلام مجید حفاظ کا بعوض مال رمضان یا رسوم وغیرہ میں یا قبور پر بہ اجرت پڑھنے کا ممنوع ہونا بیان ہوا۔ اور اہل اللہ دنیا کو تو اللہ کے نام اور رضاء سے بڑا کیا سمجھتے۔ آیت سے تو معلوم ہوتا ہے کہ یہ دولت تو نعمائے جنت سے بھی افضل ہے۔

ورضوان من اللہ اکبر. (ترجمہ:۔ رضاالٰہی بہت بڑی چیز ہے۔)

نص صریح ہے اور اس دین فروشی کے شبہ سے بچنے کے لئے بعض بزرگ بازار میں نہیں جاتے کہ شاید ان کو دیندار سمجھ کر ان کے دین کی وجہ سے کوئی دوکاندار داموں میں رعایت کرے تو

وہ ایک قسم کا عوض ہو جائے گا دین کا۔ پس نہ جانا بازار میں دو وجہ سے ہوتا ہے ایک کبر کی وجہ سے وہ تو حرام ہے دوسرا اس وجہ سے کہ لوگوں پر ہماری وجاہت سے دباؤ پڑے گا اور وہ دب کر ارزاں دیں گے جس سے ان کو نقصان ہوگا۔ سو یہ مستحسن اور ضروری ہے اس میں شبہ دین فروشی سے بچنے کے علاوہ دفع التاذی عن الخلق. (مخلوق کو اذیت سے بچانا) بھی ہے بس جاہ کے اثر سے لینا یہ بھی ایک قسم کی رشوت ہے، اسی لئے حاکم کو ہدیہ لینے کی اجازت نہیں، اس میں اس خدشے کو دفع کیا گیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم باوجود حاکم ہونے کی وجہ اور اب کیونکہ وہ محض محبت ہونے کی وجہ سے ہوتا تھا نہ حاکم ہونے کی وجہ سے اور اب ہدیہ نہیں رشوت ہے۔ الا ماشاء اللہ۔

تعمیر مساجد کا مقصد

اور جو کہا گیا ہے کہ عمارت مسجد کی ذکر و صلوٰۃ سے ہے۔ دلیل اس کی یہ ہے۔

ما کان للمشرکین ان یعمر وامساجد اللہ.

ترجمہ:۔ مشرکین کو مساجد اللہ بنانے کی اجازت نہیں ہے۔

بعض نے اس آیت ما کان للمشرکین الخ سے تعمیر مساجد کا مسئلہ مراد لیا ہے اور اس سے مسجد میں کافر کا روپیہ نہ لگانے میں استدلال کیا ہے مگر میرے نزدیک خود وہ مسئلہ مستقلہ دوسرے دلائل سے متعلق ہے۔ لیکن اس آیت سے مراد یہ ہے کہ مشرکین اس کے اہل نہیں ورنہ اس آیت سے یہ مراد ہوتی، تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کبھی بناء قریش کو باقی نہ رکھتے، قریش نے بوجہ کافی خرچ نہ ہونے کے بیت کو بناء ابراہیمی سے گھٹا دیا تھا اور حطیم جو کہ داخل بیت ہے خارج کر دیا تھا اور دروازہ صرف ایک رکھا تھا اور وہ بھی اونچا، پھر بعد انقضائے زمانہ خلفائے راشدین حضرت عبداللہ بن زبیرؓ نے اپنی خالہ حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے اس حدیث کو سن کر موافق ارشاد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم از سر نو بنائے ابراہیمی پر ہٹ کر بنوایا۔ پھر عبدالملک کی خلافت میں اس کے عامل حجاج بن یوسف نے عبداللہ بن زبیرؓ کے قتل کے بعد ان کی بناء کو تڑوا کر وہی بنائے قریش قائم کی۔ جس کے بعد خلیفہ ہارون رشید نے پھر بنائے ابراہیمی کی نسبت امام مالک رحمۃ اللہ علیہ سے استصواب کیا۔ انہوں نے بدیں وجہ کہ بیت اللہ تختہ مشق سلاطین بن جائے گا۔ اسی بناء پر قائم رہنے کی رائے دی۔ جب سے اب تک اسی بناء پر ہے اور گو عبداللہ بن زبیرؓ کی بناء کا نہ رہنا ظاہراً کسی قدر افسوس کے قابل ہے کیونکہ وہ متضمن مصالح کو تھا لیکن اس بنائے قریش پر قائم رہنے میں حق جل وعلا کی معلوم نہیں کتنی

مصلحتیں ہوں گی۔ مگر ایک بہت بڑی مصلحت اور کھلی حکمت جس کو گنوار سے گنوار بھی سمجھ سکتا ہے یہ ہے کہ اگر عبداللہ بن زبیرؓ کی بناء پر رہتا گو دروازے بھی زمین کے برابر دو ہی ہوتے مگر تاہم قفل کنجیاں تو خدام ہی کے ہاتھ میں رہتیں، اور ہر کسی کو بیت اللہ کے اندر جانا نصیب نہ ہوتا، مگر اس صورت موجودہ میں حطیم جو کہ درحقیقت داخل بیت تھا باہر ہے، اگر کوئی شخص خدام کے منع کرنے کی وجہ سے بیت کے اندر نہ جاسکے تو بلا روک ٹوک حطیم میں جاسکتا ہے اور دخول بیت کی برکت حاصل کرسکتا ہے یہاں پر یہ بات یاد رکھنے کے قابل ہے کہ کفار مکہ نے بھی بایں ہمہ شرک وکفر ''بیت اللہ'' کی تعمیر میں صرف مال حلال خرچ کیا تھا اسی وجہ سے خرچ کم ہوگیا اور پورے طور پر بنائے ابراہیمی کو پورا نہ کرسکے۔ غرض ما کان للمشرکین کا حاصل یہ ہے کہ مشرکین میں لیاقت مسجد کے آباد کرنے کی نہیں، کیونکہ جس چیز سے اس کی آبادی ہے اس کا ذکر آیت آئندہ میں ہے وہ ان میں نہیں ہے یعنی وہ تعمیر ذکراللہ ہے جس کا بیان اس آیت میں ہے۔

انما یعمر مساجد اللہ من آمن باللہ. الخ

ترجمہ:۔ اللہ تعالیٰ کی مسجدوں کو وہی بناتا ہے جو اللہ پر ایمان لائے۔

اس آیت میں مقصود اصلی اقام الصلوٰۃ ہے جس کے لئے مسجد موضوع ہے اور امن بطور شرط کے لایا گیا اور اٰتی الزکوٰۃ اقام کی میم ہے، یعنی اقامت بمعنی ادائے حقوق صلوٰۃ موقوف ہے خلوص اور محبت پر اور اس کی ایک علامت انفاق اموال ہے، حاصل یہ ہے کہ نرا ذکر زبان سے جیسا کہ نماز میں ہوتا ہے دلیل خلوص قلب کی نہیں بلکہ کچھ مال بھی دینا چاہئے اور زکوٰۃ وہی دے گا جس کے قلب میں خلوص ہو، کیونکہ کوئی حاکم تو مطالبہ کرنے والا ہے ہی نہیں اور اگر کسی کو یہ شبہ ہو کہ زمانہ خلفاؓ میں تو تحصیل زکوٰۃ کے لئے عامل مقرر تھے وہ جبراً لیتے ہوں گے۔ پھر اس میں خلوص کہاں رہا۔ جواب یہ ہے کہ عامل صرف مواشی کی زکوٰۃ لیتے تھے اور اموال باطنہ زر وسیم خود مالک کے اختیار میں تھے، مواشی کے لئے بھی عامل کا تقرر تحصیل مال یا ظلم کی وجہ سے نہ تھا بلکہ محض بہ نظر سہولت مصارف تاکہ اصحاب اموال کو تقسیم اموال میں دقت نہ ہو اور مال پورے طور پر مستحقین کو مل جائے اور اموال تجارت میں بھی عاشر کی طرف سے کچھ زبردستی نہ تھی بلکہ پوچھا جاتا تھا حولان حول ہوا یا نہیں اگر کسی نے کہا کہ ہم نے زکوٰۃ خود دیدی ہے تب بھی چھوڑ دیا۔

احترام مسجد کی صورت

دوسری دلیل اس دعویٰ کی کہ مسجد کا موضوع لہٗ ذکر ہے یہ آیت ہے:

فی بیوت اذن الله ان ترفع. الخ

ترجمہ:۔ایسے گھروں میں جا کر عبادت کرتے ہیں جس کی نسبت اللہ تعالیٰ نے حکم دیا ہے کہ ان کا ادب کیا جائے۔

اس آیت میں رفعت معنویہ مراد ہے، تیسری دلیل حدیث:

انما بنیت المساجد لذکر الله. (الصحیح لمسلم کتاب المساجد: ۸۰، ۸۱، سنن ابن ماجہ: ۷۶۵)

ترجمہ:۔مسجدیں اللہ تعالیٰ کے ذکر کے لئے بنائی گئی ہیں۔

پس جو کام ذکر کے متعلق نہ ہو وہ مسجد کی ویرانی ہے منع ہے جیسا بعض کاتب بہ اجرت مسجد میں لکھنے بیٹھ جاتے ہیں۔ بلکہ فقہاء نے یہاں تک لکھا ہے کہ جو شخص اجرت پر علم دین پڑھاتا ہو اس کو بھی بیٹھ کر مسجد میں پڑھانا منع ہے، علیٰ ہذالقیاس مسجد میں قرآن خوان لڑکوں کا پڑھنا جن سے کسی قسم کی اجرت لی جاتی ہے ممنوع ہے البتہ درس دینیات بلا اجرت خود ذکر ہے اس کا کچھ مضائقہ نہیں۔ایسا ہی معتکف کے لئے جو ذکر اللہ کی غرض سے مسجد میں آ بیٹھا ہے، اس کو بیع وشراء کا معاملہ بلا حضور مبیع بضرورت جائز ہے تاکہ ذکر اللہ سے حرمان نہ رہے، ورنہ مشتغلین بالتجارت کو اعتکاف کبھی میسر نہ آتا اور یہ شرط عدم حضور مبیع کی اس وقت ہے، جب وہ متاع مسجد کی جگہ کو گھیرے، ورنہ اگر کوئی مختصری چیز ہو تو احضار سلعہ (سامان کو مسجد میں لانا) بھی جائز ہے اور بجز معتکف کے دوسرے کو خرید وفروخت کا معاملہ خواہ کیسا ہی چھوٹا ہو مثلاً ریزگاری وغیرہ کا لین دین مسجد میں منع ہے، اسی طرح کسی ایسی چیز کا اعلان سے پوچھنا جو مسجد سے باہر کہیں کھوگئی ہو منع ہے، البتہ اگر مسجد کے اندر کوئی چیز گم ہوگئی ہو، تو اس کا پوچھ لینا مضائقہ نہیں۔اسی طرح اپنی تجارت کے اشتہار مسجد میں تقسیم کرنا ممنوع ہے، چوتھی دلیل دعویٰ مذکور کی یہ کہ حدیث میں قرب قیامت کی علامات میں وارد ہے۔

مساجدهم عامرة وهي خراب.

ترجمہ:۔ان لوگوں کی مسجدیں بظاہر آباد (پررونق) ہونگی مگر حقیقت میں ویران ہونگی۔

عمارت اور خرابی کا جمع ہونا اسی طرح ہو سکتا ہے کہ ظاہری عمارت میں تو بڑی زیب وزینت اور مجمع کی کثرت ہوگی مگر معنوی آبادی کہ ذکر وخلوص ہے کم ہوگا۔اس سے بھی وہی بات ثابت ہوئی، پانچویں دلیل یہ ہے کہ لوگوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے دریافت کیا کہ شر البقاع کیا چیز ہے اور خیر البقاع کونسی جگہ ہے، فرمایا مجھے معلوم نہیں، جبرئیل علیہ السلام سے پوچھا، انہوں نے بھی یہی جواب دیا اور یہ کہا کہ دربار خداوندی سے دریافت کر کے جواب دوں گا چنانچہ وہ

پوچھنے گئے، اس وقت بہ برکت اس مسئلہ کے پوچھنے کے حضور اقدس کے لئے ان کو اس قدر قرب ہوا کہ وہ فرماتے ہیں کہ مجھ کو کبھی اتنا قرب نہیں ہوا یعنی ستر ہزار حجاب درمیان میں رہ گئے۔ غرض دربار خداوندی سے جواب ارشاد ہوا کہ شر البقاع بازار ہے اور خیر البقاع مسجد، سو غور کرنا چاہئے کہ دونوں میں مابہ الامتیاز کیا ہے بجز ذکر اللہ و ذکر الدنیا۔ پس معلوم ہوا کہ مسجد کا موضوع لہٗ اصلی ذکر اللہ ہے۔ پس اس میں ذکر الدنیا کرنا اس کو شر البقاع بناتا ہے جو کہ اس کی ویرانی ہے۔

درس عبرت

اس جگہ پر آپ کے اور جبرئیل علیہ السلام کے "لا ادری" فرمادینے سے ان لوگوں کو عبرت حاصل کرنی چاہئے کہ باوجود نہ معلوم ہونے کے مسائل کا غلط سلط جواب دینے پر مستعد ہو بیٹھتے ہیں، نیز وہ لوگ سمجھیں اور متنبہ ہوں جو باوجود کتاب کا مطلب نہ آنے کے طالب علموں کو کچھ نہ کچھ جواب دیئے چلے جاتے ہیں اور یہ نہیں کہہ دیتے کہ یہ مقام نہیں آتا، جو نہ معلوم ہو کہہ دینا چاہئے کہ نہیں معلوم۔ بزرجمہر سے کسی بڑھیا نے کچھ پوچھا اس نے جواب دیا کہ مجھے معلوم نہیں۔ بڑھیا نے کہا کہ تم بادشاہ کی اتنی تنخواہ کھاتے ہو اور یہ بات تم کو معلوم نہیں۔ بزرجمہر نے کہا کہ تنخواہ تو مجھے معلومات کی ملتی ہے اگر مجہولات کی ملنے لگے تو بادشاہ کا سارا خزانہ بھی کافی نہ ہو۔ اور حضرت جبرئیل علیہ السلام کا ستر ہزار حجاب کو کمال قرب کہنا قابل غور ہے کہ جو لوگ دنیا میں تھوڑا سا ذکر و شغل کر کے حق تعالیٰ کی رویت کی ہوس میں پڑے ہیں کتنی بڑی غلطی ہے اگر رویت سے بڑھ کر زیادہ قرب چاہتے ہیں وہ اس سے بھی بڑی غلطی ہے اگر رویت سے بڑھ کر ذات کی کنہ کو ادراک کرنا چاہیں، کیونکہ خدا تعالیٰ کی ذات کی کنہ تک رسائی نہیں ہو سکتی۔ اس لئے اس کو ہرگز نہ سوچنا چاہئے، البتہ افعال خداوندی میں غور اور تدبیر کرنا چاہئے۔

تفکروا فی الاء اللہ ولا تکفروا فی ذاتہ.

کسی بزرگ کا قول ہے۔

دور بیناں بارگاہ الست غیر ازیں نہ بردہ اند کہ ہست
آنچہ اندر راہ می آید بدست حیرت اندر حیرت اندر حیرت است

ترجمہ:۔ بارگاہ الست کے دوربین حضرات نے سوائے اس کے کہ موجود ہے کوئی سراغ نہ لگایا۔ جو کچھ طریق میں ان کو حاصل ہوا ہے حیرت اندر حیرت اندر حیرت ہے۔

اے برتر از خیال و قیاس و گمان وھم — وز ہر چہ گفتہ اند و شنیدیم و خواندہ ایم
دفتر تمام گشت و بپایاں رسید عمر — ماہمچناں در اول وصف تو ماندہ ایم

ترجمہ:۔ اے اللہ آپ خیال اور قیام گمان و وہم سے برتر ہیں جو کچھ لوگوں نے بیان کیا اور جو کچھ ہم نے سنا اور پڑھا ہے آپ اس سے برتر ہیں۔ دفتر تمام ہو گیا اور عمر انتہاء کو پہنچ گئی ہم ایسے پہلے ہی وصف میں رہے ہیں۔

ہاں البتہ قیامت میں حسب وعدہ رویت ذات بلا حجاب ہوگی اور حدیث میں جو آیا ہے کہ اس دن کوئی اور پردہ نہ ہوگا۔ بجز رداء الکبریاء کے، اس سے بلا حجاب ہونے پر شبہ نہ ہوا کیونکہ اس کے معنیٰ بھی یہی ہیں کہ رویت تو بلا حجاب ہوگی مگر عظمت وجلال و کبریائی کی وجہ سے احاطہ نہ ہو سکے گا۔ ردائے کبریا اس کو فرمایا ہے۔ دنیا میں بلا حجاب رویت نہیں ہو سکتی۔ یہی عقیدہ اور مسئلہ شرعی ہے اور حضرت پیران پیر سیدنا شیخ عبدالقادر جیلانی قدس سرہ العزیز کی طرف سے یہ شعر منسوب ہے کہ

بے حجابانہ درآ از در کاشانہ ما

ترجمہ:۔ میرے کاشانہ میں بغیر حجاب کے چلے آئے

تو یہ مؤول بحجاب محجوبین غافلین ہے یا قیامت کے روز کیلئے اشتیاق القاء کا اظہار فرماتے ہیں، کیونکہ ''درآ'' صیغہ امر ہے اور وہ استقبال کے لئے ہے اور اگر یہ شعر کسی اور شاعر کا ہو تو ہم کو ضرورت تاویل کی نہیں غرض حدیث مذکور سے بازار کی سی باتیں مسجد میں کرنا مذموم ہونا ثابت ہوا۔ بعض لوگ صحابہؓ پر تہمت لگاتے ہیں کہ وہ حضرات بھی مساجد میں ہماری طرح خرافات باتیں کیا کرتے تھے، سو یہ بالکل تہمت ہی تہمت ہے، اگر صحابہ کرامؓ ہی ارشاد نبوی پر عمل کرنے والے نہ ہوں گے تو اور کون ہوگا ایک تو خود دنیا کی باتیں مسجد میں کرنا ظلم تھا ہی، یہ ظالم صحابہ رضوان اللہ علیہم پر تہمت لگا کر بڑھ کر ظلم کرتے ہیں یہ نہیں کہ خود توبہ کریں، الٹا اخیار امت کو بدنام کرتے ہیں۔

شرعی رعایت

البتہ بعض لوگوں کی یہ بھی غلطی ہے کہ وہ ہر بات کو دنیوی بات سمجھ جاتے ہیں مثلاً بیمار پرسی یا کسی مسلمان کا حال دریافت کرنا۔ جان لینا چاہئے کہ عیادت اور تفقد حال مسلم حقوق شرع میں سے ہیں۔ ان کا مسجد میں پوچھنا کچھ حرج نہیں، اسی طرح اگر کوئی چیز مسجد میں گم ہو جائے تو اس کا پوچھنا بھی جائز

ہے علیٰ ہذا القیاس معتکف کی خرید وفروخت جیسا اوپر مذکور ہوا اور شریعت نے کیا ہی آسانی رکھی ہے اگر کوئی سوداگر اعتکاف کرنا چاہتا ہے اور اس کے لئے معاملہ مسجد میں ناجائز ہوتا تو وہ بیچارا اس عبادت سے محروم رہتا، شریعت نے اس کے لئے اجازت دے دی۔ تاکہ وہ اس عبادت سے محروم نہ رہے، ایسی ہی باتیں شریعت کے حق ہونے کی گواہی دیتی ہیں کہ اس میں اہل تعلق کی بھی رعایت ہے۔

بہار عالم حسنش دل و جاں تازہ میدارد برنگ اصحاب صورت راببو ارباب معنی را

ترجمہ:۔ اس کے عالم حسن کی بہار دل و جان کو تروتازہ رکھتی ہے اصحاب ظاہر کو رنگ سے اور ارباب باطن کو حقیقت سے۔

باقی غیر معتکف کے لئے ممانعت بیان ہو چکی۔

ادب کی صورت

ایک بار مجھ کو اپنے ایک دوست کی کہ ان کو تلمذ کا تعلق بھی تھا ایک بات نہایت پسند آئی کہ مسجد میں بیٹھا تھا ایک روپیہ کی ریزگاری ایک شخص نے خریدی انہوں نے فوراً متنبہ کیا کہ یہ بیع ہے اور مسجد میں نہ چاہئے۔ اہل حق کی یہ شان ہوتی ہے کہ اپنے بڑوں کو بھی کہہ دے مگر ادب کو نہ چھوڑے۔ اس موقع پر اسی مناسبت سے یہ ذکر آیا کہ حضرت سید احمد بریلوی رحمۃ اللہ، مولانا شہید رحمۃ اللہ کے پیر ایک دن صبح کی نماز میں بوجہ نئی شادی ہونے کے ذرا دیر سے پہنچے۔ ان کے مرید مولوی عبدالحیؒ صاحبؒ نماز کے بعد وعظ فرمانے بیٹھ گئے۔ اس میں یہ بھی کہا کہ بعض لوگوں کا یہ حال ہے کہ جورو کی بغل میں پڑے رہتے ہیں اور تکبیر اولیٰ قضاء ہو جاتی ہے۔ جناب سید صاحب نے نہایت شکریہ ادا کیا اور فرمایا کہ اب ایسا نہیں ہوگا۔ اس بیان کے بعد فرمایا مولوی عبدالحیؒ صاحب نے باوجودیکہ ظاہراً یہ عنوان خلاف ادب تھا اس واسطے یہ عنوان کہنے کی جرأت تھی کہ ان کو معلوم تھا کہ سید صاحبؒ کے دل میں اس سے میل نہیں آئے گا بلکہ خوش ہوں گے ان کے خوش کرنے کو بے ادبی اختیار کی۔

گفتگوئے عاشقاں درکار رب جوشش عشق است نے ترک ادب

باادب ترنیست زوکس درجہاں بے ادب ترنیست زوکس درجہاں

ایسا ہی ایک قصہ حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کا جو حدیث میں آیا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ مجھے معلوم ہے کہ جب تم مجھ سے خفا ہوتی ہو تو اس وقت لا ورب ابراھیم

کہتی ہو، اور جس وقت خوش ہوتی ہو، اس وقت **لا و رب محمد** (قسم ہے حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے رب کی) کہتی ہو۔ حضرت عائشہ نے فرمایا: **لا اھجر الا اسمک** (بجز آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے نام کے نہیں چھوڑتی ہوں) بعض باتیں ایسی ہوتی ہیں کہ اگر کوئی اور کرے بے ادبی میں داخل ہو جائے، بلکہ کفر ہو جائے، مگر عاشق صادق جوش محبت اور علاقہ محبت سے کرتا ہے اس لئے وہ عفو ہوتی ہے، حاصل یہ کہ ظاہراً باتیں بے ادبوں کی سی ہوتی ہیں اور باطنا ہوتی ہیں باادب۔

کار پاکاں راقیاس از خود مگیر　　گرچہ ماند درنوشتن شیروشیر
جملہ عالم زیں سبب گمراہ شد　　کم کسے ز ابدال حق آگاہ شد
گفت اینک ما بشر ایشاں بشر　　ما و ایشاں بستہ خوابیم وخور
ایں ندانستند ایشاں ازعمے　　درمیاں فرقے بود بے منتہا
احمدؐ و بوجہل دربت خانہ رفت　　زیں شدن تا آں شدن فرقیست ژرف

ترجمہ:۔ نیک لوگوں کو اپنے اوپر قیاس مت کرو اگرچہ دیکھنے میں تمہارا اور ان کا کام یکساں جیسے لکھنے میں شیر اور شیر یکساں ہے تمام دنیا اسی خام خیالی کی وجہ سے گمراہ ہوگئی کہ انہوں نے اولیاء اللہ کو نہ پہچانا اور کہنے لگے کہ ہم بھی انسان ہیں وہ بھی انسان۔ وہ بھی کھاتے پیتے ہیں ہم بھی کھاتے پیتے ہیں۔ آپ نے یہ خیال نہ کیا کہ ان میں اور ہم میں فرق ہے احمد صلی اللہ علیہ وسلم اور ابوجہل بت خانے میں گئے ان دونوں کے جانے میں بڑا فرق ہے ابوجہل بت پرستی کیلئے گیا اور آپ بت توڑنے کیلئے۔

خلاصہ مطلب یہ ہے کہ آداب مسجد کو بلا ارادہ تشبہ ایسا خیال کرنا چاہئے جیسا کہ حاکم دنیوی کی حضوری میں قلب اور جوارح کی حالت ہوتی ہے کہ اس کا مصداق بن جاتا ہے۔

یک چشم زدن غافل ازاں شاہ نباشی　　شاید کہ نگاہے کند آگاہ نباشی

ترجمہ:۔ ایک پلک مارنے کی مقدار بھی محبوب سے غافل نہ رہو شاید تم پر لطف کی نگاہ ہوا کرے اور تم آگاہ نہ ہو۔

اتنا تو ہونا چاہئے اور ایسی حالت اول تو ہر وقت ہو ورنہ حضوری مساجد کے وقت تو ضروری ہے اور ہر وقت حاصل نہ ہونا اس حالت کو یوں سمجھا جائے کہ بزرگان پیشین پر ختم ہو سکتا ہے۔

تو مگو مارا بداں شہ بار نیست　　با کریماں کارہا دشوار نیست

ترجمہ:۔ یوں مت کہو بھلا ہماری رسائی اس دربار تک کہاں ہے کیونکہ کریموں کو کوئی کام

دشوار نہیں وہ کریم ہیں۔

دیکھئے صحابہؓ کی کیفیت کہ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے ان دو شخصوں کو جو مسجد نبوی میں بلند آواز سے باتیں کر رہے تھے، تنبیہ فرمائی اور فرمایا کہ اگر تم باہر کے مسافر نہ ہوتے تو تمہیں سزا دیتا۔

اترفعان اصواتکما فی مسجد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم۔

ترجمہ (کیا تم دونوں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی مسجد میں اپنی آوازوں کو بلند کر رہے ہو؟)

اور اس میں یہ شبہ نہ ہو کہ یہ حکم عدم رفع صوت مسجد نبوی کے ساتھ مخصوص ہے، کیونکہ مساجد سب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ہیں۔ چنانچہ فلا یقربن مساجدنا (ترجمہ:۔ پس ہماری مساجد کے قریب نہ جائیں۔) میں آپ نے جمیع مساجد کی نسبت اپنی طرف فرمائی، ہاں مسجد نبوی کا اور زیادہ ادب ہوگا۔ علاوہ ازیں یہ تو ہے ہی کہ: ان المساجد للہ الخ (ترجمہ:۔ بے شک سب مسجدیں اللہ کی ہیں۔) اور جب اللہ کی ہوئیں تو یہ ادب کو بدرجہ اولیٰ مقتضی ہوگا اور جس طرح مسجد قابل ادب ہے ایسے ہی اہل مسجد کا ادب بھی ضروری ہے وہ یہ کہ ایسی کوئی حرکت نہ کرے جس سے اہل مسجد کی تاذی ہو، مثلاً یہ خیال رکھنا چاہئے کہ ایسی جگہ کھڑا ہو جہاں اور آنے جانے والوں کو تکلیف نہ ہو، کیونکہ اس میں تکلیف ہے ذاکرین کو، علیٰ ہذا جس وقت کوئی اور شخص نماز پڑھ رہا ہو، ذکر نہ کرنا چاہئے کیونکہ اس کی نماز میں خلل ہوگا اور اس کو تکلیف ہوگی، اس کی وجہ یہ بھی ہے کہ مسجدیں بموجب ارشاد نبوی ریاض الجنۃ ہیں اور جنت میں آزار تکلیف نہ ہونا چاہئے۔

بہشت آں جا کہ آزارے نباشد کسے را با کسے کارے نباشد

ترجمہ:۔ وہ جگہ بہشت ہے جہاں کسی قسم کی تکلیف نہ ہو نہ کسی شخص سے کچھ سروکار ہو۔

العبدالربانی

یہ علم حجۃ اللہ علی العبد ہے، مگر اس کے یہ معنی نہیں کہ عمل نہ ہو سکے تو علم ہی نہ پڑھو کہ اپنے اوپر حجت الٰہی کیوں قائم کریں۔ اس وقت آپ پر دو جرم قائم ہوں گے، ایک ترک علم کا ایک ترک عمل کا، اس لئے جو علم عمل سے مجرد ہو گو حجۃ اللہ علی العبد ہے، مگر جہل محض سے پھر بھی اچھا ہے۔

حقوق علم و تعلیم کے متعلق یہ وعظ ۱۲ شعبان ۱۳۲۴ھ بروز یکشنبہ مدرسہ عبدالرب دہلی میں بیٹھ کر ارشاد فرمایا جو چار گھنٹہ میں ختم ہوا۔ سامعین کی تعداد ۱۵۰۰ کے قریب تھی۔ یہ وعظ مولانا ظفر احمد صاحب تھانوی نے قلمبند فرمایا۔

خطبہ ماثورہ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

الحمدللہ نحمده ونستعینه ونستغفره ونؤمن به ونتوكل علیه ونعوذ باللہ من شرور انفسنا ومن سیئات اعمالنا من یهده اللہ فلا مضل له ومن یضلله فلا هادی له ونشهدان لا الٰه الا اللہ وحده لا شریک له ونشهدان سیدنا ومولانا محمداً عبده ورسوله صلی اللہ تعالٰی علیه وعلٰی آلہٖ واصحابه وبارک وسلم.

اما بعد فاعوذ باللہ من الشیطان الرجیم، بسم اللہ الرحمٰن الرحیم، ما کان لبشران یؤتیه اللہ الکتب والحکم والنبوة ثم یقول للناس کونوا عباداً لی من دون اللہ ولکن کونوا ربانیین بما کنتم تعلمون الکتاب وبما کنتم تدرسون ولا یامرکم ان تتخذوا الملئکة والنبیین ارباباً ایامرکم بالکفر بعد اذانتم مسلمون. (آل عمران آیت نمبر ۷۸، ۷۹)

ترجمہ:۔ کسی بشر سے یہ بات نہیں ہوسکتی کہ اللہ تعالیٰ (تو) اس کو کتاب اور (دین کی) فہم عطا فرمائیں پھر وہ لوگوں سے (یوں) کہنے لگے کہ میرے بندے بن جاؤ خدا تعالیٰ کو چھوڑ کر لیکن (وہ نبی یوں) کہے گا کہ تم اللہ والے بن جاؤ اس وجہ سے کہ یہ کتاب تم دوسروں کو سکھاتے ہو اور خود بھی پڑھتے ہو اور نہ وہ یوں کہے گا کہ تم فرشتوں اور نبیوں کو رب قرار دو وہ تم کو کفر کی باتیں کیسے بتلائے گا جبکہ تم مسلمان ہو۔

اطاعت اور عبادت کا فرق

یہ ایک آیت ہے جس میں رد ہے بعض اہل عناد کے ایک اعتراض کا جو حضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر کیا گیا تھا انہوں نے حضورؐ پر تہمت لگائی تھی کہ نعوذ باللہ لوگوں کو اپنا بندہ بنانا چاہتے ہیں اس آیت میں اس کا جواب دیا گیا ہے جس کا حاصل یہ ہے کہ نبوت اور امر بعبادت نفس میں تباین ہے۔

’’کسی بشر سے یہ بات نہیں ہو سکتی کہ اللہ تعالیٰ (تو) اس کو کتاب اور (دین کی) فہم اور نبوت عطا فرمائیں پھر وہ لوگوں سے (یوں) کہنے لگے کہ میرے بندے بن جاؤ خدا تعالیٰ کو چھوڑ کر (خلاصہ یہ کہ نبوت اور امر بالشرک جمع نہیں ہو سکتے) لیکن (ہاں وہ نبی تو کہے گا) کہ تم لوگ اللہ والے بن جاؤ بوجہ اس کے کہ تم کتاب الٰہی دوسروں کو بھی سکھاتے ہو اور خود بھی اس کو پڑھتے ہو اور نہ وہ (بشر جس کو نبوت عطا ہوئی) یہ بتادے گا کہ تم فرشتوں کو اور (یا دوسرے) نبیوں کو رب قرار دے دو، (بھلا) وہ تم کو کفر کی بات بتا دے گا بعد اس کے کہ تم (فی الواقع یا بزعم خود) مسلمان ہو۔‘‘

یہ ترجمہ تو آیت کا ہوا، شان نزول اس کا یہ ہے کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں جب نجران کے نصاریٰ اور یہود جمع ہوئے اور آپ نے ان کو اسلام کی طرف بلایا تو ایک یہودی (ابو رافع قرظی) نے کہا کہ کیا آپ یہ چاہتے ہیں کہ ہم آپ کی عبادت کرنے لگیں۔ جیسا نصاریٰ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی عبادت کرتے ہیں آپؐ نے فرمایا معاذ اللہ اس پر آیت نازل ہوئی غالباً اس معترض نے براہ عناد اطاعت وعبادت کو ایک سمجھا اور دونوں میں فرق نہ کیا تھا اس لئے اعتراض کر دیا کہ کیا آپ ہم کو اپنا بندہ بنانا چاہتے ہیں جواب میں تصریح کر دی گئی کہ نبیؑ سے غیر اللہ کی عبادت کا امر محال ہے باقی اطاعت اور عبادت میں فرق ظاہر تھا اس سے تعرض نہیں کیا گیا کیونکہ قرآن میں بدیہیات سے تعرض نہیں کیا جاتا، اطاعت تو انسان اپنے ماں باپ اور استاد کی بھی کرتا ہے اور محکوم حاکم کی اطاعت کرتا ہے تو کیا سب معبود ہیں اور ان کی عبادت کی جاتی ہے ہرگز نہیں پھر رسول کی اطاعت میں عبادت کا شبہ کیوں ہوا محض عناد کی وجہ سے اور کچھ نہیں یہ تو آیت کا اجمالاً ترجمہ اور اس کی ضروری تفسیر تھی باقی مجھے اس وقت تمام اجزاء کی تفصیل بیان کرنا مقصود نہیں مقصود صرف ایک جزو کا بیان کرنا ہے۔

آداب تعلیم و تعلم کا فقدان

وہ جزیہ ہے۔

ولکن کونوا ربانیین بما کنتم تعلمون الکتاب وبما کنتم تدرسون.

ترجمہ: لیکن تم اللہ والے بن جاؤ اس بناء پر کہ تم کتاب سکھاتے ہو اور خود بھی پڑھتے ہو۔

مگر میں نے ادب کی وجہ سے پوری آیت کی تلاوت کر دی ہے اس جزو میں حق تعالیٰ نے تعلیم و تعلم کے کچھ حقوق بیان فرمائے ہیں اور اس وقت زیادہ ضرورت اسی مضمون کی ہے کیونکہ اس وقت

زیادہ مقصود جلسہ مدرسہ سے اہل علم کا اجتماع ہے باقی لوگ ان کے تابع ہیں کیونکہ اس وقت بعض حضرات نے دورہ حدیث ختم کیا اس لئے ان کو دستار وسند دی جائے گی اور اسی غرض سے ہر سال جلسہ ہوتا ہے کہ فارغ شدہ طلبہ کو سند وغیرہ دی جائے اور ظاہر ہے کہ اس کام کے لئے صرف علماء ہی کا اجتماع اصل مقصود ہوتا ہے اس لئے مناسب معلوم ہوا کہ ضرورت جلسہ کے موافق مضمون بیان ہو صرف وقت ہی پورا نہ کیا جائے بعض لوگ ایسے موقع میں فضائل علم اور فضائل اعانت علم کا بیان کیا کرتے ہیں گو یہ مضامین بھی فی نفسہ مفید اور ضروری ہیں مگر اس وقت **الاھم فالاھم** (زیادہ ضروری) کے لحاظ سے اس سے بھی زیادہ ضروری کو مقدم کیا گیا ہے اور وہ آداب تعلیم وتعلم کا مضمون ہے اور یہ زیادہ ضروری اس لئے ہے کہ اس کی طرف توجہ کم ہے اور علم واعانت علم کی طرف توجہ حاصل ہے اور قاعدہ ہے کہ خواص کا اثر عوام پر ہوتا ہے اس لئے جس بات کی طرف خواص کی توجہ ہوگی عوام کو بھی اس پر توجہ ہوگی پر تاسف وہ حالت ہے جس پر خواص کی بھی توجہ نہ ہو تو علم واعانت علم کا مضمون بھی گو ضروری ہے مگر زیادہ ضروری نہیں کیونکہ خواص کو اس پر پہلے سے توجہ ہے اور ان کے اثر سے عوام کو بھی توجہ ہے اور آداب تعلیم وتعلم کی طرف افسوس یہ ہے کہ خواص کو بھی توجہ نہیں اس لئے یہ زیادہ اہم ہے شاید کسی کو یہاں شبہ ہو کہ اخص الخواص کو تو توجہ ہے تو ان کے اثر سے خواص کو بھی توجہ ہو جائے گی اخص الخواص کی توجہ خواص کو متوجہ کرنے کے لئے کافی نہیں ہوتی کیونکہ توجہ کا اثر اس پر ہوتا ہے جو اپنے کو محتاج اثر سمجھتا ہو اور اپنے کمال کا مدعی نہ ہو عوام چونکہ اپنے کو مقتدا نہیں سمجھتے اور اپنی کوتاہیوں کے مقر ہوتے ہیں اس لئے خواص کی توجہ کا اثر ان پر کچھ نہ کچھ ضرور ہوتا ہے بخلاف خواص کے جو اہل علم کہلاتے ہیں کہ وہ خود مقتدی بننے کے مدعی ہیں اور اپنے کو صاحب کمال سمجھ کر اخص الخواص سے مستغنی سمجھے ان پر اخص کی توجہ کا اثر کم ہوتا ہے کیونکہ ان میں احتیاج وطلب ہی نہیں وہ تو خود اس کے مدعی ہیں کہ دوسرے ہمارے محتاج ہیں۔

اخص الخواص کی شان

اخص الخواص کی شان یہ ہے کہ وہ اپنے کمالات کی نفی کرتے ہیں جس سے بعض کوتاہ بین شبہ میں پڑ جاتے ہیں اور یوں سمجھنے لگتے ہیں کہ جب یہ اپنے منہ سے اقرار کرتا ہے کہ میں کچھ بھی نہیں مجھے کچھ نہیں آتا تو اس سے ہم ہی اچھے کیونکہ ہم کو تو بہت کچھ آتا ہے حضرت مولانا گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ نے ایک دفعہ قسم کھا کر فرمایا واللہ میں کچھ نہیں ہوں بخدا مجھ میں کچھ بھی کمال نہیں یہ سن

کر ایک صاحب فرمانے لگے کہ ہم تو مولانا کو سچا سمجھتے ہیں جھوٹا نہیں سمجھتے جب وہ خود قسم کھا کر یوں کہتے ہیں کہ مجھ میں کچھ کمال نہیں تو ہم بھی ان کو ایسا ہی سمجھتے ہیں کہ وہ صاحب صاحب کمال نہیں ہیں یہ تو اہل عناد کا قول ہے وہ اگر ایسا کہیں تو کچھ عجب نہیں مگر غضب یہ ہے کہ اس جملہ سے بعض معتقدین کو بھی شبہ ہو گیا وہ یہ تو نہ کہہ سکے کہ مولانا صاحب کمال نہیں ہیں مگر تردد میں پڑ گئے کہ بزرگ جھوٹی قسم نہیں کھاتے جب مولانا قسم کھا کر اپنے کمال کی نفی کر رہے ہیں تو ہم کیا سمجھیں اپنے اعتقاد کو صحیح سمجھیں یا مولانا کی قسم کو، چنانچہ بعض حضرات اہل علم نے خود مجھ سے یہ شبہ بیان کیا میں نے کہالا الہ الا اللہ تم کس شبہ میں پڑ گئے میاں تمہارا اعتقاد بھی سچا اور مولانا کی قسم بھی سچی تم جن کمالات کی وجہ سے مولانا کے معتقد ہو ان کے اعتبار سے مولانا نے قسم نہیں کھائی اور جن کمالات کے اعتبار سے انہوں نے قسم کھائی ہے وہ اعتقاد کا موقوف علیہ نہیں تفصیل اس کی یہ ہے کہ کمالات غیر متناہی ہیں کسی درجہ پر کمال کی انتہا نہیں ہے ایک عارف فرماتے ہیں۔

نگر دو قطع ہرگز جادۂ عشق از دویدنہا　　　　کہ می بالد بخود ایں راہ چوں تاک از بریدنہا

ترجمہ:۔ محض دوڑنے سے طریق عشق ہرگز طے نہیں ہوتا اس لئے کہ مثل انگور کے کاٹنے کے خود بخود بڑھتا ہے۔

مولاناؒ فرماتے ہیں کہ

اے برادر بے نہایت درگہیست　　　　ہرچہ بروئے میرسی بروئے مالیست

ترجمہ:۔ اے بھائی یہ بے انتہا درگاہ ہے۔ جس درجہ پر پہنچو اس پر مت ٹھہرو، آگے ترقی کرو۔

یہی توجیہ ہے...... رب زدنی علما (اے اللہ میرے علم میں ترقی عطا فرما) تعلیم فرمانے کی حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو باوجود افضل الرسل ہونے کے حکم ہو رہا ہے کہ دعا میں رب زدنی علما کہا کیجئے کیونکہ آپ کے علوم بھی ترقی پذیر ہیں۔ گو آپ صلی اللہ علیہ وسلم:

اعلم الناس و اعرف الخلق.

ترجمہ:۔ سب سے بڑے عالم اور سب سے بڑے عارف

ہیں، مگر پھر بھی علوم و معارف کا انتہا نہیں ہوا ترقی کی آپ درخواست برابر کرتے رہے۔ بعض عارفین کا قول ہے کہ جنت میں پہنچ کر بھی یہ ترقی بند نہ ہو گی وہاں بھی روز بروز درجات معرفت بڑھتے رہیں گے اور حق تعالیٰ کی ذات ایسی لامتناہی بالفعل کے اعتبار سے ان کے کمالات کا کچھ انتہا نہیں ادھر

اس کی معرفت کے مراتب یعنی لاتقف عند غیر متناہی کیونکر ہو سکتے ہیں۔

نہ حسنش غایتے دارد نہ سعدی را سخن پایاں　　بمیرد تشنہ مستسقی و دریا ہمچناں باقی

ترجمہ:۔ نہ ان کے حسن کی کوئی انتہا ہے نہ سعدیؒ کے کلام کی انتہا ہے جیسے جلندھر کا پیاسا مر جاتا ہے اور دریا باقی رہتا ہے۔

جب مراتب معرفت کا غیر متناہی ہونا معلوم ہو گیا تو اب جواب کا حاصل یہ ہے کہ مولانا کی نظر کمالات موجودہ پر نہ تھی بلکہ کمالات آئندہ پر تھی اور آئندہ کے مراتب پر نظر کر کے یہ کہنا صحیح ہے کہ میں کچھ بھی نہیں جیسے شرح جامی پڑھنے والا منتہی عالم کو دیکھ کر کہتا ہے کہ واللہ میں تو کچھ نہیں مجھے تو کچھ بھی نہیں آتا عالم تو فلاں شخص ہے میں اس کے سامنے جاہل محض ہوں اور جیسا کہ قل ہو اللہ کا حافظ پورے قرآن کے حافظ کو دیکھ کر کہتا ہے کہ واللہ میں حافظ نہیں ہوں حافظ تو یہ ہے تو کیا آپ اس قسم کو جھوٹا کہیں گے ہرگز نہیں کیونکہ وہ جس درجہ پر نظر کر کے قسم کھا رہا ہے اس درجہ کے لحاظ سے اس کی قسم سچی ہے اور جس درجہ میں آپ اس کو عالم یا حافظ سمجھ رہے ہیں اس درجہ پر اس کی نظر ہی نہیں بلکہ پورے عالم اور پورے حافظ کے سامنے اپنے علم کو علم اور اپنے حفظ کو حفظ کہنے سے بھی شرماتا ہے اسی طرح یہاں سمجھئے کہ جب عارف پر عظمت حق کا انکشاف ہوتا ہے اس وقت وہ اپنے کو لاشئے اور عدم محض سمجھتا ہے خدا تعالیٰ کے وجود کے سامنے اپنے وجود کو لاشئے سمجھتا ہے اس کے علم کے سامنے اپنے علم کو نیست و نابود سمجھتا ہے اور اس کے کمالات کے سامنے اپنے کمالات کو نقائص سمجھتا ہے اس وقت تو اس کا یہ حال ہوتا ہے۔

با وجودت ز من آواز نیاید کہ منم

(ترجمہ:۔ اس کے باوجود اس کے اندر سے آواز نہیں آتی کہ میں کچھ ہوں۔)

سعدیؒ خوب فرماتے ہیں۔

یکے قطرہ از ابر نیساں چکید　　خجل شد چو پہنائے دریا بدید

"قطرہ اسی وقت تک اپنے کو کچھ سمجھ سکتا ہے جب تک اس نے دریا کو نہیں دیکھا اور جب دریا سامنے آتا ہے اس وقت شرمندہ ہو کر یوں کہتا ہے۔"

کہ جائے کہ دریاست من کیستم　　اگر اوھست حقا کہ من نیستم

ترجمہ:۔ دریا کے سامنے میں کیا چیز ہوں اگر اس کا وجود ہے تو سچ یہ ہے کہ میں کچھ نہیں ہوں۔ اس پر تفریع کر کے سعدی فرماتے ہیں۔

ہمہ ہر چہ مستند ازاں کمتراند کہ یاہ بتیش نام ہستی برند

حقیقت میں کمالات حق کے سامنے کسی کا منہ نہیں ہے جو اپنے لئے کوئی کمال بھی ثابت کر سکے مگر چونکہ ہم پر عظمت حق و کمالات حق کا انکشاف نہیں ہوا اور ہمارا دماغ دعویٰ سے پر ہے ہم اپنے کو بہت کچھ سمجھتے ہیں اس لئے مولانا کی یہ باتیں ہماری سمجھ میں نہیں آتیں اور حیرت ہوتی ہے کہ مولانا نے قسم کھا کر کیونکر اپنے کمالات کی نفی کردی ہے ہمارے اوپر وہ حالت گذری نہیں جو ان پر گذرتی تھی اور مولانا نے جتنی بات کہی ہے یہ تو کچھ بھی نہیں وہ تو اس سے زیادہ بھی کہتے (یعنی اپنی ہستی کی بھی نفی کرتے) مگر عوام کے فتنہ کے خیال سے پوری حقیقت نہیں کھولی، افسوس ہم آج کل ایسے زمانہ میں ہیں جس میں ہم کو نہ اقوال کی تفسیر کرنا پڑتی ہے جن میں کچھ بھی اشکال نہیں اور اگر اس سے زیادہ حقائق کو بیان کیا جائے تو ان کو شاید تفسیر کے بعد بھی لوگ نہ سمجھیں پس سخن کوتاہ باید والسلام..... غرض اخص تو اپنے کمالات کی نفی کرتے ہیں اور خواص مدعی ہیں اس لئے کسی امر پر اخص کی توجہ خواص کی توجہ کو مفید نہیں ہوتی اس لئے وہ اشکال رفع ہو گیا کہ اس مضمون پر اخص الخواص کو تو توجہ ہے ان کے اثر سے خواص کو بھی توجہ ہو جاوے گی جیسا کہ خواص کی توجہ سے عوام کو توجہ ہو جاتی ہے پھر بیان کی غایت توجہ کیسے ہو گی اور یہاں سے معلوم ہوا کہ سلامتی اس میں ہے یا تو انسان محقق ہو۔ یا مقلد ہو۔ اخص الخواص محقق ہیں اور عوام مقلد محض ہیں اور جو بیچ کے لوگ ہیں یعنی خواص جو نہ محقق ہیں نہ مقلد ہیں یہ خطرہ میں ہیں علامہ غزالیؒ ایک مقام پر لکھتے ہیں کہ اے عزیز! اگر تو محقق نہیں تو مقلد ہو جا اور مقلد بھی نہیں تو کم از کم محققین کے علوم کا انکار تو نہ کر بعض ایسے بھی ہیں جو ان علوم کی تقلید نہیں کرتے تو انکار بھی نہیں کرتے۔ یہ بھی غنیمت ہیں مگر بعض تو ان پر اعتراض کرتے ہیں ان کی اصلاح سے مایوسی ہے غرض یہ مضمون نہایت اہم ہے کیونکہ ان پر عوام و خواص دونوں ہی کو توجہ نہیں ہے۔

صحیح تعلیم

اب وہ مضمون سنئے! ارشاد ہے۔

ولکن کونوا ربانیین۔ (ترجمہ:۔ لیکن اللہ والے بن جاؤ)

تقدیر کلام اس طرح ہے۔

ولکن ینبغی له ان یقول کونوا ربانیین.

یعنی رسول سے یہ تو نہیں ہوسکتا کہ وہ لوگوں کو اپنی عبادت کا امر کریں ہاں رسول کی شان یہ ہے کہ وہ حکم دے سکے گا۔

کونوا ربانیین.

جس کے معنی یہ ہیں کہ اللہ والے ہوجاؤ ربانی میں یائے نسبت ہے اور الف ونون مبالغہ کے لئے بڑھایا گیا ہے قرآن میں ایک مقام پر اصل کے مواقف ار بیون بھی آیا ہے اس آیت سے معلوم ہوا کہ رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی شان یہ ہے کہ وہ مسلمانوں کو اللہ والا بننے کا حکم فرماتے ہیں یہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان مبارک سے نکلا ہوا ہے اس سے بڑھ کر اور کیا ہوگا۔

فبای حدیث بعدہ یومنون۔ ترجمہ:۔ پس اور کون سی بات پر ایمان لاؤ گے۔

سب مسلمانوں کو عموماً اور اہل علم کو خصوصاً ضروری ہے اس پر توجہ کریں اور دیکھیں کہ اس میں ان سے کیا کوتاہی ہورہی ہے غور کے بعد معلوم ہوجائے گا کہ وہ کوتاہی کیا ہے آگے اس امر کو اس امر کے ساتھ معلل فرماتے ہیں اس پر بھی اہل علم کو غور کرنا چاہیے وہ علت یہ ہے۔

بما کنتم تعلمون الکتاب وبما کنتم تدرسون.

حاصل یہ ہوا کہ چونکہ تم کتاب پڑھتے پڑھاتے ہو اس لئے تم کو اللہ والا بننا چاہیے کتاب معہود سے یا تو کتاب مراد ہے (یعنی قرآن) یا جنس کتاب مراد ہے یعنی کتب دینیہ لیکن لام جنس کی صورت میں بھی ہر قسم کی کتابیں خواہ ان کو دین سے تعلق ہو یا نہ ہو مراد نہیں ہوسکتیں بلکہ کتب دینیہ مراد ہیں کیونکہ اس جگہ "تعلمون الکتاب" علت بنایا گیا ہے "کونوا ربانیین" کا پس اسی کتاب کی تعلیم و تدریس مراد ہوسکتی ہے جس کو اللہ والا بنانے میں دخل ہو اور ظاہر ہے کہ یہ اثر کتب دینیہ ہی کی تعلیم میں ہے نہ کہ اور کتب کی تعلیم و تعلم میں لہٰذا جنس کو عموم کلی پر محمول نہیں کیا جاسکتا یہ تفصیل میں نے اس لئے کہ آج کل تعلیم کا لفظ نئی تعلیم پر بھی اطلاق ہونے لگا ہے یعنی انگریزی تعلیم پر چنانچہ اخباروں اور رسالوں میں جب تعلیم کے اہتمام پر زور دیا جاتا اور انگریزی کی ضرورت کو ظاہر کیا جاتا ہے تو جہل کی مذمت و علم کی فضیلت و ضرورت میں جو آیات و احادیث وارد ہیں۔ ان کو استدلال میں پیش کیا جاتا ہے جس سے نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ ان آیات و احادیث میں علم سے مراد عام علم ہے جس کا مصداق علم دنیا بھی ہے یاد رکھو یہ سراسر تحریف ہے اور اصطلاحات شرعیہ کا بدل دینا ہے اس سے امام غزالیؒ کی پرانی شکایت تازہ ہوگئی وہ فرماتے ہیں منجملہ احداثات کے ایک

احداث یہ بھی ہے کہ الفاظ شرعیہ کو ان کے معانی شرعیہ سے بدلا جاتا ہے چنانچہ اے عزیز تم نے فقہ کے نئے معنی گھڑ لئے ہیں کہ صرف مسائل حیض وصلوٰۃ وغیرہ کا نام فقہ رکھ لیا ہے اور اس فقہ کا نام رکھ کر تمام ان فضائل کو اپنے اوپر منطبق کرلیا جو فقہاء کے لئے وارد ہوئے ہیں حالانکہ نص میں فقہ سے مراد مجموعہ علم وعمل ہے اور وہ فضائل علماء عاملین کے لئے مخصوص ہیں مگر تم نے اصطلاح شرعی کو بدل کر صغریٰ تو خود گھڑ لیا کہ نحن فقیھا (ہم فقیہ ہیں) اور کبریٰ نصوص واحادیث سے اخذ کیا۔

ومن کان فقیھا فقد ارادالله به خیرا وھو کذا وکذا.

پھر ان سے نتیجہ نکال لیا۔

نحن قدارادالله بنا خیراً ونحن کذا ونحن کذا تمنی العلماء ورثة الانبیاء. (سنن ابن ماجہ: ۲۲۳)

وفضل العالم علی العابد کفضلی علی ادناکم. (سنن الترمذی: ۲۶۸۵، سنن الدارمی، ا:۷۷)

وفقیه واحد اشد علی الشیطان من الف عابدوغیرہ. (سنن الترمذی: ۲۶۸۱، سنن ابن ماجہ: ۲۲۲)

یاد کر کے اپنے آپ کو بھی علماء وفقہاء میں داخل کرلیا حالانکہ دیکھنا یہ ہے کہ قرآن نے بھی آپ کو عالم کہا ہے یا نہیں۔

حقیقی علم

سونئے قرآن نے علماء بنی اسرائیل کی نسبت اول تو: ولقد علموا لمن اشتراه ما له فی الاخرة من خلاق کہا پھر فرمایا ولبئس ما شروا به انفسھم لو کانوا یعلمون. (البقرہ، آیت نمبر ۱۰۲)

ترجمہ:۔ اور بری ہے وہ چیز جسمیں یہ لوگ اپنی جان دے رہے ہیں کاش ان کی اتنی عقل ہوتی

اول لقد علموا ان کی اصلاح کے موافق فرمایا کیونکہ وہ بھی محض جان لینے اور لکھ پڑھ لینے کو علم کہتے تھے پھر لو کانوا یعلمون اپنی اصلاح کے موافق فرمایا جس میں ان سے علم کی نفی ہے اس سے معلوم ہوا کہ اصطلاح شریعت میں علم الفاظ ومعانی کا نام علم نہیں ورنہ یہ تو علماء بنی اسرائیل کو حاصل تھا اس سے نفی ان سے کیونکر ہوسکتی ہے بلکہ علم الفاظ کے ساتھ جب عمل بھی ہو تو اس وقت وہ علم کہلانے کا مستحق ہوتا ہے چنانچہ ایک حدیث میں:

ان من العلم لجھلا. (سنن ابی داؤد: 5012، فتح الباری لابن حجر 540:10)

(ترجمہ:۔ بعض علم عنداللہ جہالت ہے)

بھی وارد ہے اور ظاہر بات ہے کہ ایک چیز علم و جہل نہیں ہو سکتی اس لئے مطلب حدیث کا یہ ہے ان من العلم عند الناس لجهلا عندالله.

"کہ بعض علم جس کو عرفاً سمجھا جاتا ہے وہ خدا کے نزدیک جہل ہوتا ہے۔" معلوم ہوا کہ شریعت میں محض دانستن و نادانستن کا نام علم نہیں بلکہ ان کی حقیقت کچھ اور ہے وہ وہی ہے جس کو ایک حدیث میں کہا گیا ہے کہ بعض علم حجة الله على العبد ہے جبکہ وہ اس کے اقتضاء پر عمل کرے پس اب دیکھنا چاہئے کہ ہم جو اپنے کو عالم اور فقیہ سمجھتے ہیں ہمارا علم اس کے موافق کہاں تک ہے ہماری حالت یہ ہے کہ ہمارے اندر تکبر کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا ہے ہم کو اپنے علم پر ناز ہے دوسرے مسلمانوں کو ہم اپنے سے کم تر اور حقیر سمجھتے ہیں اور جلسوں میں جو علم کے فضائل ہم بیان کرتے ہیں اس سے مقصود اپنی فضیلت کا ظاہر کرنا ہوتا ہے کہ ہم اس درجہ کے ہیں، ہماری تعظیم کرنا چاہئے مگر علماء کو اس طرز سے شرم کرنا چاہئے حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ ہم اس درجہ میں ہیں مگر اس کے یہ معنی نہیں کہ عمل نہ ہو سکے تو علم نہ پڑھو کہ اپنے اوپر حجت الٰہی کیوں قائم کریں جیسا کہ میرے پاس ایک صاحب کا خط آیا ہے لکھا ہے کہ میرا جی مرید ہونے کو چاہتا ہے مگر میں نے سنا ہے کہ مرید ہو کر داڑھی رکھنی پڑے گی اس لئے مجبور ہوں کیونکہ میں داڑھی منڈاتا ہوں اس اللہ کے بندے نے داڑھی کے خیال سے مرید ہونے کا ارادہ ہی ملتوی کر دیا۔

شادم کہ از رقیباں دامن کشاں گذشتی ۔۔۔ گومشت خاک ماہم برباد و رفتہ باشد

ترجمہ:۔ ہم خوش ہیں کہ رقیبوں سے دامن بچا کر گزرے اگرچہ ہماری ہی مٹھی بھر مٹی برباد ہو جائیگی۔

ہم اس سے خوش ہیں کہ اس نے اتنا تو سمجھا کہ مرید ہو کر داڑھی رکھنا پڑے گی ورنہ آج کل تو یہ آفت ہے کہ بہت لوگ طریقت و شریعت کو جدا جدا سمجھتے ہیں اور کہتے ہیں کہ اعمال ظاہرہ کی کوئی ضرورت نہیں۔ بس دل سے خدا کی یاد ہونا چاہئے تو بتایئے اس شخص کو آپ کیا رائے دیں گے کیا آپ ہی کہیں گے کہ تم مرید نہ ہو کیونکہ داڑھی رکھنا پڑے گی یا کہیں گے کہ بھائی داڑھی بھی رکھو اور مرید بھی ہو جاؤ۔ اگر دونوں کام نہ ہو سکیں۔ تو ایک کی وجہ سے دوسرے کو کیوں ملتوی کیا مرید ہو جاؤ تا کہ ایک کام تو نیک ہو جائے گو اس کے ساتھ ایک گناہ بھی ملا ہوا ہے اسی طرح بعض عوام کا خیال ہے کہ وعظ سن کر عمل کرنا پڑے گا اس لئے وعظ ہی نہ سننا چاہئے یہ خیال بالکل غلط ہے کیونکہ اس وقت آپ کے اوپر دو جرم قائم ہوں گے ایک ترک علم کا ایک ترک عمل کا اور وعظ سن کر عمل نہ کیا تو صرف ترک عمل کا گناہ ہو گا ترک علم کا گناہ تو نہ ہو گا ایسے ہی یہاں سمجھو کہ جو علم عمل سے مجرد ہو گو وہ حجۃ اللہ علی العبد ہے مگر جہل محض

سے پھر اچھا ہے کیونکہ اس پر ایک ہی جرم قائم ہوگا یعنی ترک عمل کا اور اگر علم بھی حاصل نہ کیا تو دوسرا جرم ترک علم کا بھی قائم ہوگا غرض گو یہ علم جہل محض سے اچھا ہے مگر ان فضائل کا مصداق نہیں ہے جو نصوص میں وارد ہیں کیونکہ اس کے مقتضا پر عمل نہیں ہے اور وہ فضائل مجموعہ علم و عمل کے لئے ہیں۔

ہماری حالت

ہمارے عمل کی یہ حالت ہے کہ مولوی صاحب تکبر کی وجہ سے کسی عامی کو کبھی خود سلام نہ کریں گے میں خود اپنی حالت بیان کرتا ہوں کہ راستہ میں کوئی ایسا مسلمان ملتا ہے جو اصطلاحی عالم نہ ہو تو اس کی ابتداء سلام کرنے کی ہمت نہیں ہوتی مگر آج کل عوام نے ہم جیسے متکبر علماء کی حالت پر رحم کر کے اور ہماری رعایت کر کے اور اپنی صورتیں بگاڑ دیں کہ بعض دفعہ سلام کرنے کا خیال بھی ہوتا ہے تو صورت دیکھ کر تردد پیدا ہو جاتا ہے کہ یہ مسلمان ہے یا ہندو اور اسی طرح سے سلام کرنے سے بچتے رہتے ہیں سو یہ ان صاحبوں کا احسان ہے کہ ان بیچاروں نے اپنی صورت بگاڑ کر ہمارے ہاتھ میں ایک عذر دیدیا۔ چنانچہ بریلی میں بھائی سے ملنے کو دو شخص آئے ایک تھانیدار صاحب تھے یہ مسلمان تھے مگر صورت سے ہندو معلوم ہوتے تھے ڈاڑھی بالکل صاف اور مونچھیں بڑی بڑی اور ایک تحصیلدار صاحب تھے جن کی ڈاڑھی خوب لمبی اور مونچھیں کتری ہوئی تھیں وہ ہندو تھا۔ بھائی نے نوکر سے پان لانے کو کہا تو اس نے خاصدان ہندو تحصیلدار کے سامنے رکھ دیا کیونکہ وہ مسلمان معلوم ہوتا تھا نوکر کے اس فعل پر تھانیدار ہنسا تو نوکر فوراً سمجھ گیا اس نے تھالی ان کے سامنے کر دی بھائی نے کہا افسوس آپ نے ایسی صورت بنائی ہوئی ہے جس میں اسلام کا کوئی اثر نہیں تو شاید ان لوگوں نے یہ صورت ہمارے حال پر رحم کر کے اختیار کیا ہے تا کہ ہم کو ترک سلام کے لئے بہانہ مل جائے کہ ہم سلام کیسے کریں یہ تو صورت سے سب ہی ہندو معلوم ہوتے ہیں یہ تو ایک لطیفہ تھا مگر مجھے علماء سے شکایت ہے کہ ہم لوگ اپنے کو بڑا سمجھتے ہیں۔ عوام کو سلام کرنے سے ہم کو عار آتی ہے جبکہ اس کے منتظر رہتے ہیں کہ پہلے دوسرے ہم کو سلام کریں ہم عوام کو حقارت کی نظر سے دیکھتے ہیں حالانکہ مناسب یہ تھا کہ ہم ان کے ساتھ شفقت کا معاملہ کرتے بتلایئے اگر ایک تندرست آدمی بیمار کو دیکھے تو اس کو مریض کے ساتھ کیا معاملہ کرنا چاہئے ظاہر ہے کہ اس کو دیکھ کر رحم آتا ہے۔ ایسے ہی مناسب یہ تھا کہ علماء عوام پر رحم کرتے اور ان سے شفقت برتتے کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت یہی ہے۔

شفقت نبوی ﷺ

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی شفقت کا اندازہ اس آیت سے ہوتا ہے۔

لَعَلَّکَ بَاخِعٌ نَّفْسَکَ عَلٰٓی اٰثَارِهِمْ اِنْ لَّمْ یُؤْمِنُوْا بِهٰذَا الْحَدِیْثِ اَسَفًا

ترجمہ:۔شاید آپ غم کی وجہ سے اپنے کو ہلاک کرڈالیں گے کہ وہ لوگ اس قرآن پر ایمان نہیں لاتے۔

کیا ٹھکانا ہے شفقت کا کہ حق تعالیٰ اس کی وجہ سے آپ کی ہلاکت کا اندیشہ ظاہر فرماتے ہیں اور ظاہر ہے کہ قرآن میں مبالغہ سے کام نہیں لیا گیا تو واقعی آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) کی شفقت اس درجہ کو پہنچی ہوئی تھی اوراس سے ہم لوگوں کو بڑی امید ہے کہ جب آپ کو دشمنوں پر یہ شفقت تھی تو اپنے خدام پر تو کیا کچھ شفقت ہوگی۔

دوستاں را کجا کنی محروم   کہ با دشمناں نظر داری

ترجمہ:۔دوستوں کو کب محروم کروگے جبکہ دشمنوں پر آپ کی نظر عنایت ہے۔)

غرض سنت رسول ﷺ یہ ہے کہ جتلائے جہل پر رحم کیا جائے واقعات سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ حضور ﷺ نے کفار کے ساتھ ہمیشہ شفقت کا معاملہ فرمایا ہے۔

چنانچہ ایک بار آپ ﷺ دعوت اسلام کے لئے طائف تشریف لے گئے تو وہاں کے رئیسوں نے آپ کو سخت جواب دیا اور اتباع سے انکار کیا اسی پر بس نہیں کیا۔ بلکہ اوباشوں کو آپ ﷺ کے پیچھے لگا دیا جنہوں نے حضور ﷺ پر پتھر برسائے یہاں تک کہ آپ کی ایڑی مبارک سے خون بہنے لگا اس وقت غضب الٰہی جوش میں آیا اور حق تعالیٰ کے حکم سے جبرئیل علیہ السلام ملک الجبال کو ساتھ لیکر حاضر ہوئے اور فرمایا اے محمد ﷺ! حق تعالیٰ نے آپ ﷺ کی قوم کا جواب سنا اور ان کا معاملہ آپ ﷺ کے ساتھ دیکھا اب یہ ملک الجبال آپ ﷺ کے حکم کے تابع ہے آپ جو چاہیں اس کو حکم دیں اگر آپ چاہیں تو یہ اسی وقت مکہ اور طائف کے پہاڑوں کو باہم ٹکرا کر سب آدمیوں کو پیس ڈالے گا صاحبو! تم دنیا کے محکموں کو دیکھتے ہو حق تعالیٰ کے یہاں ہر چیز کا محکمہ ہے پہاڑوں کا بھی ایک محکمہ ہے جس پر فرشتے مقرر ہیں اور پہاڑ ان کے حکم کے تابع ہیں جب اللہ تعالیٰ چاہتے ہیں فرشتے پہاڑوں کو ہلا دیتے ہیں جس سے زلزلہ آجاتا ہے بعضے پہاڑ پھٹ جاتے ہیں کسی سے چشمے ابلنے لگتے ہیں اسی طرح ہوا کا ایک محکمہ ہے اس پر بھی فرشتے مقرر ہیں پانی کا

بھی ایک محکمہ ہے پھر ایسے محکمے باطنی کائنات میں بھی ہیں اسی کو سنائی کہتے ہیں۔

آسماں ہاست در ولایت جان کار فرمائے آسمان جہان

در رہ روح پست وبالا ہاست کوہ ہائے بلند وصحرا ہاست

ترجمہ:۔ ولایت جان میں بہت سے آسمان ہیں جو ظاہری آسمان میں کارفرما ہیں روح (باطن) کے راستہ میں نشیب وفراز کوہ صحرا موجود ہیں۔

غرض جس طرح ظاہر میں ہر چیز کے محکمے ہیں اسی طرح باطن میں بھی بہت سے محکمے ہیں جن سے ہم لوگ غافل ہیں حالانکہ یہ ظاہری محکمے تابع ہیں باطنی محکموں کے، حکام ظاہری وہی کرتے ہیں جو حکام باطنی حکم دیتے ہیں ان کی حکومت قلوب پر ہے اور حکام ظاہری کی حکومت اجسام پر غرض ملک الجبال حاضر ہوا اور اس نے عرض کیا کہ یا رسول اللہؐ! میں آپؐ کے حکم کے تابع ہوں جو چاہے حکم دیجئے اگر آپ چاہیں تو میں پہاڑوں کو آپس میں ٹکرا کر ان سب کافروں کو پیس ڈالوں جنہوں نے آپ کے ساتھ ایسا معاملہ کیا ہے حضورؐ نے فرمایا مجھے اور میری قوم کو چھوڑ دو میں جانوں اور وہ مجھے جانیں، مجھے امید ہے کہ شاید ان میں سے یا ان کی اولاد میں سے کچھ لوگ موحد پیدا ہوں پھر خدا تعالیٰ سے عرض کیا کہ خداوندا! ان کی ہلاکت سے مجھے کیا نفع؟ میں تو چاہتا ہوں کہ آپ ان کی آنکھیں کھول دیں تاکہ یہ مجھے پہچان لیں یہ اندھے ہیں مجھے پہچانتے نہیں، اس لئے ایسا برتاؤ میرے ساتھ کرتے ہیں۔

یارب اهد قومی فانهم لا یعلمون.

ترجمہ:۔ اے اللہ میری قوم کو ہدایت دے کیونکہ یہ مجھے نہیں جانتے۔

کا یہی حاصل ہے حضورؐ کی شفقت تو اعداء پر اس قدر تھی اور اعداء بھی کون جو رات دن ایذائیں دیتے تھے اور افسوس ہے کہ ہم کو احباب سے بھی اس قدر شفقت نہیں۔

عوام کی غلطی

مگر اسی کے ساتھ مجھے عوام کی بھی شکایت ہے اگر علماء ان کے ساتھ سختی کرتے ہیں تو ان کو اس سے ناگواری کیوں ہوتی ہے آخر وہ اطباء جسم کے نخرے بھی اٹھاتے ہیں اور ان کی سختی کو ہر طرح برداشت کرتے ہیں کیوں؟ محض اس لئے کہ صحت مطلوب ہے اور مطلوب کی تحصیل کے لئے سختی اور دشواری سب کچھ گوارا ہوا کرتی ہے پھر کیا صحت دین آپ کو مطلوب نہیں اگر مطلوب ہے تو اطباء باطن کی

سختی اور دشواری بھی ناگوار نہیں ہونا چاہئے صاحبو! اگر کسی کی گنی کھوگئی ہو اور ایک آدمی کے پاس کا پتہ ملے اور تم اس سے مانگنے جاؤ اور وہ زور سے اس کو تم پر دے مارے کہ جا لے جا تو اس سختی کی وجہ سے اس گنی کو آپ یہ کہہ کر دوبارہ پھینک دیں گے کہ اس طرح دینے سے ہم نہیں لیں گے پھر اگر کوئی ہمیں اچھی بات بتلا دے گو سختی ہی سے کہتا ہو اس پر اس کو آپ کس لئے پھینکتے ہیں اور وہاں ناک منہ کیوں چڑھاتے ہیں معلوم ہوتا ہے کہ آپ کو گنی تو مطلوب ہے دین نہیں مطلوب اس لئے کہ بعض لوگ اس تلاش میں رہتے ہیں کہ ایسا ملے جو مریدوں کی خاطر کرتا ہو چنانچہ ایک تعلق دار صاحب نے لکھنؤ میں مجھ سے خود کہا کہ کوئی ایسا پیر بتلاؤ جو مریدوں کی قدر کرتا ہو۔ مولانا شاہ فضل الرحمٰن صاحبؒ تو مریدوں کی بہت ذلت کرتے ہیں میں نے دل میں کہا حضرت آپ کو طلب ہی نہیں طلب ہوتی تو مقصود تک پہنچانے والے کی ہر سختی گوارا ہوتی طالب کی شان تو ایسی ہوتی ہے جیسے وزیر حیدرآباد کا قصہ ہے کہ وہ شاہ فضل الرحمٰن صاحب کی زیارت کو آئے تو مولانا نے فرمایا اسے نکال دو صاحبزادہ نے عرض کیا حضرت یہ حیدرآباد کے وزیر ہیں فرمایا.....تو پھر میں کیا کروں مجھے کوئی حیدرآباد سے تنخواہ تو نہیں ملتی جو میں وزیر صاحب سے ڈر جاؤں وزیر ہوں گے اپنے گھر کے پھر عرض کیا حضرت یہ بہت دور سے مشتاق ہو کر آئے ہیں بڑے اصرار کے بعد فرمایا کہ اچھا رات کے دو بجے تک رہنے کی اجازت ہے دو بجے کے بعد چلے جائیں اس وزیر کا ادب دیکھئے کہ اس کو حضرت کے ارشاد سے ذرا بھی ناگواری نہیں ہوئی اور رات کے دو بجتے ہی خانقاہ سے چلے گئے کسی نے کہا بھی کہ حضرت تو سو رہے ہیں ان کو کیا خبر ہو گی آپ صبح کو چلے جائیں کہا نہیں اب حضرت کی اجازت نہیں اور بزرگوں کے حکم کے خلاف کرنا بے ادبی ہے کوئی دوسرا ہوتا تو ایک منٹ کو بھی نہ ٹھہرتا۔ اور ناک منہ چڑھا کر فوراً چل دیتا مگر وہ طالب تھا اس لئے جتنی دیر کی اجازت تھی اتنی دیر قیام کو غنیمت سمجھا اور وقت کے بعد چلا گیا صاحبو! اگر آپ کسی حاکم کے پاس جائیں اور وہ بات چیت میں سختی کرے مگر فیصلہ آپ کے موافق کر دے تو تم اس کی تعریف کرو گے یا شکایت مشاہدہ ہے کہ اس صورت میں حاکم کی بہت تعریف کی جاتی ہے اور اس کی سختی میں حکمتیں بیان کی جاتی ہیں حاکم نے ہمارے ساتھ ابتداء میں سختی کا برتاؤ اس لئے کیا تا کہ کسی کو رعایت طرفداری کا وہم نہ ہو واے اللہ! ایک دنیادار حاکم کے افعال میں تو حکمت ہو اور خادمان دین کے افعال میں حکمت نہ ہو یہ کیسی بے انصافی ہے پس اگر کوئی پیر تمہارے ساتھ سختی کرے مگر اس کے ہاتھ سے تمہارا کام بن جاوے تو ہزار بار مبارک اس کی ایسی مثال ہے جیسے باپ اپنے بچہ پر سختی کرتا ہے کہ یہاں نہ بیٹھو فلاں

فلاں آدمیوں سے نہ ملو اور یہ چیز نہ کھاؤ وقت پر پڑھنے جاؤ اور اگر وہ کبھی اسکے خلاف کرتا تو بیٹے کو سزا دیتا ہے مگر اس میں کوئی باپ کو ظالم نہیں کہتا بلکہ اس سختی کو بیٹے کے حق میں شفقت و رحمت سمجھتے ہیں پھر مشائخ کی سختی کو بھی شفقت پر کیوں نہیں محمول کیا جاتا یہ تو درمیان میں عوام کی شکایت کا جواب تھا جو بطور جملہ معترضہ کے بیان ہو گیا اس کا حاصل یہ ہے کہ علماء اگر سختی کریں تو آپ کو شکایت اور ناگواری کا حق نہیں کیونکہ تم دنیا کے واسطے اس سے بھی زیادہ سختی کو خوشی سے برداشت کرتے ہو پھر دین کے واسطے کیوں نہیں برداشت کرتے ہاں اگر تم دنیا کے واسطے بھی کسی حاکم اور طبیب اور وکیل وغیرہ کی سختی کو برداشت نہ کیا کرتے تو پھر واقعی تمہاری شکایت کسی درجہ میں صحیح ہوتی۔

علماء کو تنبیہ

اب میں پھر علماء کی طرف رجوع کرتا ہوں کہ آپ کو عوام کے ساتھ شفقت کا معاملہ کرنا چاہئے ان کو ذلیل و حقیر نہ سمجھنا چاہئے۔ شاہ عبدالقادر صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی حکایت ہے کہ ایک دفعہ آپ وعظ فرما رہے تھے کہ اسی مجلس میں ایک شخص پر نظر پڑی جس کا پاجامہ ٹخنوں سے نیچا تھا، کوئی آج کل کا مولوی ہوتا تو یا وعظ ہی میں اس کی خبر لیتا یا کچھ بھی نہ کہتا مگر شاہ صاحب نے وعظ میں تو اس سے کچھ تعرض نہ کیا کیونکہ آداب وعظ میں سے یہ بات ہے کہ وعظ میں تعرض خاص نہ ہو بلکہ خطاب عام ہونا چاہئے اور امر بالمعروف کو ترک بھی نہیں کیا بلکہ جب وعظ ہو چکا تو آپ نے ان صاحب سے فرمایا کہ تم ذرا ٹھہر جاؤ مجھے تم سے کچھ کہنا ہے، وہ تو سہم گیا کہ بس اب میری خبر لی جائے گی، مگر اہل اللہ کے یہاں کسی کی خبر نہیں لی جاتی۔ ہاں خبر دی جاتی ہے چنانچہ جب سب لوگ چلے گئے تو آپ نے اس شخص سے فرمایا کہ بھائی میرے اندر ایک عیب ہے جس کو میں تم پر ظاہر کرتا ہوں وہ یہ کہ میرا پاجامہ ڈھلک کر ٹخنوں سے نیچے پہنچ جاتا ہے اور اس کے متعلق حدیث میں سخت وعید آئی ہے اس کے بعد آپ نے سب وعیدیں بیان کر دیں، پھر کھڑے ہو کر ارشاد فرمایا دیکھنا میرا پاجامہ ٹخنوں سے نیچے تو نہیں ہے اس شخص نے شاہ صاحب کے پیر پکڑ لئے اور کہا حضرت آپ میں تو یہ عیب کیوں ہوتا یہ مرض تو مجھ نالائق میں ہے۔ میں آج سے توبہ کرتا ہوں ان شاء اللہ پھر ایسا نہ ہوگا۔ دیکھئے شاہ صاحب نے کس شفقت کے ساتھ نصیحت فرمائی جس کا فوراً اثر ہوا۔ واللہ شفقت کا اثر مخاطب پر ضرور ہوتا ہے ہاں کوئی بہت ہی بے حس ہو تو اور بات ہے۔

صاحبو ہم کو عوام مسلمانوں کے ساتھ خیر خواہی کا معاملہ کرنا چاہئے جیسا کہ اپنی اولاد کے ساتھ ہوتا ہے اور اگر کسی سے کنارہ کش اور علیحدگی ہی اختیار کی جائے تو اس میں بھی خیر خواہی کا قصد ہونا چاہئے۔ اور ظاہر میں تہذیب کے ساتھ تعلق قطع کرنا چاہئے خدا تعالیٰ کا حکم ہے۔

وَاهْجُرْهُمْ هَجْرًا جَمِيْلًا

حالانکہ کفار کا چھوڑنا اور ان سے تعلق قطع کرنا فرض ہے مگر اس کیلئے بھی شائستگی اور تہذیب کی تاکید ہے کہ ان سے خوبی کے ساتھ تعلق قطع کرو۔ افسوس ہم مسلمانوں سے بھی تہذیب وشائستگی نہیں برتتے۔ معلوم ہوتا ہے کہ ہم کو مسلمانوں کے ساتھ خیر خواہی اور شفقت کا تعلق بہت ہی کم ہے۔ بلکہ ہم لوگ مسلمانوں کے ساتھ تکبر کرتے اور ان کو حقیر سمجھتے ہیں اور یہ تکبر بڑا ہی خاص ہے جب تک یہ ہمارے اندر ہے اس وقت تک ہم سے حقوق علم ادا نہیں ہو سکتے اور یہ صرف علم حاصل کرنے سے نہیں نکل سکتا جیسا کہ کسی کو خارش کا نسخہ یاد ہو تو محض نسخہ یاد ہو جانے سے خارش دفع نہیں ہو سکتی، بلکہ اس کا طریقہ یہ ہے کہ نسخہ کے اجزاء جمع کرو اور اس کا استعمال شروع کرو مضرات سے پرہیز کرو اور جب تک طبیب مشورہ دے اس وقت تک برابر نسخہ کا استعمال اور پرہیز جاری رکھو جب تک طبیب نبض دیکھ کر یہ نہ کہہ دے کہ اب خارش کا مادہ زائل ہو گیا ہے اس وقت تک تدبیر کو نہ چھوڑا جائے۔ یہی صورت یہاں بھی ہے محض ازالہ کبر کی تدابیر احیاء العلوم وغیرہ سے یاد کر لینا کافی نہیں بلکہ ان کے استعمال کی ضرورت ہے اور استعمال بھی کسی طبیب نفس کے مشورہ سے ہونا چاہئے کیونکہ ہر تدبیر ہر ایک کو نافع نہیں ہوتی جیسا کہ ہر نسخہ ہر شخص کے موافق نہیں ہوتا۔

اصلاح نفس کی ضرورت

پس پہلے طبیب کو تجویز کرو، کیونکہ ہر علاج کرنے والا طبیب نہیں ہوتا بعضے عطائی حکیم بھی ہوتے ہیں نیز طبیب وہ ہے جو خود علیل نہ ہو۔ کیونکہ قاعدہ ہے۔ رای العلیل علیل۔ بیمار کی رائے بھی علیل ہوتی ہے مگر اس کا مطلب یہ ہے کہ اس پر بیماری غالب نہ ہو اور کوئی مرض اس کا لازم نہ ہو۔ باقی اتفاقاً کبھی کوئی مرض تھوڑی دیر کے لئے لاحق ہو جانا طبیب ہونے کے منافی نہیں کیونکہ حقیقی صحت تو شاید ہی کسی کو حاصل ہو (انبیاء علیہم السلام کے سوا معصوم کوئی نہیں) مثلاً کسی متواضع سے کبھی کوئی بات تکبر کی نکل جاوے تو یہ مضر نہیں ہاں اس کے افعال واحوال میں زیادہ غلبہ تواضع

کا ہونا چاہئے جو شخص ایسا ہو وہ طبیب ہے اس کو غنیمت سمجھو اس کا انتظار نہ کرو کہ پیر جنید بغدادیؒ ہی ہو۔ کیونکہ اگر جنید کو دیکھتے تو ان میں بھی کوئی نہ کوئی نقص ضرور نکال دیتے پس اس علامت سے طبیب کو تلاش کر کے اپنے کو اس کے سپرد کر دو اور وہ جو تصرف تمہارے اندر کرے اس پر راضی ہو کر عمل کرو کیونکہ اگر تمہارے اندر تکبر کا خناس ہوگا تو اس کا علاج تذلیل و تحقیر سے کرے گا ایسی تدبیریں بتلائے گا جن سے نفس پامال ہو جائے جیسا سلطان نظام الدین بلخی قدس سرہ نے شیخ ابو سعید گنگوہی کا علاج کیا تھا جب یہ شیخ کے پاس طلب طریق اور اصلاح نفس کے لئے حاضر ہوئے تو شیخ نے دیکھا کہ ان میں صاحبزادگی کا اثر بہت کچھ ہے، آپ نے اس کا یہ علاج کیا کہ خانقاہ کا حمام جھونکنا ان کے سپرد کیا سال بھر تک بیچارے حمام جھونکتے رہے، ایک سال کے بعد شیخ نے بھنگن کو حکم دیا کہ آج ذرا تو ابو سعیدؒ کے پاس جانا اور جو کچھ وہ کہیں مجھے مطلع کرنا بھنگن نے ایسا ہی کیا تو شیخ ابو سعیدؒ نے تیز نگاہ سے اس کو گھورا اور فرمایا گنگوہ ہوتا تو تجھے مزہ چکھا دیتا بھنگن نے شیخ کو اطلاع دی کہ ابو سعید نے یوں کہا تھا، فرمایا اوہو! ابھی تک گنگوہ کی پیرزادگی کا اثر باقی ہے تو ایک سال تک اور اسی کام پر رکھا سال بھر کے بعد بھنگن کو پھر وہی حکم دیا اور فرمایا اب کے تھوڑا سا کوڑا بھی ان پر جھاڑ دینا اور جو کچھ کہیں اس کی خبر مجھے کرنا اس نے ایسا ہی کیا تو شیخ ابو سعید نے زبان سے کچھ نہیں کہا صرف غصہ سے ایک دفعہ گھور کر دیکھا، بھنگن نے شیخ کو اطلاع دی فرمایا کچھ کچھ اصلاح ہو چکی ہے مگر پوری نہیں ہوئی، ابھی دماغ میں خناس موجود ہے ایک سال تک اور حمام جھکوایا پھر بھنگن کو وہی حکم دیا اور فرمایا اس مرتبہ پورا ٹوکرا ان کے اوپر ڈال دینا اس نے ایسا ہی کیا تو شیخ ابو سعید رونے لگے کہ شاید میری وجہ سے تجھے ٹھوکر لگی ہے اگر کہیں چوٹ لگی ہے تو مجھ سے بدلہ لے لے یا معاف کر دے۔ غرض اس کی خوشامد کرنے لگے بھنگن نے شیخ کو اطلاع دی تو فرمایا الحمد للہ! نفس کی اصلاح ہو گئی۔ اس کے بعد پھر یہ خدمت چھڑا دی اور کچھ ذکر و شغل بتلایا اور مجلس میں حاضر ہونے کی اجازت دے دی مگر بات کرنے کی اجازت نہ تھی تو یہ نفس ان طریقوں سے درست ہوتا ہے اور یہ ذلت اول اول مرید کو بہت ناگوار ہوتی ہے مگر اس کو ہمت کے ساتھ برداشت کرنا چاہئے جیسا کہ دوائے تلخ ناک اور منہ بند کر کے پیا کرتے ہیں۔

حضرت شبلی کا واقعہ ہے کہ ان کے ایک مرید نے شکایت کی کہ مجھے ذکر سے نفع نہیں ہوتا شیخ نے توجہ کی تو اس کا سبب تکبر معلوم ہوا۔ آپ نے اس کے علاج کرنے کے لئے فرمایا کہ تو ایک ٹوکرا

اخروٹوں کا فلاں محلہ میں (جہاں اس شخص کے معتقد بہت تھے) لیجا اور عام طور سے یہ اعلان کردے کہ جو کوئی میرے ایک دھول مارے گا اسے ایک اخروٹ ملے گا، یہ سن کر مرید نے کہا اللہ اکبر میں ایسا کروں؟ شیخ نے فرمایا کمبخت یہ اللہ کا نام وہ ہے کہ اگر کافر صد سالہ اس کو کہے تو مسلمان ہو کر جنتی ہو جائے مگر تو نے جس موقعہ پر یہ نام لیا ہے اس سے تو کافر ہو گیا کیونکہ اس وقت تو نے اللہ اکبر خدا کی عظمت ظاہر کرنے کے لئے نہیں کہا بلکہ اپنی عظمت ظاہر کرنے کے لئے کہا ہے۔ جا اپنے ایمان کی تجدید کر۔ سو پہلے پہل یہ ذلت کے کام نفس کو بہت ناگوار ہوتے ہیں مگر بدون ذلت کے کام بھی نہیں بنتا۔ کیونکہ خدا تعالیٰ اور بندہ کے درمیان بھی خودی حائل ہے اگر یہ نکل جائے تو بس واصل ہے اور جب تک یہ باقی ہے اس وقت تک وصول نہیں ہو سکتا۔ عارف شیرازیؒ فرماتے ہیں۔

میان عاشق و معشوق ہیچ حائل نیست تو خود حجاب خودی حافظ از میاں برخیز

ترجمہ:۔ عاشق و معشوق کے درمیان کوئی حائل نہیں تیری خودی خود حجاب ہو رہی ہے حافظ خودی کو درمیان سے اٹھا۔

حضرت بایزید بسطامی رحمۃ اللہ علیہ نے ایک بار حق تعالیٰ کو خواب میں دیکھا تھا عرض کیا یا رب دلنی علی اقرب الطریق الیک۔

(یعنی خداوند مجھے اپنے تک پہنچنے کا نزدیک رستہ بتا دیجئے)

جواب ارشاد ہوا یا بایزید دع نفسک وتعال

یعنی اپنے آپ کو چھوڑ دو اور آ جاؤ

مولانا اسی کو فرماتے ہیں۔

قرب نزد پستی ببالا رفتن ست قرب حق از قید ہستی رستن ست

ترجمہ:۔ قرب اس کا نام نہیں کہ نیچے سے اوپر کو جاؤ بلکہ قرب یہ ہے کہ ہستی سے چھوٹ جاؤ۔

از قید ہستی رستن کے معنی یہ نہیں کہ سنکھیا کھا کر مر جاؤ بلکہ اس کے معنی یہ ہیں کہ اپنے اوپر نظر نہ کرو، اپنی ذات کے معاملہ میں مشغول نہ ہو۔ اپنے ارادہ و اختیار کو فنا کر دو دعویٰ اور پندار کو مٹا دو، اپنے علوم پر نظر کرنا یہ بھی اشتغال بنفسہ ہے جس میں علماء کی جماعت زیادہ مبتلا ہے۔

حجاب انانیت

محققین کا قول ہے کہ حجاب علم حجاب جہل سے اشد ہے یعنی معنی ہیں اس قول کے العلم ھو

الحجاب الاکبر. (ترجمہ:۔علم وہ جوحجاب اکبر ہے)

سواس میں ایک قید ہے جس کو حضرت حاجی صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے بیان فرمایا۔ حضرت کا ارشاد ہے۔ العلم بغیر اللہ ھو الحجاب الاکبر.

''یعنی جس علم میں غیر اللہ کی طرف التفات واشتغال ہو وہ حجاب اکبر ہے۔''

اس سے علوم وھبیہ اور واردات قلبیہ خارج ہو گئے کہ وہ حجاب نہیں کیونکہ ان سے غیر کی طرف التفات نہیں ہوتا بلکہ ان سے عظمت حق کا انکشاف ہوتا ہے اسی طرح اگر کسی کو علم ظاہرہ سے التفات الی الغیر نہ رہے وہ بھی حجابیت سے خارج ہو جائے گا۔ اور اگر کسی کو علوم وہبیہ واردات قلبیہ سے بھی عجب ہونے لگے اس کے لئے یہ بھی حجاب ہو جائیں گے مگر ایسا کم ہوتا ہے بخلاف علوم ظاہرہ کے کہ ان میں اکثر لوگوں کے لئے غوائل نفس زیادہ متحمل ہیں۔ غرض ہم لوگ رات دن اپنے نفس میں مشغول ہیں بلکہ کسی دوسرے کے ساتھ بھی جو مشغول ہوتے ہیں وہ بھی اپنے ہی لئے کسی سے عشق بھی ہوتا ہے وہ بھی اپنے ہی واسطے ہوتا ہے اور اگر کسی کو علم کی ترقی کی فکر ہے وہ بھی اپنی ہی غرض کے لئے اگر وعظ و درس کا مشغلہ ہے تو وہ بھی اس لئے کہ ہم واعظ یا مدارس مشہور ہوں گے چار آدمی ہماری تعظیم کریں گے یہ ہی ہے اصل حجاب اسی کے قطع کرنے کا خواب میں حق تعالیٰ نے حکم فرمایا۔

دع نفسک وتعال. (ترجمہ:۔اپنے نفس کو چھوڑ دو اور چلے آؤ)

یہ انانیت بڑا حجاب ہے اور اس کا علاج بدوں ذلت نفس کے نہیں ہو سکتا کیونکہ اطباء کا اس پر اتفاق ہے۔ العلاج بالضد

یعنی حرارت کا علاج برودت سے ہوتا ہے، برودت کا علاج حرارت سے شاید اس پر کوئی یہ کہے کہ میں اہل ہند کا قول لیتا ہوں۔ العلاج بالمثل

یعنی حرارت کا علاج حرارت سے اور برودت کا علاج برودت سے۔ اس لئے میں تکبر کا علاج تکبر ہی سے کرتا ہوں، تو میں کہوں گا کہ تم نے اطباء ہند کے قول کا مطلب ہی نہیں سمجھا، ان کا یہ مطلب نہیں کہ مزاج کی حرارت کا علاج خود مزاج کی حرارت سے کیا جاتا ہے بلکہ حرارت مزاج کا علاج حرارت دوا سے ہوتا ہے، دونوں حرارتوں کا محل الگ الگ ہے پس تکبر کا علاج اگر تکبر سے ہو تو وہ اپنا تکبر نہیں بلکہ حضرت حق کی شان کبریائی کا استحضار ہونا چاہئے یہ ہے علاج الکبر بالکبر۔ (کبر کا علاج کبر سے) کیونکہ قاعدہ ہے کہ اپنے سے بڑے کے سامنے اپنی بڑائی جاتی رہتی ہے۔ جیسے ایک

دہقان زادہ اپنے باپ کے ساتھ جا رہا تھا وہ سمجھتا تھا کہ میرا باپ گاؤں کا چودھری ہے اس سے اور بڑا کون ہوگا اتفاق سے راستہ میں کسی بادشاہ کا کیمپ پڑا ہوا تھا جس کو شیخ نقل کرتے ہیں۔

رئیس رہے باپسر درد ہے　　　　گذشتند بر قلب شاہنشہے

اس کو دیکھ کر دہقان کانپنے لگا، ساری چودھراہٹ دھری رہ گئی، دہقان زادہ حیران ہو گیا کہ یہ کون شخص ہے جس سے میرا باپ کانپنے لگا بعد میں پوچھا کہ ابا جان! کیا آپ سے بھی بڑا کوئی چودھری ہے جس سے آپ ڈر گئے، کہا بیٹا بادشاہ کے سامنے میں کیا چیز ہوں کچھ بھی نہیں۔

اسی پر شیخ تفریع فرماتے ہیں

تو اے غافل از حق چناں درد ہی　　　　کر بر خویشتن منصبے می نہی

صاحبو! میں بقسم کہتا ہوں کہ حق تعالیٰ کی عظمت دل میں آ جائے تو کسی زبان سے اپنی نسبت مولانا صاحب وغیرہ تعظیمی الفاظ سننے سے شرم آنے لگے۔ جیسا کہ سررشتہ دار کو کلکٹر کے سامنے اپنی تعظیم ہونے سے شرم آتی ہے۔ ایک بزرگ ''صاحب حال'' کا قصہ ہے کہ ایک دفعہ کسی نے ان کو پنکھا جھلنا چاہا تو نہایت سختی سے منع فرمایا۔ پھر تھوڑی دیر کے بعد اجازت دیدی بعض لوگ تو اس کو جنون سمجھیں گے مگر واللہ! یہ جنون نہیں، اور اگر کوئی ان کو مجنوں ہی کہے تو وہ اس کی پروا نہیں کرتے اور یوں کہتے ہیں کہ

ما اگر قلاش و گر دیوانہ ایم　　　　مست آں ساقی و آں پیمانہ ایم

اور جس کو یہ جنون نہ ہو وہ خود دیوانہ ہے۔

اوست دیوانہ کہ دیوانہ نشد　　　　مرعسس رادید درخانہ نشد

(ترجمہ:۔ وہ دیوانہ، دیوانہ نہیں ہے جو کوتوالی کو دیکھ کر گھر چلا جائے۔)

کسی نے ان بزرگ سے دریافت کیا کہ حضرت اس کی کیا وجہ تھی کہ آپ نے اول تو پنکھا جھلنے سے منع فرمایا اور بعد میں اجازت دے دی فرمایا اس وقت مجھ سے عظمت حق کا غلبہ ہو رہا تھا، اس وقت مجھے کسی کا پنکھا جھلنا سخت ناگوار ہوا۔ یوں معلوم ہوتا تھا کہ میرے ساتھ مذاق کر رہا ہے، جب وہ غلبہ کم ہو گیا تو میں نے اجازت دے دی۔ صاحبو! اس کا انکار نہ کرو، یہ سب باتیں پیش آتی ہیں، غرض ہمارے اندر تکبر اسی وقت تک ہے جب تک کہ خدا تعالیٰ کی عظمت دل میں نہیں آئی۔ اور اگر عظمت حق دل میں آ جائے تو پھر یہ حال ہوگا۔

چو سلطان عزت علم برکشد   جہاں سر بجیب عدم درکشد

(ترجمہ:۔ جب محبوب حقیقی کی تجلی قلب پر وارد ہوتی ہے تو سب چیزیں فنا ہو جاتی ہیں۔)

پھر یہ سارے دعوے نیست ونابود ہو جائیں گے۔ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جو اپنے مراتب ومناقب بیان فرمائے وہ محض حق تعالیٰ کے حکم سے بیان فرمائے۔ (جیسے اولیاء میں بھی ایسے ہوئے ہیں جنہوں نے حق تعالیٰ کے حکم سے **قدمی هذه علی رقبته کل اولیاء الله** کہا ہے) پھر باوجودیکہ جو کچھ آپ نے فرمایا حق سے فرمایا، مگر حضور کے الفاظ سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ ان مراتب کو بیان فرماتے ہوئے شرماتے تھے۔ چنانچہ اسی لئے بار بار **ولا فخر ولا فخر** (اور مجھے فخر نہیں اور مجھے فخر نہیں) بھی فرماتے جاتے ہیں، آپ نے ہماری اصلاح ایمان کے لئے اپنے واقعی فضائل بیان فرما دیئے تاکہ مسلمان جوش محبت میں اپنی طرف سے مبالغہ کر کے ایسے فضائل نہ تراشیں جن سے دوسرے انبیاء کی تنقیص ہو جائے، چنانچہ اس سے بچانے کے لئے آپ نے یہ بھی فرمایا ہے۔ **لا تفضلونی علی یونس بن متیٰ۔** (کتاب الشفاء للقاضی عیاض،۱:۲۶۵، اتحاف السادۃ ۲:۱۰۵)

(ترجمہ:۔ مجھے حضرت یونس بن متیٰ پر فضیلت نہ دو۔)

غرض حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ہماری اصلاح کے لئے اور وہ بھی حکم حق سے بہت شرماتے ہوئے اپنے کچھ فضائل بیان فرمائے ہیں اور یہ شرم وحیاء عظمت حق کی وجہ سے تھی کیونکہ عظمت حق کا علم تمام مخلوق سے زیادہ آپ کو تھا چنانچہ فرماتے ہیں۔

انا اعلمکم بالله واخشاکم لله۔

(ترجمہ:۔ مجھے تم سب سے زیادہ حق سبحانہ وتعالیٰ کی علم ومعرفت سے حاصل ہے اور میں سب سے زیادہ اللہ تعالیٰ سے ڈرتا ہوں۔)

آپ کے کمال علم ومعرفت کی بڑی دلیل یہ ہے کہ باوجودیکہ حق تعالیٰ کے محامد جیسے حضور نے بیان فرمائے ہیں ایسے کسی نے بیان نہیں کئے مگر اس پر بھی یہ آپ کی شان واضح دیکھئے کہ باوجود اتنے بے نظیر محامد بیان فرمانے کے ساتھ ساتھ یہ بھی فرمائے۔ **اللھم لا احصی ثناء علیک انت کما اثنیت علی نفسک۔** (اتحاف السادۃ المتقین للزبیدی،۲:۱۱)

(ترجمہ:۔ اے اللہ میں آپ کی ثناء کا حق ادا نہیں کر سکتا جیسا کہ آپ نے اپنی تعریف خود فرمائی ہے)

اور اس کی وجہ یہی تھی یعنی انکشاف عظمت حق جس سے تواضع وعبدیت پیدا ہوتی ہے اس مضمون

کے قریب حضرت مرزا مظہر جانجاناں کی حمد و نعت بھی ہے گویا اسی حدیث کا ترجمہ فرماتے ہیں۔

خدا در انتظار حمد ما نیست　　محمدؐ چشم براہ ثنا نیست

(ترجمہ:۔ اللہ سبحانہ وتعالیٰ کو ہماری حمد و ثناء کا انتظار نہیں اور حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم ہماری مدح (تعریف) کے منتظر نہیں ہیں۔)

خدا مدح آفریں مصطفےٰؐ بس　　محمدؐ حامد حمد خدا بس

مناجات اگر خواہی بیان کرد　　بہ بیتے ہم قناعت می تواں کرد

محمد از تو مے خواہم خدارا　　الٰہی از تو حب مصطفیؐ را

(ترجمہ:۔ حضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم کو حق سبحانہ وتعالیٰ کی تعریف کافی ہے اور اللہ تعالیٰ کو یہ کافی ہے کہ حضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم اللہ تعالیٰ کی حمد و ثناء کرنے والے ہیں۔ اگر تو مناجات بیان کرنا چاہے تو اس بیت پر قناعت کر حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم سے ہم یہ چاہتے ہیں کہ ہمیں اللہ تعالیٰ واصل کر دیں اور اللہ تعالیٰ سے یہ چاہتے ہیں کہ ہمیں حضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت عطاء فرمائیں۔)

اے اللہ! حضور صلی اللہ علیہ وسلم تو باوجود اتنے کمالات کے تواضع اختیار کریں اور ہم ذرا سے علم پر نازاں ہوں یاد رکھو یہ ناز کرنا ہی اس کی دلیل ہے کہ تم کمال سے عاری ہو ورنہ اہل کمال ناز نہیں کیا کرتے کیونکہ ان کو کمال کی حقیقت واضح ہو جاتی ہے جس سے اپنے کو عاجز پا کر وہ کبھی ناز نہیں کر سکتے۔ مولانا محمد اسمٰعیل صاحب شہید کا واقعہ ہے کہ ایک دفعہ آپ نے وعظ کیا تو بعد وعظ کے کسی نے تعریف کی فرمایا میں کیا چیز ہوں اس نے کہا یہ آپ تواضعاً فرماتے ہیں آپ نے فرمایا یہ تواضع کا کلمہ نہیں تکبر کا کلمہ ہے، یہ کلمہ وہی کر سکتا ہے، جس کو کمال کی پوری حقیقت معلوم ہو وہ اس پر نظر کر کے کہتا ہے میں کچھ نہیں، غرض جس کو کمال کی حقیقت معلوم ہو گی وہ کبھی کمال کا دعویٰ نہ کرے گا۔ مگر آج کل ہم لوگوں نے محض چند الفاظ یاد کر لینے کو کمال سمجھ لیا ہے۔ ہم ناز کرتے ہیں کہ ہم کو عربی لکھنا اور بولنا آتی ہے مگر اس سے کیا ہوتا ہے، صاحبو! اگر ایک شخص جاہل ہو مگر خدا سے اس کو تعلق ہو اور ایک شخص عربی دان ہو مگر خدا سے علاقہ نہ ہو تو بتلایئے ان دونوں میں کون افضل ہو گا یقیناً وہ جاہل افضل ہے جس کو خدا تعالیٰ سے علاقہ ہو اور محض عربی دانی کس کام کی جس میں خدا سے بے تعلق ہو۔

طلباء کو نصیحت:۔

اسی لئے میں طلبہ کو نصیحت کرتا ہوں کہ زیادہ توجہ فقہ و حدیث و تفسیر پر کریں کہ یہی علوم مقصودہ ہیں، انہی سے خدا تعالیٰ اور رسول ؐ کی عظمت کا علم ہوتا ہے اور معقول و ادب میں بقدر ضرورت توجہ کریں کیونکہ عربی دان ہونا کچھ کمال نہیں خدا دان ہونا چاہئے اگر عربی دانی کوئی چیز ہوتی تو ابوجہل حضرت بلالؓ سے افضل ہوتا کیونکہ وہ قریشی فصیح ہے اور حضرت بلالؓ حبشی ہیں جو ابوجہل کے برابر ہرگز فصیح و بلیغ نہ تھے مگر دیکھ لیجئے کہ عربی دانی اس کے کیا کام آئی کچھ بھی نہیں بلکہ وہ ابوجہل ہی رہا اور حضرت بلالؓ وہ ہیں جن کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے جنت میں اپنے آگے آگے چلتا دیکھا تھا اسی کو ایک بزرگ کہتے ہیں۔

حسن زبصرہ بلالؓ از حبش صہیبؓ زروم   زخاک مکہ ابوجہل ایں چہ بوالعجبی ست

(ترجمہ:۔ حضرت حسن بصریؒ کو بصرہ سے اور حضرت بلالؓ کو حبش سے اور حضرت صہیب رومیؓ کو روم سے جذب فرمایا اور خاک مکہ مکرمہ سے ابوجہل پیدا ہو یہ کس قدر عجیب قدرت ہے۔)

یہاں سے معلوم ہوا کہ محض عربی دانی کوئی چیز نہیں اور نہ ایسا شخص عالم ہے بلکہ ابوجہل کی طرح جاہل ہے اصل علم وہ ہے جس کو حق تعالیٰ اس آیت میں فرماتے ہیں۔

كُوْنُوْا رَبّٰنِيّٖنَ ۔   ''یعنی اللہ والے ہو جاؤ خدا تعالیٰ سے علاقہ پیدا کرو۔''

بِمَا كُنْتُمْ تُعَلِّمُوْنَ الْكِتٰبَ وَبِمَا كُنْتُمْ تَدْرُسُوْنَ.

یعنی تم کتاب پڑھاتے اور پڑھتے ہو اس میں ایک مقتضی کا ذکر ہے کہ تمہارا یہ فضل خود اس کو مقتضی ہے کہ تم کو اللہ والا بننا چاہئے اور

کونوا ربانیین ۔   (ترجمہ:۔ اللہ والے بن جاؤ)

کے بعد اس مقتضی کا بیان فرمانا ہم کو شرم دلانے کیلئے ہے مطلب یہ ہے کہ اگر تمہارے کہنے سے ''ربانی'' نہیں بنتے تو اپنے کئے ہی کی شرم کرو، اور اسی سے ربانی بن جاؤ، یہ طرز ایسا ہے جیسا کوئی شخص حریص لالچی ہو اور کسی وقت بیٹوں کا باپ بن جائے تو اس سے کہا کرتے ہیں کہ میاں تم اب باپ بن گئے ہو اب تو بچپن کی سی حرص کو جانے دو غرض جب مخاطب میں کسی امر کا مقتضی موجود ہو اور پھر بھی وہ اس کو اختیار نہ کرے تو اس مقتضی کو بیان کر کے زیادہ عار دلایا کرتے ہیں، اسی طرح

یہاں حق تعالیٰ فرماتے ہیں کہ یہ تمہاری درس وتدریس ہے خود مقتضی ہے ربانی بننے کی پھر حیرت ہے اگر باوجود مقتضی کے تم ربانی نہ بنو کہ اس وقت تمہارا ربانی نہ بننا اور عمل کا اہتمام نہ کرنا بڑا ظلم ہوگا اور میں نے مقتضی کے ساتھ اتم کی قید اس لئے بڑھائی تا کہ عوام اس سے خوش نہ ہوں کہ ہم سستے چھوٹے، ہمارے اندر عمل کا مقتضی ہی نہیں اس لئے ہم کو"کونوا ربانین" کے خطاب کے مخاطب نہیں سو وہ سن لیں کہ مقتضی ان کے پاس بھی ہے اور وہ خوش نہ ہوں۔اس میں ان کی عید نہیں ہے بلکہ ان کے لئے بھی وعید ہے کیونکہ ایک مقتضی ان کے پاس بھی ہے اور وہ مقتضی کیا ہے؟ ایمان۔

ایجاب وقبول کی حقیت:۔

شاید اس پر کوئی یہ کہے کہ ایمان تو لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ہو جاتا ہے جس میں صرف توحید ورسالت کا اقرار ہے، نماز روزہ اور حج وزکوٰۃ کا کہاں اقرار ہے سو آپ گھبرائیں نہیں میں ابھی ثابت کرتا ہوں کہ اس میں سب باتوں کا اقرار ہے جس کو میں ایک مثال سے واضح کرنا چاہتا ہوں جو نہایت لذیذ مثال ہے وہ یہ کہ نکاح آپ کے نزدیک کاہے کا نام ہے؟ ظاہر ہے کہ ایجاب و قبول کا نام ہے اب بتلایئے اگر کوئی شخص نکاح کے بعد بیوی کے نان ونفقہ سے انکار کرے اور کہے کہ میں نے تو صرف بیوی کو قبول کیا تھا یہ جھگڑے میں نے کب قبول کئے تھے یہ میرے ذمہ نہیں ہیں تو آپ کیا فتویٰ دیں گے ظاہر ہے ہر شخص اسے احمق بتائے گا اور کہے گا میاں کا بیوی کو قبول کرنا ہی سب جھگڑوں کو قبول کرنا تھا، یہ نکاح تو شیخ سعدیؒ کا گالا ہے کہ دنیا بھر یک گالیاں اس میں آ گئی تھیں۔

ایک دفعہ شیخ سعدیؒ کسی سرائے میں گئے۔ بھٹیاری سے کھانا پکوانا چاہتے تھے مگر وہاں جا کر دیکھا کہ بھٹیاری کسی دوسری عورت سے لڑ رہی ہے شیخ سعدیؒ نے کچھ دیر تو صبر کیا کہ شاید لڑائی ختم ہو جائے مگر یہ سلسلہ ختم ہی نہ ہوا تو آخر بھٹیاری سے کہا کہ بی! تو میرے واسطے کھانا تیار کر دے وہ بولی جاؤ میاں مجھے لڑائی سے فرصت نہیں، آپ نے فرمایا کہ تو میرا کام کر دے میں تیرا کام کرلوں گا یعنی اس عورت سے لڑائی میں کرلوں گا وہ اس پر راضی ہو گئی اور دوسری عورت سے کہا کہ میں نے اس مسافر کو اپنا قائم مقام کیا اس سے لڑتی رہ میں بھی تھوڑی دیر میں آتی ہوں اس نے شیخ سعدی کو گالیاں دینا شروع کیں آپ بیٹھے سنتے رہے، جب وہ سب کچھ کہہ چکی تو آپ نے کہا دیکھو اب ہماری باری ہے اب ہم گالیاں دیں گے اور یہ شرط ہے کہ فریقین میں سے کوئی مکرر گالی نہ دے بلکہ

جو گالی ہوئی ہو وہ اس پر راضی ہوگئی تو آپ بولے جتنی گالیاں اب تک ہو چکی ہیں اور جتنی آئندہ کو ہو سکتی ہیں میں نے سب کا ایک گالا بنا کر تیرے وہاں دے دیا اور یہ کہہ کر چپ ہو گئے اس نے کوئی گالی دی فرمایا کہ یہ تو اسی گالے کی ہے اس لئے مکرر ہو گئی پھر تو وہ جو کچھ کہتی آپ فرما دیتے یہ تو اسی گالے کی ہے کوئی نئی بات کہو۔ وہ جھک مار کر چپ ہو گئی تو ایسے ہی بیوی کا قبول کرنا سعدیؒ کا گالا ہے اس میں ساری ذمہ داریاں آ گئیں۔ جب آپ یہ نکاح کی مثال سمجھ گئے تو اب سنئے۔

لا الٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ۔ (ترجمہ:۔ اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی عبادت کے لائق نہیں اور حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم اللہ کے رسول ہیں۔)

بھی ایجاب و قبول ہے اس کا مطلب یہ ہے کہ اللہ و رسول جو کچھ حکم دیں گے ہم سر آنکھوں سے قبول کریں گے تو اب جتنے اعمال کا شریعت نے حکم دیا ہے سب کی ذمہ داری آپ نے لے لی اس سے علماء غالبا

یٰاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْٓا اٰمِنُوْا ۔ (ترجمہ:۔ اے ایمان والو ایمان لاؤ)

کے معنی بھی سمجھ گئے ہوں گے اس میں بظاہر اشکال ہے کہ اہل ایمان کو امر بالایمان کیسا؟ اس کے مختلف جواب دیئے گئے ہیں۔ ایک توجیہ اس کی یہ بھی عمدہ ہے جس کی طرف میں نے اس وقت اشارہ کیا ہے یعنی اول "امنوا" تو خطاب قولی ہے جو ایمان اجمالی سے حاصل ہو جاتا ہے، کیونکہ ایمان اجمالی سے آدمی جماعت مومنین میں داخل ہو جاتا ہے۔ پھر دوسری دفعہ امنوا فرما کر ان کو ایمان تفصیلی کا حکم ہے کہ جن احکام کو تو نے ایمان اجمالی میں قبول کیا ہے ان کی تفصیل معلوم کر کے عمل کا اہتمام کرو۔ غرض ایمان لانے کے وقت تفصیل احکام کی کچھ بھی خبر نہ ہو مگر ایمان لانے کے بعد سب احکام کو ماننا پڑے گا، جیسے کسی کا یہ مان لینا کہ میں بادشاہ کی رعایا بنتا ہوں بادشاہ کے تمام احکام ماننے کو مستلزم ہے تو ایمان لانا ہی ان سب کے ماننے کا عہد ہے پس مقتضی "کونوا ربانیین" پر عمل کرنے کا سب کے اندر موجود ہے اور مقتضی بھی تام، اس لئے عوام یہ نہیں کہہ سکتے کہ ہم تو اہل علم و تدریس نہیں اس لئے ہم عمل سے چھوٹ گئے، ہرگز نہیں بلکہ ان پر دو جرم قائم ہیں ایک ترک علم کا ایک ترک عمل کا۔ پس غیر علماء کے پاس بھی کوئی عذر نہیں۔ ان کے پاس اگر مقتضی اتم نہیں تو مقتضی تام تو موجود ہے، اس تقریر سے یہ شبہ تو رفع ہو گیا اور معلوم ہو گیا کہ:

بِمَا كُنْتُمْ تُعَلِّمُوْنَ الْكِتٰبَ وَبِمَا كُنْتُمْ تَدْرُسُوْنَ

(ترجمہ:۔ (اس لئے کہ تم کتاب پڑھتے اور پڑھاتے ہو۔)

میں مقتضی مطلق کا ذکر نہیں۔ بلکہ مقتضی اتم کا بیان ہے اسی لئے میں نے اتم کی قید بڑھائی تھی اس بناء پر ان سے کہا جاتا ہے کہ تم کتاب پڑھاتے ہو اور پڑھتے بھی ہو تو تمہارا ربانی نہ ہونا ظلم و غضب ہے۔

علماء کو مشورہ:۔

یہاں ایک نکتہ پر بھی متنبہ کئے دیتا ہوں وہ یہ کہ اس جگہ تعلمون کو مقدم کیا گیا ہے اور تدرسون کو مؤخر حالانکہ وقوع مقتضی عکس کو ہے، کیونکہ ترتیب واقعی یہ ہے کہ اول درس یعنی قرأت کا (**کما فی قوله تعالی درسوا ما فیه**) وقوع ہوتا ہے، پھر تعلیم یعنی اقراء کا (**و التعلیم هذا لمعنی ظاهر**) مگر خدا تعالیٰ کے کلام میں عجیب اسرار ہیں، یہاں تعلمون کو اس لئے مقدم کیا گیا کہ پہلے معلوم ہو چکا ہے کہ اس جگہ مقتضی کا بیان شرم دلانے کیلئے ہے اور واقعہ یہ ہے کہ دوسروں کو تعلیم و نصیحت کرنا عدم عمل کی حالت میں زیادہ باعث شرم ہوتا ہے، محض جان لینا اور پڑھ لینا اس قدر موجب شرم نہیں ہوتا کیونکہ تعلیم میں گویا قسم کا دعویٰ ہوتا ہے تو معلم و ناصح ہو کر خود عمل نہ کرنا بہت ہی شرم کی جگہ ہے۔ اگر ذرا بھی طبیعت سلیم ہو تو معلم و ناصح ہو کر انسان سب سے پہلے خود اپنی تعلیم پر عمل کرتا ہے، یہاں سے ایک اور شبہ رفع ہو جائے گا جو نادر شبہ ہے جس کی طرف شاید کسی کا ذہن بھی نہ گیا ہو گا وہ یہ کہ بعض دفعہ مشائخ نااہلوں کو مجاز کر دیتے ہیں، اس پر لوگ اعتراض کرتے ہیں کہ فلاں بزرگ نے نااہل کو خلافت دیدی، اس کے جوابات چند ہیں، ایک تو یہ کہ ممکن ہے اجازت کے وقت اہل ہو پھر نااہل ہو گیا ہو اور ایسا ہونا مستبعد نہیں، اسی لئے عقاید کی کتابوں میں مذکور ہوا ہے، ایک تو یہی کہ **لسعید قد یشقی**۔ نیک آدمی کبھی شقی بھی ہو جاتا ہے اور یہ اہلسنت کے عقائد میں داخل ہے اور میرے نزدیک

اَمَّا الَّذِيْنَ سُعِدُوْا فَفِي الْجَنَّةِ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا مَا دَامَتِ السَّمٰوٰتُ وَالْاَرْضُ اِلَّا مَا شَآءَ رَبُّکَ۔ (هود آیت نمبر ۱۰۷)

(ترجمہ:۔ اور وہ لوگ جو سعید ہیں پس میں وہ جنت میں ہوں گے اور اس میں ہمیشہ رہیں گے جب تک آسمان اور زمین قائم ہیں اور آپ کے رب کو نکالنا منظور ہوا تو دوسری بات ہے)

کی یہی اولیٰ ہے۔ بعض مفسرین نے **اِلَّا مَا شَآءَ رَبُّکَ** کو خالدین کی طرف راجع کیا ہے۔ اسی طرح

اَمَّا الَّذِيْنَ شَقُوْا فَفِي النَّارِ لَهُمْ فِيْهَا زَفِيْرٌ وَّ شَهِيْقٌ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا مَا دَامَتِ السَّمٰوٰتُ وَالْاَرْضُ اِلَّا مَا شَآءَ رَبُّکَ۔ (هود آیت نمبر ۱۰۶)

(ترجمہ:۔پس وہ لوگ جو شقی ہیں تو وہ دوزخ میں ہوں گے اسمیں ہمیشہ رہیں گے جب تک آسمان اور زمین قائم ہیں ہاں اگر آپ کے رب کو نکالنا منظور ہوا تو اور بات ہے۔)

کو خالدین کی طرف راجع کیا ہے، پھر اس پر اشکال واقع ہوا ہے کہ کیا کسی وقت خلود مشیت الٰہی سے منقطع ہو جائے گا، پھر اس کا جواب دیا گیا ہے، جس میں سب سے اچھا جواب وہ ہے جس کی طرف شاہ عبدالقادر صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے ارشاد فرمایا ہے کہ مَا شَآءَ رَبُّکَ ۔ (جو آپ کا رب چاہے) بڑھانے سے مقصود اس بات کا بتلانا ہے کہ یہ خلود جنت و نار مثل بقاء واجب کے لازم ذات نہیں بلکہ مشیت وقدرت الٰہیہ کے تحت میں داخل ہے، مگر میں کہتا ہوں کہ اس آیت میں لفظ ''ما'' اگر بمعنی ''من'' لیا جائے اور مطلب یہ ہو کہ جو لوگ سعید ہیں وہ سب جنت میں ہمیشہ رہیں گے مگر ان میں سے جن کو خدا تعالیٰ چاہیں وہ مستثنیٰ ہیں تو یہ آیت مسئلہ مشہورہ ''اَلَّذِیْنَ سُعِدُوْا'' اور ''اَلَّذِیْنَ شَقُوْا'' سے مراد وہ لوگ ہیں جو لوگوں کے نزدیک ظاہر میں سعید و شقی ہیں۔ تو اولا ان کے لئے خلود جنت و خلود نار کو بیان فرما کر بعد میں ان لوگوں کو مستثنیٰ کیا گیا جو ظاہر میں سعید تھے مگر مشیت حق میں شقی تھے یا ظاہر میں شقی تھے اور مشیت حق میں سعید تھے پس معنی یہ ہوں گے کہ اہل سعادت میں جو شقی ہو گئے یا اہل شقاوت میں سے جو سعید ہو گئے وہ اس حکم سے مستثنیٰ ہیں اس صورت میں استثنے سے انقطاع خلود کا وہم نہ ہوگا یہ تو درمیان میں ایک علمی نکتہ بیان ہو گیا میں اس سے پہلے یہ کہہ رہا تھا کہ مشائخ جن لوگوں کو مجاز کرتے ہیں اور بعد میں ان میں سے کسی کی نا اہلیت ثابت ہوئی ہے تو یہ امر موجب اعتراض نہیں کیونکہ ممکن ہے اجازت کے وقت وہ اہل ہی ہوں اور بعد میں وہ شقی ہو گئے ہوں اور یہ ''الواصل لایرد (واصل واپس نہیں لوٹتا) باقی الواصل لایرد'' کا قاعدہ واقع کے اعتبار سے بالکل صحیح ہے حدیث سے اس کی تائید ہوتی ہے۔

وکذالک الایمان اذا خالط بشاشۃ القلوب.

(ترجمہ:۔یہی ایمان ہے جب بشاشت قلوب میں پیوستہ ہو جائے)

کہ ایمان کی حلاوت جب قلب میں پیوستہ ہو جاتی ہے تو ارتداد ممکن نہیں اس قول کو حضرات صحابہؓ نے بلا نکیر نقل فرمایا ہے کسی نے ان پر کلام نہیں کیا پس تقریر صحابہؓ سے یہ مسئلہ ثابت ہو گیا دوسرا جواب اس اعتراض کا اور ہے جو لطیف بات ہے اور اس مقام پر اسی کو ذکر کرنا مقصود ہے وہ یہ کہ مشائخ بعض دفعہ کسی نا اہل میں حیاء و شرم کا مادہ دیکھ کر اسے اس امید پر مجاز کر دیتے ہیں کہ جب وہ دوسروں

کی تربیت کرے گا تو اس کی لاج اور شرم سے اپنی بھی اصلاح کرتا رہے گا یہاں تک کہ ایک دن کامل ہو جائے گا پھر بعضے نا اہل شیخ کی اس امید کو غلط کر دیتے ہیں اور اپنی حرکات سے اپنی نا اہلیت ظاہر کر دیتے ہیں مگر ایسے کم نکلتے ہیں غالب حالت یہی ہے کہ جس میں حیاء و شرم کا مادہ ہوتا ہے وہ دوسروں کی تربیت کرتے ہوئے اپنی اصلاح بھی ضرور ہی کرتا ہے اسی لئے علماء سے بطور مشورہ کے میری گذارش ہے کہ جو لوگ فارغین عن الدرسیات باحیاء ہوں ان کو ابھی سے وعظ کہنے کی اجازت دیدی جائے اصلاح کامل کا انتظار نہ کریں۔ کیونکہ وعظ کہہ کر وہ بہت جلد اپنی اصلاح کر لے گا۔

دعویٰ اور دعوت کا فرق:۔

اس میں ایک راز ہے وہ یہ کہ واعظ جس امر پر خود عامل نہیں ہوتا اس کے متعلق اگر وہ وعظ کہنے بیٹھتا ہے تو الفاظ میں شوکت وصولت نہیں ہوتی اندر سے دل بجھنے لگتا ہے چنانچہ ایک مقدمہ یہ ہے ایک بزرگ کے پاس ایک بڑھیا اپنے بچہ کو لے گئی اور کہا حضرت یہ گڑ بہت کھاتا ہے ذرا آپ اس کو نصیحت کر دیجئے انہوں نے کہا کہ کل آنا کل سمجھا دوں گا وہ اگلے دن بچہ کو لے کر آئی اور آپ نے نصیحت کر دی وہ اس سے رک گیا کسی خادم نے کہا حضرت یہ کونسا باریک مسئلہ تھا جس کے لئے آپ نے ایک دن کی مہلت مانگی تھی فرمایا بات یہ ہے کہ کل تک میں خود اس مرض میں مبتلا تھا اس وقت میری نصیحت کا اثر نہ ہوتا کیونکہ زبان ہی نہ اٹھتی اس لئے میں نے ایک دن کی مہلت مانگی تا کہ پہلے اپنی اصلاح کر لوں چنانچہ کل سے میں نے بھی گڑ کھانا چھوڑ دیا اور اس کا عزم کر لیا کہ آئندہ بھی نہ کھاؤں گا تو آج میرے بیان میں اثر تھا الفاظ میں زور تھا سو واقعی غیر کامل کے وعظ میں شوکت و صولت نہیں ہوتی پھر اگر اس میں حیا ہے تو اس کو انقباض کا احساس ہوگا یہ دوسرا مقدمہ ہوا پس وہ جلد اپنی اصلاح کر لے گا اس لئے باحیاء کو وعظ سے نہ روکنا چاہیے اس سے پیش نظر طبعاً ہر وقت

لِمَ تَقُوْلُوْنَ مَا لَا تَفْعَلُوْنَ۔ (تم وہ بات کیوں کہتے ہو جس پر خود عمل نہیں کرتے)

اَتَاْمُرُوْنَ النَّاسَ بِالْبِرِّ وَتَنْسَوْنَ اَنْفُسَكُمْ۔

(کیا تم لوگوں کو نیکی کا حکم دیتے ہو اور اپنے آپ کو بھلاتے ہو۔)

کا مضمون ہوگا مگر ان دونوں آیتوں میں ایک بات قابل فہم علماء ہے وہ یہ کہ اکثر لوگ ان آیات سے غیر عامل کے وعظ کا عدم جواز سمجھتے ہیں یہ صحیح نہیں ہاں اتنی بات تو صحیح ہے کہ: اَتَاْمُرُوْنَ

النَّاسَ بِالْبِرِّ وَتَنْسَوْنَ اَنْفُسَكُمْ۔

(کیا تم لوگوں کو نیکی کا حکم دیتے ہو اور اپنے آپ کو بھلاتے ہو۔)

یہ آیت واعظ غیر عامل کے بارہ میں ہے لیکن اس میں انکار صرف جزو اخیر پر ہے یعنی نسیان نفس پر ہر چیز پر انکار نہیں پس آیت میں واعظ کے غیر کامل ہونے پر انکار ہے۔ غیر عامل کے واعظ ہونے پر انکار نہیں جس کا حاصل یہ ہے کہ واعظ کو مبتلائے معصیت ہونا حرام ہے اور مبتلائے معصیت کو وعظ کہنا حرام نہیں۔ "خوب سمجھ لو" اور دوسری آیت کو تو وعظ پر حمل کرنا ہی صحیح نہیں کیونکہ "لم تقولون" سے قول انشائی مراد نہیں بلکہ قول خبری مراد ہے یعنی دعویٰ مراد ہے دعوت مراد نہیں کیونکہ جس معاملہ کے متعلق اس کا نزول ہوتا ہے اس میں لمبے چوڑے دعوے ہوئے تھے کہ اگر ہم کو احب الاعمال کا علم ہو جائے تو ایسا ایسا مجاہدہ کریں جب ایک واقعہ میں ترغیب ہوئی اس پر یہ آیتیں نازل ہوئیں کہ ایسے دعوے کس لئے کرتے ہو جن کو پورا نہیں کر سکتے تو یہاں دراصل دعویٰ سے احکام اسلامیہ پر عمل کرنے کا حکم کیا جاتا ہے اور نواہی سے منع کیا جاتا ہے جس کا حاصل دعوت ہے یعنی امر بالمعروف ونہی عن المنکر، اس لئے وعظ گوئی اس آیت میں داخل نہیں مگر چونکہ کبھی کلام انشائی بھی متضمن خبر ہو جاتا ہے جیسے منافقین کا۔نشهد انک لرسول اللہ۔ کہنا واقع میں تو انشاء ہے کہ ہم آپ کی رسالت کی تصدیق کرتے ہیں مگر ضمناً اس میں یہ دعویٰ بھی ہے کہ ہم سچے اور مخلص مسلمان ہیں منافق نہیں ہیں اسی لئے حق تعالیٰ نے آگے فرمایا: وَاللّٰهُ یَشْهَدُ اِنَّ الْمُنٰفِقِیْنَ لَكٰذِبُوْنَ ۔ (اور اللہ تعالیٰ خود گواہی دیتے ہیں کہ بے شک منافق جھوٹے ہیں۔)

جس میں ان کو اس کلام میں کاذب فرمایا گیا اور یہ مسئلہ مسلمہ ہے کہ کلام انشائی کے قائل کو صادق کاذب کہہ نہیں سکتے تو یہاں ان کو کاذب کیسے کہا گیا اس کا جواب یہ ہے کہ کلام انشائی ایک کلام خبری کو متضمن ہے اس متضمن کے اعتبار سے ان کو کاذب کہا گیا ہے اسی طرح ہر چند کہ وعظ کلام انشائی ہے یعنی امر بالمعروف ونہی عن المنکر لیکن صورۃ اس میں ایک قسم کا دعویٰ بھی ہے کہ ہم خود بھی اس پر عامل ہیں اس دعویٰ ضمنی کے اعتبار سے باحیاء آدمی کو وعظ کہتے ہوئے طبعاً۔

لِمَ تَقُوْلُوْنَ مَا لَا تَفْعَلُوْنَ۔ (تم وہ بات کیوں کہتے ہو جو خود نہیں کرتے)

پیش نظر رہے گا گو اصل میں یہ آیت وعظ کے متعلق نہیں مگر وہ تضمن خبر کی وجہ سے اپنے کو اس کا مصداق سمجھ کر شرماتا ہے اور جلد اصلاح کر لیتا ہے اس لئے بعض لوگوں کا طرز عمل دیکھا گیا ہے جس کام کی ان کو ہمت نہیں ہوتی اس کے بارہ میں ایک دو دفعہ کہہ دیئے۔ جس سے شرما کر بہت جلد ہی خود ہی عامل ہو گئے۔

مشیت ایزدی:۔

دوسری بات اس میں اور بھی ہے جو ابھی ذہن میں آئی ہے کہ وعظ سے ہمت عمل ہو جانے کا سبب ایک تو حیاء طبعی ہے۔ جیسا کہ مذکور ہوا۔ دوسرا سبب یہ بھی ہے کہ وعظ کے ذریعہ سے جب اس نے اہل اسلام کی خدمت کی، ان کو احکام کی تبلیغ کی۔ جس میں اہل اللہ بھی ہوتے ہیں۔ تو یہ اہل اللہ اس سے خوش ہو کر دعاء دیتے ہیں۔ اس کی برکت سے حق تعالیٰ اس کی بھی اصلاح کر دیتے ہیں۔ کیونکہ ہر مجلس وعظ میں کوئی نہ کوئی ایسا ہوتا ہے جو اللہ کے نزدیک مقبول ہوتا ہے واعظ اس گھمنڈ میں نہ رہے کہ علوم و معارف جو میں بیان کرتا ہوں یہ میرا کمال ہے۔ صاحبو! نہ معلوم یہ کس اللہ کے بندہ کی برکت سے بیان ہوتے ہیں۔

ایک بزرگ کا واقعہ ہے کہ وہ کسی عالم کے وعظ میں بیٹھے ہوئے تھے۔ اور واعظ کی طرف متوجہ تھے۔ ان کی توجہ کی برکت سے وہ عجیب عجیب علوم بیان کرتے رہے۔ درمیان وعظ میں عالم صاحب کو عجب پیدا ہوا۔ اور وہ اپنے علوم پر دل ہی دل میں فخر کرنے لگے تو بزرگ نے اپنی توجہ دوسری طرف متوجہ کر دی۔ بس ان کی توجہ کا بند ہونا تھا کہ عالم صاحب کو مضامین کی آمد بند ہو گئی۔ اس سے معلوم ہوا کہ یہ علوم کسی دوسرے کی توجہ سے آرہے تھے۔ ہمارے حاجی صاحب کا ارشاد ہے کہ بعض سامعین مثل طفل کے ہوتے ہیں۔ جس طرح بچہ کی کوشش سے ماں کے پستان میں دودھ اترتا ہے اور اگر وہ دودھ پینا چھوڑ دے تو چند روز میں چھاتیاں اکڑ جاتی ہیں اور دودھ کی آمد بند ہو جاتی ہے، اسی طرح بعض سامعین کی طلب و کشش سے واعظ کے قلب میں علوم القا ہوتے ہیں۔ اگر یہ طلب نہ ہو تو شیخ صاحب کورے کے کورے رہ جائیں۔ مولانا فرماتے ہیں۔

تا نہ گرید طفل کے جوشد لبن ۔۔۔ تا نہ گرید ابر کے خندد چمن

(ترجمہ:۔ جب تک بچہ نہ روئے ماں کے دودھ کو کیسے جوش آئے جب تک بادل نہ روئے باغ کیسے مسکرائے یعنی سرسبز و شاداب ہو۔)

خود میرا واقعہ ہے کہ ایک بار میں گڑھی خام میں گیا جو ہمارے قصبہ سے قریب ایک بستی ہے۔ وہاں لوگوں نے وعظ کی درخواست کی، میں نے وعظ کا وعدہ کیا، اور اسوقت قلب میں یہ وسوسہ ہوا کہ بحمد اللہ! مجھے وعظ پر قدرت حاصل ہے۔ اس کے بعد جو وعظ کہنے بیٹھے تو خطبہ اور آیت پڑھ کر رہ گیا۔

مضمون ہی کچھ نہ آیا، ہر چند زور لگایا مگر چل ہی نہ سکا۔ پھر خیال ہوا کہ میں نے اتنے وعظ کہے ہیں لاؤ ان ہی میں سے کسی کا اعادہ کر دوں۔ مگر پہلے مواعظ کا مضمون بھی کچھ یاد نہ آیا۔ اس وقت مجھے معلوم ہوا کہ یہ میرے اس وسوسہ کا جواب ہے جو حق تعالیٰ نے دکھلایا، کہ تم خود بھی نہیں بیان کر سکتے بلکہ ہم ہی کہلوانا چاہتے ہیں تو سب کچھ کہہ سکتے ہو، سچ ہے

در پس آئینہ طوطی صفتم داشتہ اند آنچہ استاد از گفت ہماں می گویم

(ترجمہ:۔ پس پردہ مجھے طوطے کی طرح بٹھا دیا ہے مجھے جو استاذ ازل سے حکم ملا تھا وہی میں کہہ رہا ہوں)

اور اس روز اس آیت کی تفسیر منکشف ہوئی

ولئن شئنا لنذھبن بالذی اوحینا الیک ثم لا تجدلک بہ علینا وکیلاً.

حق تعالیٰ حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے فرماتے ہیں:

اگر ہم چاہیں تو جتنی وحی آپ کی طرف بھیجی ہے سب کو سلب کر لیں، پھر آپ ہمارے مقابلہ میں کسی کو اپنا کارساز و مددگار نہ پائیں گے۔"

اور اسی سے معلوم ہوتا ہے کہ قرآن کلام الٰہی ہے۔ کیونکہ اتنی شوکت وصولت سوائے کلام الٰہی کے کسی کلام میں نہیں ہو سکتی کہ ایسی معظم ہستی کو کس طرح بے دھڑک خطاب ہے۔ اب سوچئے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے دل پر اس کو سن کر کیا کچھ گزری ہوگی۔ کیونکہ وہاں شرطیات کا وہ اثر نہ تھا جو ہم پر ہے، ہم تو قضایا شرطیہ کو یہ کہہ کر ٹال دیتے ہیں کہ صدق شرطیہ کے لئے وقوع مقدم ضروری نہیں۔ مگر حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام پر عظمت حق منکشف تھی۔ آپ جانتے تھے کہ حق تعالیٰ کے چاہنے ہی میں کیا دیر لگ سکتی ہے، کچھ بھی نہیں۔ اس لئے آپ تو نہ معلوم یہ سن کر کیا کچھ نہ سہم گئے ہوں گے۔ مگر آگے فوراً تسلی دی گئی کہ ہم کو اس پر قدرت ہے مگر اس کا وقوع نہ ہوگا۔ اِلَّا رَحْمَةً مِّنْ رَّبِّکَ اِنَّ فَضْلَهٗ کَانَ عَلَیْکَ کَبِیْرًا۔

کیونکہ آپ پر خدا کا فضل بہت بڑا ہے۔ ایک جگہ اسی طرح اپنی عظمت وقدرت ظاہر کرنے کیلئے فرماتے ہیں فَاِنْ یَّشَاِ اللّٰهُ یَخْتِمْ عَلٰی قَلْبِکَ ۔ (اگر اللہ تعالیٰ چاہیں آپکے دل پر مہر لگا دیں)

اللہ اللہ کتنا سخت کلمہ ہے، مگر آج کل لوگ اس فکر میں ہیں کہ نعوذ باللہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو خدا بنا دیں، میں کہتا ہوں کہ تم حضور کی تنقیص کرتے ہو، کیونکہ ہم آپ کو عبداللہ کہتے ہیں اور عبد بھی کیا عبد کامل۔ صاحبو! نہ معلوم فَاِنْ یَّشَاِ اللّٰهُ یَخْتِمْ عَلٰی قَلْبِکَ۔

سن کر حضورؐ کے دل پر کیا گزری ہوگی۔ اسکو اہل نسبت خوب سمجھ سکتے ہیں۔ کیونکہ ان پر یہ حالت خوب گزرتی ہے۔ ان کورات دن ایسے چرکے لگتے رہتے ہیں جن سے انکی اصلاح و تنبیہ مقصود ہوتی ہے۔ پھر جوان پر گزرتی ہے اس کو وہی جانتے ہیں۔

بر دل سالک ہزاراں غم بود گر زباغ دل خلالے کم بود

دل میں بھی ایک باغ ہے جس کے سامنے دنیا کے باغات کی کچھ بھی ہستی نہیں۔

مستم است اگر ہوست کشد کہ بہ سیر سمن درآ تو زغنچہ کم نہ دمیدہ دردل کشا بہ چمن درآ

جس کو اس باغ کی خبر لگ گئی اسے اور کسی تماشے کی ضرورت نہیں وہ اسی کی سیر میں ہر دم مست رہتا ہے۔

خلوت گزیدہ بہ تماشا چہ حاجت است چوں کوئے دوست ہست بصرا چہ حاجت است

(ترجمہ:۔ خلوت نشین کو تماشائی کی کیا حاجت ہے جب محبوب کے دربار میں ہیں تو جنگل کی کیا ضرورت ہے۔)

پھر اگر کبھی اس باغ میں خزاں کا اثر آنے لگے اور وہ پژمردہ ہونے لگے مثلاً وساوس وخطرات کا ہجوم ہو جائے تو سالک سے زیادہ پریشان بھی کوئی نہیں ہوتا۔ اس وقت بعضوں نے تو خودکشی کرلی ہے مگر یہ ان کے محقق نہ ہونے کی دلیل ہے۔ محقق ان باتوں سے زیادہ پریشان نہیں ہوتا، گو طبعی پریشانی ہوتی ہے مگر عقلی پریشان نہیں ہوتی۔ محقق وساوس سے بھی اپنا کام نکال لیتا ہے اور ان کو بھی مطالعہ جمال محبوب کا مراۃ بنالیتا ہے حضرت حاجی صاحب کا ارشاد ہے کہ وساوس کو آئینہ مطالعہ حق اس طرح بنالینا چاہئے کہ یہ سوچیں کہ اللہ اکبر خدا تعالیٰ کی کیا قدرت ہے کہ میرے دل میں خیالات کا ایک دریا پیدا کردیا دفعتاً چار طرف سے آکر مجھے محیط ہوگئے۔ اس کے بعد شیطان کی تدبیر کمزور ہو جائے گی، کیونکہ جب وہ دیکھے گا کہ یہ شخص تو وساوس سے پریشان نہیں ہوتا، بلکہ اس سے بھی قدرت حق کا مطالعہ کرتا ہے، تو وہ اپنا سامنہ لے کر رہ جائے گا۔ اور وساوس کا ڈالنا بند کردے گا۔ یہ ہیں وہ حضرات جو فقیہ واحداشد علی الشیطان من الف عابد (ایک فقیہ شیطان پر ہزار عابد سے بڑھ کر ہے) کا مصداق ہیں۔ اوران کی تعلیم پر عمل کر کے معلوم ہوتا ہے کہ شیطان کی یہ چالیں نہایت بودی ہیں اِنَّ کَیْدَ الشَّیْطٰنِ کَانَ ضَعِیْفًا ۔ (بے شک شیطان کا مکر کمزور ہے)

اس تصرف حق کے مشاہدہ کے بعد مولانا کے اس قول کی حقیقت معلوم ہو جائے گی۔

گر بعلم آئیم ما ایوان اوست
در بجہل آئیم ما زندان اوست

گر بخواب آئیم مستان اوئیم
ور بہ بیداری بستان اوئیم

(ترجمہ:۔اگر علم تک ہماری رسائی ہو جائے تو یہ ان کا ایوان ہے کہ تصرف حق سے علم کا درجہ حاصل ہوا اور جہل میں بتلا ہیں تو ان کا زندان ہے کہ حق تعالیٰ کا تصرف ہے کہ جہل سے نہیں نکل سکتے اگر سورہیں تو انہیں کے بے ہوش کیے ہوئے ہیں اگر جاگ اٹھیں تو انہیں کی گفتگو میں ہیں)

اور اگر کبھی ایسی حالت پیش آتی ہے کہ نہ وساوس کا ہجوم ہے نہ واردات کا ورود ہے بس ایک حیرت سی قلب پہ طاری ہوتی ہے۔ سالک پریشان ہوتا ہے کہ یہ حالت کیسی ہے۔ مولانا اس کی حقیقت کو بتلاتے ہیں کہ اس سے بھی نہ گھبراؤ۔

در تردد ہر کہ او آشفتہ است
حق بگوش او معما گفتہ است

(ترجمہ:۔جو شخص کسی تردد میں پریشان ہورہا ہے گویا حق تعالیٰ نے اسکےکان میں کوئی معمہ کہدیا ہے)

بگوش او کا لفظ عجیب ہے کہ تمہارے کان میں حق تعالیٰ نے چپکے سے ایک معما کہدیا ہے اس کے نہ سمجھنے سے یہ حیرت ہے۔ پھر بعضے اس حالت میں روتے ہیں اور بعضے ہنستے ہیں اسی کو کہتے ہیں۔

بگوش گل گفتہ چہ سخن کہ خنداں است
بعند لیب چہ فرمودہ کہ نالان است

(ترجمہ:۔پھول کے کان میں کیا فرمادیا کہ خنداں ہے بلبل سے کیا ارشاد فرمایا کہ نالاں ہے)

ڈاروِن کا نظریہ:۔

قرآن میں بھی حق تعالیٰ فرماتے ہیں وَاَنَّهٗ هُوَ اَضْحَكَ وَاَبْكٰى.

(بے شک وہی ہنساتا اور رلاتا ہے)

اس کی حقیقت سالکین ہی خوب سمجھتے ہیں کہ واقعی رلانا اور ہنسانا حق تعالیٰ ہی کا کام ہے، کبھی وہ روتوں کو ہنسا دیتے ہیں کبھی ہنستوں کو رلا دیتے ہیں اہل ظاہر تو بس اتنا چاہتے ہیں کہ "اضحک" "باب افعال سے ہے۔ اور ابکی "اصل میں ابکی" تھا۔ یا کو الف کرلیا گیا۔ اس پر مجھے ایک عرب کا مقولہ یاد آیا کہ اس کے سامنے کوئی صرفی کہہ رہا تھا کہ قال اصل میں قول تھا۔ واؤ کو فتح ماقبل کی وجہ سے الف کیا گیا۔ اس پر وہ عرب بولا۔ کس بادشاہ کے زمانے میں یہ قول تھا۔ ہم نے ہمیشہ قال ہی سنا ہے۔ قول کبھی نہیں سنا۔ اس کے نزدیک صرفیں کا یہ کہنا کہ قال اصل میں قول تھا

بالکل ایسا ہی تھا جیسا کہ ڈارون کا یہ کہنا کہ انسان پہلے بندر تھا پھر ترقی کر کے آدمی ہو گیا۔ مگر غضب ہے، کہ آجکل تو تعلیم یافتہ طبقہ خدا کی باتوں پر یقین نہیں کرتا اور بار بار نظیر کا مطالبہ کیا جاتا ہے کہ اس کی نظیر دکھلاؤ بدوں مشاہدہ کے ہم نہ مانیں گے اور ڈارون کے قول کو بدوں دیکھے ان لوگوں نے مان لیا۔ حالانکہ اس کا مشاہدہ یہ لوگ تو خاک کرتے خود ڈارون نے بھی نہیں کیا۔ اس نے بھی محض تخمین و گمان ہی سے یہ بات ہانک دی اور اس تخمین کی بالکل وہی مثال ہے، جیسے تین شخص ایک منارہ پر گزرے جو بہت بلند تھا، تینوں کو حیرت ہوئی کہ اتنا اونچا منارہ کس طرح بنایا ہوگا۔ ایک بولا کہ پہلے زمانہ کے آدمی بہت لمبے ہوتے ہوں گے۔ دوسرا بولا نہیں اس کو زمین پر رکھ کر بنایا گیا ہوگا۔ پھر سیدھا کر دیا گیا۔ تیسرا بولا نہیں یہ پہلے کنواں تھا پھر زمین کا تختہ ٹوٹ کر منارہ ہو گیا۔

چوں ندیدند حقیقت رہ افسانہ زدند

(ترجمہ:۔ جب حقیقت نہ دیکھی تو افسانہ کی راہ اختیار کی۔)

اسی طرح ڈارون کی یہ تخمین ہے مگر ہمارے بھائی ہیں کہ اس کو وحی سمجھے ہوئے ہیں۔ یہاں تک کہ ایک صاحب نے یہ بھی لکھ مارا کہ نعوذ باللہ آدم علیہ السلام سب سے پہلے آدمی ہیں جو بندر سے انسان ہوئے، گویا اپنے نزدیک اس نے تعلیم الاسلام کو ڈارون کے قول پر منطبق کرنا چاہا۔ مگر افسوس اس میں نبی کی شان میں تو جو گستاخی ہے وہ تو ہے ہی، اس کے علاوہ خود یہ ڈارون کے قول کے بھی خلاف ہے، اصولاً بھی فروعاً بھی...... اصولاً تو اس طرح کہ ڈارون کو تو اس قول کی طرف اس امر نے مجبور کیا کہ وہ خدا تعالیٰ کو خالق نہیں مانتا۔ بلکہ طبیعت کو فاعل مانتا ہے اور طبیعت غیر ذی شعوری ہے اس کی تاثیر تدریجی ہے۔ اس لئے اس کو طبعی قاعدہ سے یہ کہنا پڑے گا تمام عالم اصل میں جماد محض تھا۔ پھر مادہ جماد نے ترقی کی تو وہ نبات ہو گیا، پھر مادہ نبات نے ترقی کی وہ حیوان ہو گیا۔ اور اسی طرح حیوان ترقی کر کے انسان بن گیا۔ مگر وہ شخص مسلمان ہے جو خدا تعالیٰ کو خالق مانتا ہے اسے اس تدریج کے قائل ہونے کی کیا ضرورت ہے۔ وہ تو بے تکلف کہہ سکتا ہے کہ حق تعالیٰ نے جب چاہا جس چیز سے چاہا انسان بنا دیا اور جس چیز سے چاہے حیوان بنا دے۔ حاصل یہ کہ جو اصل ڈارون کے لئے اس قول کی داعی ہوئی یعنی انکار صانع۔ تم اس اصل ہی میں اس کے مخالف ہو۔ پھر تمہارا یہ کہنا کہ سب سے پہلے بندر جو انسان بنا وہ نعوذ باللہ آدم علیہ السلام ہیں۔ شرعاً تو غلط ہے ہی۔ کیونکہ قرآن میں خلقت آدم کا واقعہ مفصل مذکور ہے۔ حدیث نبویؐ میں اس کی تشریح موجود ہے۔ یہ بیہودہ گمان اس کے بالکل خلاف ہے مگر خیر سے یہ

قول ڈارون کے بھی خلاف ہے اور فروعاً اس طرح کہ اس کا قول تو یہ ہے کہ جب بندر کی نوع کے رفتہ رفتہ ترقی کرتے کرتے ایک زمانہ میں اس نوع کے بہت سے افراد دفعۃً انسان بن گئے، وہ صرف کسی ایک بندر کو تمام انسانوں کا باپ نہیں کہتا جیسا کہ تم کہتے ہو۔

امثال عبرت:۔

بہر حال میں یہ کہہ رہا تھا کہ اہل ظاہر قرآن کا بوجہ اہل حال نہ ہونے کے مشاہدہ نہیں کر سکتے، یہ تو صرف الفاظ کی خدمت کرتے ہیں، قرآن کا مشاہدہ صحیح طور پر عارفین ہی کرتے ہیں جو اس کے حقائق سے واقف ہیں اور یہ علوم ہی ان کی اصلی کرامات ہیں جن سے وہ شیطان کی چالوں کو اس طرح توڑ دیتے ہیں کہ تار عنکبوت سے زیادہ اسکی وقعت باقی نہیں رہتی۔ شیخ کامل کی کرامات اور لوگ تو دوسری باتوں میں دیکھتے ہیں اور طالب صادق خود اپنے اندر اس کی زندہ کرامات ہر وقت دیکھتا ہے۔ جب کہ وہ روز بروز اپنے کو ظلمت سے نور کی طرف چلتا ہوا دیکھتا ہے، اسی طرح عارفین ہستی حق کی دلیل خود اپنی ذات میں دیکھتے ہیں، کیونکہ ان کا حال یہ ہے۔

کشتگان خنجر تسلیم را ہر زماں از غیب جانے دیگر است

(ترجمہ: تسلیم ورضا کے خنجر لگے ہوؤں کو ہر آن غیب سے نئی زندگی ملتی ہے)

وہ کبھی بسط میں ہیں اور کبھی قبض میں، کبھی تجلی جمال کا غلبہ ہے، کبھی تجلی جلال کا یہی لوگ سمجھ سکتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے دل پر فَاِنْ یَّشَاِ اللّٰهُ یَخْتِمْ عَلٰی قَلْبِکَ کا کیا اثر ہوگا، کیونکہ یہ حالات ان کے اوپر خود بھی گزرتے رہتے ہیں۔ اتنا فرق ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے تو یہ خطابات حق تعالیٰ اپنی عظمت و ربوبیت ظاہر کرنے کے لئے فرماتے ہیں اور اولیاء سے یہ معاملات ان کی اصلاح کے لئے کیے جاتے ہیں۔ نیز حضورؐ کے ساتھ تو یہ شرطیات قضایا شرطیہ ہی کے درجہ میں رہتے ہیں جن کے مقدم کا کبھی وقوع نہیں ہوتا اور دوسروں کے ساتھ کبھی ان شرطیات کے مقدم کا وقوع بھی ہو جاتا ہے۔ حضرت جنیدؒ کا واقعہ ہے کہ ایک بار وہ کہیں جارہے تھے ایک مرید ساتھ تھا۔ راستہ میں ایک نصرانی لڑکا نظر پڑا، جو نہایت حسین تھا۔ تو مرید نے اس کو دیکھ کر حضرت سے سوال کیا۔ ایدخل اللّٰہ ھذہ الصورۃ فی النار۔

کیا خدا تعالیٰ ایسی ایسی صورتوں کو بھی جہنم میں ڈالیں گے۔ حضرت جنیدؒ نے فرمایا کہ تو نے

اس کو گھورا ہے۔ ستری غب ذالک

چنانچہ کچھ دنوں بعد قرآن بھول گئے۔ کچھ بھی یاد نہ رہا۔ اللہ اللہ! اس بیچارہ کا اس وقت کیا حال ہوا ہوگا۔ خدا تعالیٰ کی رحمت سے امید ہے کہ اس نے جب اس گناہ سے توبہ کی ہوگی تو قرآن پھر عود کر آیا ہوگا۔ اس امت کے ساتھ حضور کی برکت سے بہت سی رحمت کاملہ ہے۔

طوبیٰ لنا معشر الاسلام ان لنا   من العنایة رکنا غیر منهدم

(ترجمہ:۔ اے اسلام کے ماننے والو ہمارے لئے کس قدر عظیم خوشخبری ہے کہ ہم حق سبحانہ وتعالیٰ کی عنایت کے ستون ہیں جبکہ دوسروں کو یہ سعادت حاصل نہیں۔)

بنی اسرائیل کا قصہ ہے کہ ان میں کسی ظالم نے ایک غریب کی مچھلی چھین لی تھی، غریب نے بددعا کی کہ اے اللہ! اس کو ظلم کا بدلہ ابھی دکھادے تو مچھلی نے فوراً اس ظالم کا ہاتھ منہ میں پکڑ لیا۔ حالانکہ مچھلی مردہ تھی، مگر خدا تعالیٰ کے سامنے ہر چیز زندہ ہے۔

آب و باد خاک و آتش بندہ اند   با من و تو مردہ باحق زندہ اند

(ترجمہ:۔ پانی، ہوا، مٹی اور آگ سب تیرے غلام ہیں میرے اور تیرے نزدیک مردہ ہیں مگر حق سبحانہ وتعالیٰ کے نزدیک زندہ ہیں۔)

اس حیات جمادات پر مولانا کے کلام میں ایک ظالم یہودی بادشاہ کی حکایت یاد آ گئی کہ اس نے مسلمانوں کو مرتد کرنا چاہا تھا اور آگ سے خندقیں بھر کر ایک بت وہاں رکھا تھا، مسلمانوں کو کہتا تھا کہ اس بت کو سجدہ کرو ورنہ آگ میں ڈال دیئے جاؤ گے، مسلمان سجدہ سے انکار کرتے اور آگ میں ڈال دیئے جاتے تھے۔ اسی اثناء میں ایک عورت مسلمان لائی گئی اس سے بھی سجدہ بت کو کہا گیا، اس نے انکار کیا تو ظالموں نے اس کے بچہ کو گود سے لیکر آگ میں ڈال دیا۔ اس وقت گھبراہٹ اور بچہ کی محبت میں ماں کی لغزش ہونے کو تھی کہ دفعتہً بچہ آگ سے چلایا، کہ اے ماں! تو بھی آ جا کہ یہ آگ نہیں یہ گلزار ہے، یہ سن کر ماں خود بخود آگ میں کود پڑی اور اس نے مسلمانوں کو آواز دی کہ ڈرو نہیں اس آگ کا اندیشہ نہ کرو یہاں تو عجیب راحت ہے۔ اب کیا تھا مسلمان جوق در جوق آگ میں کودنے لگے، اب یہ حال ہوا کہ کفار ان کو روکتے تھے اور مسلمان زور کر کے آگ میں گرنا چاہتے تھے، یہ دیکھ کر یہودی بادشاہ نے آگ سے کہا۔ اے آگ تجھے کیا ہوا تو ان کو جلاتی کیوں نہیں تو اس نے جواب دیا

گفت آتش من ہمانم آتشم   اندر آتا تو بہ بینی تابشم

آگ نے کہا میں تو وہی آگ ہوں جس کی خاصیت احراق ہے۔ اگر تجھے شبہ ہو تو ذرا تو میرے پاس آ اس وقت تجھے میری تابش معلوم ہوگی۔ باقی مسلمانوں کو جو میں نہیں جلاتی تو اس کی وجہ یہ ہے کہ

طبع من دیگر نہ گشت نہ عنصرم　　　تیغ حقم ہم بد ستوری برم

کہ میری خاصیت اور طبیعت بدلی نہیں بلکہ میں حکم خداوندی کے تابع ہوں بدوں ان کے حکم کے میں کچھ نہیں کرسکتی۔ اس پر مولانا فرماتے ہیں۔

آب و باد و خاک و آتش بندہ اند　　　با من وتو مردہ باحق زندہ اند

((ترجمہ:۔ پانی، ہوا، مٹی اور آگ سب تیرے غلام ہیں میرے اور تیرے نزدیک مردہ ہیں مگر حق سبحانہ وتعالیٰ کے نزدیک زندہ ہیں۔))

چنانچہ اس مردہ مچھلی نے ظالم کا ہاتھ منہ میں لے لیا، جو بڑی وقت سے کئی آدمیوں نے چھڑایا مگر اس گرفت کا زہر ایسا چڑھا کہ تمام اطباء علاج سے عاجز آ گئے اور سب کی رائے یہ ہوئی کہ ہاتھ کاٹ ڈالا جائے ورنہ تمام بدن میں زہر پھیل جائے گا، چنانچہ ہاتھ کاٹ ڈالا گیا۔ اس وقت اس کو اپنے ظلم پر ندامت ہوئی اور سمجھا کہ یہ میرے ظلم کا نتیجہ تھا تو معافی چاہنے کے لئے اس غریب کے پاس گیا۔ اس طرح امید ہے کہ توبہ کے بعد حضرت جنید کے مرید کو بھی قرآن یاد ہو گیا ہوگا۔ اس قصہ کو سن کر کوئی حافظ صاحب خوش نہ ہوں کہ ہم رات دن شرارتیں کرتے رہتے ہیں اور کبھی قرآن نہیں بھولتے، کیونکہ وہ شخص سالک تھا، حق تعالیٰ نے اس کو جلدی سزا دے کر متنبہ فرما دیا تھا کہ غلطی کی اصلاح کرلے۔ اور دوسروں کے واسطے یہ قاعدہ ہے۔

وَاُمْلِیْ لَهُمْ. اِنَّ کَیْدِیْ مَتِیْنٌ.

حق تعالیٰ ڈھیل دیتے رہتے ہیں تا کہ دفعتہً پکڑلیں کسی کو اپنے حفظ یا علم پر ناز نہ کرنا چاہئے حق تعالیٰ اگر چاہیں تو ایک سیکنڈ میں سب چھین لیں پھر کورے کے کورے رہ جاؤ چنانچہ ان عالم صاحب کو وعظ میں عجب وناز پیدا ہوا تھا ان بزرگ نے فوراً اپنی توجہ ہٹالی ان کا توجہ ہٹانا تھا کہ سب علوم بند ہو گئے تو بعض دفعہ وعظ میں کوئی بزرگ ہوتے ہیں وعظ سن کر ان کا جی خوش ہوتا ہے حق تعالیٰ ان کی خوشی کی برکت سے واعظ کو بھی نواز لیتے ہیں اسی خیال سے بعض دفعہ غیر کامل کو مشائخ اجازت دے دیتے ہیں کہ شاید کسی طالب مخلص کی برکت سے اس کی بھی اصلاح ہو جائے کیونکہ بعض اوقات ایسا ہوتا ہے کہ کوئی پیر نا اہل ہے اور اس کا مرید کوئی مخلص ہے تو طالب صادق کو تو حق تعالیٰ اس کے صدق

وخلوص کی برکت سے نواز ہی لیں گے جب وہ کامل ہو جائے گا تو پھر حق تعالیٰ پیر کو بھی کامل کر دیں گے کیونکہ یہ اس کی تکمیل کا ذریعہ بنا تھا۔

ایک چور کی حکایت ہے کہ جوانی میں تو وہ مال کی چوری کیا کرتا تھا بڑھاپے میں جب اس کام کا نہ رہا اور اس نے دین کی رہزنی اختیار کی پیر بنکر لوگوں کو موںڈنے لگا اتفاق سے کوئی مخلص بھی اس کے پاس آ پھنسا اس نے ذکر وشغل پوچھا یہ بیچارہ کیا بتاوے اس نے اپنا پیچھا چھڑانے کے لئے یہ خدمت اس کو بتلائی کہ ایک درخت آم کا خشک تھا اس کو کہا اس کو پانی دیتے رہو جب ہرا ہو پھلنے لگے پھر آ گے اور کچھ بتاویں گے یوں سمجھا کہ اس کی نوبت ہی نہ آوے گی پیچھا چھوٹ جاوے گا اس نے پانی دینا شروع کیا یہاں تک کہ اس کو آم لگا جب وہ پختہ ہوا پیر کے پاس لایا اس کو تراش کر چور نے آدھا خود کھایا آدھا اس کو دیا پیٹ میں پہنچنا تھا دونوں صاحب نسبت ہو گئے یہاں سے ایک اور بات بھی ثابت ہو گئی کہ کبھی پیر کو بھی مرید سے نفع ہو جاتا ہے اسی لئے حضرت حاجی صاحب رحمۃ اللہ علیہ فرماتے تھے کہ ہم تو بیعت اس نیت سے کرتے ہیں کہ حشر میں یا ہم اس کو جنت کی طرف کھینچ لیں گے یا یہ ہم کو کھینچ لے گا خوب کہا ہے

بخت اگر مدد کند دامنش آورم بکف　　گر بکشم زہے طرب ور بکشد زہے شرف

(ترجمہ:۔ اگر قسمت میری یاوری کرے تو میں اس کا دامن پکڑ لوں اگر وہ مجھے کھینچ لے تو زہے نصیب اور اگر میں اسے کھینچ لوں تو زہے نصیب)

یعنی چاہے وہ کھینچ لے یا ہم کھینچ لیں مدعا ہر صورت میں حاصل ہے غرض یہ نکتہ ہے غیر کامل کی اجازت میں کہ وہ باحیا ہو گا تو اس سے شرما کر جلد اپنی اصلاح کر لے گا۔

انبیاء کا طریق تعلیم:۔

اس مقدمہ کے بعد واضح ہو گیا ہوگا کہ تعلیم بہ نسبت تعلم کے کونوا ربانیین (اللہ والے بن جاؤ) کو زیادہ مقتضی ہے اس لئے تُعَلِّمُوْنَ کو تَدْرُسُوْنَ پر مقدم کیا گیا نیز یہ بھی نقطہ ہو سکتا ہے کہ تعلم سے مقصود تعلیم ہے جیسا کہ حق تعالیٰ فرماتے ہیں۔

فَلَوْلَا نَفَرَ مِنْ كُلِّ فِرْقَةٍ مِّنْهُمْ طَآئِفَةٌ لِّيَتَفَقَّهُوْا فِي الدِّيْنِ وَلِيُنْذِرُوْا قَوْمَهُمْ اِذَا رَجَعُوْٓا اِلَيْهِمْ لَعَلَّهُمْ يَحْذَرُوْنَ. (التوبہ آیت نمبر ۱۲۲)

ترجمہ:۔ پس ایسا کیوں نہ کیا جائے کہ انکی ہر بڑی بڑی جماعت میں سے ایک چھوٹی چھوٹی

جماعت جہاد میں جایا کرے تا کہ باقی لوگ دین کی سمجھ بوجھ حاصل کرتے رہیں تا کہ یہ لوگ اپنی قوم کو جب اس کے پاس واپس آئیں ڈرائیں۔

اور مقصود گو حساً مؤخر مگر قصداً مقدم ہوتا ہے اس لئے تعلمون کو مقدم فرمایا کہ وہ غایت ہے تدرسون کی اس سے علماء بہت خوش ہوئے ہوں گے کہ اس غایت پر تو ہمارا پورا عمل ہے کہ پڑھنے کے بعد ہم پڑھانے میں مشغول ہیں حضرات آپ خوش نہ ہوں کیونکہ حق تعالیٰ نے یہاں:

بِمَا كُنْتُمْ تُعَلِّمُوْنَ الْكِتٰبَ وَبِمَا كُنْتُمْ تَدْرُسُوْنَ۔ (اس لئے کہ تم کتاب پڑھاتے ہو اور پڑھتے ہو)

نہیں فرمایا بلکہ ''بِمَا كُنْتُمْ تُعَلِّمُوْنَ'' فرمایا ہے کہ اور آپ درس کے بعد تدریس میں مشغول ہیں تعلیم میں مشغول نہیں ہیں تعلیم کی حقیقت وہ ہے جس کو دوسری آیت میں حق تعالیٰ نے نذر سے تعبیر کیا ہے۔

وَلِيُنْذِرُوْا قَوْمَهُمْ اِذَا رَجَعُوْا اِلَيْهِمْ۔

(تا کہ اپنی قوم کے پاس جب واپس آئیں ڈرائیں)

اور وہ اصل میں وعظ کا کام ہے جو میں اس وقت آپ کے سامنے کر رہا ہوں جس سے آج کل علماء متنفر ہیں اور اس کے اصل ہونے کی دلیل یہ ہے کہ یہ دیکھ لیا جائے کہ حضرات انبیاء علیہم السلام کی تعلیم کا کیا طرز تھا کیا وہ کتابیں پڑھایا کرتے تھے ہرگز نہیں ان کی تعلیم کا طریقہ یہی وعظ تھا اور اصل مقصود یہی ہے مگر وعظ کہنے کے لئے ہم جیسوں کو ضبط علوم کی ضرورت ہے حضرات انبیاء علیہم السلام کی تعلیم تو علوم وہبی تھے۔ ان کو نہ کتاب پڑھنے کی ضرورت تھی۔ نہ وہ اس کے محتاج تھے کہ کتاب سامنے رکھ کر دوسروں کو پڑھائیں کیونکہ وہ حقائق کو بدوں اصطلاحات کی مدد کے سمجھانے پر قادر تھے وہ معقول کو محسوس بنا دیتے تھے اس لئے ان کو کتابیں پڑھنے اور پڑھانے کی ضرورت نہ تھی پھر بعد میں صحابہ بھی حضرات انبیاء علیہم السلام کے ساتھ سب سے زیادہ مشابہ تھے وہ بھی اس کے محتاج نہ تھے بعد میں جب حفظ میں کمی آئی علوم وہبیہ کی استعداد کم ہوگئی تو علوم کو کتابوں میں مدون کیا گیا اور اس کی ضرورت محسوس ہوئی کہ کتابیں پڑھی اور پڑھائی جائیں مگر اس کی ضرورت اس بات کے واسطے ہوئی کہ کتابوں سے علم حاصل کر کے عوام کو صحیح علوم کی تبلیغ کریں غلط سلط باتیں نہ بنائیں۔

علماء کا قصور:۔

اس کا مطلب یہ نہیں تھا کہ کتابیں پڑھانے ہی کو مقصود سمجھ لو اور تبلیغ و نذار کو چھوڑ کر بیٹھ جاؤ واقعی مسلمانوں کو اس بات نے بیحد تباہ کیا ہے کہ وعظ کہنے والے زیادہ تر جاہل ہیں اور علماء وعظ نہیں کہتے اگر علماء واعظ ہوتے تو مسلمانوں کی حالت تباہ و برباد نہ ہوتی بعض علماء اس کے متعلق یہ عذر کرتے ہیں کہ ہم کو وعظ کہنا نہیں آتا میں کہتا ہوں کہ آپ کو عربی پڑھنا ہی کب آتا تھا یہ بھی تو محنت کرنے سے ہی آیا ہے اسی طرح وعظ کہنے کا ارادہ کیجئے اور کچھ دنوں محنت کیجئے یہ کام بھی آجائے گا جس کی سہل تدبیر یہ ہے۔ کہ اول اول طلبہ کے سامنے مشکوٰۃ وغیرہ لے کر بیٹھ جاؤ اور کتاب دیکھ کر بیان کرو پھر کچھ دنوں میں بدوں کتاب کے بیان کرنا شروع کرو۔ اسی طرح ایک دن خوب بیان کرنے لگو گے حیرت کی بات ہے کہ جہلاء میں تو وعظ کی جرأت ہو اور علماء کو اس کی ہمت نہ ہو جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اب جہلاء علماء کے سامنے بھی غلط باتیں بیان کرنے سے نہیں ڈرتے چنانچہ مجھے ایک واقعہ یاد آیا کہ دیوبند میں ایک شخص نے میرے سامنے طلبہ کے مجمع میں يَاۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْۤا اِذَا نُوْدِيَ لِلصَّلٰوةِ مِنْ يَّوْمِ الْجُمُعَةِ فَاسْعَوْا اِلٰى ذِكْرِ اللّٰهِ وَذَرُوا الْبَيْعَ. ذٰلِكُمْ خَيْرٌ لَّكُمْ اِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ۔(سورۃ الجمعہ:۹)

ترجمہ:۔ اے ایمان والو جب جمعہ کے روز نماز (جمعہ) کے لئے اذان کہی جایا کرے تو تم اللہ کی یاد کی طرف (نماز و خطبہ) کی طرف چل پڑو اور خرید و فروخت چھوڑ دو یہ تمہارے لئے زیادہ بہتر ہے اگر تم کو کچھ سمجھ ہو۔

کا ترجمہ یہ کیا کہ جب جمعہ کی اذان ہوا کرے تو گھروں اور دوکانوں کو تالے موند کر نماز میں آجایا کرو یہ اس نے تعلمون کا ترجمہ کیا تھا کے تالے موند کر آجایا کرو اس نے تعلمون کی عین کو تو الف سے بدلا اور لام کی فتح کو دراز کیا تالا ہو گیا آگے رہ گیا مون اس کو موند کا مخفف بتایا جس کے معنی ہیں ''بند کرنا'' اس طرح سے یہ معنی حاصل ہو گئے اسی طرح ایک جاہل نے اِنَّاۤ اَعْطَيْنٰكَ الْكَوْثَرَ ۔(سورۃ الکوثر آیت نمبر ۱) کا ترجمہ کیا تھا

(اے محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے ہم نے آپ کو دی ہے مثل کوثر کے)

اس احمق نے ''اعطینک'' میں کاف تشبیہ بتلایا اور ضمیر مفعول کو فعل سے الگ کر دیا۔ ایسے ہی کانپور کے ایک جاہل نے مِنْ شَرِّ الْوَسْوَاسِ الْخَنَّاسِ (ترجمہ:۔ وسوسے ڈالنے والے کے شر سے)

کی تفسیر یہ کی کہ وسواس تو شیطان کا نام ہے اور خناس اس کا بیٹا ہے پھر اس پر ایک حکایت گھڑی اور دیر تک بیان کرتا رہا، اسکا سارا الزام علماء پر ہے، جہلاء کو وعظ کی جرات اسی لئے ہوئی ہے کہ علماء نے یہ کام چھوڑ دیا ہے۔ اگر علماء یہ کام کرنے لگیں تو جہلاء کا حوصلہ پست ہو جائے۔ اور یہ بھی نہ ہو تو کم از کم عوام مسلمین ان کا بیان سننا چھوڑ دیں۔ کیونکہ ان کو محقق اور جاہل کے بیان میں زمین و آسمان کا فرق نظر آئے گا۔ پس علماء خوش نہ ہوں کہ ہم تُعَلِّمُوْنَ الْکِتٰبَ پر عامل ہیں۔

صاحبو! عمل کہاں ہے؟ جب آپ نے طریق وعظ کو بالکل چھوڑ رکھا ہے، اگر یہ کہا جائے کہ خواص کے ضمن میں عام بھی ہوا کرتا ہے اور تعلیم عام ہے اور تدریس خاص ہے تو تدریس کے ضمن میں تعلیم بھی پائی گئی یہ منطقی سوال ہے۔ مگر میں حقیقت واضح کر کے ابھی اس کا جواب دیئے دیتا ہوں۔ سنئے یہ جو قاعدہ ہے کہ خواص کے ضمن میں عام ہوا کرتا ہے، یا بعنوان دیگر خاص مستلزم ہے عام کو تو اس کا مطلب یہ ہے کہ خاص اس عام کو مستلزم ہوتا ہے جو اس خاص کا جزو ہے، باقی اس عام کے جو دوسرے افراد ہیں، جو اس خاص کے قسیم ہیں ان کو یہ خاص مستلزم نہیں رہتا۔ پس اسی طرح تدریس بھی اس تعلیم کو مستلزم ہے جو تدریس کے ضمن میں متحقق ہے، دوسرے افراد تعلیم کو مثلاً وعظ کو مستلزم نہیں تو وعظ کی ضرورت تو پھر بھی رہی۔ تدریس اس سے مستغنی نہ ہوئی، اور میں اوپر بتلا چکا ہوں کہ یہاں تعلیم سے زیادہ انداز وعظ مراد ہے۔ جس کی دلیل دوسری آیات میں اور انبیاء علیہم السلام کا طرز تعلیم بھی اور اگر آپ ہی کا قول مان لیا جائے کہ تعلیم عام ہے اور تدریس کے ضمن میں اس کا بھی تحقق ہو رہا ہے تو بہت سے بہت آپ یہ کہہ سکتے ہیں کہ ہم تعلیم سے بالکل کورے نہیں مگر یہ تو نہیں کہہ سکتے۔ تُعَلِّمُوْنَ الْکِتٰبَ (تم کتاب پڑھاتے ہو)

پر ہمارا عمل کامل ہے کیونکہ جب تعلیم عام ہے اور اسکے افراد چند ہیں اور سب مطلوب ہیں بلکہ تمہاری فرد معمول سے زیادہ تمہاری فرد متروک مقصود ہے اور آپ نے صرف ایک فرد کو لے رکھا تو کمال کہاں ہوا یقیناً آپ اس کو نقص تسلیم کریں گے تو خیر اپنے آپ کو ناقص ہی مان لیجئے عاری عن التعلیم نہ مانئے پھر کیا نقص کا رفع کرنا ضروری نہیں یقیناً ضروری ہے غرض تعلیم عام ہے اپنے سب افراد کو جو سب مطلوب ہیں اب ان افراد کو سمجھئے۔

علماء کے کرنے کے کام:۔

سو اس وقت اس کے چند افراد میرے ذہن میں ہیں ان کو عرض کرتا ہوں اور استقرار چار ہیں

وعظ، تدریس امر بالمعروف بخطاب خاص، تصنیف۔ علماء کو ان چاروں شعبوں کو اختیار کرنا چاہئے اس طرح کہ طلباء کے سامنے تو مدرس بن کر بیٹھیں اور عوام کے سامنے واعظ ہوں اور خاص مواقع میں امر بالمعروف کریں اور خاص مواقع میں مراد یہ ہے کہ جہاں اپنا اثر ہو وہاں خطاب خاص سے نصیحت کریں کیونکہ ہر جگہ امر بالمعروف مفید نہیں ہوتا اور بعض دفعہ عام لوگوں کو امر بالمعروف کرنے کی وجہ سے مخالفت بڑھ جاتی ہے جس کا تحمل ہر ایک سے نہیں ہوتا اور اگر کسی سے تحمل ہو سکے تو سبحان اللہ! وہ امر بالمعروف کریں مگر یہ ضرور ہے کہ اپنی طرف سے سختی اور درشتی کا اظہار نہ کریں بلکہ نرمی اور شفقت سے امر بالمعروف کرے اس پر بھی مخالفت ہو تو تحمل کرے اور اگر تحمل کی طاقت نہ ہو تو خطاب خاص نہ کرے محض خطاب عام پر اکتفا کرے۔ میں نے ایک دوست کو یہی مشورہ دیا تھا کہ ہر شخص کو امر بالمعروف جب کرو جبکہ اس کے نتائج کا تحمل ہو ورنہ صرف ان لوگوں کو خطاب خاص کرو جن پر اپنا اثر ہے ان کو تقویٰ کا شوق ہوا ایک طرف سے سب کو نصیحت کرنے لگے پھر جب لوگ مخالف ہوئے تو میرے پاس شکایت لکھ دی میں نے جواب میں سرمد کی یہ رباعی لکھ دی۔

سرمد گلہ اختصاری می باید کرد | یک کار ازیں دوکار می باید کرد
یا تن برضائے دوست می باید کرد | یا قطع نظر زیار می باید کرد

(سرمدؔ شکایت کو مختصر کرو اور دو کاموں میں سے ایک کام کرو یا تو تن کو محبوب کی خوشنودی حاصل کرنے کیلئے وقف کردو یا محبوب سے قطع تعلق کردو۔)

غرض امر بالمعروف وہیں کرے جہاں قدرت ہو اور یہ آجکل بالکل ہی متروک ہو گیا ہے باپ بیٹے کو استاد شاگرد کو پیر مرید کو آقا نوکر کو اور خاوند بیوی کو بھی تو امر بالمعروف نہیں کرتا حالانکہ یہ ایسے رشتے ہیں جن میں انسان کا پورا اثر ہوتا ہے تو یہ بہت بڑی کوتاہی ہے جس کا ہم سے سوال ہوگا تین کام تو یہ ہیں چوتھا کام تصنیف کا ہے۔ علماء کو ضرورت کے موقع پر تصنیف بھی کرنا چاہئے اس کے یہ معنی نہیں کہ سب کے سب مصنف اور واعظ ہو جائیں بلکہ مطلب یہ ہے کہ بقدر ضرورت علماء میں کچھ لوگ مصنف اور واعظ بھی ہونے چاہئیں کیونکہ یہ امور فروض کفایہ ہیں ہر کام کرنے والے ضرورت کے مطابق کافی مقدار میں ہونے چاہئیں۔

(علامہ بیہقی نے حدیث لایزال طائفۃ من امتی علی الحق منصورین۔ (سنن ابن ماجہ:۱۰، السنن الکبریٰ للبیہقی ۹:۱۸۲)

(ہمیشہ میری امت میں سے ایک جماعت حق کی نصرت کرتی رہے گی)

کی شرح میں لکھا ہے کہ اس سے کوئی خاص جماعت مراد نہیں بلکہ دین کی خدمتیں بہت سی ہیں ہر شخص ان میں سے جو خدمت بجالا رہا ہے وہ اس میں داخل ہے خواہ واعظ ہو یا مصنف ،فقیہ ہو یا محدث (جامع)

اگر ایک قصبہ میں مثلاً بقدر ضرورت واعظ موجود ہوں۔ تو دوسرے علماء پر وعظ کہنا واجب نہیں ان کو درس و تدریس میں مشغول رہنا جائز ہے اور اگر واعظ کوئی نہ ہو تو مولوی صاحب کو اجازت نہیں کہ وہ صرف مدرس ہی بن کر رہیں بلکہ ضرورت کے موقعہ پر ان کو وعظ بھی کہنا چاہئے۔

وعظ کی اہمیت :۔

وعظ میں خاص اثر ہے جس سے عوام کی اصلاح زیادہ ہوتی ہے نیز عوام کو اس سے وحشت بھی نہیں ہوتی بلکہ دلچسپی ہوتی ہے اور اس کا جلدی اثر ہوتا ہے تصنیف میں بھی وعظ کے برابر اثر نہیں ہوتا بعض لوگوں کو علماء پر یہ بھی اعتراض ہے کہ ان کی تصانیف دشوار ہوتی ہیں یہ اعتراض تو محض لغو ہے کیونکہ احکام جو کہ مقصود ہیں ان کے متعلق تو تصانیف علماء کی سہل ہی ہوتی ہیں بلکہ ایسی سہل ہوتی ہیں کہ بچے اور عورتیں بھی سمجھ لیتے ہیں باقی رہے دلائل اور علوم دقیقہ سو وہ مقصود ہی نہیں اور اگر باوجود غیر مقصود ہونے کے کسی کو مرغوب ہوں اور اس لئے ان کی تسہیل کا مشورہ دیا جاوے سو وہ کسی عبارت سے سہل نہیں ہو سکتے بلکہ وہ اصل میں درس و تدریس سے اور بعضے مضامین صحبت علماء میں رہنے سے اور بعضے ان سے دریافت کرنے سے حل ہو سکتے ہیں تو اعتراض تو محض فضول ہے مگر اتنا ضرور ہے کہ تصنیف کا نفع بھی عام نہیں اور درس کا نفع تو بہت ہی خاص ہے کہ ایک خاص جماعت تک محدود ہے سب سے زیادہ عام نفع وعظ کا ہے کہ ایک گھنٹہ میں پانچ چھ ہزار کو نفع ہو جاتا ہے تو وعظ کا نفع اتم و اعم و اسہل ہے اس لئے اس کو ضرور اختیار کرنا چاہئے دوسرے وعظ کو اس لئے بھی اختیار کرنا چاہئے کہ جس چیز کو آپ آجکل مقصود سمجھے ہوئے ہیں یعنی درس و تدریس خود اس کے لئے بھی یہ بہت معین و مفید ہے اس کی تفصیل یہ ہے کہ علماء کو آجکل مدارس کی طرف بہت توجہ ہے اور ہونا بھی چاہئے کیونکہ علوم اسلامیہ کے بقاء کی صورت یہ ہی ہے اور اس کے لئے وہ چندے وغیرہ کرتے ہیں اور امراء پر نظر کرتے ہیں اور یہ سمجھ رکھا ہے کہ بدوں امراء سے ملے مدارس نہیں چل سکتے ،خیر یہ تو اپنا اپنا خیال ہے مجھے تو یقین کامل ہے کہ اگر علماء امراء سے بالکل نہ ملیں جب بھی کسی بات میں کمی نہ

آئے گی کیونکہ جس خدا نے ابتداء میں اسلام میں بدوں امراء کی امداد کے محض چند غریبوں کے ہاتھوں اپنے دین کو پھیلایا تھا وہ خدا اب بھی موجود ہے اور وہ اب بھی اپنے دین کا محافظ ہے۔

ہنوز آں ابر رحمت درفشان ست — خم خمخانہ بامہر ونشان ست

ترجمہ:۔اب بھی وہ ابر رحمت درفشاں ہے خم اور خمخانہ مہر ونشاں کے ساتھ موجود ہے۔

اور بحمد اللہ اب بھی بعضے مدارس ایسے موجود ہیں جو محض توکل پر چل رہے ہیں جن میں کسی سے سوال نہیں کیا جاتا مگر خیر اگر کسی کو توکل کی ہمت نہ ہو تو میں ان کو چندہ کرنے سے منع نہیں کرتا شرعا اس کی بھی اجازت ہے بشرطیکہ چند امور کا لحاظ رکھا جائے۔ایک یہ کہ کسی پر دباؤ نہ ہو دوسرے یہ کہ اس طرح سوال نہ کیا جائے جس سے دین کی تحقیر ہو۔اس کے بعد نفس چندہ میں کوئی قباحت نہیں عام طور پر قومی کام اسی طرح چلا کرتے ہیں آجکل تو تعلیم یافتہ طبقہ علماء پر یہ اعتراض بھی کرتا ہے کہ یہ لوگ چندہ کرتے پھرتے ہیں ان لوگوں کو اس اعتراض کا کیا منہ ہے کیونکہ یہ خود اس میں مبتلا ہیں یہ بھی خوب چندے کرتے ہیں بلکہ علماء سے زیادہ کرتے ہیں علماء کے تو بہت سے وعظ چندہ کے ذکر سے خالی بھی ہوتے ہیں اور ان کا تو کوئی لیکچر بھی اس سے خالی نہیں ہوتا اس کے متعلق سید اکبر حسین صاحب کا شعر خوب ہے۔

درپس ہر لیکچر آخر چندہ ایست — مرد آخر بیں مبارک بندہ ایست

ترجمہ:۔ ہر لیکچر کے آخر میں چندہ ہے مرد آخر کو دیکھ کہ بندہ ہے۔

میں نے آخر کو بضم خا بنا دیا ہے جو کہ مقصود ہے چندہ سے غرض مدارس کا زیادہ تر مدار چندہ پر ہے اور چندہ دینے والے زیادہ تر عوام ہیں تو علماء کو چاہئے کہ عوام کو اپنی طرف مائل رکھیں اس کا طریقہ صرف یہ ہے کہ ہر مدرسہ میں ایک واعظ محض وعظ و تبلیغ کے لئے رکھا جائے جس کا کام صرف یہ ہو کہ احکام کی تبلیغ کرے اس کو ہدایا لینے سے قطعا منع کر دیا جائے۔اور استحسانا یہ بھی کہہ دیا جائے کہ مدرسہ کے لئے بھی چندہ نہ کرے بلکہ اگر کوئی خود بھی دے تو قبول نہ کرے بلکہ مدرسہ کا پتہ بتلا دے کہ اگر تم کو بھیجنا ہو تو اس پتہ پر بھیج دو۔واعظ کو محصل چندہ نہ ہونا چاہئے محصل چندہ اور لوگ ہوں واعظ کا کام صرف وعظ کہنا ہو۔اس سے یہ فائدہ ہوگا کہ اس کے وعظ میں جب چندہ کا ذکر نہیں ہوگا تو بے غرض وعظ ہوگا اس کا مخاطب پر بڑا اثر ہوتا ہے پھر عوام کو مدرسہ سے تعلق ہوگا کہ اس مدرسہ سے ہم کو دین کا نفع پہنچ رہا ہے اس کی امداد کرنا چاہئے اور اب تو عوام کو یہ بڑا اعتراض ہے۔کہ صاحب ہم کو مدرسہ سے کیا نفع بس عربی پڑھنے والوں ہی کو کچھ نفع ہوگا اور واقعی ایک حد تک یہ اعتراض بھی

صحیح ہے اس لئے جن عوام سے آپ چندہ لینا چاہتے ہیں ان کو بھی تو کچھ نفع پہنچانا چاہئے جس کی صورت میں نے بتلادی کہ ہر مدرسہ میں ایک واعظ محض وعظ کے لئے ہونا چاہئے اگر ہر مدرسہ میں ایک ایک واعظ ہو جائے تو پھر دیکھئے عوام کو مدرسے سے کیسا تعلق ہوتا ہے اور چندہ کی بھی کیسی کثرت ہوتی ہے یہ چلتے ہوئے نسخے میں اگر شبہ ہوتو تجربہ کر کے اس کے نفع کا مشاہدہ کر لیجئے میں اہل مدارس سے کہتا ہوں کہ امتحان کے طور پر کچھ عرصہ کے لئے اس پر عمل کر کے دیکھ لو اگر تمہارے مدرسہ کو اس سے نفع نہ ہوتو اس کام کو بند کر دینا ہر وقت اختیار میں ہے ایک کام تو کرو اور دوسرے اس کی کوشش کرو کہ تمہارے مدرسے اہل دنیا کی نظر میں باوقعت ہو جائیں جس سے قلوب میں طلباء کی وقعت ہوگی تو اہل دنیا اپنی اولاد کو عالم بنائیں گے کیونکہ وہ عزت کے بڑے بندے ہیں جن کے کام میں عز و جاہ دیکھتے ہیں اس کی طرف جلدی مائل ہوتے ہیں "میر باقر داماد" کا قصہ ہے کہ ان سے بادشاہ نے اپنی بیٹی بیاہ دی تھی بس علم کی یہ عزت دیکھ کر امراء نے اپنی اولاد کو تحصیل علم میں مشغول کر دیا تھا اور وہ کوشش یہ ہے کہ علماء کی عزت استغناء سے ہوتی ہے عبا و قبا سے نہیں ہوتی پس اول تو یہ چاہئے کہ علماء چندہ کا کام ہی نہ کریں اور اگر ایسا نہ کرسکیں تو کم از کم چندہ میں استغناء ہی کا طریقہ اختیار کریں۔ کسی کی خوشامد اور للو پتو نہ کیا کریں نیز آجکل طلباء کو کھانا لانے کے لئے امراء کے گھروں پر بھیجنا مناسب نہیں اس سے طلباء عوام کی نظروں میں حقیر ہوتے ہیں۔ اور طلباء کی حقارت سے علم دین عوام کی نظروں میں حقیر ہو جاتا ہے۔ یہ تقریر وعظ کی ضرورت پر چلی تھی اور میں نے واعظ کو محصل چندہ بننے سے انکار کیا تھا اس پر اتنا طول ہو گیا مگر کچھ حرج نہیں اس میں بھی بہت سی مفید باتیں بیان ہوگئیں بہر حال تعلیم کے چار شعبے ہیں ان سب کا حق ادا کیجئے اس وقت یہ کہنا صحیح ہو گا کہ تعلم سے جو مقصود تھا وہ آپ نے پورا کر دیا پس تعلمون کے مقدم کرنے کی یہ بھی وجہ ہے کہ تعلیم مقصود ہے اور تعلم ذریعہ مقصود ہے اور مقصود ذہناً مقدم ہوتا ہے اس لئے لفظاً بھی مقدم کیا گیا۔

ربانی بننے کی شرائط:۔

اب آیت کا مطلب سمجھئے حق تعالیٰ فرماتے ہیں کہ چونکہ تم پڑھاتے ہو اور پڑھتے ہو اس لئے ربانی (اللہ والے) بن جاؤ اس سے معلوم ہوا کہ تعلیم و تعلم پر کام ختم نہیں ہو گیا بلکہ ابھی ایک اور کام باقی ہے۔ وہ کیا؟ ربانی ہونا اللہ والا بننا کیونکہ بدوں اس کے تعلیم و تعلم کا کچھ نتیجہ حاصل نہیں ہوتا۔ سب سے مقصود یہی ہے کہ آدمی خدا کا ہو جاوے مگر آجکل اہل علم نے صرف تعلیم و تعلم ہی کو مقصود سمجھ لیا ہے۔ عمل کا

اہتمام نہیں کرتے محض الفاظ پر اکتفا کرتے ہیں ان کو قلب تک نہیں پہنچاتے اسی کو ایک حکیم کہتے ہیں۔

ایھا القوم الذی فی المدرسہ ۔۔۔ کل ما حصلتموہ وسوسہ
علم نبود غیر علم عاشقی ۔۔۔ مابقی تلبیس ابلیس شقی
علم رسمی سربسر قیل است وقال ۔۔۔ نے ازو کیفیتے حاصل نہ حال
علم چہ بود آنکہ راہ بنمایدت ۔۔۔ زنگ گمراہی زدل بزدایدت
ایں ہوسہا ازسرت بیروں کند ۔۔۔ خوف وخشیت وزدلت افزوں کند
تو ندانی جز یجوز ولایجوز ۔۔۔ خود ندانی تو کہ حوری یا عجوز
علم چوں بردل زنی یارے شود ۔۔۔ علم چوں برتن زنی مارے شود

(ترجمہ:۔اے وہ قوم جو کچھ تم نے مدرسے میں حاصل کیا ہے وہ صرف وسوسہ ہے۔علم عاشقی کے علاوہ جو علم ہے وہ ابلیس شقی کی تلبیس ہے علم رسمی محض قیل وقال ہے نہ اس سے کوئی کیفیت حاصل ہوتی ہے نہ حال علم وہی ہے جو تم کو خدا کا راستہ دکھلا دے اور دل سے گمراہی کا زنگ دور کرے۔اور حرص وھوی سے چھڑا کر تمہارے دل میں خوف وخشیت پیدا کرے۔تو سوائے جائز اور ناجائز کے نہیں کچھ نہیں جانتا تجھے تو اپنی خبر نہیں کہ تو مقبول ہے یا مردود علم اگر دل پر اثر کرے تو وہ دوست (محبوب) ہے اور اگر علم تن پر اثر کرے تو سانپ ہے۔)

مگر اس سے علم رسمی کو فضول وبیکار اور حقیر نہ سمجھا جائے بلکہ مقصود یہ ہے کہ علم رسمی کافی نہیں بلکہ یہ ایسا ہے جیسے نماز کے لئے وضو کہ تنہا وضو بغیر نماز کے کافی نہیں ہے مگر کافی نہ ہونے سے غیر ضروری ہونا لازم نہیں آتا بلکہ نماز کے لئے وضو شرط ہے۔اس کے بغیر نماز ہی نہ ہوگی اس لئے علم رسمی علم حالی کے لئے شرط ہے بدوں علم بقدر ضرورت کے علم حالی بھی حاصل نہیں ہوسکتا وہ لوگ جاہل ہیں جو علم درسی کو غیر ضروری سمجھتے ہیں اس کی بہت ضرورت ہے اور ساتھ ہی اس کی بھی ضرورت ہے کہ علم رسمی کو عربی ہی کے ساتھ مخصوص نہ کیا جائے۔ بلکہ تعلیم دین کو عام کیا جائے جس کا ایک طریقہ تو وہ ہے جو میں نے بیان کیا ہے کہ عوام کو وعظ کے ذریعہ سے احکام سے مطلع کیا جائے دوسرا طریقہ یہ ہے کہ اردو رسائل میں احکام کا ترجمہ لکھا جائے اور مردوں سے گزر کر عورتوں میں بھی تعلیم کو رائج کرنا چاہئے جس کا طریقہ یہ ہے کہ مرد وعظ سن کر عورتوں کو احکام سے

مطلع کریں اور جو رسائل اردو میں عورتوں کے واسطے لکھے گئے ہیں وہ ان کو پڑھائے جائیں مگر اس کا یہ مطلب نہیں کہ ان کو جغرافیہ اور حساب پڑھایا کرو آج کل تعلیم نسواں کا مطلب لوگ یہی سمجھتے ہیں مگر تجربہ ہے کہ علم دین کے سوا اور علوم عورتوں کو پڑھانا مضر ہیں مثلاً جغرافیہ پڑھانا گھر سے بھاگنے میں مدد دیتا ہے چنانچہ آجکل میرے پاس ایک عورت کی تصنیف کردہ کتاب تقریظ کے لئے آئی ہے اس میں ترقی کی کوشش کی تعلیم کے سلسلہ میں لکھا ہے کہ مسلمانوں سے اور تو کچھ ہوتا نہیں بس اٹھے اور اللہ میاں سے دعا مانگ لی اللہ میاں بھی کہتے ہیں (نعوذ باللہ) کہ مجھ کو اور بھی کام ہیں تمہارے کام بنانے کی مجھ کو کہاں فرصت تم بھی تو کچھ کرو الٰہی توبہ اس نئی تعلیم سے تو عورتیں مردوں سے آگے بڑھ گئیں کہ مرد تو علماء پر مشق کرتے تھے انہوں نے اللہ میاں پر مشق شروع کردی۔ غرض علم ربی کو فضول نہ سمجھا جاوے بلکہ اس کو تو عام کرنے کی ضرورت ہے باقی ان اشعار کا مطلب یہ ہے کہ تم محض اس پر کفایت نہ کرو کہ ہم عالم ہو گئے بلکہ اس غرض وغایت پر بھی نظر کرو وہ یہ ہے کہ اللہ والے بن جاؤ کیونکہ پڑھانا اسی کے لئے ہے۔ اور یاد رکھو کہ: بِمَا كُنْتُمْ تُعَلِّمُوْنَ (جس کی پڑھتے ہو) كُوْنُوْا رَبّٰنِيّٖنَ (اللہ والے ہو جاؤ)

کے لئے مقتضی شرط نہیں ہے یہاں تک کہ شبہ ہو۔ جہاں شرط نہیں وہاں مشروط بھی لازم نہ ہوگا تو عوام پر ربانی ہونا واجب نہ ہوگا۔ اور مقتضی ہونے پر جو شبہ ہوا تھا اس کا جواب میں پہلے دے چکا ہوں کہ مراد مقتضی اتم ہے اور نفس مقتضی ہر مسلمان میں موجود ہے۔ یہ علماء ہی کے ساتھ خاص نہیں یعنی ایمان۔ اب بعد رفع اشکالات کے میں کہتا ہوں کہ علم سے فارغ ہو کر یہ نہ سمجھو کہ تم بالکل فارغ ہو گئے۔ بلکہ ابھی آپ کو دوسری منزل طے کرنے کے لئے اس سوال کا موقع باقی ہے۔

از مدرسہ بکعبہ روم یا بمیکدہ — اے پیر رہ بگو کہ طریق صواب چیست

(ترجمہ: مدرسہ سے کعبہ جاؤں یا میکدہ، اے پیرو مرشد بتاؤ کہ درست طریقہ کون سا ہے)

اس میں کعبہ سے مراد طریقہ سلوک و کثرت عبادت ہے۔ اور میکدہ سے طریق جذب و محبت، اس کا یہ مطلب نہیں کہ طریق محبت میں عبادت نہیں ہوتی یہ خیال تو الحاد و زندقہ ہے، بلکہ مطلب یہ ہے (مثلاً) نوافل کی تکثیر نہیں۔ غرض سلوک اور جذب دو طریقے ہیں وصول الی اللہ کے، اس وقت ان کی تفصیل کا موقع نہیں مگر میں نے اجمالا اس پر اس لئے متنبہ کر دیا ہے تاکہ سامعین ان الفاظ سے پریشان نہ ہوں۔

رموز تصوف:۔

حافظ کے کلام میں ایسے کنایات بہت ہوتے ہیں، چنانچہ اس وقت ایک اور شعر یاد آیا جس کا مطلب شاید بہت لوگ نہ سمجھے ہوں گے۔ کیونکہ وہ انکی اصطلاحات کو نہیں جانتے اسی لئے خواہ مخواہ اعتراض کر دیتے ہیں۔

فرماتے ہیں

دوش از مسجد سوئے میخانہ آمد پیر ما　　چیست یاران طریقت بعد ازیں تدبیر ما

(ترجمہ:۔ ہمارے پیر و مرشد مسجد سے میخانہ کی طرف آئے اے یاران طریقت اسکے بعد ہماری تدبیر کیا ہو۔)

اس میں تو سوال ہے، اگلے شعر میں خود ہی اس کا جواب دیتے ہیں

درخرابات مغاں، نیز ہم منزل شویم　　کایں چنیں رفت است در عہد ازل تقدیر ما

(ترجمہ:۔ پیر و مرشد کے ہمراہ ہم میکدہ پہنچے، ازل سے ہمارے واسطے ایسا ہی مقدر ہے۔)

اس سے اہل ظاہر تو یہ سمجھے کہ پیر اگر مسجد کو چھوڑ کر شراب خانہ میں جا پڑے تو مرید کو بھی ایسا ہی کرنا چاہئے، یہ بالکل غلط ہے، جس کا منشا وہی جہل عن الاصطلاح ہے، بلکہ یہاں بھی مسجد سے مراد طریقہ سلوک ہی ہے اور میخانہ سے مراد طریقہ جذب ہے۔ ایک مقدمہ تو یہ ہوا دوسرا مقدمہ یہ سمجھئے کہ کبھی کامل پر بھی جذب کا غلبہ ہو جاتا ہے گو مبتدی جیسا نہ ہو مگر ہو جاتا ہے۔ تیسرا مقدمہ یہ سمجھئے کہ جب تک شیخ اپنے حال میں مشغول رہتا ہے اور غلبہ حال کے لئے یہ بات ضروری ہے تو اس حالت میں دوسروں کو نفع نہیں پہنچا سکتا۔ اس مقدمات کے بعد سنئے کہ سوال کا حاصل تو یہ ہے کہ ہمارے شیخ پر کچھ دنوں سے جذب کا غلبہ ہے تو اب ہم کو کیا کرنا چاہئے اگلے شعر میں جواب ہے کہ نہیں، ہم کو اس حالت میں بھی شیخ کا ساتھ دینا چاہئے، کیونکہ جس کو ایک دفعہ شیخ بنا لیا ہے اور طبیعت کو اس سے کامل مناسبت ہو گئی ہے۔ ازل سے وہی ہمارے واسطے مقدر ہو چکا ہے تو ہم کو دوسرے سے نفع نہیں ہو سکتا اور اس حالت میں افادہ نہ کر سکنے کا جواب یہ ہے کہ کاملین کا جذب دیرپا نہیں ہوتا، بلکہ عارضی ہوتا ہے، غرض آپ کو تحصیل علم کے بعد طریق سلوک یا جذب کو حسب تجویز شیخ اختیار کر کے اصلاح نفس کا کام کرنا چاہئے پس ابھی آپ فارغ نہیں ہوئے درسیات کے بعد یہ کام باقی ہے۔ مگر میں

یہ رائے نہ دوں گا کہ سند درسیاست حاصل کرتے ہی فوراً ذکر وشغل شروع کردیجئے، بلکہ پہلے اپنے لکھے پڑھے کو پختہ کرلو۔ کیونکہ جذب وسلوک میں مشغول ہوکر اس علم سے قطع نظر کرنا پڑے گی بلکہ اس کو بھلا دینا پڑے گا اور جو شخص بیوی کو طلاق دینا چاہے اس کو چاہئے کہ پہلے اپنے جیسے ایک دو جنوالے پھر طلاق دے ایسے ہی آپ علم حاصل کرکے اول تعلیم میں مشغول ہوں اور اپنے جیسے دو چار عالم بنا دیجئے۔ پھر اس کو بھلایئے گا اور پڑھتے ہی فوراً بھلا دو گے تو ساری محنت ضائع ہو جائے گی۔ اور یہ مناسب میں اور اصلاح نفس کے لئے علم رسمی سے قطع تعلق کرنے کی ضرورت اس لئے ہے کہ سلوک وجذب کے لئے یکسوئی اور خلوت کی ضرورت ہے۔ اشتغال علمی کے ساتھ اس کا جمع ہونا دشوار ہے بلکہ اس کے لئے تو اس کی ضرورت ہے۔

قعر چہ بگزید ہر کہ عاقل ست　　　زانکہ در خلوت صفا ہائے دل ست

(ترجمہ:۔ جو عقلمند ہے وہ کنوئیں (مجمع) سے بھاگتا ہے اس وجہ سے خلوت میں صفائی قلب ہے)

مگر خلوت کو جلوت پر مطلقاً فضیلت نہ دینی چاہئے۔ مولانا نے ایک مقام پر اس کی عجیب وجہ لکھی ہے فرماتے ہیں کہ تم جو خلوت کے فضائل بیان کررہے ہو، یہ بھی تو جلوت ہی کی بدولت حاصل ہوئے، سبحان اللہ کیا عجیب وغریب بت ہے واقعی خلوت کے برکات وفضائل بھی صحبت ہی میں رہ کر معلوم ہوسکتے ہیں دوسرے یہ کہ خلوت وغیرہ کا از خود اپنے لئے تجویز کرلینا مفید نہیں، بلکہ اس وقت مفید ہے جب کوئی شیخ محقق تمہارے لئے اس کو تجویز کرے ورنہ خلوت بھی غوائل سے خالی نہ ہوگی پس اصلاح نفس کی تدبیر یہ ہے کہ اپنے کو کسی کے سپرد کردے جو وہ کہے اس پر عمل کرے، مگر تجویز ایسے کو کرے جس کی یہ شان ہو۔

بر کفے جام شریعت بر کفے سندان عشق　　　ہر ہوسنا کے نداند جام و سنداں باختن

(ترجمہ:۔ ایک ہاتھ میں شریعت کا اور دوسرے میں عشق کا جام ہر ہوسناک دونوں کے ساتھ ایک وقت میں نمٹنا نہیں جانتا۔)

کیونکہ محقق ایسا ہی شخص ہوگا جو شریعت وطریقت دونوں کا جامع ہو۔ بدوں کسی محقق کے اتباع کے اصلاح نفس نہیں ہوسکتی بعض لوگ اس خبط میں ہیں، کہ کتاب میں نسخے دیکھ کر اپنا علاج خود کرلیں گے مگر یہ خیال ایسا ہی ہے جیسے کوئی مریض کتاب میں نسخے دیکھ کر اپنا علاج خود کرنا چاہے کہ اس کا انجام بجز ہلاکت کے کچھ نہیں حضرت اگر کبھی طبیب بھی بیمار ہوتا ہے تو وہ اپنا علاج خود نہیں کرسکتا بلکہ

دوسرے طبیب کا محتاج ہوتا ہے پھر جو بیمار طبیب بھی نہ ہو اس کو اپنے علاج سے صحت کیونکر ہو سکتی ہے، باقی اس کے لئے بیعت ہونے کی ضرورت نہیں بلکہ کسی کو متبوع بنانے کی ضرورت ہے اور جو پیر بدوں بیعت کے تعلیم نہ کرے اس کو چھوڑ دو وہ محقق نہیں ہے۔

مصلحین کو ہدایت:۔

پھر جب کسی شیخ کی تعلیم و صحبت کی برکت سے تمہاری اصلاح ہو جائے تو اس کے بعد دوسروں کو بھی اصلاح کرنی چاہئے ربانی بھی بنو اور ربانی گر بھی بنو۔ مگر اس میں ایک بات قابل تنبیہ ہے وہ یہ کہ کام شروع کرنے سے پہلے تو ربانی گر بننے کی نیت کر لو تاکہ نیت افادہ کا ثواب ملتا رہے مگر کام میں لگنے کے بعد اس نیت کی طرف التفات نہ کرنا چاہئے بلکہ کام شروع کرنے کے بعد ساری توجہ کام پر مبذول کرنا چاہئے اس وقت ثمرات پر نظر کرنا مضر ہے اس کی ایسی مثال ہے جیسے ایک شخص جامع مسجد جانا چاہتا ہے تو اس کو چاہئے کہ ابتداء میں جامع مسجد کا قصد کرے اور چلنا شروع کرے اب اگر وہ قدم قدم پر یہ سوچے گا کہ میں نے کتنا راستہ طے کیا اور جامع مسجد کتنی دور ہے تو بجائے آدھ گھنٹہ کے ایک گھنٹہ میں پہنچے گا۔ اسی طرح اہلمد سرکاری ملازمت تنخواہ کے واسطے کرتا ہے اگر وہ ہر وقت کام کرتے ہوئے یہی سوچا کرے کہ آج میں نے اتنے دن کام کر لیا ہے میری تنخواہ اتنی لازم ہوگئی اور اتنی کا استحقاق فلاں تاریخ کو ہو جائے گا تو یقیناً وہ کام کو خراب کرے گا کیونکہ ایک کام کے ساتھ دوسری باتوں پر نظر کرنا موجب تشتت ہے کام جبھی ہوتا ہے جب اس میں ایسا لگے کہ اس وقت اس کے سوا کسی پر نظر نہ ہو۔ ایسے ہی یہاں سمجھئے کہ اصلاح نفس میں مشغول ہو کر یہ خیال کرنا کہ ہم ایک دن مصلح بنیں گے سد راہ ہے اسی سے ایک شبہ حل ہو گیا جو اس واقعہ سے پیدا ہوتا ہے جو ایک بزرگ کی نسبت سنا گیا ہے کہ ان کے ایک مرید کو ذکر و شغل سے نفع نہیں ہوتا تھا۔ شیخ نے بہت کچھ تدبیریں کیں مگر کچھ نفع نہ ہوا۔ آخر ایک دن پوچھا کہ میاں یہ تو بتلاؤ کہ ذکر و شغل سے تمہاری نیت کیا ہے اس نے کہا حضور! میری نیت یہ ہے کہ میری اصلاح ہو جائے تو پھر میں دوسروں کی اصلاح کروں گا۔ فرمایا اس خیال سے توبہ کرو اس کو دل سے نکال دو یہ تو شرک ہے۔ یعنی شرک طریقت ابھی سے بڑا بننے کی فکر ہے اس نے اس خیال سے توبہ کی بس روز بروز نفع ہونا شروع ہو گیا۔ اس پر یہ شبہ ہوتا ہے کہ یہ نیت تو شرعاً محمود تھی کیونکہ نفع متعدی کی نیت تھی اور نفع متعدی کی نیت نفع لازم سے اولیٰ ہے

جواب اس کا یہ ہے کہ اس نیت کا کام شروع کرنے سے پہلے کر لینا مضر نہ تھا اس شخص نے کام شروع کرنے کے بعد یہ نیت کی اس لئے اس کو ضرر ہوا کام شروع کرنے کے بعد تو یہ حال ہونا چاہئے۔

عاشقی چیست بگو بندہ جاناں بودن   دل بدست دگرے دادن و حیراں بودن

سوئے زلفش نظرے کردن درویش دیدن   گاہ کافر شدن و گاہ مسلماں بودن

(ترجمہ:۔ عاشقی کیا ہے کہہ دو محبوب کا بندہ بن جانا دل دوسرے کو دے دینا اور خود حیران رہنا اس کے زلف کی طرف نظر کرنا اور اس کا چہرہ دیکھنا کبھی فنا ہونا اور کبھی باقی رہنا۔)

یہاں کافر و مسلمان الفاظ اصطلاحیہ ہیں مطلب یہ ہے کہ طالب کو بندہ بن کر رہنا چاہئے فی ید الغسال ثمرات پر نظر نہ کرنا چاہئے کہ یوں ہوگا اور اس طرح ہوگا یہی مطلب ہے حضرت استاد علیہ الرحمۃ کے اس قول کا کہ مقصود طلب ہے وصول مطلوب نہیں یعنی طلب کے وقت مقصود طلب ہے طلب کے وقت وصول پر نظر نہ کرنا چاہئے کہ مجھے وصول ہوگا یا نہیں بلکہ اس وقت تو یہ مذہب ہونا چاہئے۔

دست از طلب ندارم تا کام من برآید   یا تن رسد بجان یا جاں زتن برآید

(ترجمہ:۔ میں طلب سے اس وقت تک ہاتھ نہیں ہٹاؤں گا جب تک میرا مقصد نہ برآئے یا تو میرا مقصود حاصل ہو جائے یا میری جان تن سے نکل جائے۔)

یعنی طلب ہی کو اپنا فرض سمجھے۔ حضرت حاجی صاحب سے جب کوئی ذاکر عدم نفع کی شکایت کرتا اس وقت حضرت یہ شعر پڑھا کرتے تھے۔

یابم اور ایا نہ یابم جستجوئے می کنم   حاصل آید یا نیاید آرزوئے می کنم

اس کا بھی وہی مطلب ہے کہ جستجو اور آرزو مطلوب ہے اس میں لگنا چاہئے وصول و حصول پر نظر نہ کرنا چاہئے۔ جامی اس سے بھی آگے بڑھتے ہیں۔

ھمینم بس کہ داند ماہ رویم   کہ من نیز از خریداران اویم

کہ بس ہمیں اتنا کافی ہے کہ ان کو خبر ہو جاوے کہ فلاں ہمارا خریدار ہے۔ یہ بڑی بات ہے، تھوڑی بات نہیں۔ جب انہیں خبر ہو جائے گی، تو وہ اپنے خریدار کو محروم نہیں رکھا کرتے۔

عاشق کہ شد کہ یار بحالش نظر نہ کرد   اے خواجہ درد نیست وگرنہ طبیب ہست

(ترجمہ:۔ کوئی شخص ایسا نہیں کہ عاشق ہوا ہو اور محبوب نے اس کے حال پر نظر نہ کی ہو اے صاحب تمہیں درد ہی نہیں ورنہ طبیب موجود ہے۔)

مگر تم تفویض بھی اس نیت سے نہ کرو کہ تفویض کی وجہ سے ہمارا کام ہو جائے گا بلکہ ان کا حق سمجھ کر تفویض کرو۔الغرض وصول اور ایصال کا قصد کرنا زمانہ طلب میں غلطی ہے کیونکہ قصد اس شے کا ہو سکتا ہے جس میں قصد و اختیار کو دخل ہو اور وصول اور صلاحیت ایصال دونوں تمہارے اختیار سے باہر ہیں۔ پس۔

کار خود کن کار بیگانہ مکن

(ترجمہ:۔اپنا کام کرو دوسرے کا کام مت کرو۔)

کام کے وقت مقصود پر نظر نہ کرو، بلکہ کام پر نظر کرو۔یعنی طلب پیدا کرو۔

آب کم جو تشنگی آور بدست ۔ تا بجوشد آب از بالاؤ پست

تشنگاں گر آب جویند ازجہاں ۔ آب ہم جوید بعالم تشنگاں

(ترجمہ:۔کم پانی زیادہ پیاس بڑھاتا ہے پیاس تہ و بالا تک پانی کی جویاں ہے اگر پیاسے دنیا میں پانی کو تلاش کرتے ہیں تو دنیا ہی میں پانی پیاسوں کا متلاشی ہے۔)

اسی طرح ایک دن ان شاء اللہ مقصود تک پہنچ جاؤ گے، پھر جب ربانی بن جاؤ اور دوسروں کی تربیت کرنے لگو کہ ہر شخص کو اس کی استعداد کے موافق تعلیم کرو، سب کو ایک ہی لکڑی نہ ہانکنا۔ کیونکہ عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ نے ربانی کی تفسیر میں فرمایا ہے۔

الربانی الذی یعلم صغار العلوم قبل کبارھا.

یعنی ربانی وہ ہے جو چھوٹے علوم اول تعلیم کرے اور بڑے علوم بعد سکھائے یعنی طالب کو بتدریج ترقی کی طرف لیتا جاوے۔اب میں ختم کرنا چاہتا ہوں۔گو میں اس وقت ربانی کی تفسیر زیادہ نہ کر سکا۔مگر تمہید میں جو مضمون مذکور ہوا ہے باشارۃ النص اس کی تفصیل کر سکتا ہے۔خلاصہ بیان کا یہ ہے کہ حق تعالیٰ نے دو مرتبے تو آپ کو عطا فرمائے ہیں، تعلیم و تعلم اور تیسرے امر کا مطالبہ کیا ہے کہ ربانی بن جاؤ۔اب حق تعالیٰ دیکھتے ہیں کہ آپ اس تیسرے درجے کے ساتھ کیا برتاؤ کرتے ہیں۔ اس پر عمل کرتے ہیں یا نہیں۔اب دعا کیجئے کہ حق تعالیٰ سب کو اور ساتھ میں مجھے بھی عمل کی توفیق عطا فرمادیں۔آمین! وصلی اللہ علیٰ سیدنا ومولانا محمد وعلی الہ واصحابہ اجمعین واخر دعوانا ان الحمدللہ رب العلمین.

منبر سے اترتے ہوئے فرمایا کہ اس وعظ کا نام ''العبد الربانی'' رکھا جائے۔اور وجہ تسمیہ کی بابت فرمایا کہ آیت میں پہلے یہ الفاظ مذکور ہیں۔

مَا كَانَ لِبَشَرٍ اَنْ يُّؤْتِيَهُ اللّٰهُ الْكِتٰبَ وَالْحُكْمَ وَالنُّبُوَّةَ ثُمَّ يَقُوْلَ لِلنَّاسِ كُوْنُوْا عِبَادًا لِّيْ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ

(ترجمہ:۔ کسی انسان سے یہ بات نہیں ہوسکتی کہ اللہ تعالیٰ (تو) اس کو کتاب اور دین کی فہم عطا فرمائیں لیکن وہ لوگوں سے یوں کہنے لگے کہ تم میرے بندے بن جاؤ۔)

اس کے بعد ارشاد ہے:

وَلٰكِنْ كُوْنُوْا رَبّٰنِيّٖنَ۔ (لیکن وہ یوں کہے گا کہ تم اللہ والے بن جاؤ)

پس یہاں ربانیین کے معنی یہی ہیں کہ عبدالرب بننا چاہئے۔ اس لئے العبدالربانی نام مناسب ہے جس میں لطیف اشارہ محل بیان کی طرف بھی ہے۔ کیونکہ مدرسہ کا نام مدرسہ عبدالرب ہے۔

علوم العباد من علوم الرشاد

ہماری حالت ایسی نکمی اور ردی ہو گئی ہے کہ قابل بیان نہیں۔ نہ ہمارے عقائد کامل ہیں، نہ اعمال و عبادات، نہ معاملات، نہ معاشرات، نہ اخلاق، نہ اقوال و احوال، غرض ہر چیز ناقص و کمزور ہے، اگر صحابہ زندہ ہو کر ہمیں دیکھیں، تو ہمیں حضور کی امت میں خیال کرنا انکو دشوار ہو جائے۔

آداب مجالس اور فضیلت علم و عمل کے متعلق یہ وعظ مدرسہ عبدالرب دہلی میں ۱۹ شعبان ۱۳۳۵ھ کو تقریباً پندرہ سو کے مجمع میں کھڑے ہو کر فرمایا جو تقریباً تین گھنٹوں میں ختم ہوا اسے مولوی اشفاق الرحمٰن صاحب کاندھلوی نے قلمبند کیا۔

خطبہ ماثورہ

بسم اللہ الرحمن الرحیم

الحمد للہ نحمدہ ونستعینہ ونستغفرہ ونومن بہ ونتوکل علیہ ونعوذ باللہ من شرور انفسنا ومن سیئات اعمالنا من یھدہ اللہ فلا مضل لہ ومن یضللہ فلا ھادی لہ ونشھدان لا الہ الا اللہ وحدہ لا شریک لہ ونشھدان سیدنا ومولانا محمداً عبدہ ورسولہ صلی اللہ علیہ وعلی الہ واصحابہ وبارک وسلم.

امابعد فاعوذ باللہ من الشیطٰن الرجیم. بسم اللہ الرحمن الرحیم. یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْٓا اِذَا قِیْلَ لَکُمْ تَفَسَّحُوْا فِی الْمَجٰلِسِ فَافْسَحُوْا یَفْسَحِ اللّٰہُ لَکُمْ وَاِذَا قِیْلَ انْشُزُوْا فَانْشُزُوْا یَرْفَعِ اللّٰہُ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا مِنْکُمْ وَالَّذِیْنَ اُوْتُوا الْعِلْمَ دَرَجٰتٍ.وَاللّٰہُ بِمَاتَعْمَلُوْنَ خَبِیْرٌ (المجادلہ، آیت نمبر ۱۱)

ترجمہ:۔ اے ایمان والو جب تم سے کہا جائے کہ مجلس میں جگہ کھول دو تو تم جگہ کھول دیا کرو اللہ تعالیٰ تم کو جگہ کھول دے گا اور جب تم سے کہا جائے کہ اٹھ کھڑے ہو تو اٹھ کھڑے ہوا کرو اللہ تعالیٰ تم میں ایمان والوں کے اور ان لوگوں کے جن کو علم عطا ہوا ہے درجے بلند کردے گا اور اللہ تعالیٰ کو سب اعمال کی پوری خبر ہے۔

تمہید وضرورت:۔

یہ سورۂ مجادلہ کی آیت ہے حق سبحانہ وتعالیٰ نے آیت میں بعض آداب مجالس کے بیان فرمائے ہیں ہر چند آیت کا شان نزول خاص ہے مجلس جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ لیکن چونکہ الفاظ عام ہیں اس لئے خصوص مورد کا اعتبار نہ ہوگا بلکہ عموم الفاظ کے اعتبار سے حکم عام ہوگا پس خاص حضور ہی کی مجلس کے ساتھ یہ حکم مخصوص نہیں بلکہ یہ حکم تمام مجالس کو عام ہے اور حق

تعالیٰ شانہ نے اس جگہ اس حکم کے جو کہ دو حکموں پر مشتمل ہے امتثال پر اس کے ثمرہ کا بھی وعدہ فرمایا ہے چنانچہ پہلے حکم اور اس کے ثمرہ کے لئے ارشاد ہے۔

اِذَا قِيْلَ لَكُمْ تَفَسَّحُوْا فِي الْمَجٰلِسِ فَافْسَحُوْا يَفْسَحِ اللّٰهُ لَكُمْ

ترجمہ:۔ جب تم سے کہا جائے کہ مجلس میں جگہ کھول دو تو کھول دیا کرو۔ اللہ تعالیٰ تم کو جگہ کھول دے گا۔

یہ تو پہلا حکم اور اس کا ثمرہ ہے آگے بذریعہ عطف دوسرا حکم اور اس کا ثمرہ ارشاد فرماتے ہیں: وَاِذَا قِيْلَ انْشُزُوْا فَانْشُزُوْا ۔(اور جب کہا جائے کھڑے ہو جاؤ تو اٹھ کھڑے ہوا کرو)

یہ تو حکم ہے اور اس کا ثمرہ ارشاد فرماتے ہیں

يَرْفَعِ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مِنْكُمْ وَالَّذِيْنَ اُوْتُوا الْعِلْمَ دَرَجٰتٍ

ترجمہ:۔ اللہ تعالیٰ تم میں سے اہل ایمان اور اہل علم کے درجات بلند کرے گا۔

اور اس ثمرہ اور اس کے وعدہ میں اول تعلیم فرمائی اس کے بعد تخصیص کے طور پر بعض لوگوں کے واسطے یعنی اہل علم کے لئے ثمرہ جداگانہ بیان فرمایا اور تخصیص بعد تعمیم بقواعد علم بلاغۃ اہتمام کو مقتضی ہوتی ہے اس سے معلوم ہوا کہ اہل کو چاہئے کہ اس کو مہتم بالشان سمجھ کر اس کا خاص طور پر اہتمام کریں اور اس وقت اس بیان کو اس واسطے اختیار کیا گیا کہ یہ امر بظاہر شعائر وارکان دین سے نہیں بلکہ ایک معمولی سی عادت ہے جس کی ہر جلسہ میں ضرورت ہوتی ہے مگر عام طور پر لوگ اس کو ضروریات سے خیال نہیں کرتے اس لئے اس کو بیان کے لئے اختیار کیا گیا۔

آداب مجلس:۔

اس اجمال کی تفصیل اس کے ترجمہ سے واضح ہو جائے گی اور ترجمہ آیت کا یہ ہے کہ اے مسلمانو! جب تم سے کہا جاوے کہ مجلس میں فراخی کر دو تو فراخی کر دیا کرو جب تم سے کہا جاوے اٹھ کھڑے ہو تو اٹھ جایا کرو یعنی اگر اس جگہ سے اٹھنے کا امر ہو تو اس جگہ سے اٹھ جایا کرو پھر خواہ تم کو دوسری جگہ بیٹھنے کا حکم ہو جاوے خواہ چل دینے کا امر ہو اسی پر عمل کیا کرو (استکبار وانکار نہ کیا کرو) اور ظاہر ہے کہ یہ امر عقائد میں سے نہیں اعمال رکنیہ میں سے نہیں مالی حقوق میں سے نہیں اس لئے کہ اس کو نہایت اہتمام کے ساتھ بیان فرمایا۔ چنانچہ اول تو يٰاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا

سے خطاب ہے۔ باوجودیکہ قرائن سے تو مومنین ہی مخاطب ہیں اور اکثر قرآن میں مسلمانوں ہی سے خطاب ہوتا ہے پھر اس صریح خطاب سے کیا فائدہ ہے تو خوب سمجھ لو کہ اس سے مقصود رغبت دلانا ہے کہ یہ امر ہر چند شعائر دین سے نہیں اس لئے عام طور سے ممکن ہے کہ لوگوں کو اس کا اہتمام نہ ہو مگر ہمارے مخاطب وہ ہیں جو ہم پر اعتقاد رکھتے ہیں وہ ضرور اس کو قبول کریں گے۔ اسی طرز کلام سے اس مضمون کی سامعین کو رغبت دلائی اور دوسرا اہتمام "اذا قیل" بصیغہ مجہول سے ظاہر فرمایا باوجودیکہ واقعہ خاصہ میں اس قول کے قائل خاص حضور اقدسؐ ہیں پھر بھی عنوان عدم تعیین قائل سے تعبیر فرمایا (یعنی قیل مجہول کے صیغہ کے ساتھ بیان فرمایا بجائے صیغہ معلوم "قال بکم" کے) اور یہ عدول اس وجہ سے فرمایا کہ اس مسئلہ میں حضور کے ارشاد کی تخصیص نہیں اس لئے حکم عام ہے ہر صدر مجلس کے قول کو۔ تیسرا اہتمام یہ کہ امر کے صیغہ کے ساتھ بیان فرمایا ہے یعنی "فافسحوا" اور "فانشزوا" اور ظاہر ہے کہ امر حقیقۃً وجوب کے لئے ہوتا ہے۔ جب تک کہ کوئی قرینہ صارفہ عن الحقیقۃ نہ ہو گو واجبات کے درجات مختلف ہوتے ہیں کہیں وجوب بعینہ ہوتا ہے کہیں وجوب لغیرہ، مگر نفس وجوب میں شرکت ضرور ہوتی ہے چوتھا اہتمام یہ ہے۔ کہ "تفسحوا" کا امر اور اس کا ثمرہ جدا بیان فرمایا۔ اور "انشزوا" اور اس کا ثمرہ جدا بیان فرمایا ورنہ اگر اختصار کے ساتھ مجلس میں حکم صدر کی اتباع کا مشترکا امر فرما دیتے تو اس درجہ اہتمام نہ ہوتا جیسا کہ جدا جدا بیان کرنے میں ہوا پانچواں اہتمام یہ ہے کہ لفظ فی المجالس بصیغہ جمع فرمایا باوجودیکہ فی المجلس بھی کافی تھا وہ بھی جنس کی وجہ سے عام ہوتا مگر چونکہ اس میں یہ احتمال باقی تھا کہ اس عام کو خاص پر حمل کر لیا جاتا اور مجلس سے خاص مجلس مراد لے لی جاتی (یعنی حضورؐ کی مجلس) اس لئے فی المجالس فرما کر اس کا احتمال بھی قطع فرما دیا کہ اب احتمال تخصیص کا ہو ہی نہیں سکتا لہٰذا حکم عام ہوگا تخصیص کا احتمال ہی نہیں چھٹا اہتمام یہ ہے کہ جس ثمرہ کو مرتب فرمایا اس کا بڑا ہونا ظاہر فرما دیا کیونکہ مقتضا علم بلاغت کا یہ ہے کہ عادۃً چھوٹے ثمرہ کو ذکر نہیں کیا کرتے اور یہاں ثمرہ کا ذکر موجود ہے اور قرآن کا فصیح و بلیغ ہونا مسلم ہے پس قرآن میں کسی ثمرہ کا ذکر کرنا اس کو مقتضی ہے کہ یہ ثمرہ بہت بڑا ہے اور جب ثمرہ بڑا ہوتا ہے تو عمل کا بڑا ہونا بھی ضروری ہے جس پر اس قدر بڑا ثمرہ مرتب ہوا ہے تو اس سے عمل مذکور کی یعنی توسع اور قیام کی اہمیت و عظمت بھی معلوم ہوئی ساتواں اہتمام خاص اہل علم کی فضیلت ظاہر کرنے کے لئے یہ کیا گیا کہ ثمرہ

يَرْفَعِ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مِنْكُمْ وَالَّذِيْنَ اُوْتُوا الْعِلْمَ دَرَجٰتٍ

ترجمہ:۔ اللہ تعالیٰ تم میں سے اہل ایمان اور اہل علم کے درجات بلند کرے گا۔
میں ایمان والوں کو اولاً وعموماً اور اہل علم کو ثانیاً وخصوصاً بیان فرمایا تا کہ اہل علم کی بالتخصیص فضیلت معلوم ہو جاوے پھر اس سب کے خلاف پر وعید ہے۔

وَاللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ خَبِيْرٌ ۔ (اور اللہ تعالیٰ کو سب اعمال کی پوری خبر ہے)

اس سے اور زیادہ اہتمام بڑھ گیا یعنی اگر تم اس پر عمل نہ کرو گے تو حق تعالیٰ اس سے خبردار ہیں اس لئے تمہیں مخالفت سنبھل کر کرنی چاہئے پس

وَاللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ خَبِيْرٌ (اور اللہ تعالیٰ کو سب اعمال کی پوری خبر ہے)

ظاہراً وعید ہے اور یہ بھی احتمال کہ یہ وعدہ ہو کہ اس عمل کے کرنے پر ثمرہ کا ترتب ضرور ہوگا کیونکہ تمہارے اعمال کی حق تعالیٰ کو خبر ہے اس لئے اس عمل کے کرنے پر ثمرہ کا ترتب فرمادیں یا اعمال مذکورہ کے معتدبہ ہونے کی شرائط کی طرف اشارہ ہے۔ یعنی تفسح فی المجالس یا نشوز مطلقاً معتبر ومعتدبہ نہیں بلکہ اس میں خلوص بھی شرط ہے یعنی صرف صورت عمل پر ثمرہ مذکورہ مرتب نہ ہوگا بلکہ اخلاص بھی ضروری ہوگا اور اخلاص امر باطنی ہے اس لئے اپنے خبیر، معنی عالم بباطن الامور ہونے پر تنبیہ فرمادی غرض ان سب اہتماموں سے معلوم ہوا کہ یہ عمل نہایت مہتم بالشان ہے یہ تو آیت کا حل اجمالی ہے جس سے میرا مقصود علم وعمل کا اہتمام ثابت کرنا ہے۔

مہتم بالشان عمل:۔

عمل کا اہتمام تو ظاہر ہے کہ ایک معمولی عمل کے لئے یہاں اتنا اہتمام فرمایا گیا ہے۔ پھر جو عمل ذاتاً بھی عظیم ہو اس کا اہتمام تو بدرجہ اولیٰ ضروری ہوگا اس سے تمام اعمال کا مہتم بالشان ہونا ظاہر ہو گیا اور علم کا اہتمام اس طرح ہوا کہ ثمرہ میں اہل علم کو تمام مومنین سے جدا بیان کیا اور تخصیص بعد تعمیم کے مفید اہتمام کو ہوتی ہے اب میں اس مضمون کے بعض اجزاء اور متعلقات کی تفصیل مختصراً عرض کرتا ہوں اور اس سے پہلے ایک شبہ کا ازالہ ضروری ہے وہ شبہ یہ ہے کہ آداب مجالس تو ایک معمولی اور چھوٹا سا عمل ہے اس کو اس قدر اہتمام سے کیوں بیان فرمایا۔ کیونکہ یہ کوئی درجہ عقائد سے نہیں۔ فرائض سے نہیں ارکان وواجبات سے نہیں اس درجہ کا اہتمام تو ان امور کا ہونا چاہئے جو ذاتاً بڑا نہ ہو اس کے ایسے اہتمام کی کیا ضرورت ہے؟ اور آداب مجالس کوئی ایسا امر نہیں ہے جس

کے اہتمام کی اس قدر ضرورت ہو یہ شبہ بہت سے لوگوں کے ذہن میں آیا ہوگا جس کی وجہ یہ ہے کہ عام طور پر لوگوں نے اس عمل کو معمولی سمجھ رکھا ہے اور اسی وجہ سے عام طور پر اس کا اہتمام نہیں کرتے تو منشاء شبہ کا صرف یہ بات ہے کہ یہ ایک معمولی اور چھوٹا سا عمل ہے اور معمولی شے قابل اہتمام نہیں ہوتی حالانکہ اول تو یہی مقدمہ غلط ہے کہ معمولی اور چھوٹی شے قابل اہتمام نہیں ہوتی کیونکہ چھوٹا اور معمولی ہونے کے لئے یہ لازم نہیں کہ وہ قابل اہتمام اور قابل وقعت نہ ہو دیکھو سب سے چھوٹا آسمان سماء دنیا ہے عرش کرسی وغیرہ سے بہت چھوٹا مگر اس کے یہ معنی نہیں کہ سماء دنیا کوئی چیز نہیں دنیا یا سماء دنیا قابل وقعت نہیں بلکہ باوجودیکہ عرش وغیرہ سے بہت چھوٹا ہے۔ مگر پھر بھی اپنی ذات میں اسی طرح بہت سی اور چیزوں کے مقابلہ میں وقعت ضرور ہے عرش و کرسی سے چھوٹا ہوا تو کیا لیکن ٹیلوں کے مقابلہ میں تو بہت بڑا ہے۔

آسماں نسبت بعرش آمد فرود لیک بس عالی ست پیش خاک تود

اور نظیر دیکھو آسمان کے سامنے ستارے کتنے چھوٹے ہیں مگر ان میں بعضے بعضے زمین سے بھی بہت بڑے ہیں تو ستاروں کا چھوٹا ہونا اس کو مقتضی نہیں کہ ستارہ قابل وقعت نہ ہو یہ تو محسوسات میں گفتگو تھی اب اعمال میں دیکھو کہ ارکان بھی آپس میں متفاوت ہیں مثلاً نماز میں قیام، سجدہ، جلسہ، مختلف ارکان ہیں مگر سب ایک درجہ کے نہیں کیونکہ ان کے فضائل مختلف ہیں اور آپس میں چھوٹے بڑے ہیں کوئی چھوٹا کوئی بڑا کیونکہ صغر و کبر امور اضافیہ میں سے ہے۔ مگر ایک رکن کا دوسرے کے اعتبار سے چھوٹا ہونا اس کو ہرگز مقتضی نہیں کہ وہ رکن قابل وقعت نہیں ورنہ اس کی رکنیت ہی محل کلام ہو جائے گی پس یہ مقدمہ ہی غلط ہے کہ جو چیز کسی سے چھوٹی ہو وہ قابل اہتمام ہی نہ ہو۔ مگر اس غلطی میں آج کل بہت لوگ مبتلا ہیں۔

ذکر اللہ:۔

بعض جہلاء وصوفیاء نے اِنَّ الصَّلٰوۃَ تَنْھٰی عَنِ الْفَحْشَآءِ وَالْمُنْکَرِ (بے شک نماز بے حیائی اور بُرے کاموں سے روکتی ہے) کے بعد وَلَذِکْرُ اللّٰہِ اَکْبَرُ (اور اللہ کی یاد بہت بڑی چیز ہے)

کو دیکھ کر نماز ہی چھوڑ دی کیونکہ ان لوگوں نے اس آیت کی تفسیر یوں کی ہے کہ نماز تو صرف فحشاء اور منکر ہی سے بچاتی ہے اس میں صرف یہ عارضی فضیلت ہے اور ذکر اللہ اپنی ذات میں بڑی چیز

ہے تو جو لوگ ذکر اللہ میں مشغول ہوں ان کو نماز کی حاجت نہیں مگر اس شبہ کا منشاء صرف تفسیر کا بدلنا ہے ذرا صحیح تفسیر کیجئے تو یہ شبہ جاتا رہے گا۔ اس کی تقریر یہ ہے کہ حق تعالیٰ اس آیت میں نماز کی فضیلت بیان فرماتے ہیں کہ نماز کی پابندی کرو کیونکہ نماز فحشاء اور منکر سے روکتی ہے اور نماز فحشاء و منکر سے اس لئے روکتی ہے کہ وہ ذکر اللہ پر مشتمل ہے اور ذکر اللہ بڑی چیز ہے اس میں ایسی ہی برکت اور خاصیت ہے اب اس تقریر کے بعد جواب دیجئے سود راصل

وَلَذِكْرُ اللّٰهِ اَكْبَرُ دلیل ہے اِنَّ الصَّلٰوةَ تَنْهٰى عَنِ الْفَحْشَآءِ وَالْمُنْكَرِ

کی کہ نماز فحشاء وغیرہ سے اس لئے روکتی ہے کہ وہ مشتمل ہے ذکر اللہ پر اور ذکر اللہ بہت بڑی چیز ہے اس کی یہی خاصیت ہے تو اب بتلاؤ کہ اس تقریر سے نماز کا بڑا ہونا لازم آیا یا چھوٹا ہونا جب نماز بھی بڑی چیز ہے تو وہ قابل ترک کیسے ہوئی دوسرے ہم کو یہ بھی مسلم نہیں کہ چھوٹی چیز قابل ترک ہوا کرتی ہے مثال کے طور پر غور کیجئے ہم سوال کرتے ہیں کہ اگر کسی کے دولڑکے ہوں ایک چھوٹا ایک بڑا۔ کیا چھوٹے کو قتل کر دیں گے؟ ہرگز نہیں پس یہ قاعدہ مسلم نہیں کہ چھوٹی چیز قابل ترک ہوا کرتی ہے اور ذکر اللہ نماز سے بڑا بھی ہو تو نماز کو اس کے مقابلہ میں ترک نہیں کر سکتے چہ جائے کہ وہ ذکر اللہ کو بھی مشتمل ہے۔

چھوٹی چیزوں کی اہمیت:۔

یہ تفاوت تو دنیا میں بھی ہوتا ہے کہ کوئی چیز بڑی ہے کوئی چیز چھوٹی مگر دنیا میں سینکڑوں مثالیں ایسی ملتی ہیں کہ بڑی شے کے موجود ہوتے ہوئے بھی چھوٹی شے کی حاجت رہتی ہے اور چھوٹی شے قابل ترک نہیں ہوتی۔ دیکھئے بادشاہ اپنے ماتحتوں اور چھوٹوں کو معزول نہیں کر سکتا اور اگر معزول کر دے تو کام نہیں چل سکتا۔ اور دیکھئے انگلیوں میں آپس میں کس قدر تفاوت ہے مگر سب کی حاجت ہے صرف بڑی پر اکتفاء نہیں ہو سکتا چھوٹی کی بھی حاجت ہے بلکہ بڑے کی بڑائی چھوٹے کے وجود پر موقوف ہے اگر چھوٹے نہ ہوتے تو بڑے کا وجود بے قدر تھا اس بناء پر چھوٹے کا وجود بھی مہتم بالشان ہے چنانچہ بادشاہ کو رعایا کی سخت حاجت ہے بلکہ بادشاہ کی بادشاہی رعایا پر موقوف ہے اگر رعایا نہ ہو تو بادشاہ ہی معرض خطرہ میں ہو جاوے اس مضمون کو شاعرانہ مضمون نہ خیال کیا جاوے بلکہ یہ بات واقعی ہے اور سچ یہ ہے کہ بڑے اعمال میں نورانیت چھوٹے ہی اعمال سے ہوتی ہے چنانچہ فرائض کی تکمیل نوافل سے ہوتی ہے اگر کوئی نوافل ادا نہ کرے اور

بالکل ترک کرے۔اس کا فرض بھی غیر کامل ہوگا۔گو بمعنی ناقص نہیں بلکہ غیر اکمل ہوگا اور اگر مع نوافل ادا کرے۔تو وہ فعل اکمل ہوگا تو دیکھئے تکمیل فرائض کی نوافل سے ہوئی تو امثلہ سابقہ میں جیسے چھوٹوں سے بڑوں کی تکمیل دنیا میں ہوتی ہے ایسے ہی آخرت میں بھی نوافل سے تکمیل فرائض کی ہوگی یعنی فرائض میں جس قدر کمی ہوگی نوافل سے اس کی بھرتی کی جاوے گی اور یہ تکمیل فرائض کی نوافل سے کبھی تو ایک جیسے اعمال میں ہوتی ہے (یعنی فرائض جس جنس کے ہیں وہ نوافل مکملہ بھی اسی جنس کے ہوں) اور کبھی یہ تکمیل فرائض کی نوافل وغیرہ کی جنس سے ہوتی ہے مثلاً نماز سے پہلے آپ کے پاس کوئی شخص آیا جو بڑا اگندہ حال اور بدصورت وغیرہ تھا جس کی تعظیم کو جی نہ چاہتا تھا اٹھنے کو دل گوارہ نہ کرتا تھا مگر آپ نے نفس کی مخالفت کر کے اور نفس کو مجبور کر کے اس کی تعظیم کی اور تواضع اختیار کی پھر اس کے بعد نماز پڑھی تو اس نماز میں اس تواضع کی برکت سے نورانیت بڑھ جاوے گی جس کا اہل باطن کو شب و روز مشاہدہ ہوتا ہے۔

اعمال کی نورانیت:۔

راز اس کا یہ ہے کہ اعمال میں سب میں باہم مناسبت ہے نیک اعمال کو نیک سے اور بد کو بد سے خواہ جنس میں اتحاد ہو یا نہ ہو تو ہر عمل خیر دوسرے عمل خیر کا موید و مقوی ہوتا ہے مثلاً آپ کا ایک نوکر اور باورچی ہے آپ نے اس کو آواز دی آپ کے پکارنے سے فوراً حاضر ہو گیا سو ایک تو اس کا حاضر ہونا اس وقت ہے اور ایک اس وقت ہے کہ وہ کسی سے لڑ بیٹھا، اتفاقاً اسی حالت میں آپ نے اسے پکارا تو وہ حاضر تو ضرور ہوگا مگر اس حاضری اور پہلی حاضری میں فرق ضرور ہوگا باوجودیکہ نوکر کی آقا سے لڑائی نہیں ہوئی بلکہ دوسرے شخص سے ہوئی تھی مگر اس عمل منکر کا یہ اثر ہوگا کہ لہجہ کلام میں ادب و نیاز مندی کی وہ شان نہ ہوگی جو پہلے تھی اسی طرح اگر نماز سے پہلے کوئی عمل تواضع کا کیا تو اس کا نماز میں یہ اثر ہوگا کہ نماز میں نورانیت بڑھ جاوے گی اور اگر نماز سے پہلے کسی کے ساتھ تکبر کا معاملہ کیا تھا اگرچہ تکبر جنس صلوٰۃ سے نہیں مگر تکبر کا ظلماتی اثر نماز میں ضرور ہوگا اور نماز سے پیشتر وہ تکبر کرنا مانع نورانیت صلوٰۃ ضرور ہوگا یہی مطلب اور مقصود ہے اس حدیث کا حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے۔

الحسد تاکل الحسنات کما تاکل النار الحطب۔ (سنن ابن ماجۃ: ۴۲۱۰، الدر المنثور ۶: ۴۹۹)

"حسد نیکیوں کو اس طرح کھا لیتا ہے جیسے لکڑی کو آگ"

اگرچہ اس پر علماء کا اتفاق ہے کہ باوجود حسد کے بھی حسنات باقی رہتی ہیں مگر معنی یہ ہیں کہ

اعمال میں نورانیت نہیں رہتی اسی طرح صوم کے بارہ میں ارشاد ہے:

اذا کان یوم صوم احدکم فلا یرفث ولا یصحب فان سابه احد اوقاتله فلیقل انی امرء صائم (۱). (الصحیح للبخاری ۳:۳۴، الصحیح لمسلم صیام:۱۶۳)

(۱)رواه البخاری عن ابی هریره قال قال رسول الله صلی الله علیه وسلم فی حدیث طویل الخ ایضا رواه البخاری عن ابی هریرة قال قال رسول الله صلی الله علیه وسلم الصوم جنته فلا یرفث ولا یجهل فان امرئو قاتله او شاتمه فلیقل انی صائم (ص ۲۵۴، ص ۲۵۵ ترجمہ حدیث: اور جب تم میں سے کسی کا روزہ کا دن ہو پس نہ فحش باتیں کہے اور نہ لڑے۔ (کوئی اور لڑے) تو کہہ دے کہ میں روزہ دار ہوں)

تو اس حدیث میں مقصود یہی ہے کہ عمل صوم میں ان افعال کے ارتکاب سے نورانیت نہیں رہتی گو روزہ باطل نہیں ہوتا پس ثابت ہوگیا کہ جو اعمال ہم جنس نہیں وہ بھی باہم ایک دوسرے کے مکمل ہیں لہٰذا چھوٹی شے کو بے وقعت نہ سمجھنا چاہیے چھوٹی اشیاء بڑوں کی حفاظت کے لئے ہوتی ہیں۔

حسن معاشرت:۔

یہ گفتگو تو اس بات کے تسلیم کر لینے پر تھی کہ یہاں اس آیت میں جو تعلیم دی گئی ہے وہ چھوٹی اور معمولی بات ہے اور دوسرا جواب تحقیقی یہ ہے کہ یہ تعلیم درحقیقت معمولی نہیں بلکہ بہت بڑی ضروری تعلیم ہے آپ نے اس کی ظاہری صورت پر نظر کی ہے حقیقت پر نظر نہیں کی حقیقت میں یہاں حق تعالیٰ نے ہم کو تواضع کی اور ترک تکبر کی تعلیم دی ہے اور میں عنقریب واضح کر دوں گا کہ تکبر کتنی سخت چیز ہے مگر افسوس ہے کہ ہم لوگوں کو اس کا احساس نہیں بہرحال اس زمانہ میں یہ عام غلطی ہے کہ جو دیندار بھی ہیں وہ عقائد اور نماز روزہ اور اوضاع لباس کا تو ضرور اہتمام کرتے ہیں مگر اخلاق و معاشرت اکثر کی نہایت گندی ہے بعضے آدمی تو اخلاق و معاشرت کی طرح معاملات کو بھی دین سے خارج سمجھتے ہیں مگر خیر متقی لوگوں نے معاملات کا تو خیال کیا مگر معاشرت اخلاق کو تقریباً سب ہی نے بالائے طاق رکھ دیا ہے حالانکہ حسن معاشرت کا معاملات سے بھی زیادہ خیال رکھنا لازمی ہے اس وجہ سے کہ معاملات کا اثر تو اکثر مال پر ہوتا ہے اور معاشرت کا اثر قلب پر ہوتا ہے اور قلب پر جو اثر ہو مال کے اثر سے زیادہ گراں اور موجب صدمہ ہوتا ہے مثلاً ایک شخص آپ کے پاس آیا اور آپ نے اس کی طرف التفات نہ فرمایا اس کی بات کا جواب نہ دیا اس سے

اس کا دل دکھا تو اس اخلال معاشرت کا اثر اس کے قلب تک پہنچا یا ماں باپ کی نافرمانی کی ان کا دل دکھایا تو یہ آثار موذیہ اخلال معاشرت سے اور اس کو ضروری نہ سمجھنے سے پیدا ہوئے پس ثابت ہوا کہ حسن معاشرت حسن معاملہ سے بھی زیادہ ضروری ہے عارف شیرازی کا قول ہے

مباش درپئے آزار ہر چہ خواہی کن　　　که در طریقت ما غیر ازیں گناہ نیست

یعنی برابر ایں گناہے نیست اور اس شعر میں جو "ہر چہ خواہی کن" کہا گیا ہے یہ یا تو مبالغہ پر محمول ہے یا اس کو عموم لیا جاوے۔ یا اس کو خاص کہا جاوے غیر معاصی کے ساتھ اور "مباش درپئے آزار" کو تمام معاصی کے لئے عام لے لیا جاوے تو تقریر مقصود کی یہ ہوگی کہ جس طرح اخلاق معاشرت سے دوسروں کو آزار ہوتا ہے اسی طرح جمیع معاشی سے مثلاً نماز نہ پڑھنے سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو بوجہ شفقت کے آزار ہوتا ہے اور تکلیف پہنچتی ہے چنانچہ ایک آیت کریمہ سے یہ بات صاف ظاہر ہے۔

فَلَعَلَّكَ بَاخِعٌ نَّفْسَكَ عَلٰٓى اٰثَارِهِمْ اِنْ لَّمْ يُؤْمِنُوْا بِهٰذَا الْحَدِيْثِ اَسَفًا

"یعنی شاید آپ ان کے پیچھے اگر یہ لوگ اس مضمون قرآنی پر ایمان نہ لائے غم سے اپنی جان دے دیں گے۔"

یعنی اتنا غم نہ کیجئے کہ قریب بہ ہلاک ہو جائیں اس سے صاف ظاہر ہے کہ حضور کو بوجہ شفقت کے مخلوق کی بدحالی پر بے حد رنج ہوتا تھا۔ دیکھئے مدرس کو جب شفقت زیادہ ہوتی ہے اور مقصود مدرس کا یہ ہو کہ کسی صورت سے یہ پڑھنے والے کتاب سمجھ جاویں تو اس کو ان کے نہ سمجھنے سے تکلیف ہوتی ہے اسی لئے وہ تقریر کے بعد سوال کیا کرتا ہے کہ سمجھ بھی گئے اور اس کا منشاء محض شفقت ہے۔ اسی طرح جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بعد تبلیغ کے صحابہؓ سے فرمایا:

الا ھل بلغت الاھل بلغت ۔　(الصحیح للبخاری فی کتاب الحج باب الخطبۃ ایام منی رقم:۱۷۴۱،۳:۵۷۳)

صحابہؓ فرماتے "قلنا نعم آپؐ نے فرمایا اللھم اشھد (رواہ البخاری)

حضور کی شفقت کی یہ شان ہے کہ میں نے تیئس برس میں اس قدر تبلیغ کی اور اس قدر جانفشانی برداشت کی کہ کوئی نہیں کر سکتا کلیات کی علیحدہ تبلیغ فرمائی اور جزئیات کی علیحدہ پھر جزئیات میں ایک ایک جزئی کی تبلیغ فرما دی یہ تو تبلیغ قولی تھی پھر اس پر اکتفاء نہیں فرمایا بلکہ تبلیغ عملی بھی فرمائی یہ سب حضور کی شفقت ہے نیز صحابہؓ کا خلوص بھی قابل نظر ہے کیونکہ اگر صحابہؓ کی طلب کامل نہ ہوتی اور ان میں خلوص نہ ہوتا تو وہ علوم محفوظ نہ رہتے۔ مگر بحمد اللہ آج حضورؐ کے تمام علوم

محفوظ ہیں، جن کو دیکھ کر حیرت ہوتی ہے کہ آپؐ نے اس قلیل عرصہ میں اس قدر علوم کیونکر بیان فرمادیئے خصوصی جبکہ دیکھا یہ جاتا ہے کہ آپ محض تعلیم ہی کے کام کے لئے فارغ نہ تھے بلکہ اس کے ساتھ انتظام ملکی اور تدابیر غزوات کا کام بھی آپ کو بہت زیادہ کرنا پڑتا تھا حضورؐ کی اس شفقت کا خیال تو کیجئے کہ باوجود اس قدر مشاغل کثیرہ کے آپ نے کس قدر اور کس درجہ ہم کو معاشرت سکھلائی اور کس درجہ آداب مجالس سکھلائے کہ چھوٹی چھوٹی باتوں میں بھی ہم کو ایک دوسرے کو اذیت دینے سے بچایا ایک دو نمونہ بتلاتا ہوں غور کیجئے! کہ حضورؐ فرماتے ہیں کہ جب کسی مجمع میں تین آدمی ہوں تو دو آدمی علیحدہ سرگوشی نہ کریں جب تک کہ چوتھا آدمی نہ ہو دیکھئے آداب مجالس کی کس قدر رعایت فرمائی سلف صالحین کا معمول تھا کہ جب کسی مجلس میں چوتھا آدمی نہ ہوتا اور دوسرے آدمی سے تنہائی میں بات کرنی منظور ہوتی تو چوتھے آدمی کے آنے کا انتظار کرتے تاکہ وہ اس سے ہم کلام رہے اور اس کو توحش نہ ہو نہ تفرد سے اس خیال سے کہ مجھ سے ہی اخفاء راز تو مقصود ہے اور دیکھئے حضورؐ فرماتے ہیں کہ اگر کھانا کھاتے ہوئے لقمہ گر پڑے تو اس وقت یہ خلاف ادب ہے کہ اس کو چھوڑ دے بلکہ **فلیمطط عنه اذی** ''اس کو صاف کر کے کھالے''

دیکھئے کیسے چھوٹے چھوٹے اور دقیق دقیق امور پر آپ کی نظر تھی کسی بات کو چھوڑا نہیں اس تعلیم میں آپ نے کھانے کا کس قدر ادب تعلیم فرمایا ہے جس کی نظیر نہیں مل سکتی۔

عملی تعلیم اور اس کا اثر:۔

اس پر مجھے ایک حکایت یاد آئی ایک مرتبہ مجھے سفر کا اتفاق ہوا ریل میں ایک صاحب رئیس ہمراہ تھے انہوں نے کھانا جو کھایا اتفاق سے ایک بوٹی گر پڑی انہوں نے جوتا سے تختہ کے نیچے سرکادی چونکہ میں قولاً ان سے کچھ نہ کہہ سکتا تھا اس لئے میں نے عملاً حکم شرعی بتلانا چاہا تاکہ انہیں معلوم ہو جائے اس لئے میں نے اپنے ایک ساتھی سے کہا کہ اس بوٹی کو دھو کر مجھے دیدو میں کھاؤں گا انہوں نے کہا اگر میں کھالوں میں نے کہا یہ آپ کی ہمت ہے چنانچہ انہوں نے کھالی میرے اس طرز عمل کا ان پر بے حد اثر پڑا۔ اور دوسروں سے کہنے لگے کہ واقعی میری سمجھ میں آ گیا اگر دس برس تک بھی اس کے متعلق نصیحت کی جاتی تو دل میں نہ گھستی اور اس طریق سے ایک مرتبہ کا عمل عمر کے لئے کارگر ہو گیا صوفیہ پر یہ اعتراض کیا جاتا ہے کہ وہ امر بالمعروف نہیں کرتے حالانکہ یہ اعتراض بالکل لغو ہے ان کے برابر کوئی بھی امر بالمعروف نہیں کر سکتا، وہ تو

امر بالمعروف ایسا کرتے ہیں کہ اپنے اوپر جھیلتے ہیں یعنی وہ قولا امر بالمعروف کم کرتے ہیں زیادہ تر عملی تعلیم کرتے ہیں کیونکہ عملی تعلیم قولی تعلیم سے زیادہ موثر ہوتی ہے۔

اعمال کی پیشی :۔

اسی طرح حضورؐ نے بہت چھوٹے چھوٹے اعمال کا اہتمام کیا اور کوئی امر چھوڑا نہیں بلکہ ہر حکم کو عملاً دکھلا دیا تاکہ سامع پر زیادہ اثر ہو تو اسقدر اہتمام محض شفقت پر مبنی ہے مگر ہماری ایسی بری حالت ہے اگر صحابہؓ زندہ ہو کر ہمیں دیکھیں تو ہمیں حضورؐ کی امت میں خیال کرنا ان کو دشوار ہو جائے ہماری حالت تو اس قدر نکمی اور ردی ہو چکی ہے کہ قابل بیان نہیں نہ ہمارے عقائد کامل ہیں نہ اعمال و عبادات، نہ معاملات، نہ معاشرات، نہ اخلاق و اقوال و احوال، غرض ہر چیز ناقص اور کمزور ہے اور عوام نے تو ادب خداوندی تک کو بھی بالائے طاق رکھ دیا حتیٰ کہ نعوذ باللہ خدا تعالیٰ کی جناب میں گستاخی کرنا شروع کر دی چنانچہ امسال بارش بکثرت ہونے کے باعث ایک صاحب نے کسی گاؤں والے سے کہا کہ بھائی توبہ و استغفار کرو کہ ہمارے گناہوں کی شامت ہے جو اس قدر بارش ہے تو اس نے جواب دیا کہ ہمارے گھر میں تو اناج ہے جس کے گھر میں اناج نہ ہو تو وہ توبہ کرے افسوس آجکل یہ مسلمان ہیں اگر حضورؐ کے سامنے ہمارے یہ اعمال پیش ہوں تو حضورؐ کو کس قدر اذیت ہو گی اور اگر کیا معنی بلکہ یقیناً پیش ہوتے ہیں کیونکہ حدیث میں تصریح ہے کہ اعمال امت کے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے پیش کئے جاتے ہیں ہائے پھر آپ کو ہماری اس بدحالی پر کتنا رنج ہوتا ہوگا پس۔

مباش درپے آزار ہر چہ خواہی کن (کسی کو تکلیف پہنچانے سے بچو اور جو جی چاہے کرو)

اگر مبالغہ پر بھی محمول نہ کیا جائے تب بھی یہ کلام درست ہے اور اس سے کسی گناہ کی اجازت مفہوم نہیں ہو سکتی کیونکہ گناہوں سے اگر اور کسی کو بھی ایذا نہ ہو تو حضورؐ کو ایذا ہوتی ہے اور حضورؐ سے زیادہ مسلمانوں کیلئے کون ہے جس کا خوش کرنا مطلوب ہو اس پر مجھے مرزا بیدل کی ایک حکایت یاد آ گئی۔

آج کل کا تصوف :۔

مرزا بے دل کا کلام صوفیہ کے طرز پر ہوتا تھا ایک ایرانی ان کا کلام دیکھ کر اور بزرگ سمجھ کر ان سے ملنے کے لئے دہلی آیا یہ اس وقت ڈاڑھی ترشوار ہے تھے۔ اس شخص نے یہ منظر دیکھ کر کہا آغا

ریش مے تراشی (جناب کیا تم اپنی ڈاڑھی کٹا رہے ہو) انہوں نے متعارف صوفیانہ جواب دیا کیونکہ تصوف تو بڑی سستی چیز ہوگئی ہے بس ایک دو نکتے یاد کر لئے اور صوفی بن گئے آج کل تصوف محض نکتوں کا نام رہ گیا ہے گو وہ نکتے جاہلانہ ہی ہوں جیسے ایک صاحب نے **والضحٰی واللیل اذا سجٰی** (ترجمہ:۔قسم ہے دن کی روشنی کی اور رات کی جبکہ وہ قرار پکڑے)

کا ترجمہ کیا تھا "اے نفس تیری یہی سجا (سزا) ہے ہمارے ماموں صاحب سے کسی صوفی جاہل نے دریافت کیا تھا کہ بتا رزق بڑا ہے یا محمدؐ؟ ماموں صاحب نے کہا کہ اول تو اس کی کوئی جزئی تعلیم نہیں دی گئی مگر پھر بھی قواعد کلیہ سے حضورؐ ہی کا رتبہ بڑا معلوم ہوتا ہے۔ کہنے لگا تو بے پیرا معلوم ہوتا ہے دیکھ۔

اشھد ان محمدا رسول اللہ ۔ (بے شک میں گواہی دیتا ہوں کہ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم اللہ کے رسول ہیں۔)

میں پہلے ان (رزق) کا نام آیا ہے پیچھے حضور کا معلوم ہوا کہ ان بڑا ہے کیا واہیات ہے بھلا کلمہ کے اندر حرف مشبہ بالفعل ہے یا ہندی کا ان ہے۔

اسی طرح مولوی فیض الحسن صاحب سے کسی فقیر نے دریافت کیا کہ بتلا چار میم کون سے ہیں ظاہر ہے کہ مولوی صاحب اس مہمل سوال کا کیا جواب دیتے تو وہ شاہ صاحب کہتے ہیں کہ دیکھ مکہ، مدینہ، مولا، محمد۔ کانپور میں ایک صوفی صاحب آئے بتلاؤ آسمان پر کیا چیز نہیں زمین پر کیا چیز نہیں قرآن میں کیا چیز نہیں پھر خود ہی بولے آسمان پر قبر نہیں زمین پر ستارہ نہیں اور قرآن میں جھوٹ نہیں یہ تصوف رہ گیا ہے آج کل سو مرزا بیدل نے بھی ایسا ہی ایک نکتہ ہانکا کہ "بلی ریش میتراشم و لے دل کسے نمی تراشم۔ یعنی

(ترجمہ:۔ہاں میں اپنی ڈاڑھی منڈا رہا ہوں لیکن کسی کا دل نہیں دکھا رہا۔)

مباش درپئے آزار ہرچہ خواہی کن (کسی کو تکلیف نہ پہنچاؤ جو جی چاہے کرو)

یہ میرا عمل ہے ایرانی سچا طالب تھا اس نے ایسا منہ توڑ جواب دیا کہ مرزا بیدل ہونٹ چاٹتے رہ گئے ایرانی نے کہا بلی دل رسول اللہ می خراشی (ہاں ہاں تم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا دل دکھا رہے ہو) یہ سن کر تو مرزا بیدل کی آنکھیں کھل گئیں اور ایک وجد کی سی کیفیت طاری ہوگئی اور بزبان حال یہ شعر پڑھنے لگے۔

جزاک اللہ کہ چشمم باز کردی　　　مرا با جان جاں ہمراز کردی

ترجمہ:۔اللہ تعالیٰ تمہیں جزائے خیر عطا فرمائے کہ تم نے میری آنکھیں کھول دیں اور مجھے اپنے محبوب سے ہمراز کر دیا۔

حقوق العباد کی اہمیت:۔

اب وہ شبہ جاتا رہا کہ نماز روزہ کے چھوڑنے میں کسی کو تکلیف نہیں پہنچتی۔اس لئے نماز و روزہ کے ترک میں مضائقہ نہیں صاحبو! اس سے تو اس ذات کو تکلیف پہنچتی ہے جس سے بڑھ کر مسلمان کو کوئی چیز بھی محبوب نہیں غرض میں یہ کہہ رہا تھا کہ معاملات سے زیادہ معاشرات کا اہتمام ضروری ہے کیونکہ معاملات کی اصلاح میں تو زیادہ معاشرات کا اہتمام ضروری ہے کیونکہ معاملات کی اصلاح میں تو زیادہ لوگوں کے مال کی حفاظت ہے اور حسن معاشرت میں مسلمانوں کے قلب کی حفاظت ہے اور ظاہر ہے کہ مال سے دل کا رتبہ بڑھا ہوا ہے اور نیز معاشرت کی اصلاح میں علاوہ قلوب کے لوگوں کی آبرو کی بھی حفاظت ہے اور ظاہر ہے کہ آبرو کی حفاظت بعد ایمان کے ہر چیز سے زیادہ ضروری ہے۔عرفاً بھی شریف آدمی مال بلکہ جان سے بھی زیادہ آبرو سمجھتا ہے۔ چنانچہ جان بچانے کے لئے تو شریف آدمی مال کو خرچ کرتا ہے اور آبرو بچانے کے لئے تو شریف آدمی جان و مال دونوں کو قربان کر دیتا ہے اور حدیث حقوق میں بھی تینوں کی حفاظت مامور بہ ہے حضور صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں۔

الا وان اللہ تعالیٰ حرم علیکم دمائکم واموالکم واعراضکم کحرمتہ یومکم فی شھر کما ھذا وفی بلدکم ھذا۔ (الصحیح للبخاری فی کتاب الحج باب الخطبہ ایام منی رقم:۴۱، ۱۷۴۱:۳،۴:۳ ۵۷۳)

''حضورؐ نے حجتہ الوداع میں یہ ارشاد فرمایا کہ خون یعنی جان و مال اور آبرو باہم ایک دوسرے پر قیامت تک ویسے ہی حرام ہیں جیسے آج کے محترم دن میں محترم مہینے میں اور محترم بلد میں حرام ہیں۔''

پس مسلمانوں کے مال کی بھی حفاظت کرو جان کی بھی حفاظت کرو آبرو کی بھی حفاظت کرو اس لئے کہ حقوق العباد میں یہ سب داخل ہیں صرف مالی حقوق کا نام حقوق العباد نہیں اور یہ معاشرت بعض حیثیات سے نماز، روزہ، وغیرہ سے بھی قابل اہتمام ہے کیونکہ عبادات کے اخلال سے صرف اپنا ضرر ہے اور معاشرت کے اخلال سے دوسروں کا ضرر، اسی لئے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے معاشرت کا بہت اہتمام فرمایا ہے ایک ایک کر کے تمام فرما دی چنانچہ ارشاد ہے:

اذا جاء کم کریم قوم فاکرموہ۔ (المعجم الکبیر للطبرانی ۲:۳۳۴، اتحاف السادۃ ۴:۱۸۲)

''کہ جب تمہارے پاس کسی قوم کا سردار آوے اس کی تعظیم کرو'' تذلیل نہ کرو خصوصیت نہ کرو

حضورؐ کے اصحاب پڑوسی یہودی تک کو ہدیہ دیا کرتے تھے اور بیماری میں اس کی عیادت کرتے اسی طرح ایک یہودی کا قرضہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم پر تھا اس نے مسجد میں آ کر مانگا اس وقت آپ کے پاس موجود نہ تھا آپ نے فرمایا پھر لے لینا یہودی نے کہا میں تو لے کر جاؤں گا۔ اللہ اکبر! کس درجہ حسن معاشرت تھی کہ رعیت کا ادنیٰ آدمی بھی جو چاہے کہے اور آپ باوجود ہر طرح اختیار وقدرت کے انتقام نہیں لیتے صحابہ نے کچھ کہنا بھی چاہا حضورؐ نے روک دیا اور فرمایا کہ:

ان لصاحب الحق مقالا ۔(الصحیح للبخاری ۳:۱۳۰، ۱۵۳، ۱۵۵، ۱۱۱، ۵، الصحیح لمسلم کتاب المساقات:۱۴۰)

کہ صاحب حق کو تقاضے کا حق ہے" چنانچہ وہ بیٹھا رہا اور رات کو حضورؐ کو گھر بھی نہ جانے دیا تو آپ مسجد میں ہی رہے صبح کی نماز پڑھی یہ حال دیکھ کر بعد نماز اس یہودی نے کہا میں نے تورات میں پڑھا تھا کہ نبی آخر الزمان کے یہ صفات ہیں میں نے اور تو سب صفات دیکھ لئے صرف صفت حلم کا امتحان باقی تھا سو آج اس کا بھی امتحان ہو گیا واقعی آپ سچے نبی ہیں۔

اشهد ان لا اله الا الله واشهد ان محمدا رسول الله.

مسلمان ہو گیا صاحبو! حضورؐ نے جب غیر مسلم کی اس قدر رعایت کی ہے تو مسلم کی تو کس درجہ رعایت فرماتے ہوں گے۔

جانوروں کے حقوق:۔

پھر غیر مسلم آدمی تو ہے حضورؐ نے جانوروں پر بھی رحم کا حکم فرمایا ہے اور ان کے حقوق بھی بیان فرمائے ہیں چنانچہ حکم ہے کہ جانوروں کو زیادہ نہ مارو بھوکا نہ رکھو تحمل سے زیادہ کام نہ لو زیادہ بوجھ نہ لادو مجھے یاد آیا کہ ایک صاحب نے مجھے خط میں لکھا تھا کہ جانوروں کے حقوق میں اب تک کوئی کتاب نہیں لکھی گئی تو واقعی اس وقت تک کوئی کتاب مستقل نہیں لکھی گئی تھی۔ اور ضرورت تھی اس لئے میں نے "**ارشاد الهائم فی حقوق البهائم**"

کتاب لکھی ہے جانور رکھنے والوں کو اس کتاب کے رکھنے کی ضرورت ہے اس سے معلوم ہوگا کہ شریعت میں جانوروں کے کس درجہ کے حقوق ہیں حدیث شریف میں بنی اسرائیل کی ایک عورت کا قصہ مذکور ہے کہ اس نے ایک بلی کو باندھ رکھا تھا نہ تو چھوڑتی تھی نہ کچھ کھانے کو دیتی تھی پھر حضورؐ نے دوزخ میں اس کا عذاب دیا جانا دیکھا دیکھئے ایک بلی کے ستانے پر اسے عذاب ہوا اور جانور کو

تکلیف پہنچانے پر وہ معذب تھی ہماری حالت یہ ہے کہ عام انسان اور عام مسلمان کا تو کیا خیال کرتے ہم تو حقیقی بھائی کو تکلیف پہنچانے پر کمر بستہ ہیں جائیداد دبانے کو تیار ہیں بلکہ ہم لوگوں کی معاشرت اعزہ اقارب کے ساتھ زیادہ خراب ہے حالانکہ ہم جانوروں پر تک بھی رحم کرنے کے لئے مامور ہیں یاد رکھنا چاہئے کہ ان افعال پر ضرور ہم سے سوال ہوگا حاصل یہ ہے کہ شریعت نے معاشرت کے بارہ میں بھی بہت زیادہ اہتمام کیا ہے اسلام بڑی چیز ہے اسلام نے ہمیں تمام ضروری امور سکھلائے ہیں تاکہ اسلام پر بالکل دھبہ نہ رہے کہ اس میں فلاں بات کی کمی ہے فلاں پہلو کی رعایت نہیں سو بحمد اللہ اسلام کامل مکمل شریعت ہے اور کیوں نہ ہو خدا کا بھیجا ہوا دین ہے اور حق تعالیٰ تو ماں باپ سے زیادہ شفیق ہیں اور شفیق اپنے علم میں کسی ضروری بات کو نہیں چھوڑتا اس لئے حق تعالیٰ نے کسی ضروری بات کو اسلام میں نہیں چھوڑا اور حق تعالیٰ کا علم کامل ہے۔ اس لئے واقع میں بھی کوئی ضروری بات نہیں رہی بلکہ ادنیٰ سے ادنیٰ بات کی بھی تعلیم رسولؐ کے واسطہ سے کردی ہے۔

شفقت پر گرانی:۔

گو ہم کو بعض پابندیاں گراں ہوتی ہیں مگر شفقت کا یہی مقتضیٰ ہے کہ باوجود گرانی مخاطب کے پھر بھی اس کو نفع پہنچایا جائے چنانچہ میرا ہی واقعہ ہے کہ بچپن میں مجھے کنکوے کا شوق تھا جہاں چھٹی ملی کنکوا لیکر باہر چلدیا اور سر پر بال بھی رکھے ہوئے تھے اتفاق سے میرے بالوں میں جوئیں پڑ گئیں میری والدہ صاحبہ کا تو انتقال ہوگیا تھا اپنی تائی صاحبہ کی پرورش میں تھا ان کو شفقت و محبت زیادہ تھی انہوں نے کئی بار سر دھونے کیلئے مجھے کہا مگر میں حسب معمول کنکوا لیکر چلدیتا ایک روز انہوں نے پہلے ہی سے کھلی گھول کر رکھ لی تھی میرے آتے ہی موقع پا کر سر میں لپیٹ دی بس اب میں مجبور ہوگیا بدوں دھلوائے کہاں جاسکتا تھا دیکھئے اس وقت ان کا یہ فعل ناگوار تھا مجھ کو خبر ہی نہ تھی کہ میرے لئے کیا مفید ہے مریض کو کیا خبر کہ میرے لئے کیا نافع ہے مگر ان کی یہ عنایت اور شفقت تھی کہ مجھے مجبور کر کے راحت پہنچاتی رہیں یہی برتاؤ حق تعالیٰ کا ہمارے ساتھ ہے کہ ہم بعض دفعہ احکام سے تنگ ہوتے ہیں مگر حق تعالیٰ مجبور کرتے ہیں۔ کہ تم کو ایسا ہی کرنا پڑے گا شفقت کا ایک اور واقعہ یاد آیا ایک شخص ہمارے یہاں آنکھ بناتے تھے ایک شخص آنکھ بنوانے آیا انہوں نے کام شروع کیا تو وہ تکلیف کے خوف سے ان کو برا بھلا کہہ رہا تھا مگر وہ ہنس رہے تھے اور آنکھ بنا رہے تھے اگر شفقت نہ ہوتی تو بیچ

ہی میں کام چھوڑ دیتے مگر انہوں نے مریض کی ناگواری پر اصلاً نظر نہیں کی بلکہ غایت شفقت سے نشتر لگاتے رہے ہمارے یہاں کے ایک رئیس نے جو اس وقت موجود تھے ان سے کہا بھی کہ دیکھئے یہ کیا بکتا ہے مگر انہوں نے جواب دیا کہ تھوڑی دیر میں دیکھنا جب نظر آنے لگے گا تو کیسی دعائیں دیتا ہے۔ اسی طرح حق جل شانہ اور جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیم پر عمل کرنے کا نتیجہ آخرت میں ہم پر روشن وظاہر ہو جائے گا۔ گو اس وقت ہم کو گرانی ہوتی ہے حق تعالیٰ فرماتے ہیں:

فَكَشَفْنَا عَنْكَ غِطَآءَكَ فَبَصَرُكَ الْيَوْمَ حَدِيْدٌ

ترجمہ:۔ ہم نے آپ کی نظر سے پردہ ہٹا دیا پس آج آپ کی نظر بہت تیز ہے۔

غرض حضورؐ نے عقائد و اعمال، معاملات، معاشرت تمام امور ہم کو سکھلائے تاکہ ہم اپنی اصلاح کرلیں۔

اسلام پر اعتراض کی وجہ:۔

مگر اب ہماری حالت ایسی خراب ہے کہ دیگر اقوام کے لوگ ہماری حالت دیکھ کر اسلام پر اعتراض کرتے ہیں افسوس ہے کہ ایک زمانہ وہ تھا کہ اہل اسلام کے کارناموں کو دیکھ کر لوگ مسلمان ہوتے تھے آج مسلمانوں کی حالت دیکھ کر لوگ اسلام سے منحرف ہو جاتے ہیں چنانچہ مدراس کا قصہ سنا ہے کہ ایک انگریز اسلام کی خوبیاں دیکھ کر مسلمان ہو گیا تھا اتفاقاً مسجد میں آیا تو مسجد میں دیکھا کہ نالی میں تھوک وغیرہ بہت پڑا ہے اور مسجد بھی صاف نہیں اس نے صفائی کی نسبت لوگوں سے کہا سب لوگ اس کے پیچھے پڑ گئے کہ یہ تو ابھی تک عیسائی ہے کہ صفائی صفائی پکار رہا ہے اور اس کو مسجد سے نکال دیا بعض ذی فہم مسلمانوں کو اطلاع ہوئی انہوں نے ان صاحب سے معذرت کی یہ لوگ ناواقف تھے آپ کچھ خیال نہ کریں اس نومسلم نے جواب دیا کہ میں اسلام کے محاسن اور کارنامے دیکھ کر مسلمان ہوا ہوں میں جانتا ہوں کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم صفائی کا بہت اہتمام فرماتے تھے صاحبو! صفائی تو دراصل ہمارے ہاں کی چیز ہے۔ جو آجکل عیسائیوں نے لے لی ہے اور مسلمانوں نے ایسی چھوڑ دی ہے کہ اگر کوئی صفائی برتے تو عیسائی کے نام سے موسوم ہوتا ہے۔ صفائی کے باب میں حدیث ہے:

ان اللہ نظیف یحب النظافۃ۔ (مناھل الصفا:۶، اتحاف السادۃ ۲:۳۱۱)

ترجمہ:۔ بے شک اللہ تعالیٰ نظیف ہیں نظافت کو پسند فرماتے ہیں۔

اور دوسری حدیث میں ہے:

"نظفوا افنیتکم" (اپنے صحنوں کی صفائی کرو)(سنن الترمذی:۲۷۹۹)

اسلام کے برابر تو طہارت و نظافت کسی مذہب میں بھی نہیں مگر اس کا یہ مطلب نہیں کہ استری اور کلف کا اہتمام کرو اور ہر وقت بنے ٹھنے رہو کیونکہ اس کا نام نظافت نہیں بلکہ یہ تصنع اور تکلف ہے اور تن آرائی ہے اس کے متعلق حدیث میں ہے:

البذادة من الایمان. کہ "سادگی ایمان کا جزو ہے (سنن ابن ماجہ:۴۱۱۸، المستدرک للحکم ۹:۱)

بذاذت کے معنی میلا کچیلا رہنے کے نہیں بلکہ سادگی سے رہنے کے ہیں پس نظافت اور طہارت کی حقیقت یہ ہے کہ کپڑے اور بدن کو پاک صاف رکھو اور میلا ہو جائے تو دھوڈالو صاف ہو جاؤ اور پاک ہو جاؤ اور پاک بن جاؤ شریعت اسلامیہ میں طہارت کی تو بہت زیادہ تاکید ہے، کہ بدوں طہارت کے نماز نہیں ہوتی اور گو بدوں نظافت کے ہو جاتی ہے مگر بد ہیئت سے نماز پڑھنا مکروہ ہے یہ بھی حکم ہے کہ جس شخص کے کپڑوں میں سے پسینہ کی سخت بدبو آ رہی ہو اس کو جماعت میں شریک ہونا مکروہ وممنوع ہے مگر آج کل ہماری وہ حالت ہے کہ مولانا نے مثنوی میں حکایت لکھی ہے کہ ایک کافر لڑکی اسلام کی طرف راغب تھی اتفاق سے اس کے گھر کے قریب مسجد میں ایک مؤذن بدآواز آ گیا اس نے جو اذان دی تو لڑکی نے باپ سے دریافت کیا کہ ابا یہ کیا ہو رہا ہے باپ نے جواب دیا بیٹی تو جس مذہب کی طرف راغب ہے یہ اس کی اذان ہے لڑکی یہ سن کر اسلام سے دل پھر گیا تو اس کا باپ اس خوشی میں کچھ ہدیہ لے کر اس مؤذن صاحب کے پاس آیا کہ اس شخص کے سبب مجھ کو یہ خوشی نصیب ہوئی موذن صاحب سمجھے یہ مجھ سے بہت راضی اور خوش ہے اس لئے ہدیہ لایا ہے مگر جب وہ واقعہ معلوم ہوا تب حقیقت حال منکشف ہوئی یہی ہماری حالت آج کل ہے کہ ہم کو دیکھ کر کفار اسلام سے ہٹنے لگے ہیں حالانکہ فی نفسہ اسلام کی یہ حالت ہے۔

زفرق تا بقدم ہر کجا کہ می نگرم   کرشمہ دامن دل میکشد کہ جا اینجاست

ترجمہ:۔ سر سے قدم تک جس جگہ دیکھتا ہوں کرشمہ دامن دل کو کھینچتا ہے کہ یہی جگہ محبوب کی ہے۔

حقانیت اسلام:۔

صاحبو! مسلمانوں کی تو یہ حالت تھی کہ حضرت علیؓ کی زرہ چوری ہو گئی تھی، آپ نے اس کو

ایک یہودی کے پاس دیکھا اس سے مطالبہ کیا، اس نے نہ دی، اور کہا کہ یہ تو میری ہے، آپ باوجود اس کے کہ خلیفہ تھے، مگر اس کو لیکر مدعی بن کر حضرت شریح (قاضی) کے یہاں پہنچے، قاضی صاحب نے گواہوں کو طلب کیا۔ حضرت علی کرم اللہ وجہہ، نے اپنے صاحبزادہ اور ایک آزاد شدہ غلام کو گواہی میں پیش کیا۔ حضرت علیؓ کے نزدیک ولد عادل کی گواہی باپ کے موافق جائز تھی، مگر قاضی شریح کے نزدیک جائز نہ تھی، اس لئے قاضی صاحب نے صاحبزادے کی گواہی رد کردی، اللہ اکبر! ایک بادشاہ وقت کی چیز چوری ہو جائے اور بادشاہ اس کو پہچان لے، اور ایک ادنیٰ آدمی رعیت کا جو کہ مسلمان بھی نہ ہو بے تکلف اپنی ظاہر کرے پھر بادشاہ اپنے ہی ماتحت قاضی کے یہاں محاکمہ کے لئے جاویں اور صاحبزادہ کو گواہی میں پیش کریں جو کہ اہل جنت کے سردار ہیں اور قاضی صاحب ان کی گواہی قبول نہ کریں اور زرہ یہودی کو دلوادیں اور خلیفہ اس کو قبول کرلیں۔ آخر یہ حقانیت ان کو بجز تعلیم اسلام کے کس نے دی ہے۔ پس اسلام یقیناً حق ہے، یہودی یہ حالت دیکھ کر فوراً مسلمان ہو گیا اور حضرت علیؓ سے بیعت ہو گیا اور جنگ صفین میں شہید ہوا۔

اصلاح اخلاق:۔

مسلمانوں کے یہ اخلاق تھے، مگر اب ہمارے اخلاق دیکھ کر مسلمانوں کو بھی دین سے نفرت ہو جاتی ہے۔ غرض ہمیں نماز روزہ کا تو خیال ہے مگر اخلاق کا بالکل خیال نہیں، ظاہر میں اخلاق چھوٹی چیز ہے مگر واقع میں بہت بڑی چیز ہے، کیونکہ تمام اعمال کی جڑ اخلاق ہی ہے، حقیقت اس کی یہ ہے کہ ایک درجہ منشاء کا ہوتا ہے اور ایک ناشی کا۔ یعنی ایک تو افعال ہوتے ہیں اور ایک ملکات، اور ملکات اصل ہیں افعال فرع، ملکات ہی سے اعمال ناشی ہوتے ہیں جس میں جیسے اخلاق ہوتے ہیں ویسے ہی اس سے افعال سرزد ہوتے ہیں، مثلاً آپ نے کسی پہ ظلم کیا یا سخت کلامی کی کہ اس کا منشاء تکبر ہے، اگر آپ میں تکبر نہ ہوتا تو یہ عمل سرزد نہ ہوتا، اور یقیناً ظلم بری چیز ہے۔ اور اس کی اصلاح واجب ہے، تو پھر تکبر کی اصلاح کیوں نہ واجب ہوگی جو کہ ظلم کا منشاء ہے اور جس کی اصلاح کے بغیر ظلم کی اصلاح ہو ہی نہیں سکتی، مگر ہماری غلطی یہ ہے کہ افعال پر تو ہم کو نظر ہے ملکات پر نہیں اور وجہ اس کی یہ ہے کہ ملکات کی اصلاح نفس کو گوارہ ہے، اعمال اس درجہ گراں نہیں، اس لئے اخلاق کو بالکل چھوڑ دیا ہے، جس کا منشاء یہ ہے کہ ہم کو اس کی ضرورت ہی کا

احساس نہیں، اگر ان کو ضروری سمجھتے تو پھر گرانی کا خیال ہرگز نہ کرتے، جیسے پھل توڑنے میں کانٹوں کا لگنا ناگوار نہیں ہوتا، چونکہ پھل توڑنا ضروری چیز ہے اس لئے کانٹوں کا خیال نہ کیا جاوے گا۔ اسی طرح اگر اخلاق کی ضرورت کا احساس ہو جاوے تو پھر اس کی اصلاح میں کتنی ہی مشقت ہو سب گوارا ہو جاوے۔ اس لئے اعمال سے پہلے ان کی جڑ یعنی اخلاق کی اصلاح کرو۔

اخلاق اور تکبر کا اثر:۔

سو ایک فرق تو اعمال میں منشاء اور ناشی ہونے کا ہے، اور ایک فرق یہ ہے کہ ترک اخلاق کا اثر یہ ہوتا ہے کہ ایسے شخص سے عام نفرت ہو جاتی ہے برخلاف نماز روزہ کے اس کے تارک سے نفرت نہیں ہوتی۔ شاید کوئی یہ کہے کہ صاحب! متکبروں سے نفرت کہاں ہے ان کی تو تعظیم کی جاتی ہے سو یاد رکھو کہ لوگ متکبر کی تعظیم خوف کی وجہ سے کرتے ہیں محبت سے نہیں کرتے۔ اور وہ تعظیم ایسی ہے جیسے اس مجلس میں اگر بھیڑیا آ جائے اور اس کی وجہ سے آدمی کھڑے ہو جاویں تو آپ خود انصاف کر لیں کہ یہ کھڑا ہونا کیسا ہوگا، کیا تعظیم کے لئے ہوگا یا وحشت کے سبب ہوگا، اسی طرح متکبر کی تعظیم کو سمجھو، کہ دل سے نہیں بلکہ اس پر چونکہ قدرت نہیں اس لئے صورۃً اس کی تعظیم کی جاتی ہے۔ چنانچہ ظالم اگر معزول ہو کر کسی مقدمہ میں گرفتار ہو کر جیل خانہ میں چلا جائے تب دیکھیں اس کی کیسی تعظیم ہوتی ہے، جبکہ وہاں تو قدرت اور موقع ملنے کی وجہ سے ہر شخص بدلہ لینے پر تیار ہو جاتا ہے اور اس کے مقابل ایک اللہ والا ہے اگر اس پر اتفاقاً صورتاً تکلیف بھی ہو جائے تو اس کی تکلیف کا سبب آدمی تذکرہ کرتے ہیں اور افسوس کرتے ہیں اور حتی الوسع اس کو آرام پہنچانے کی کوشش کرتے ہیں۔ چنانچہ ہمارے ایک بزرگ زمانہ غدر میں ماخوذ ہو کر جیل خانہ میں لے جائے جا رہے تھے، اتفاق سے نماز کا وقت آ گیا، ان بزرگ نے پولیس کے افسر سے جو کہ ہندو سکھ تھا، اجازت چاہی'' داروغہ نے کانسٹیبلوں سے کہا کہ بھائی انہیں چھوڑ دو۔ اور بیڑیاں کھول دو۔ یہ ایماندار آدمی معلوم ہوتے ہیں یقین ہے کہ یہ دھوکہ نہ دیں گے۔ صاحبو! یہ اثر ہے اللہ والوں کے اخلاق کا اور تکبر کا یہ اثر ہے کہ اس کے مرتکب سے نفرت ہوتی ہے تو جس کے یہ آثار ہوں۔ آپ ہی انصاف کیجئے کہ وہ چھوٹی چیز کیسے ہو سکتی ہے اور اخروی اثر یہ ہے کہ حدیث میں ہے کہ متکبر جنت میں نہ جائے گا۔ اب اس حدیث کے جو بھی معنی ہوں مگر ہر اعتبار سے یہ تھوڑی وعید ہے، سو اگر اب بھی تکبر چھوٹی اور

خفیف شئے ہے تو اس کی وہی مثال ہوگی جیسے ایک طبیب ناواقف نے کسی کو مسہل دیا تھا، اس سے دست آنے شروع ہوئے، طبیب صاحب سے ظاہر کیا گیا دست بکثرت آرہے ہیں فرمایا آنے دو، مادہ خارج ہو رہا ہے، چند بار اسی صورت سے شکایت کی گئی مگر طبیب نے ہر بار وہی کہا کہ آنے دو مادہ نکل رہا ہے۔ غرض اس قدر دست آئے کہ مریض مر گیا، اعزہ نے پھر اطلاع دی کہ صاحب! وہ تو مر گیا فرمانے لگے اللہ اکبر کس درجہ مادہ سخت تھا کہ خروج کے بعد بھی مار دیا، اگر یہ مادہ باقی رہتا تو نا معلوم کیا حالت ہوتی۔ جاہل! ارے اس سے زیادہ اور کیا ہوتا سو جس طرح دستوں کا آنا اس جاہل کے لئے معمولی اور خفیف بات تھی، اسی طرح اگر تکبر بھی جس کا انجام دوزخ میں جانا ہے خفیف اور معمولی بات ہے جناب ہی فرمادیں کہ اس سے بڑی بات اور کیا ہے، اس سخت مرض کے علاج میں جو میں خاص اہتمام کرتا ہوں اس کی بدولت بدنام ہوں کہ بہت تیز مزاج ہے، اس کے یہاں ذرا ذرا سی بات پر گرفت ہوتی ہے اور بعض لوگ اس تیزی کو جو کہ تکبر کا علاج ہے تکبر پر محمول کرتے ہیں، مگر میں دعویٰ سے نہیں کہتا، خدا کی نعمت بیان کرتا ہوں کہ الحمد للہ میرے اندر تکبر نہیں ہے، مگر لوگوں کو تکبر کی حقیقت کا علم نہیں، اس لئے بدگمانی ہے۔

عجب کا علاج:۔

طبیب شفقت کی بناء پر لوگوں کے امراض کا اظہار کرے اور مریض اسے سختی سمجھیں، تو آپ ہی بتلایئے کہ علاج کی کیا سبیل ہو سکتی ہے اور امراض باطنہ کا علاج کس صورت میں ہو سکتا ہے، افسوس اصلاح کے متعلق ہم لوگوں کی تو یہ حالت ہے، کہ اس معاملہ میں طبیب روحانی کی ذرا سی تدبیر کو بھی سختی سمجھتے ہیں اور سلف صالحین کی یہ حالت تھی کہ تکبر و عجب وغیرہ کی اصلاح میں مریدوں سے بڑے بڑے مجاہدے کراتے تھے اور سختی نہیں سمجھی جاتی تھی، چنانچہ ذوالنون مصری کی حکایت ہے کہ ایک مرید نے ایک دفعہ آکر شیخ سے عرض کیا کہ حضرت فلاں مرید نے شراب پی رکھی ہے اور شراب کے نشہ میں شراب خانہ کے دروازہ پر پڑا ہے، حضرت نے فرمایا کہ تم شراب خانہ سے اس کو اٹھا کر لاؤ۔ شیخ کا حکم تھا۔ ہر چند کہ نفس پر ثقیل اور شاق گزرا مگر مجبوراً شراب خانہ کی طرف چلے اور اس کو کمر پر لاد کر واپس ہوئے۔ لوگوں نے دیکھ کر دونوں کو برا بھلا کہنا شروع کیا کہ میاں دونوں شرابی ہیں۔ مگر ایک پر نشہ کا اثر ہو گیا ہے اور دوسرے پر ابھی نہیں ہوا۔ افسوس یہ مقطع صورت اور

تصوف کا دعویٰ اور یہ افعال استغفر اللہ یہ صاحب سمجھ گئے کہ میں نے جو حضرت سے اس شخص کی شکایت کی تھی اور اپنے کو اس شرابی سے اچھا سمجھا تھا اس لئے حضرت نے میرے نفس کو سزا دی ہے کہ مجھے بھی ساتھ میں بدنام کرایا، تو پہلے بزرگ ان طریقوں سے تکبر و عجب کی اصلاح کرتے تھے، کیونکہ جب تک یہ خناس دماغ سے نہیں نکلتا، اس وقت تک وصول میسر نہیں ہوتا۔

اسی طرح حضرت شبلی کا واقعہ ہے کہ ان کے پاس ایک مرید آیا اور ثمرات کے عدم ترتب کی شکایت کی، شیخ نے جب طریق تزکیہ بدل کر دیکھا کہ کس طریق سے نفع مرتب نہیں ہوتا تو سمجھ گئے کہ اس کے اندر عجب و کبر کا مرض ہے، وہی نفع سے مانع ہے تو شیخ نے ایک ٹوکرا اخروٹ کا بھرا ہوا دے کر کہا کہ فلاں محلہ میں جہاں ان کے معتقدین زیادہ تھے جا بیٹھو اور اعلان کردو کہ ایک دھول کے بدلے ایک اخروٹ لے جاؤ۔ اسی طرح یہ ٹوکرا ختم کردو۔ یہ حالت تھی معالجہ کی، مگر ہم لوگوں کی یہ حالت ہے کہ اگر ذرا سی بھی سختی ہوتی ہے تو ناگوار ہوتی ہے کہ ہم پر یہ سختی کیوں ہوتی ہے۔ لا الہ الا اللہ طلب کا دعویٰ اور بات بات پر ناگواری، صاحبو! طلب کا نام بھی کیوں بدنام کرتے ہیں مولانا فرماتے ہیں

در بہر زخمے تو بر کینہ شوی ۔۔۔ پس کجا بے صیقل آئینہ شوی
تو بیک زخمے گریزانی زعشق ۔۔۔ تو بجز نامے چہ میدانی زعشق

ترجمہ:۔ ہر ایک زخم سے تو کینہ میں بھر جاتا ہے پھر تو بغیر صفائی کے آئینہ کی مانند ہوگا۔ تو ایک ہی زخم سے عشق کے نام سے بھاگتا ہے تو تو سوائے عشق کے نام کے اور کچھ نہیں جانتا۔

طالب کا تو یہ مذاق ہوتا ہے کہ فرماتے ہیں۔

نا خوش تو خوش بود بر جان من ۔۔۔ دل فدائے یار دل رنجان من
پس زبوں وسوسہ باشی دلا ۔۔۔ گر ہوس راباز داری از بلا

ترجمہ:۔ محبوب کی جانب جو اثر پیش آئے گو وہ طبیعت کو ناخوش ہی کیوں نہ ہو مگر وہ میرے لئے پسندیدہ ہے جو میری جان کو رنج دینے والا ہے میں اپنا دل اس پر قربان کرتا ہوں۔ تم بالکل مغلوب وساوس سمجھے اگر محبوب کے طرب و بلا میں فرق سمجھو گے۔

ہماری یہ حالت ہے کہ ہم سے شیخ کی سختیاں تو کیا برداشت ہوتیں اور ہم شیخ کے تو کیا ہوتے بعضے تو اللہ کے بھی نہیں، چنانچہ ایک شخص نے روزہ رکھا تھا، اتفاق سے اس دن اس کی بھینس مرگئی۔ تو کم بخت نے فوراً منہ سے لوٹا لگا کر پانی پی لیا اور روزہ توڑ کر آسمان کی طرف منہ کر کے خدا تعالیٰ

سے کہتا ہے کہ لے روزہ رکھوالے نعوذ باللہ! خدا کے ساتھ یہ معاملہ، اور اس شخص پر تعجب نہ کرنا، ایسے لوگ آج کل بھی بکثرت ہیں، مگر اتنا فرق ہے کہ جاہل زبان سے بھی کہہ دیتا ہے اور مہذب زبان سے تو نہیں کہتا مگر دل میں حق تعالیٰ کے افعال پر اعتراض وہ بھی کرتا ہے تو بدنام ہوتے ہیں کہ بد اخلاق ہیں۔ اصل یہ ہے کہ اہل حقیقت منشاء کو دیکھتے ہیں مثلاً تکبر کو کفر کا باپ سمجھتے ہیں، کیونکہ کفار کو خوب معلوم تھا اور حضورؐ کی نبوت کو خوب پہچانتے تھے، چنانچہ حق تعالیٰ فرماتے ہیں۔

يَعْرِفُوْنَهٗ كَمَا يَعْرِفُوْنَ اَبْنَآءَهُمْ وَاِنَّ فَرِيْقًا مِّنْهُمْ لَيَكْتُمُوْنَ الْحَقَّ وَهُمْ يَعْلَمُوْنَ

ترجمہ:۔ وہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو ایسے پہچانتے ہیں جیسے اپنے بیٹوں کو پہچانتے ہیں اور ان میں سے ایک جماعت حق چھپاتی ہے اور وہ جانتے ہیں۔ اور

ام لم یعرفوا رسولھم فھم لہ منکرون.

ترجمہ:۔ یا انہوں نے اپنے رسول کو نہیں پہچانا پس وہ ان کا انکار کرنے والے ہیں۔ اور

وَجَحَدُوْا بِهَا وَاسْتَيْقَنَتْهَآ اَنْفُسُهُمْ ظُلْمًا وَّعُلُوًّا. (النمل آیت نمبر ۴)

ترجمہ:۔ اور وہ ظلم اور تکبر کی راہ سے (ان معجزات) کے بالکل منکر ہو گئے حالانکہ انکے دلوں نے یقین کرلیا تھا۔

مگر باوجود پہچاننے کے اتباع سے عار کرتے تھے تو ان کے کفر کا منشاء یہی تکبر تھا کیا اب بھی کسی کو شبہ ہے اخلاق کے مہتم بالشان ہونے میں کیا آجکل ایسے لوگ موجود نہیں ہیں جو کہ باوجود جاننے کے حکم الٰہی سے عار کرتے ہیں تو کیا ان کا علاج نہ کیا جاوے۔

خوب یاد رکھنا چاہئے کہ یہ معمولی چیز نہیں اکثر گناہوں کی جڑ یہی ہے حتیٰ کہ کفر بھی اکثر تکبر ہی سے پیدا ہوتا ہے اسی طرح اکثر معاصی بھی چنانچہ بہت لوگ بے دھڑک ڈاڑھی منڈواتے اور ترشواتے ہیں اور جب نصیحت کی جاتی ہے تو نہایت بے باکی سے کہتے ہیں کہ میاں تمام عمر تو اس وجہ سے رہے اب کیا توبہ کریں گے اور یہ شعر زبان زد ہوتا ہے۔

عمر تو ساری کٹی عشق بتاں میں مومن　　آخری وقت میں کیا خاک مسلماں ہوں گے

بھائی تم آخری ہی وقت میں توبہ کرلو خدا تعالیٰ معاف کردیں گے مگر قلب کو ایسا مسخ کردیتا ہے کہ آخری وقت میں بھی توبہ کی توفیق نہیں ہوتی۔ حضورؐ کے زمانہ میں کفار حضورؐ کا پیغمبر ہونا جانتے تھے مگر تکبر کی وجہ سے قلوب مسخ ہورہے تھے جیسا ابھی قریب بیان ہوا۔

تکبر کی نشانیاں:۔

بعض اہل سیر نے ذکر کیا ہے کہ فرعون نے مسلمان ہونا چاہا تھا مگر کچھ تو اس کا تکبر اور کچھ ہامان نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کی اتباع سے روکا۔ کیونکہ ہامان بھی متکبر تھا۔ غرض یہ تکبر بڑ ہے نہ معلوم کہاں جا کر دھکا دے گا، چنانچہ مجلس میں کسی کو جگہ نہ دینا اور کسی کے کہنے سے نہ اٹھنا اسی طرح گرا ہوا کھانا نہ اٹھانا اور جھکنے سے عار کرنا اور کھانا جھک کر نہ کھانا جیسا کہ آجکل میز کرسیوں پر کھانا کھایا جاتا ہے کہ جھکنے سے عار آتی ہے مسجد میں نہ جانا۔ ان سب کا سبب بھی تکبر ہے ایک صاحب میرے پاس مسجد میں تشریف لائے مگر کوٹ پتلون بوٹ جوتہ زیب تن تھا آ کر فرش سے باہر کھڑے ہو گئے وہ اس کے منتظر رہے کہ میں اٹھ کر ان کے پاس آ کر ان سے گفتگو کروں۔ دیکھئے یہ کونسی تہذیب ہے کہ جاویں تو خود ملنے کے لئے اور اس کے منتظر رہیں کہ یہ خود اٹھ کر ہمارے پاس آئے یہ بھی اسی تکبر کی فرع تھی، پھر لطف یہ کہ اگر کوئی شخص اس قسم کے مواقع میں ان کے لئے نہ اٹھے تو بد دماغ کہلائے۔ اور ان خر دماغوں کو کوئی کچھ نہیں کہتا۔

ایک اور صاحب میرے پاس مدرسہ میں تشریف لائے جن کا تمام جسم متصل واحد تھا لکڑی کی طرح بندشوں میں کھینچا ہوا تھا وہ بھی تھوڑی دیر تک کھڑے رہے شاید کرسی کے منتظر ہوں گے مگر وہاں کرسی کہاں آخر مجبور ہو کر بیٹھنا چاہا تو دھم سے زمین پر گر پڑے اور اٹھنا اور بھی دشوار ہوا اس فرعونی وضع کا جس میں کوئی راحت بھی نہیں سبب یہی تکبر ہی ہے کہ جہاں جائیں وہاں ان کے لئے کرسی منگائی جائے اور تا کہ ہر وقت بالکل فرعون کہلاتے رہیں۔ جھکنے کی بھی توفیق نہ ہو حتیٰ کہ کھانے کے وقت بھی جھکنا نہ پڑے اسی واسطے میز کرسی پر کھانا کھاتے ہیں حالانکہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم اپنی ذات مقدس کے باب میں فرماتے ہیں کہ میں تو غلاموں کی طرح کھانا کھاتا ہوں میں اس کے متعلق آپ لوگوں سے سوال کرتا ہوں کہ اگر جارج پنجم آپ کو ایک امرود دے کر اپنے سامنے کھانے کا حکم دیں تو میں دریافت کرتا ہوں کہ اس کے تناول کے لئے آپ میز کرسی اور کانٹے چھری کے منتظر ہوں گے؟ ہرگز نہیں اور اگر جارج کے اس دیئے ہوئے امرود کی ایک قاش آپ کے ہاتھ سے گر جاوے تو کیا اس کو زمین ہی پر پڑا رہنے دیں گے اور بوٹ جوتہ سے آگے سرکا دیں گے یا فوراً اٹھا کر کھالیں گے شاید صاف بھی نہ کریں بتلایئے اس وقت کس طرح

عملدرآمد کریں گے یقینی امر ہے کہ آپ فوراً اٹھا کر کھالیں گے تو یہاں بھی اس طریق سے عمل کیوں نہیں کیا جاتا کیا نعوذ باللہ حق تعالیٰ کی عظمت جارج پنجم سے کم ہے کہ ان کی دی ہوئی نعمت کے ساتھ اتنا بھی معاملہ نہیں کرتے اور ایک سوال اس کے متعلق یہ ہے کہ اگر آپ کو جارج پنجم اپنے سامنے اس امرود کے کھانے کا امر کریں جیسا اوپر مذکور ہوا تو بتلائیں آپ اس کو رغبت کی صورت سے کھاویں گے یا بلا رغبت کھاویں گے بالکل ظاہر ہے کہ غایت درجہ کی رغبت کا اظہار کر کے کھائیں گے اور رغبت اور پسندیدگی کے اظہار کے لئے اس کو اور جلدی جلدی اور عجلت کے ساتھ کھائیں گے۔ یہی وجہ ہے کہ حدیث شریف میں آیا ہے۔

کان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یاکل اکلا ذریعا۔ (جناب رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم جلدی جلدی کھانا تناول فرماتے تھے۔)

اگر کوئی جاہل کہے کہ یہ عجلت متانت کے خلاف ہے تو ہو مگر عشق کے خلاف تو نہیں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو حق تعالیٰ کا مشاہدہ تھا اس لئے ایسی صورت سے کھاتے تھے کہ بے رغبتی کی صورت ظاہر نہ ہو حاصل یہ کہ بڑے کے مشاہدہ کے وقت تکبر نہیں رہتا اس لئے ایسے افعال ہی پیدا نہیں ہوتے جو تکبر پر دال ہوں چاہے کھانا کھانے میں ہو یا مجلس ہو جگہ دینے میں بعض آدمیوں میں تکبر ایسا نمایاں ہوتا ہے کہ ذراسی بات بھی کسی کی نہیں سن سکتے چنانچہ ایک دفعہ کا واقعہ ہے کہ میں نو بالغ تھا نابالغ نہیں اور مجھے نماز پڑھانے کا اتفاق ہوا تو داہنی طرف آدمی کم تھے میں نے ایک صاحب سے مخاطب ہو کر کہا کہ داہنی طرف آدمی کم ہیں آپ اس طرف آجائیں تو وہ صاحب بائیں طرف اخیر میں کھڑے تھے اسی طرح کھڑے رہے میں نے ان کے پاس والے سے کہا بھائی ان کی تو شان گھٹتی ہے تم ہی اس طرف آجاؤ یہ سن کر وہ بیحد غصہ ہوئے اور کہنے لگے کہ ہم کبھی بھی اس مسجد میں نہ آویں گے ہماری بے حرمتی ہوتی ہے (اس وقت میرا بچپن کا زمانہ تھا اور بچپنے میں تیزی ہوتی ہی ہے اس لئے یہ تیز جملہ منہ سے نکل گیا اب اس تو ایسی بات کبھی نہ کہوں) میں نے کہا مسجد بھی آپ کی محتاج نہیں، چنانچہ وہ حضرت فوراً جوتے اٹھا اور چلتے ہوئے تو بعضے لوگوں کی یہاں تک حالت ہے کہ غصہ تو مجھ پر اور انکار و تکبر مسجد میں آنے سے اور بعضے دعا میں تکبر کرتے ہیں چنانچہ ہمارے یہاں واقعہ ہے کہ ہمارے یہاں ایک لڑکا ہے بہت نیک نماز روزہ کا پابند، مگر اس کے اقارب کو شریعت کی طرف توجہ نہیں، چنانچہ ایک مرتبہ اسی کا چچا کہتا ہے، کہ یہ لڑکا جو نماز پڑھ پڑھ کر ہاتھ پھیلا کر دعا مانگتا

ہے،اس کے گھر میں کیا گھاٹا ہے جو خدا تعالیٰ سے مانگتا ہے۔ نعوذ باللہ عجب بات ہے کہ حق تعالیٰ شانہٗ تو جگہ جگہ عبادت کا امر فرمادیں اور ہم لوگ عبادت کرنے سے جس میں دعا بھی بڑی فرد ہے عار اور تکبر کریں۔ غرض یہ تکبر بڑا مرض ہے جو ہمارے اندر گھسا ہوا ہے۔

تکبر کا علاج:۔

اب اس آیت میں اس کا علاج بھی کیا گیا ہے اور اس کی بھی اصلاح کی گئی ہے اب تو آپ کا وہ شبہ زائل ہو گیا کہ یہ مضمون تو معمولی ہے، نہ ارکان میں سے ہے نہ فرائض میں سے پھر اس کا اتنا اہتمام کیوں کیا گیا ہے۔ پس اب تو واضح ہو گیا کہ اِذَا قِيْلَ لَكُمْ تَفَسَّحُوْا فِي الْمَجٰلِسِ

ترجمہ:۔ جب تم سے کہا جائے کہ مجلس میں فراخی کرو تو فراخی کرو۔

میں ایک بڑی ضروری تعلیم ہے لیکن بعد تامل معلوم ہوتا ہے کہ اس میں خاص اہتمام سے تکبر کا علاج کیا گیا ہے جو منشاء ہے آداب مجالس پر عمل نہ کرنے کا اور بڑے بڑے گناہوں کے ارتکاب کرنے کا پھر جب اصل اور جڑ خرابی کی جاتی رہے گی یعنی تکبر کا علاج ہو جائے گا اور اس کے علاج سے گناہ متروک ہو جائیں گے تو اب اعمال کے کرنے سے ارتفاع موانع کے سبب ان کا اصلی ثمرہ ضرور مترتب ہوگا۔ یہ حقیقت ہے اس تعلیم کی اس کو معمولی نہ سمجھو اگر کوئی صاحب یہ کہیں کہ صدر مجلس کے کہنے پر عمل کرنے کو ازالہ تکبر میں کیا دخل ہے۔ ہم نے تو ایک بار ایسا کیا مگر کچھ بھی اثر نہ ہوا تو اس کا جواب یہ ہے کہ گو ایک بار عمل کرنا بھی بیکار نہیں مگر ایک بار میں معتدبہ کا اثر ظہور نہیں ہوتا، لیکن اگر بار بار اس پر عمل کریں گے تو خود ہی اثر معلوم ہو جائے گا۔ دیکھو ایک جگہ پانی کا قطرہ ٹپکتا ہے تو اس وقت تو اس سے کچھ اثر محسوس نہیں ہوتا لیکن اگر اسی طرح ٹپکتا رہے تو دس برس میں اس پانی کے قطرہ ہی سے غار ہو جائے گا اور ظاہر ہے کہ اس اثر میں جس طرح مجموعہ من حیث المجموع کو دخل ہے اسی طرح ہر قطرہ کا بھی دخل ہے اسی طرح ہر عمل شرعی پر ایک مرتبہ بھی عمل کرنا ضرور تصفیہ باطن میں اثر رکھتا ہے گو کمال اثر کی علت تامہ نہ سہی اس کے لئے ضرورت ہے تکرار دوام کی یہاں تک ایک جزو کا بیان تمام ہو گیا جو آداب مجالس کے بارہ میں ہے اور اس جزو کے واسطے رسالہ آداب المعاشرت کا مطالعہ کافی نافع ہے، اب میں بقیہ اجزاء کو بیان کرنا چاہتا ہوں۔

آرام کا مدار:۔

یہ تمہید میں مذکور ہے کہ آیت میں دو عمل اور دو ثمرے بیان کئے گئے ہیں۔ عمل اول یفسح فی المجالس اور اس کا ثمرہ

یَفْسَحِ اللّٰہُ لَکُمْ ۔ (اللہ تعالیٰ تم کو کھلی جگہ دے گا)

اور یہ عمل مع ثمرہ کے بیان ہو چکا اور عمل ثانی اُنْشُزُوْا (اٹھ کھڑے ہو جاؤ)

جس پر ثمرہ رفع درجات کو مرتب فرمایا اور انشزوا کا امتثال چونکہ واقع میں تفسح فی المجالس سے ارفع ہے کیونکہ اس میں انقیاد کا زیادہ اظہار ہے جو نفس کو زیادہ شاق ہے اس لئے اس پر ثمرہ بھی ارفع یعنی رفع درجات کا مرتب فرمایا۔ غالباً یہ امر بیان سے رہ گیا کہ فافسحو (جگہ کھول دیا کرو) اور فانشزوا (تو اٹھ کھڑے ہو) عام ہے خواہ جوارح سے ہو یا قلب سے یعنی جس وقت مجلس میں تفسح کا حکم ہو کشادگی کر دے اور جب مجلس سے اٹھایا جائے اٹھ جائے اور جب تک اس حکم کی نوبت نہ آوے تو اس کے لئے دل سے آمادہ رہے اس آمادگی سے قلب میں زیادہ وسعت ہوگی اصلاح اخلاق کے لئے کیونکہ حالت قلب کی زیادہ قابل اعتبار ہے۔ مولانا رومی فرماتے ہیں۔

صورت رفعت بود افلاک را　　　معنی رفعت رواں پاک را

ترجمہ:۔ آسمانوں کی سی بلندی ہوگی بلندی کا مفہوم دلوں کا پاک ہونا ہے۔

اور حکیم سنائی فرماتے ہیں

آسمانہاست در ولایت جاں　　　کار فرمائے آسمان جہاں

در رہ روح پست و بالا ہاست　　　کوہ ہائے بلند و صحرا ہاست

ترجمہ:۔ ولایت جان میں بہت سے آسمان ہیں جو ظاہری آسمان میں کارفرما ہیں روح (باطن) کے راستہ میں نشیب و فراز کوہ و صحرا موجود ہیں۔

صوفیائے کرام نے روح ہی کا زیادہ اعتبار کیا ہے اور یہ احکام حسیہ میں بھی ہے دیکھئے ایک شخص تو دو آنے یومیہ کا مزدور ہے اور ایک شخص رئیس ہے مگر اس پر پھانسی کا مقدمہ ہو گیا اس وقت اگر پوچھا جائے کہ ان دونوں میں سے کون آرام سے ہے تو کوئی نہ کہے گا کہ یہ غنی اس مزدور سے زیادہ آرام سے ہے بلکہ وہ غنی تمنا کرے گا کہ کاش! یہ مزدور میں ہوتا تو اچھا ہوتا اب سوال یہ ہے

کہ اس آرام کا مدار روح پر ہے یا کہ جسم پر اگر جسم کی راحت کو راحت کہیے تو غنی سے مفلس کسی حال میں اچھا نہ ہوتا پس یقیناً یہی امر منقح ہوا کہ آرام اور راحت روح کی معتبر ہے نہ کہ جسم کی اس حکمت کے لئے حق سبحانہ وتعالیٰ کا یہ ارشاد

يَفْسَحِ اللّٰهُ لَكُمْ وَاِذَا قِيْلَ انْشُزُوْا فَانْشُزُوْا يَرْفَعِ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مِنْكُمْ وَالَّذِيْنَ اُوْتُوا الْعِلْمَ دَرَجٰتٍ

ترجمہ:۔ اللہ تعالیٰ تم کو کھلی جگہ دے گا اور جب یہ کہا جائے گا کہ اٹھ کھڑے ہو تو اٹھ کھڑے ہوا کرو، اللہ تعالیٰ تم میں جو ایمان والے ہیں گے اور ان لوگوں کو جن کو علم عطا ہوا ہے درجے بلند کردے گا۔

ظاہر و باطن سب کیلئے شامل رکھا گیا۔

اعمال عوام اور علماء کا فرق:۔

اب اس مضمون ضمنی کے بعد

يَرْفَعِ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا (اہل ایمان کے درجات بلند کرے گا)

کا بیان کرتا ہوں کہ یہاں پر حکم رفع درجات اولاً عام مؤمنین کے لئے ثابت فرمایا پھر تخصیصاً اہل علم کے لئے اس کا حکم کیا اور صرف

يَرْفَعِ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مِنْكُمْ (تم میں سے اہل ایمان کے درجات بلند کرے گا)

پر اکتفاء نہیں فرمایا، گو وہ اہل علم کو بھی شامل ہو جاتا، سو ایسا کرنے سے مقصود اہل علم کی فضیلت کا ثابت کرنا ہے اور راز اس کا یہ ہے کہ ایک عمل عوام کا ہے کہ بوجہ بہت حقائق نہ جاننے کے وہ اس عمل کے پورے حقوق ادا نہیں کرسکتے اور ایک عمل اہل علم کا ہے وہ اس کے زیادہ حقوق ادا کرسکتے ہیں، پس اس عارض کی وجہ سے ان دونوں کے اعمال میں ضرور فرق ہوا، اور اہل علم کا عمل قوی اور کامل ہوا تو اہل علم کو جدا کر کے بیان کیا اور ظاہر ہے کہ اہل علم اور عوام میں جو یہ فرق ہوا، اس کا مدار بجز علم کے اور کوئی شے نہیں۔ لہٰذا علم ہی ایسی چیز ہوئی، اس سے اہل علم کو فضیلت ہوئی، پھر جب علم مقبول و محبوب ہوا، تو اہل علم بھی ضرور محبوب اور مقبول ہوں گے اور قاعدہ ہے کہ محبوب کو غیر محبوب سے زیادہ دیتے ہیں، اس لئے اہل علم کو زیادہ اجر ملے گا۔ اب میں اس راز کو بھی بتلاتا ہوں وہ یہ کہ ایک ثمرہ تو نفس عمل پر مرتب ہوتا ہے اور ایک اسکی خصوصیت پر، مثلاً دو شخصوں سے ایک مضمون

لکھوایئے، ایک تو محض مضمون لکھ دے، اور ایک منشی ذی فہم ہو کہ اس کو سمجھے بھی اور خوشنویسی سے زیب وزینت کے ساتھ لکھے بھی، ظاہر ہے کہ جو ثمرہ لکھائی کا اس منشی کو ملے گا وہ ہرگز پہلے شخص کو نہیں ملے گا، تو یہ زیادتی نفس عمل پر بھی ہوئی بلکہ اس کے تحسین وتکمیل پر، اس پر ایک حکایت یاد آئی کہ ایک معمار تھا وہ تعمیر کرتے ہوئے نقش ونگار اور نزاکت وصفائی ستھرائی میں مستغرق تھا۔ اس پر ہمارے ماموں صاحب نے کہا کہ میاں کیوں وقت ضائع کر رہے ہو؟ بس چنائی کر دو، وہ معمار بولا منشی جی جب آپ لکھتے ہیں اس حالت پر قیاس کرلیں، کہ اس وقت آپ کیسے مرکز اور باریک اور موٹے خطوط کے تناسب اور ہر حرف کی اور ہر شدومد کی مقدار کا اہتمام کرتے ہیں۔ آخر آپ اس میں کیوں وقت ضائع کرتے ہیں نفس کتابت پر کیوں نہیں اکتفا کرتے۔ ماموں صاحب لاجواب ہوگئے۔ تو جب محسوسات میں یہ بات ظاہر ہے کہ تکمیل کے بعد جو قدر ہوتی ہے، وہ قبل تکمیل نہیں ہوتی، اور تکمیل ہوتی ہے اس کے فن دان سے۔ کیونکہ بدوں فن دانی کے کام کی تکمیل ہو ہی نہیں سکتی۔ پس تکمیل موقوف ہوئی علم پر۔ اور جب کسی عمل میں تکمیل ہوگی تو وہ عمل افضل ہوگا، اور اس عمل کے ثمرات بھی افضل ہوں گے۔ پس اسی وجہ سے اہل علم کے عمل پر ثمرات بھی عوام کے ثمرات سے زیادہ مرتب ہوں گے۔ حضرت حاجی صاحب رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ عارف کی نماز غیر عارف کی لاکھ نمازوں سے افضل ہے اس پر کہ تکمیل موقوف ہے علم پر۔ مجھے ایک حکایت یاد آئی۔ حضرت حاجی صاحب کے ایک خلیفہ تھے۔ ایک مرتبہ انہوں نے قصداً اہتمام کرکے نہایت خضوع وخشوع سے نماز پڑھی اور نماز پڑھ کر مراقب ہوئے عالم امثال کی طرف اس کی صورت دیکھنے کے لئے متوجہ ہوئے تو دیکھا کہ نہایت حسین جمیل صورت ہے جو سر سے پیر تک زیوروں میں لدی ہوئی تھی مگر آنکھوں سے اندھی ہے۔ یہ واقعہ حضرت حاجی صاحب سے بیان کیا۔ حضرت نے معاً سنتے ہی فرمایا، کہ معلوم ہوتا ہے کہ تم نے آنکھیں بند کرکے نماز پڑھی ہوگی۔ عرض کیا جی ہاں، حضرت نے فرمایا یہی وجہ ہے کہ اندھی نظر پڑی، حضرت کا فہم عجیب وغریب تھا، فرمانے لگے کہ آنکھ جس کا بند کرنا خطرات سے بچنے کے لئے گو جائز ہے، لیکن زیادہ اچھا ہے کہ آنکھیں کھلی رہیں، گو لاکھوں خطرات آتے رہیں، کیونکہ نماز میں آنکھیں کشادہ رہنا موافق سنت کے ہے اور بند کرنا خلاف سنت ہے، یہ فرق ہے عارف اور غیر عارف میں، اور غیر عارف جس کا مدار وہی علم کا ہوتا ہے اور یہی وجہ ہے کہ عارف کی ایک رکعت، غیر عارف کی لاکھ رکعت سے افضل ہے۔ اب تو معلوم ہوگیا کہ یہ وجہ ہے علم

کی رفعت کی۔ دوسری ایک وجہ یہ ہے کہ اعمال کا ثمرہ علم ہی کی وجہ سے ملتا ہے کیونکہ وہ موقوف ہیں علم پر تو جو موقوف پر ثمرہ ملتا ہے وہ بلحاظ موقوف علیہ کے ملتا ہے، کیونکہ اسکے بدوں موقوف کا وجود ہی نہیں ہوسکتا۔ پس عمل کا اجر ہی موقوف پر ہوا۔ پس عقلاً بھی علم کی فضیلت ثابت ہوگئی اور اسی سے علماء کے لئے زیادت اجر کا ملنا عقلاً معلوم ہوگیا۔

شریعت اور سائنس:۔

اب میں نو تعلیم یافتہ جماعت کی ایک غلطی پر متنبہ کرنا چاہتا ہوں وہ یہ کہ شریعت میں جو علم کی فضیلت وارد ہے، اس میں علم سائنس وعلم معاشیات وغیرہ داخل نہیں بلکہ علوم احکام مراد ہیں جو قرآن وحدیث وفقہ میں منحصر ہے، بعض احادیث ونصوص میں جو علوم کا لفظ مطلق وارد ہوا ہے تو اس مطلق سے یہ مقید ہی مراد ہے، اس سے ایسا عموم سمجھنا جس میں سائنس وغیرہ سب داخل ہوجائیں ایسا ہے جیسا کوئی شخص کہے کہ تعلیم حاصل کرو، اس کا مطلب بیان کیا جائے کہ پاخانہ کمانا بھی سیکھو، ہر چند کہ پاخانہ اٹھانا بھی واقعہ میں تعلیم کا ایک شعبہ ہے مگر عرفاً تعلیم حاصل کرنے سے ہرگز ہرگز کوئی شخص یہ نہ سمجھے گا کہ پاخانہ اٹھانے کی بھی تعلیم مراد ہے، پس اسی طرح قرآن وحدیث میں جو علم کی فضیلت مذکور ہوئی ہے۔ اس علم میں سائنس وغیرہ ہرگز داخل نہیں، بلکہ یہ علم کو بمقابلہ علم احکام کے بحکم جہل ہے، دیکھئے قرآن مجید میں حق تعالیٰ نے یہود کے متعلق اول تو لقد علموا فرمایا۔ اس سے ان کا اہل علم ہونا ظاہر فرمایا ہے اور اس کے بعد لو کانوا یعلمون (کاش وہ جانتے) فرمایا، جس میں انہی سے علم کی نفی فرماتے ہیں، تو یہاں نفی علم سے مراد علم مع العمل کی نفی ہے۔ پس معلوم ہوا کہ شریعت میں جہاں علم کی فضیلت کا ذکر ہے وہاں علم سے وہ مراد ہے جس کو عمل میں بھی دخل ہو، بلکہ اس کے ساتھ عمل موجود بھی ہو، پس بتلایئے کہ سائنس کو عمل شرعی میں کیا دخل ہے، جو اس کو اطلاق شرع میں داخل کیا جائے۔ اس دعویٰ کی دوسری دلیل یہ ہے کہ حدیث میں ہے۔

ان الانبیاء لم یورثوا دینار اولا درھما ولکن ورثوا العلم۔ (موارد الظمآن للہیثمی: ۸۰، مشکل الآثار للطحاوی ۱: ۴۲۹)

ترجمہ:۔ بے شک حضرات انبیاء علیہم السلام درہم ودینار بطور وراثت نہیں چھوڑتے لیکن ان کی وراثت علم ہے۔)

پس اس سے روز روشن کی طرح ظاہر اور واضح ہوگیا کہ شریعت میں علم سے مراد علم دینار اور درہم نہیں۔ حالانکہ حق تعالیٰ نے بعض انبیاء علیہم السلام کو علوم ذرائع کسب بھی عطا فرمائے تھے، مگر حضورؐ نے نہ ان کو علم سے تعبیر فرمایا اور نہ ان میں وراثت جاری ہوئی، کہ جو کسب ایک نبی کو عطا فرمایا تھا وہ وراثۃً ان کی اولاد در اولاد چلا ہو، جب یہ امر منقح اور طے ہوگیا کہ علم سے مراد ایسے ذرائع و طرق کسب بھی نہیں۔ جو بعض انبیاء کو عطا فرمائے گئے تھے جیسا داؤد علیہ السلام کو زرہ بنانا سکھلایا اور ان کے ہاتھوں میں لوہے کو موم بنادیا گیا:

والنا له الحديد در کف داؤد اهن موم کرد ۔ (اور ہم نے ان کیلئے لوہے کو نرم کیا)

اور اس قسم کے کسب انبیاء علیہم السلام کو بھی عطا فرمائے گئے تھے۔ چنانچہ زکریا علیہ السلام نجار تھے۔ نیز انبیاء کے لئے ہوا کو مسخر فرمادیا۔ مگر ان سب امور میں سے انبیاء کسی ایسے امر کے لئے مبعوث نہیں ہوئے اور نہ انبیاء کی وراثت بجز علم شرعی کے کسی اور چیز میں جاری ہوئی۔ سو جب یہ مفید علوم بھی نصوص فضیلت میں داخل نہیں تو پھر سائنس اور جغرافیہ جو طرق کسب میں سے بھی نہیں علم انبیاء میں کیونکر داخل ہوسکتے ہیں۔ پس معلوم ہوا کہ انبیاء کے کلام میں علم سے مراد علم نبوت ہے نہ کہ علم کسب اور نہ علم طبیعات وغیرہ۔ الغرض اس ذی فضیلت علم سے دین کا علم مراد ہے اور اہل علم کی فضیلت اسی علم کی وجہ سے ہے۔

حال وقال:۔

اب ان فضائل کے بعد چونکہ یہاں علماء کے ناز کا موقع تھا کہ ہم اہل علم ہیں اور ہمارا عمل عوام سے بڑھا ہوا ہے تو ان لوگوں کی تنبیہ کے لئے فرماتے ہیں

وَاللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ خَبِيْرٌ ۔ (اور اللہ تعالیٰ کو سب اعمال کی پوری خبر ہے)

اے علیم بباطن الامور یعنی خدا تعالیٰ کو عمل کے ساتھ باطن کی بھی خبر ہے۔ وہ سب کے باطن کو بھی دیکھ رہے ہیں کہ کس میں اخلاص ہے کس میں نہیں محض علم پر ناز نہ کرنا کیونکہ یہ علم تو شیطان اور بلعم باعور کو بھی حاصل تھا۔ شیطان بقول مشہور معلم ملائکہ بھی تھا اور بلعم باعور اپنی قوم کا واعظ بھی تھا۔ اور دونوں شخص علم کے ساتھ عمل ظاہر کے بھی جامع تھے، بڑے عابد اور جفاکش مجاہدہ کرنے والے تھے، مگر ان کے باطن میں اخلاص اور خدا تعالیٰ کی محبت و معرفت پوری نہ تھی اس لئے یہ علم و عمل سب بیکار ہوگیا پس عمل کیساتھ ایک اور چیز کی بھی ضرورت ہوئی جس کا نام حال باطنی ہے۔

بدوں حال کے علم وعمل قابل اعتبار نہیں اور یہ حال کتب بینی سے حاصل نہیں ہوتا۔ یہ کسی صاحب حال کی جوتیاں سیدھی کرنے سے نصیب ہوتا ہے۔ غرض اس جگہ آیت میں باختلاف وجوہ دلالت تین چیزیں مذکور ہوئیں۔ علم وعمل وحال اور ان تینوں کی تحصیل ضروری ٹھہری اور محض علم و عمل حاصل ہو گیا۔ مگر حال نہ ہو تو اس کی نسبت ارشاد ہوتا ہے:

وَاللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ خَبِیْر ۔ (اور اللہ تعالیٰ کو سب اعمال کی پوری خبر ہے)

جیسا قریب ہی مذکور ہوا۔ یعنی خدا باطن کو بھی دیکھتے ہیں۔ نرے ظاہری علم وعمل کو نہیں دیکھنے، عارف رومی فرماتے ہیں

ما بروں را ننگریم وقال را — ما دروں را بنگریم وحال را

ترجمہ:۔ ہم ظاہر اور قال کو نہیں دیکھتے ہر باطن اور حال کو دیکھتے ہیں۔

اور فرماتے ہیں

ناظر قلبیم اگر خاشع بود — گرچہ گفت لفظ نا خاضع بود

ترجمہ:۔ ہم دلوں کے خشوع کو دیکھتے ہیں اگرچہ الفاظ میں ظاہری شان وشوکت نہ ہوں۔

حق سبحانہ تعالیٰ زیادہ دل کو دیکھتے ہیں، ہم لوگ ظاہر میں پارسا اور مقدس بنے ہوئے ہیں مگر باطن میں یہ حالت ہے۔

از بروں چوں گور کافر پر حلل — واندروں قہر خدائے عزوجل

از بروں طعنہ زنی بر بایزید — وز درونت ننگ میدارد یزید

ترجمہ:۔ کافر کی قبر باہر سے بڑی شاندار ہوتی ہے اور اندر اللہ تعالیٰ کا قہر نازل ہوتا ہے ظاہری حالت کی بناء پر تم حضرت بایزید بسطامیؒ پر طعنہ زنی کرتے ہو اور تمہاری باطنی حالت اتنی گندی ہے کہ اس سے یزید بھی شرماتا ہے۔

اور محض علم کے ناکافی ہونے کو ایک دوسرے حکیم بیان فرماتے ہیں

علم رسمی سر بسر قیل ست وقال — نے ازو کیفیتے حاصل نہ حال

ترجمہ:۔ ظاہری علم محض قیل وقال ہے ان سے نہ کوئی کیفیت حاصل ہوتی ہے اور نہ حال۔

یعنی اگر اس پر اکتفا کیا تو سوائے قیل وقال کے کچھ نہیں۔ محض اس سے حال حاصل نہیں ہوتا، اگر اس کے بعد کسی صاحب حال کو لپٹ جائے، تو پھر یہ علم رسمی بہت کارآمد ہے، جاہل صوفی

سے عالم صوفی افضل ہوتا ہے آگے علم حقیقی کو بتلاتے ہیں۔

علم چہ بود آنکہ راہ بنمایدت　　زنگ گمراہی زدل بزدایدت
ایں ہوسہا از سرت بیروں کند　　خوف وخشیت دردلت افزوں کند
تو ندانی جز یجوز ولا یجوز　　خود ندانی کہ تو حوری یا عجوز

ترجمہ:۔ علم وہی ہے جو تم کو خدا کا راستہ دکھائے اور دل سے گمراہی کا زنگ دور کرے۔ اور حرص وھوئی سے چھڑا کر تمہارے دل میں خوف وخشیت پیدا کردے۔ تو جائز اور ناجائز کے علاوہ اور کچھ نہیں جانتا تجھے اپنا بھی پتہ نہیں کہ تو مقبول ہے یا مردود۔

اسی مضمون پر مولانا نے مثنوی میں ایک حکایت لکھی ہے کہ:

ایک نحوی کو دریا کا سفر پیش آیا، علم نحو سے زیادہ دلچسپی تھی، جاہلوں کو حقیر سمجھتے تھے، جب کشتی میں بیٹھے، مطمئن ہو کر ملاح سے دریافت فرماتے ہیں، کہ میاں تم نے نحو بھی پڑھی ہے، اس نے کہا نہیں صاحب میں نے نحو نہیں پڑھی فرمانے لگے کہ تم نے آدھی عمر یونہی کھوئی، وہ بے چارہ یہ سن کر غمزدہ ہو کر خاموش ہو گیا۔ اتفاق سے کشتی بھنور میں پڑ گئی، اب اس ملاح کا موقع آیا، دریافت کیا کہ مولوی صاحب آپ نے تیرنا بھی سیکھا ہے، فرمانے لگے نہیں، تو ملاح نے جواب دیا کہ جناب نے اپنی ساری عمر کھوئی، کیونکہ یہ کشتی اس بھنور میں ڈوبتی ہے۔

محوی باید نہ نحو اینجا بداں　　گر رو محوی بے خطر در آب راں

ترجمہ:۔ یاد رکھ کہ اس جگہ محو ہونا چاہئے نہ نحو۔ اگر تو محو ہی ہے تو بے خطرہ پانی میں چل۔

افسوس کہ ہم نے قال ہی پر کفایت کی حال نہ حاصل کیا۔ صاحبو! اگر ہم مرنے لگیں تو کیا یہی جی چاہے گا کہ اس قال پر خاتمہ ہو جائے، جس پر ہم اس وقت ہیں، ہرگز نہیں، مگر پھر بھی یہ حالت ہے کہ اگر آجکل کسی کے میر زاہد اور حدیث کے اسباق میں تعارض ہو جاوے تو حدیث کے سبق چھوڑ دیں گے مگر میر زاہد نہ چھوٹے گا۔ لیکن مرتے ہوئے اس میر زاہد کی حقیقت معلوم ہو گی، اس وقت بزبان حال یوں کہیں گے۔

ایہا القوم الذی فی المدرسہ　　کل ما حصلتموہ وسوسہ
علم نبود غیر علم عاشقی　　ماقی تلبیس ابلیس شقی

ترجمہ:۔ اے قوم جو کچھ تم نے مدرسہ میں حاصل کیا ہے وہ محض وسوسہ ہے۔ علم عاشقی

(معرفت الٰہی) کے علاوہ اور کوئی علم نہیں۔ اسکے علاوہ باقی ابلیس شقی کی تلبیس ہے۔

میں دریافت کرتا ہوں کہ کیا آپ کا یہی دل چاہتا ہے کہ موت کے وقت صدرا کی مثناۃ بالتکریر کی تقریر زبان سے نکلے ہرگز نہیں۔ پس معلوم ہوا کہ یہ علم ضروری نہیں بلکہ زائد از ضرورت ہے۔ لہٰذا قاعدہ مسلمہ ''الضروری۔ تتقدر بقدر الضرورۃ'' (ضروری سے مراد بقدر ضرورت ہے) پر عمل فرما کر غیر مقصود میں اس قدر غلو نہ کیجئے۔ یہ مسلم پائخانہ ایک ضروری شے ہے۔ مگر آدمی بقدر ضرورت ہی پائخانہ میں رہتا ہے۔ یہ نہیں کہ پائخانہ کے ساتھ دل بستگی اور شیفتگی ہو جائے۔ اسی طرح جب فلسفہ وغیرہ محض آلات ہیں اور علوم دینیہ کے لئے مقدمات کے درجہ میں ان کی ضرورت ہے نہ کہ مقصودیت کے درجہ میں تو بقدر ضرورت ہی ان کا اکتساب اور شغل کیجئے البتہ منطق بہت ضروری اور مفید ہے مگر رفع ضرورت کے لئے منطق میں قطبی ہی تک سمجھ کر پڑھ لو تو بہت ہے، ملا حسن اور حمد اللہ کی بھی کیا ضرورت، ایک رسالہ بھی منطق کے لئے کافی ہے جعل بسیط و مرکب منطق کا مسئلہ نہیں بلکہ فلسفہ کا مسئلہ ہے، مگر اس کی بحث خواہ مخواہ علم منطق میں اور کتب منطقیہ میں موجود ہے، اسی طرح اور بہت سے مسائل فلسفہ کے کتب میں ٹھونس رکھے ہیں، انہی کے لئے مدرسین اور طلبہ بہت سے رسالے پڑھتے پڑھاتے ہیں، حالانکہ فلسفہ ضرورت سے زیادہ ہے، آج کل اکثر طلبہ کے خطوط میرے پاس منطق و فلسفہ کے عدم فہم کی شکایت کے آتے ہیں، میں لکھ دیتا ہوں کہ چھوڑ دو۔ قرآن و حدیث پڑھو، مگر اس زمانہ میں حدیث و قرآن سے بہت ہی کم تعلق ہے، معقولات سے دلچسپی زیادہ ہے، اس لئے وہ درسیات سے فارغ ہو کر ایسے مولوی بنتے ہیں کہ۔

مولوی گشتی وآ کہ نیستی — خود کجاؤ از کجاؤ کیستی

ترجمہ:۔ مولوی بن گیا لیکن معرفت خداوندی سے آگاہ نہ ہوا خود کیا ہے کہاں سے ہے کچھ نہیں جانتا۔

مستحق حال کی ضرورت:۔

غرض مکلفین میں تین قسم کے لوگ تھے، حق تعالیٰ نے ہر ایک کو اس کی حالت کے مطابق اس آیت میں نصیحت فرمائی ہے، ہر ایک کو اس کی حالت کے مطابق ضروری امر کی رغبت دلائی، جاہلوں کو علم کی رغبت دلائی ہے اور اہل علم کو عمل کی اور عالم باعمل کو حال کی، جیسا کہ توضیحات سے

واضح ہو چکا ہے اور حال وہ چیز ہے کہ بدوں اس کے کوئی عمل کامل نہیں ہو سکتا۔ بدوں حال کے عمل کی ایسی مثال ہے جیسے ریل گاڑی کو آدمی ٹھیلتے ہوں، آخر کب تک ٹھیلیں گے اور کیا اس طرح منزل مقصود تک پہنچ سکتے ہیں، بہت مشکل ہے اور ہر وقت خطرہ ہے کہ بیچ ہی میں تھک کر چھوڑ دیں ہم نے بہت لوگوں کو دیکھا ہے جو اعمال کے بہت پابند تھے مگر حال سے خالی تھے، انہوں نے مرض الموت میں نماز چھوڑ دی جس کا سبب یہی تھا کہ حال سے محروم تھے اور حال کے ساتھ عمل کی ایسی مثال ہے جیسے انجن میں اسٹیم بھرا ہوا ہو کہ وہ بہت جلد گاڑی کو منزل پر پہنچا دیتا ہے اور اس میں یہ خطرہ نادر ہے کہ بیچ ہی میں گاڑیوں کو چھوڑ دے، اسی کو کہتے ہیں کہ۔

تسبیح و خرقہ لذت مستی بہ بخشدت ہست دریں عمل طلب از مے فروش کن

صاحبو! عمل کی ہمت مستی حال سے پیدا ہوتی ہے اس کو حاصل کرو بحمد اللہ اب بھی ایسے ساقی موجود ہیں جن کے یہاں شراب محبت فروخت ہوتی ہے جس کی قیمت صرف طلب ہے، طلب کی پونجی لے جاؤ اور جتنی چاہو شراب خرید لو۔ مگر طلب کے یہ معنی ہیں کہ تم اپنے کو اس کے سپرد کر دو کہ وہ جو چاہے تمہارے اندر تصرف کرے اور جس طرح چاہے آزمائے کیونکہ اس شراب کے پینے کے لئے کچھ شرائط ہیں، ان شرائط کے بعد ہی پلائی جاتی ہے، بغیر ان کے ایک قطرہ بھی نہیں مل سکتا اور بدوں شراب محبت پئے ہوئے حال پیدا نہیں ہو سکتا۔

کامیابی کا طریق:۔

بعض لوگ یوں چاہتے ہیں کہ ہمیں کچھ نہ کرنا پڑے بس ایک چھو سے مستی پیدا ہو جائے یہ غلط خیال ہے، اگر کوئی شخص شراب خانہ میں جا کر خمار سے یوں کہے کہ ایک پھونک مار کر اور چھو کر کے مجھے اس طرح کی شراب دیدے جس سے بدوں پئے ہی مجھ میں مستی پیدا ہو جائے اور کسی قسم کی تلخی بھی نہ معلوم ہو، یقین ہے کہ ساقی بھی یہی جواب دے گا کہ مستی پیدا کرنے کی صورت تو یہی ہے کہ دام خرچ کرو۔ اور شراب پیو اور میری چھو یہی ہے کہ اسے پی جاؤ، پھر حیرت ہے، کہ ظاہری مستی تو جو کہ ایک معمولی چیز ہے بدوں کچھ خرچ کئے اور بغیر پئے حاصل نہ ہو سکے۔ اور باطنی مستی جس کے سامنے ہفت اقلیم کی سلطنت بھی گرد ہے ایک چھو سے حاصل ہو جاوے، اور تمہیں کچھ نہ کرنا پڑے، آج کل بعض لوگ شیوخ کاملین کے پاس جاتے ہیں اور ان کی یہ خواہش ہوتی ہے کہ ہم کو

کسی قسم کی محنت اور مشقت برداشت نہ کرنا پڑے بلا محنت کلفت کے مقصود حاصل ہو جاوے، ایسے لوگوں کو طلب کا نام لینے ہی کی کیا ضرورت ہے جب وہ تلخی شراب کی بھی تحمل نہیں کر سکتے۔

چوں نداری طاقت سوزن زدن　　　از چنیں شیر ژیاں پس دم مزن

ترجمہ:۔ جب تو سوئی چبھوانے کی طاقت نہیں رکھتا تو پھر شیر کی تصویر گدوانے کا نام نہ لے۔

مثنوی میں ایک حکایت پر مولانا نے یہ شعر فرمایا ہے کہ ایک شخص اپنا بدن گدوانے چلا اور گودنے والے سے جا کر کہا کہ میرے شانہ پر شیر کی تصویر بنادے تاکہ لڑائیوں میں بہادر رہوں اور شجاعت کا مجھ میں اثر رہے، اس نے اس کے کہنے کے مطابق ایک مقام پر سوئی چبھوئی تو آپ سے سوئی کی تکلیف برداشت نہ ہو سکی شور وغل مچانا شروع کیا اور اس سے سوال کیا کہ میاں کیا عضو بناتے ہو۔ اس نے جواب دیا کہ دم بنا رہا ہوں۔ فرمانے لگے کہ بے دم کا بھی شیر ہوتا ہے، دم کو چھوڑ دو یہ دم کٹا ہی سہی۔ اس نے دوسری جگہ سے گودنا شروع کیا۔ اس دفعہ آپ نے پہلی مرتبہ سے زیادہ شور مچایا اور پوچھا کہ اب کونسا حصہ بنتا ہے تو اس نے جواب دیا کہ کان تو آپ فرمانے لگے کہ کانوں کو بھی جانے دو بوچا ہی سہی، کیونکہ شیر کا وجود کانوں پر موقوف نہیں۔ اس نے وہ جگہ چھوڑ کر تیسری جگہ سوئی لگائی۔ آپ نے دستور سابق دریافت کیا کہ اب کیا بنا رہا ہے، اس نے کہا کہ پیٹ، آپ فرماتے ہیں کہ تصویر کو پیٹ کی کیا حاجت ہے، اسے کوئی کھانا پینا تو نہیں ہے، اس نے جھلا کر سوئی زمین پر پٹخ دی اور کہنے لگا کہ۔

شیر بے گوش سر و اشکم کہ دید　　　ایں چنیں شیرے خدا ہم نافرید

ترجمہ:۔ بغیر کان، پیٹ اور سر کا شیر کس نے دیکھا ہے ایسا شیر تو اللہ نے بھی نہیں پیدا کیا۔

کہ ایسا شیر تو خدا نے بھی پیدا نہیں کیا، میں کس طرح بناؤں، پھر مولانا فرماتے ہیں۔

چوں نداری طاقت سوزن زدن　　　از چنیں شیرے ژیاں پس دم مزن

ترجمہ:۔ جب تو سوئی چبھوانے کی طاقت نہیں رکھتا تو شیر کی تصویر گدوانے کا نام نہ لے۔

حافظ فرماتے ہیں۔

یا مکن با پیلباناں دوستی　　　یا بنا کن خانہ برانداز پیل

ترجمہ:۔ یا تو ہاتھی والوں سے یارانہ نہ رکھو یا اپنا گھر ہاتھی رکھنے کے انداز پر بناؤ۔

یا مکش بر چہرہ نیل عاشقی　　　یا فرو شو جامہ تقویٰ بہ نیل

ترجمہ:۔ یا تو اپنے چہرے پر عاشقی کا نیل نہ لگاؤ یا اپنا جامہ تقویٰ دریائے نیل میں دھو ڈالو۔

میاں جس جماعت میں شامل ہونا چاہو پہلے اپنے کو اس جماعت جیسا بنالو۔ پھر شرکت کا نام لینا کیونکہ ہر جماعت کی شان جدا ہے، مسخروں کی جماعت ڈھول ڈھپ کے لئے ہے اس میں شریک ہونا چاہو تو ڈھول کھانے کو تیار ہو جاؤ، اور مولویوں کی جماعت میں مسائل کی تحقیق ہوتی ہے، اس میں شریک ہونا چاہو تو علمی باتوں کی قابلیت پیدا کرو، اور اہل حال کی جماعت حالات اور واردات کے لئے ہے۔ اس میں داخل ہونا چاہو تو نفس کو پامال کرنے کے لئے آمادہ رہو۔

ور بہر زخمے تو پر کینہ شوی　　　پس کجا بے صیقل آئینہ شوی

ترجمہ:۔ اگر تو ایک زخم پر ہی کینہ سے معمور ہو جاتا ہے تو بغیر صفائی قلب کے تیرا دل کیسے مجلی ہوگا۔

غرض اگر ایسے لوگوں کی مجالس میں جانے کا قصد ہو تو پہلے اپنے ارادہ کو بالکل چھوڑ دیجئے اور کالمیت فی ید الغسال ہو کر ان کی خدمات میں جایئے، وہ لوگ طبیب ہیں اور طبیب کبھی مسہل بھی دیتا ہے، گو تلخ ضرور ہوتا ہے، مگر چونکہ وہ مواد فاسد کو دور کر دے گا، اس لئے اس کا پینا عقلاً ثقیل اور دشوار نہیں معلوم ہوتا ہے ایسے ہی یہ لوگ بھی طبیب روحانی ہیں، جو شخص واقعی طالب صحت ہو، ان کے پاس جائے گا، وہ کبھی مسہل سے ناک منہ نہ چڑھائے گا۔ خیال تو کرو۔ اگر ایک شخص نے ایک مٹکے میں ڈھیلا گوبر لگا ہوا پھینک دیا تو اب اس میں یہی کرنا پڑے گا کہ گوبر مع پانی کے نکال دیا جائے گا اور صاف کر کے پھر نیا پانی بھرا جائے گا، تو وہ بھی اس کو دھوئیں گے مانجیں گے اور اچھی طرح صاف کریں گے۔ پھر اس کے بعد پانی بھریں گے، مگر آج کل ناپاک پانی کے صاف کرنے کا تو لوگوں کو خیال نہیں اور پہلے ہی دن نیا پانی بھرنا چاہتے ہیں، پس تسبیح و زہد وغیرہ پر نظر ہے، حالانکہ نیا پانی اسی وقت صاف ستھرا رہے گا جبکہ نکما اور میلا پانی پہلے صاف کر دیا جاوے لہٰذا اخلاق ردیہ کو پیشتر صاف کرنے کی حاجت ہوگی اور اس کے ساتھ ہی ان مضر علوم کو بھی رخصت کرنا پڑے گا جو آپ کے دماغ میں تکدر پانی کی طرح بھر رہے ہیں۔ اس کے بعد پھر صاف اور عمدہ پانی آوے گا۔ یہ ہے طریقہ کامیابی کا۔ اس مجموعہ کے متعلق یہ ارشادات ہیں۔

قال را بگزار مرد حال شو　　　پیش مرد کاملے پامال شو

تسبیح و خرقہ لذت مستی نہ بخشدت　　　ہمت دریں عمل طلب ے فروش کن

فکر خود ورائے خود عالم رندی نیست　　　کفر است دریں مذہب خود بینی و خود رائی

ترجمہ:۔ قال چھوڑ و صاحب حال بنو کسی مرد کامل کے سامنے پامال ہو جاؤ تسبیح و خرقہ سے لذت

نہیں ہوتی عمل کی مستی حال سے پیدا ہوتی ہے ایسے ساقی موجود ہیں جن کے یہاں شراب محبت فروخت ہوتی ہے اپنی رائے اور فکر کو راہ سلوک میں کچھ دخل نہیں اس راہ میں خود بینی اور خودرائی کفر ہے۔

مگر ان سب تدبیروں کے بعد بڑی شرط یہ ہے کہ طالب ہو اور عاشق ہو، اور اس طرح بے چین ہو کہ طلب میں اس کا یہ ورد ہو۔

اے بادشاہ خوباں داد از غم تنہائی   دل بے تو بجاں آمد وقت است کہ باز آئی

اے درد تو ام درماں بر بستر ناکامی   وے یاد تو ام مونس درگوشہ تنہائی

ترجمہ:۔ اے بادشاہ خوباں غم تنہائی سے روح نکلنے کے قریب ہے یہ بڑا نازک وقت تو واپس آ جا یا درد تمام دردوں کا کافی علاج نہیں ہے پس اپنی یاد کی توفیق دے کیونکہ تیری یاد ہی گوشہ تنہائی میں مونس وغمخوار ہوتی ہے۔

جب طلب میں اس قدر پریشانی ہوگی، اس وقت مربی روحانی اور طبیب باطن یہ کہے گا کہ

من غم تو مے خورم تو غم مخور   بر تو من مشفق ترم از صد پدر

ترجمہ:۔ میں تمہارے غم کو اپنا غم سمجھتا ہوں آپ غم نہ کریں میں تجھ پر والد سے سوگنا مہربان ہوں۔

اسی طرح اشارہ کیا گیا ہے:

واللہ بما تعملون خبیر   (اور اللہ تعالیٰ کو سب اعمال کی خبر ہے)

سے یعنی جب تمہاری یہ حالت ہوگی ہم کو بھی خبر ہوگی اور تم پر لطف فرماویں گے۔ غرض آیت مذکورۃ الصدر میں جیسا کہ تقریر کی گئی علم وعمل وحال تینوں کی طرف اشارہ ہے اور بقدر ضرورت بحمد اللہ تینوں کا بیان بھی ہو گیا، جو عمل کے لئے کافی وافی ہے، اور چونکہ میرے مواعظ اکثر شائع ہوتے رہتے ہیں، اس لئے مواعظ کے نام بھی رکھ دیئے جاتے ہیں تو اس وعظ کا نام بھی رکھنا مناسب ہے۔ چنانچہ میں اس بیان کا نام "علو العباد من علوم الرشاد" رکھتا ہوں جس میں نام مبارک استاذی جناب مولانا عبدالعلی صاحب کی طرف بھی اشارہ ہے، جو اصل آمر ہیں اس کے بیان کے اور نیز اس میں مضمون آیت کی طرف بھی اشارہ ہے کیونکہ اس آیت میں بیان ہے علو درجات عباد کا۔

اب دعا کیجئے کہ حق تعالیٰ ہم کو علم وعمل کی توفیق عطا فرمائیں اور قال کے ساتھ حال بھی نصیب ہو آمین!

وصلی اللہ تعالیٰ علی سیدنا ومولانا محمد وعلی الہ واصحابہ اجمعین.

التہذیب

جو عمل ہاتھ پاؤں سے ناجائز ہے وہ قلب سے بھی ناجائز ہے، بعض لوگ تسخیر کے لئے عمل کیا کرتے ہیں، یہ بھی حرام ہے تسخیر کا عمل تو تہذیب الاخلاق ہے، اس سے بڑھ کر کوئی تسخیر نہیں۔

تراویح اور قرآن کے حقوق کے متعلق یہ وعظ جامع تھانہ بھون میں ۱۴ رمضان المبارک ۱۳۳۲ھ کو بیٹھ کر فرمایا جو تین گھنٹے ۲۵ منٹ میں ختم ہوا، تقریباً ۵۰۰ کی حاضری تھی، مولوی محمد عبداللہ گنگوہی نے قلمبند کیا۔

خطبہ ماثورہ

بسم اللہ الرحمن الرحیم

الحمد للہ نحمدہ ونستعینہ ونستغفرہ ونومن بہ ونتوکل علیہ ونعوذ باللہ من شرور انفسنا ومن سیئات اعمالنا من یھدہ اللہ فلا مضل لہ ومن یضللہ فلا ھادی لہ ونشھدان لا الہ الا اللہ وحدہ لا شریک لہ ونشھدان سیدنا ومولانا محمداً عبدہ ورسولہ صلی اللہ علیہ وعلی الہ واصحابہ وبارک وسلم۔

امابعد فاعوذ باللہ من الشیطٰن الرجیم۔ بسم اللہ الرحمن الرحیم۔ لَيْسُوْا سَوَآءً مِنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ اُمَّةٌ قَآئِمَةٌ يَّتْلُوْنَ اٰيٰتِ اللّٰهِ اٰنَآءَ الَّيْلِ وَهُمْ يَسْجُدُوْنَ (آل عمران ، آیت نمبر ۱۱۳)

ترجمہ:۔ یہ سب برابر نہیں اھل کتاب میں سے ایک جماعت وہ بھی ہے جو قائم ہیں۔ اللہ کی آیتیں اوقات شب میں پڑھتے ہیں اور وہ نماز بھی پڑھتے ہیں۔

تمہید:۔

آج سے دو جمعہ قبل ایک مبسوط تقریر میں بیان کیا گیا تھا کہ اللہ تعالیٰ نے خاص خاص حکمتوں کے واسطے دو قسم کی عبادتیں مشروع فرمائی ہیں ایک روزہ اور دوسرے تراویح جس میں قرآن مجید پڑھا جاتا ہے اور یہ بھی بیان کیا گیا تھا کہ وہ مصلحتیں اور حکمتیں جب مرتب ہوتی ہیں جبکہ ان دونوں عبادتوں کے حقوق ادا کیے جاویں اور ہر ایک کے جدا جدا حقوق ہیں روزہ کے حقوق ادا کرنے سے اس کی غایات خاصہ مرتب ہوتی ہیں اور کچھ حقوق تراویح کے ہیں اور چونکہ اس میں قرآن مجید خواہ پورا ختم یا اس کے بعض اجزاء پڑھے جاتے ہیں اس قرآن خوانی کے اعتبار سے بھی اس تراویح کے کچھ حقوق ہیں اور اس کے منافع جب ہی مرتب ہوں گے کہ وہ حقوق ادا کیے جائیں یہ مضمون تو دو

جمعہ پہلے بیان کیا گیا تھا اور اس سے پہلے جمعہ میں مضمون سابق کی تتمیم اور تکمیل کے لئے روزہ کے منکرات کو بیان کیا تھا آج وہ حقوق بیان کرنا ہے جو متعلق نماز یعنی تراویح کے ہیں اور روزہ کی طرح ان منکرات کا ذکر بھی ضروری ہوگا کہ جو لوگوں نے اپنی طرف سے اس میں شامل کر لئے ہیں اس میں بعض منکرات و حقوق وہ ہوں گے جن کا تعلق مطلق نماز سے ہے اور بعض وہ ہوں گے جو تراویح کے ساتھ خصوصیت رکھتے ہیں غرض بعض مضامین وہ ہوں گے جو خاص رمضان المبارک کے متعلق ہیں اور بعض عام اسی طرح تراویح کے ضمن میں جو قرآن مجید کے متعلق حقوق و منکرات بیان کئے جاویں گے بعض ان میں مطلقاً قرآن پڑھنے کے متعلق ہوں گے اور بعض وہ مضامین ہوں گے جو رمضان المبارک سے علاقہ رکھتے ہوں گے یہ حاصل ہوگا آج کے بیان کا۔

مقام مؤمن:۔

یہ بات بھی اول ہی سمجھ لینے کے قابل ہے کہ اگر چہ دونوں قسم کے حقوق بیان کئے جائیں گے تراویح کے بھی اور قرآن کے بھی لیکن یہ سمجھنا چاہئے کہ مقصود اعظم ان دونوں میں کیا ہے اس لئے کہ شریعت کا فرق مراتب معلوم کرنا اور اس کا لحاظ ہر شے میں رکھنا بھی ضروری قرار دیا گیا ہے یعنی جیسے عمل مقصود ہے اسی طرح بعض علوم بھی مقصود ہیں پھر ان کی مقصودیت دو طرح سے ہے بعض علوم تو عمل کے لئے مطلوب ہیں اور بعض علوم وہ ہیں جو باعتبار علم ہی کے مقصود ہوتے ہیں پس سمجھنا چاہئے کہ قرآن مجید کے اندر دو حیثیتیں ہیں ایک تو نفس قراءت کہ جس کے بدوں نماز نہیں ہوتی اس کے اعتبار سے جو حقوق ہوں گے وہ تو حقوق صلوٰۃ مندرج ہو جاویں گے اس اعتبار سے بیان فرق کرنا مقصودیت نماز و مقصودیت قرآن میں مقصود نہیں ہے۔ دوسرے رمضان کی تراویح کے اندر جو قرآن ختم کیا جاتا ہے جس کے بدوں نماز ہو جاتی ہے اس کے اعتبار سے فرق مذکور بیان کرنا منظور ہے تراویح مقصود ہے یا قرآن مجید اور وجہ اس فرق بیان کرنے کی یہ ہے کہ اس کا اثر عمل پر پڑتا ہے چنانچہ اکثر لوگوں کا گمان یہ ہے کہ مقصود ختم قرآن ہے اسی واسطے رمضان المبارک میں نماز کی بڑی گت بنتی ہے حتیٰ کہ اس کا اثر فرض پر بھی پڑتا ہے کہ وقت سے پہلے یا مستحب وقت سے پہلے فرض عشاء کے ہوتے ہیں اس لئے کہ اہتمام اس کا ہوتا ہے کہ جلدی ختم ہو جائے تو جلدی مسجد سے بھاگو صاحبو! مسجد میں جی نہ لگنا بری علامت ہے سلف صالحین میں سے کسی کا قول ہے۔

المومن فی المسجد کالسمک فی الماء۔

''یعنی مومن مسجد میں ایسا ہے جیسے مچھلی پانی میں'' جیسے مچھلی کو پانی سے الگ کرنے میں تکلیف ہوتی ہے اور پانی میں رہنے سے اس کی حیات ہے ایسے ہی مومن کا حال مسجد کے ساتھ ہے۔ اور:

المنافق فی المسجد کالطیر فی القفس

یعنی منافق مسجد میں ایسا ہے جیسے پرندہ پنجرے میں پھڑپھڑاتا ہے اور چاہتا ہے کہ جلدی خلاصی ہو اور بہانہ یہ ہوتا ہے کہ جلدی سوئیں گے لیکن یہاں سے جا کر گھنٹوں حقہ پیتے ہیں اور ایسے لوگوں نے ایک لطیفہ یاد کر رکھا ہے کہ کسی نے کسی بزرگ سے پوچھا تھا کہ نماز میں نیند کیوں آتی ہے اور ناچ میں کیوں نہیں آتی فرمایا کہ پھولوں پر نیند آیا کرتی ہے کانٹوں پر نہیں آتی نماز میں روح کو راحت ہوتی ہے اس لئے نیند آجاتی ہے اور ناچ چونکہ خلاف شریعت ہے اس لئے اس میں اگر کسی کسی جگہ ابتلا ہو جائے تو روح کو کلفت ہوتی ہے اس لئے نیند نہیں آتی گویا ان حضرات کا مطلب یہ ہے کہ ہم بھی اس قابل ہیں کہ نماز میں ان کو راحت ہوتی ہے یہ لطیفہ کسی صاحب حال کے معالجہ کے اعتبار سے ٹھیک ہوگا لیکن ہم جیسے اللہ والوں کے حق میں تو درست نہیں ہم لوگوں کے اندر اس کی وجہ اور ہے وہ یہ ہے کہ جس شے کے اندر ہمارا جی لگا کرتا ہے تو اس میں ہم سرتاپا مشغول ہو جاتے ہیں اور تمام حواس بھی اسی طرف ہو جاتے ہیں اور نیند اڑ جاتی ہے، اور نماز میں تمام حواس اس طرف متوجہ نہیں ہوتے اور نیند بھی اڑانے والی توجہ ہی تھی اور کوئی اور کام بھی اس وقت نہیں ہوتا اس لئے نیند آجاتی ہے۔

استغراق اور اس کے آداب:۔

باقی ان بزرگ نے کسی خاص شخص کی حالت کے اعتبار سے فرمایا ہے اور حقیقت اس کی یہ ہے کہ سالکین کو ذکر میں یکسوئی ہوتی ہے اور بعض مرتبہ وہ یکسوئی اس قدر بڑھتی ہے کہ وہ نیند تو نہیں ہوتی مگر مشابہ نیند کے اس بات میں ہوتی ہے کہ جیسے نائم کو اس عالم سے غیبت ہو جاتی ہے ایسے ہی اس ذاکر کو بھی ہو جاتی ہے اس حالت کا نام استغراق ہے چنانچہ اس کے نیند کے مشابہ ہونے پر مجھے حکایت یاد آئی کہ حضرت مولانا گنگوہی رحمتہ اللہ علیہ تھانہ بھون میں رہ کر ذکر و شغل فرمایا کرتے تھے چنانچہ ایک مرتبہ حضرت اپنے حجرہ میں مراقب بیٹھے تھے حضرت حاجی صاحب نے ایک سوار فوجی کو جو مہمان آئے تھے ارشاد فرمایا کہ جاؤ مولانا کو بلاؤ انہوں نے آ کر دیکھا تو

حضرت کی گردن جھکی ہوئی تھی اور آنکھیں بند بے چارہ فوج کا آدمی اس کو کیا خبر یہ کیا کر رہے ہیں جا کر عرض کیا کہ حضرت وہ تو ٹول رہے ہیں حضرت حاجی صاحب سمجھ گئے کہ مشغول ہیں پھر نہ بلایا اور حضرت کا مولانا کو نہ بلانے کا راز ایک بزرگ کے ایک ملفوظ سے معلوم ہوا وہ یہ ہے کہ ایک بزرگ فرماتے ہیں کہ جو شخص مشغول مع اللہ کو اپنی طرف مشغول کرے اور کہ المقت فی الوقت یعنی اس کو اسی وقت اللہ تعالیٰ کی ناراضگی لاحق ہوتی ہے بڑی زیادتی اور بے احتیاطی کرتے ہیں وہ لوگ جو کہ مشغول باللہ کو اپنی طرف متوجہ کریں اکثر لوگ بزرگوں کے پاس جاتے ہیں اور ان کو مشغول پاتے ہیں تو یہ چاہتے ہیں کہ ان کو اپنی طرف متوجہ کریں تو ایسی حرکتیں کرتے ہیں جس سے دل بٹ جائے کیا کرتے ہیں بعضے تو السلام علیکم پکار کر کرتے ہیں یاد رکھو جو شخص قرآن مجید پڑھتا ہو یا ذکر و شغل میں مشغول ہو اس کو سلام مت کرو جا کر دیکھو کہ وہ کس حالت میں ہے اگر سلام کا موقعہ ہو تو سلام کرو ورنہ چپکے سے ایسے طور سے بیٹھ جاؤ کہ ان کو تمہارے آنے کی بھی خبر نہ ہو جب میں جلسہ دیوبند میں گیا تو علیل تھا بلکہ ارادہ بھی جانے کا نہ تھا ایک بار نماز کے وقت باجازت امام نماز پڑھانے کیلئے مصلی پر جانے لگا راہ میں وہاں مصافحوں کا ہجوم ہوا مصافحے کرتا کرتا حیران ہو گیا خیر جوں توں کر کے مصلے کے قریب پہنچ گیا تو دوسری صف میں سے ایک شخص نے نکل کر ہاتھ پکڑ کر گھسیٹا اور مصافحہ کر کے چھوڑ دیا ایک بار وطن میں بعد نماز کے کچھ اوراد مصلی پر بیٹھا پڑھ رہا تھا ایک شخص سپاہی سا آ کر کھڑا ہو گیا اور بآواز بلند پشت کی طرف کہا مصافحہ میں نے کہا وظیفہ اور بعض کیا کام کرتے ہیں حلق سے کام لیتے ہیں یعنی کھانستے ہیں مطلب یہ ہے کہ ہم آئے ہیں وظیفہ چھوڑ کر ہم سے باتیں کرو بعض ہاتھوں کی آہٹ سے کام لیتے ہیں بعضے پاؤں کو زمین پر مارتے ہیں جو شخص کہ مشغول ہو اس کو جب معلوم ہوتا ہے کہ کوئی میرا منتظر ہے اس کا دل بٹ جاتا ہے اور دل پر بوجھ ہوتا ہے اور بعضے جو ادب سے کام لیتے ہیں وہ چپکے سے ایک جگہ بیٹھ جاتے ہیں مگر بیٹھتے ہیں ایسی جگہ کہ اس مشغول شخص کی نظر بار بار پڑے یاد رکھو اگر انتظار کرنا ہو تو ایسی جگہ بیٹھو جہاں اس کو خبر بھی نہ ہو جب دیکھو کہ اب فارغ ہو گئے ہیں اس وقت ملو ہاں خدانخواستہ اگر کوئی مرتا ہو یا کنویں میں گرتا ہو تو اس وقت وظیفہ تو الگ رہا فرض نماز کا توڑ دینا واجب ہے مگر غضب تو یہ ہے کہ معمولی بات کے لئے آ کر حرج کراتے ہیں۔

ایک شخص میرے پاس آیا میں کچھ پڑھ رہا تھا۔ میں اٹھ کر گیا کہ کیا ہے کہو کہنے لگا تیج (تعویذ)

چاہئے پوچھا کاہے کا کہا بکھار آوے (بخار آتا ہے) لیجئے ایک تعویز کے واسطے اس بندہ خدا نے میرا حرج کیا میں صبح کو اپنی مصلحت سے جنگل چلا جاتا ہوں بعض حضرات وہاں بھی پہنچتے ہیں بعض حضرات ایک اور حرکت کرتے ہیں وہ ہیں جو ذرا بزرگ ہیں وہ یہ کرتے ہیں کہ بیٹھ تو جاتے ہیں الگ ہی لیکن قلب سے اس کی طرف متوجہ ہو جاتے ہیں یاد رکھو کہ اگر کسی کا شیخ ''صاحب کشف'' نہ ہو تو اس کا کچھ حرج نہیں اور اگر وہ صاحب کشف ہے تو اس کو ادراک ہوگا کہ کوئی شخص میری طرف متوجہ ہے اس کو تکلیف ہوگی ایک شخص ہمارے حضرت حاجی صاحب کے یہاں آئے اس وقت حضرت بالا خانے پر تشریف رکھتے تھے، وہ شخص حضرت کا خیال کر کے بیٹھ گیا۔ تھوڑی دیر میں کیا دیکھتے ہیں کہ حضرت آرہے ہیں اس طرف نظر اہل تحقیق کی پہنچتی ہے وہ اس سے بچتے ہیں حضرت حاجی صاحب فرماتے ہیں کہ ایک شخص یہاں آئے اور آکر ٹٹولنے لگے یعنی مراقب ہوئے کہ دیکھیں حضرت کی نسبت کس درجہ کی ہے حضرت سیدھے ہو بیٹھے اور یہ آیت تلاوت فرمائی:

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَدْخُلُوْا بُيُوْتًا غَيْرَ بُيُوْتِكُمْ حَتّٰى تَسْتَاْنِسُوْا۔ (النور آیت نمبر ۲۷)

ترجمہ:۔ اے ایمان والو تم اپنے گھروں کے سوا دوسرے گھروں میں داخل مت ہو جب تک کہ اجازت حاصل نہ کرلو)

اور فرمایا، قال اللہ تعالیٰ ''لاتجسسوا (اور تجسس نہ کرو) اور فرمایا کہ یہ بھی تجسس حرام کے اندر داخل ہے یہ چوروں کی طرح گھسنا کہاں جائز ہے اور فرمایا کہ میاں جو چھپانے والے ہوتے ہیں ہزار ٹکریں مارا کرو پتہ بھی نہیں دیتے انہوں نے فوراً پاؤں پکڑ لئے۔

تصرف کی حرمت:۔

اسی طرح تصرف سے کسی سے کچھ وصول کرنا یہ بھی حرام ہے بعض اہل تصرف اس کو بزرگی سمجھتے ہیں کہ کسی کی طرف متوجہ ہو گئے کہ یہ شخص ہم کو پانچ سو روپے دے گا تصرف کے اندر یہ اثر ہے کہ اس شخص کا قلب مغلوب ہو کر متاثر ہو جاتا ہے اور وہ وہی کام کرتا ہے یہ سمجھتے ہیں کہ یہ حلال ہے حالانکہ حرام ہے اور ایسا ہی حرام (۱) ہے جیسے کسی کو مار کر کچھ چھین لیا جائے اور ایسے دیئے ہوئے کا اثر یہ ہوتا ہے کہ بعد میں آدمی پچھتاتا ہے ایک فقیہ صاحب تصرف تھا وہ پڑھ پڑھ کر پیشانی پر مٹی لگا

حاشیہ(۱):۔ فقہی روایت بھی اس میں اگر ہو[illegible] ے تو بہتر ہے ورنہ بظاہر فتویٰ کی رو

سے جائز معلوم ہوتا ہے، گو تقویٰ کے خلاف ہو۔ اور اگر ناجائز ہو تو کسی صاحب ریاضت کو دیکھ کر ایک بے انتہا کشش اس کی طرف ہوتی ہے اگرچہ وہ صاحب ریاضت تصرف نہ کرے اور اس کشش کے غلبہ سے وہ کچھ انکی خدمت کرے اور جب وہ اثر نہ رہے تو پچھتائے اور اس لئے اس کی محبت تو قلوب میں راسخ نہیں ہے تو چاہئے یہ بھی ناجائز ہو، ورنہ مابہ الفرق کیا ہے۔ ۱۲ جامع

الجواب:۔ فقہی روایت اس کی مؤیدہ وہ ہے جو کتاب الحظر والاباحۃ میں کتب فتاویٰ میں لکھی ہے کہ زوجہ کو تعویذ حب کا زوج کے لئے حرام ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ اسکے اثر سے زوج کو ایسے امر کے لئے مغلوب کرنا ہے جو اس پر واجب نہیں، یہی علت یہاں بھی ہے پس اشتراک علت سے حکم مشترک ہو گیا اور صاحب شبہ کے مقیس علیہ میں اور اس میں فرق ظاہر ہے کہ اس مقیس علیہ میں اس صاحب نے نہ اس کا قصد کیا نہ اس کو اس کا علم اور مدار تکلیف یہی دو امر ہیں اور مقیس میں خود قصد کیا ہے جو مسبوق بالعلم ہوتا ہے اور اگر مقیس علیہ میں بعد میں علم ہو جاوے کہ دینے کے بعد پچھتایا ہے تب بھی واپس کرنا واجب نہیں کیونکہ شرط علت طیب قلب وقت عطاء ہے بعد میں اس کا بقاء ضروری نہیں، البتہ مروت و ہمت اسی میں ہے کہ واپس کر دے، چنانچہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو کسی اعرابی نے ہدیہ دیا، آپ نے اس کا بہت سا بدل دیا مگر وہ راضی نہ ہوا، مگر آپ سے یہ منقول نہیں کہ واپس فرمایا ہو، اس سے تو عدم وجوب واپس کا ثابت ہوا اور آپ چونکہ بدل دے چکے تھے جو حکم مبدل ہے اس سے واپسی کا اقرب الی الہمت ہونا معلوم ہوا۔ ۱۲ اشرف)

لیتا تھا ایک مرتبہ وہ ایک انگریز کے پاس گیا اس انگریز نے اس کی صورت دیکھتے ہی خانساماں کو حکم دیا کہ اس کو سو روپیہ دے دو جب وہ چلا گیا تو بہت پچھتایا کہ میں نے کیا کیا فوراً خانساماں سے کہا کہ اس کو پکڑو جب وہ آیا صورت دیکھتے ہی کہا کہ اس کو وہ سو روپے دیدو کچھ نہ کہو پھر وہ چلا گیا تو نادم ہوا پھر خانساماں نے کہا کہ آپ تو دق کرتے ہیں آپ لکھ دیجئے چنانچہ سو روپیہ دینا اس سے لکھوا لیا اس وقت وہ نادم تو ہوا لیکن چونکہ لکھ چکا تھا اس لئے کچھ نہ بولا پس اس طرح کسی کا مال لینا بالکل ایسا ہی ہے جیسے لٹھ مار کر لینا ہمارے حافظ محمد ضامن صاحب رحمۃ اللہ علیہ شہید کے صاحبزادہ حافظ محمد یوسف صاحب مرحوم بھی صاحب نسبت تھے اور بھوپال میں تحصیلدار تھے ایک صاحب تصرف فقیر یہ سمجھ کر کہ یہ تو ایک تحصیلدار ہیں ان کی طرف متوجہ ہو کر کھڑا ہو گیا ان کو معلوم ہو گیا فوراً یہ شعر پڑھا

سنبھل کر رکھنا قدم دشت خار میں مجنوں کہ اس نواح میں سودا برہنہ پا بھی ہے

حافظ صاحب کا یہ شعر پڑھنا تھا کہ وہ تڑپ سے گر پڑا اور کہا کہ حضور میں تو آپ کا ہی شغال رنگیں ہوں حافظ صاحب نے اس کو نصیحت فرمائی اور فرمایا کہ توبہ کرو کس خرافات میں مبتلا ہو اتباع سنت کرو بڑی شے اتباع سنت ہے تصرف کوئی شے نہیں ہے اور یاد رکھو جو عمل ہاتھ پاؤں سے ناجائز ہے وہ قلب سے بھی ناجائز ہے۔

راز محبوبیت:۔

بعض لوگ تسخیر کے لئے عمل کیا کرتے ہیں یہ بھی حرام ہے اور اگر کسی بزرگ کو دیکھا ہو کہ وہ میاں بیوی میں محبت ہونے کے لئے عمل کرتے ہیں۔ تو وہ اس درجہ کا عمل کرتے ہیں جس سے میاں حقوق واجبہ ادا کرنے لگے یہ نہیں کہ وہ مغلوب الحواس ہو جائے بزرگوں کے پاس تسخیر کا عمل تو تہذیب اخلاق ہے اس سے بڑھ کر کوئی تسخیر نہیں جس کی نسبت کسی نے کہا ہے۔

اخلاق سب سے کرنا تسخیر ہے تو یہ ہے　　　خاک آپ کو سمجھنا اکسیر ہے تو یہ ہے

جو خدا کا مطیع ہوتا ہے وہ سب کا محبوب ہو جاتا ہے اور اگر وہ غصہ بھی کرتا ہے تو اس کی سب سہتے ہیں حضرت مولانا فضل الرحمٰن صاحب گنج مراد آبادی علیہ الرحمۃ مزاج کے تیز تھے اور جذب بھی تھا وزیر حیدر آباد آئے حکم دے دیا کہ نکالو کسی نے عرض کیا کہ حضرت وزیر ہیں فرمایا میں کیا کروں جو وزیر ہے جب بہت اصرار کیا تو یہ فرمایا کہ اچھا دو بجے رات تک رہنے کی اجازت ہے حیدر آباد کے امراء بھی اللہ اکبر! بزرگوں کے بہت ہی معتقد ہوتے ہیں اس شخص نے باوجود وزیر ہونے کے برا نہیں مانا اور دو بجے رات کو چل دیا اور یہ کہا کہ بھائی اب مولانا کا حکم نہیں ہے۔ تو یہ کیا بات تھی ان کے کہنے سے یوں برا نہ مانتے تھے بات یہ ہے کہ ان حضرات کا جو کام اللہ کے واسطے ہے نفس کے واسطے نہیں ہوتا نرمی کریں جب اور سختی کریں تب، جو بات ہے وہ سب اللہ ہی کے واسطے ہے اور حق تعالیٰ سب کے محبوب حقیقی ہیں آپ نے کبھی نہ دیکھا ہوگا کہ معشوق اگر گالی دے یا گھونسہ مارے تو عاشق نے برا مانا ہو بلکہ گھونسے کھانے میں بھی مزہ آتا ہے اور عاشق یہ کہتا ہے کہ

نشود نصیب دشمناں کہ شود ہلاک تیغت　　　سر دوستاں سلامت کہ تو خنجر آزمائی

ترجمہ:۔ دشمنوں کا یہ نصیب نہ ہو کہ وہ تیری تلوار سے ہلاک ہوں تیری خنجر آزمائی کے لئے دوستوں کا سر سلامت رہے۔

اس لئے یہ بھی سب کے محبوب ہیں اس لئے ان کی سب حرکات بھی محبوب ہیں اور اسی واسطے

جس قدر اہل کمال ہیں ان کے کمالات کے تذکرہ کرنے میں تو لذت آتی ہے مگر اہل اللہ کے ہنسنے اور رونے اور بیٹھنے اور سونے کے تذکرہ میں بھی مزہ آتا ہے ان کی سب حرکات میں محبوبیت کی شان نظر آتی ہے جس کا راز اصلی یہ ہے کہ یہ حق تعالیٰ کے محب اور محبوب ہوتے ہیں پس اصل تسخیر تو یہ ہے اور تسخیر کے عمل کو وہ حرام جانتے ہیں بہر حال جو شخص مشغول ہو اس کی طرف قلب سے بھی متوجہ نہ ہونا چاہئے یہ وجہ تھی اور یہ راز تھا کہ حضرت حاجی صاحب نے حضرت مولانا کو پھر نہ بلایا پس وہ حالت مشابہ نیند کے ہوتی ہے اور یہ سالکین مشاغلین کو پیش آتی ہے پس ایسی حالت والوں کے اعتبار سے وہ نکتہ چل سکتا ہے باقی ہم لوگوں کو نیند آنے کی یہ وجہ نہیں نیند تو آتی ہے اسباب طبعیہ کے لوازم کی وجہ سے فرق اتنا ہے کہ نماز میں تو کوئی شے دفع لوازم موجود نہیں اور ناچ رنگ میں موجود ہے۔

اوقات نماز:۔

حاصل یہ ہے کہ لوگوں کا نماز میں جی نہیں لگتا اور یہ کچھ تراویح کے ساتھ خاص نہیں بعضے لوگ جامع مسجد میں سب سے پہلے آتے ہیں لیکن بیٹھتے ہیں سائبان میں ہوا کے واسطے یہ اتباع ہوا ہے جس کی نسبت داؤد علیہ السلام جیسے پیغمبر کو یہ ارشاد ہے:

وَلَا تَتَّبِعِ الْهَوٰى فَيُضِلَّكَ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ. (ص آیت نمبر ۲۶)

ترجمہ:۔ اور آئندہ بھی خواہش نفسانی کی پیروی مت کرنا کہ وہ خدا کے رستہ سے تم کو بھٹکا دیگا۔

بعض لوگ اس مصلحت سے بھی باہر بیٹھتے ہیں کہ جلدی سے بھاگ جاویں اس لئے کہ شاید ہمارے پیچھے کوئی ایسا شخصیت باندھے کہ قرنطینہ ہی ہو جائے اس لئے بس امام نے سلام پھیرا اور چل دیئے ایک آقا صاحب اپنے نوکر کے ساتھ شرط باندھ کر نماز پڑھا کرتے تھے کہ دیکھیں پہلے کون فارغ ہو، ایک ظریف صاحب نے دیکھ کر کہا تھا کہ معلوم ہوتا ہے کہ اذکار اور قراءت تو تم گھر پڑھ لیتے ہو یہاں خالی اٹھنا بیٹھنا رہ جاتا ہے اور تراویح میں تو خصوصیت سے اہتمام کرتے ہیں کہ جلدی فراغت ہو اسی واسطے بہت جلدی کھڑے ہوتے ہیں اور اس جلدی کھڑے ہونے میں تین حالتیں ہیں بعض جگہ تو اذان بھی وقت پر ہوتی ہے اور فرض وتراویح بھی وقت پر ہوتے ہیں خیر اتنی جلدی تو قابل شکایت نہیں گو دلیل بے رغبتی کی ہے اور بعض جگہ اذان ہوتی ہے وقت سے پہلے اور فرض وتراویح وقت پر ہوتے ہیں۔ اور بعض جگہ نہ اذان وقت پر ہوتی ہے اور نہ فرض وقت پر، یہ لوگ

جب اپنے نزدیک دیکھ لیتے ہیں کہ سرخی غائب ہوگئی بس اذان کہہ دیتے ہیں حالانکہ امام صاحب کا مذہب یہ ہے کہ سرخی کے بعد جو سفیدی ہوتی ہے جب وہ غائب ہو جائے اس وقت عشاء کا وقت آتا ہے اور ریاضی کے قاعدہ سے بھی امام صاحب کا مذہب قوی معلوم ہوتا ہے اس لئے کہ دیکھنا اس بات کو ہے کہ شفق کی حقیقت کیا ہے سو شفق واقع میں اثر ہے قریب آفتاب کا، افق سے یہ نور اس کی شعاعوں کا ہے اور شفق اس وقت ہوتی ہے جب آفتاب افق سے اٹھارہ درجہ پر ہوا ایک مقدمہ تو یہ ہوا دوسری بات یہ ہے کہ شفق دو وقت ہوتی ہے طلوع سے پہلے اور غروب کے بعد صبح میں سب کا اتفاق ہے کہ سفیدی کے بعد صبح ہو جاتی ہے اور رات ختم ہو جاتی ہے پس وہ سفیدی لیل ونہار کی ہے پس اسی طرح غروب کے بعد بھی سفیدی تک نہار کا اثر ہے اور تجربہ سے معلوم ہوا کہ ہر موسم میں تقریباً برعایۃ الاحتیاط غروب کے ڈیڑھ گھنٹہ بعد کم ازکم عشاء کی اذان ہونی چاہئے۔ اور نیز اذان اور نماز میں کچھ فصل بھی ہونا چاہئے کم ازکم آدھ گھنٹہ کافی ہے پس غروب سے پورے دو گھنٹہ بعد عشاء کے فرض ہونا چاہئے اس سے پہلے کھڑے ہونا تعجیل غیر مناسب ہے۔

آج کل کے مجتہدین:۔

بعضے پڑھے جن ہوتے ہیں وہ کہتے ہیں کہ نیک کام میں جلدی کام کرنا چاہیے اجی حضرت نیک کام میں سرعت آئی ہے جس کی نسبت:

يسارعون في الخيرات. (آل عمران آیت نمبر ۱۱۴)

ترجمہ:۔ وہ نیکی کے کاموں میں جلدی کرتے ہیں۔

آیا ہے سرعت اور شے ہے اور تعجیل اور شے، سرعت کہتے ہیں:

التقدم فيما يجوز التقدم فيه ۔(اس کام میں آگے بڑھنا جس میں آگے بڑھنا جائز ہو)

کو اور تعجیل کے معنی ہیں:

التقدم فيما لا يجوز التقدم فيه۔ (اس کام میں آگے بڑھنا جس میں آگے بڑھنا جائز نہ ہو)

اس کی نسبت:

العجلة من الشيطن ۔(السنن الکبریٰ للبیہقی ۱۰۴:۱۰،۱۰۴:۱۰-۱۰۴:۱۰)(جلدی کا کام شیطان کا ہے)

آیا ہے۔
حاشیہ (لیکن تعجیل کے یہ معنی حدیث **لایزال امتی بخیر ما عجلوا الا فطار والسجود** (المستدرک للحاکم ۱:۱۹۰، ۱۹۱) کے اندر نہیں بنتے ۔۱۲ جامع

الجواب یہاں بالمعنی الاعم استعمال کیا گیا ہے، پس یہ مجادلہ ہوگا، یا اصل یہ ہے کہ تعجیل کی دو قسم ہوں (۱) محمود (۲) مذموم (اشرف))

آجکل مجتہد بہت پیدا ہوئے ہیں ایسے ہی مجتہدوں نے دین کو خراب کیا ہے اور ایسے ایسے مجتہد ہزاروں ہیں اور ان کے القاب بھی عجیب عجیب ہیں کوئی لیڈر ہے کوئی ریفارمر کہلاتے ہیں ایسوں ہی کی نسبت جو کہ شرائع میں تحریف کرتے ہیں کسی نے کہا ہے۔

گربہ میرو سگ وزیر و موش را دیواں کنند ایں چنیں ارکان دولت ملک را ویراں کنند

ترجمہ:۔بلی امیر، کتا وزیر اور چوہا دربان مقرر کیا جائے تو ایسے ارکان سلطنت ملک کو ویران کرتے ہیں۔)

ناس کر دیا ان خیر خواہوں نے اسلام کا بلکہ سچ یہ ہے کہ اپنا ناس کر لیا ہے اسلام کو یہ کیا ضرر پہنچا سکتے ہیں اسلام کی تو وہ کیفیت ہے۔

يُرِيْدُوْنَ لِيُطْفِئُوْا نُوْرَ اللّٰهِ بِاَفْوَاهِهِمْ. وَاللّٰهُ مُتِمُّ نُوْرِهٖ. الخ

(ترجمہ:۔وہ لوگ اللہ کے نور (اسلام) کو پھونکوں سے بجھانا چاہتے ہیں اور اللہ اس نور (اسلام) کو پورا کرنا چاہتے ہیں۔)

چراغے را کہ ایزد برفروزد ہر آنکس تف زند ریشش بسوزد
اگر گیتی سراسر باد گیرد چراغ مقبلاں ہرگز نمیرد

ترجمہ:۔جس چراغ کو اللہ تعالیٰ روشن کریں جو اس کو بجھانے کیلئے پھونک مارے گا اسکی اپنی ڈاڑھی جل جائے گی اگر پوری زمین ہوا بن جائے تب بھی مقبولوں کا چراغ گل نہ ہوگا۔

لیکن انہوں نے تو اس شمع کو بے نور کرنیکا ارادہ کر لیا ہے گو وہ شمع روشن رہا اسلام کی تو وہ حالت ہے۔

ہنوز آں ابر رحمت درفشان ست خم و خمخانہ بامہرو، و نشان ست

ترجمہ:۔اس کا ابر رحمت اب بھی برس رہا ہے کہ جام اور شراب خانہ کا باقی ہونا اس کی رحمت کی نشانی ہے۔(یعنی دین اسلام کا کائنات میں باقی رہنا)

واللہ! اسلام میں ذرہ برابر بھی ان کرتوتوں سے فرق نہیں آیا اور وجہ اصلی اس کی یہ ہے وَاِنَّا لَہٗ لَحٰفِظُوْنَ۔ (اور ہم ہی اس کے محافظ ہیں)

''کہ ہم اس کی حفاظت کرنے والے ہیں۔''

اور ظاہری صورت اس کی یہ ہے کہ خادمان دین ہزاروں کی تعداد میں حق تعالیٰ نے پیدا فرما دیئے ہیں جو منصورین عن الحق ہیں اور ایک جماعت کی جماعت اس کام کے لئے پیدا کر دی ہے کہ وہ ہمیشہ دین کے اندر اجزاء مختلفہ کو جدا کرتے رہتے ہیں اور بتلاتے ہیں کہ دین اس قدر ہے اور اتنی بات اس میں بددینی کی، اس لئے کسی کی کچھ نہیں چلتی ورنہ ان اہل الرائے کا اثر تو واقعی بہت زبردست تھا جس کی نسبت ارشاد ہے۔

وَاِنْ کَانَ مَکْرُھُمْ لِتَزُوْلَ مِنْہُ الْجِبَالُ

گویا ان کے مکروں کو دیکھ کر اسلام بزبان حال کہتا ہے

قتل ایں خستہ بہ شمشیر تو تقدیر نہ بود ورنہ ہیچ از دل بے رحم تو تقصیر نہ بود

ترجمہ:۔ اس کمزور کا قتل تیری تلوار کے مقدر میں نہیں تھا ورنہ تیرے بے رحم دل نے تو کوئی کسر نہ چھوڑی۔

لیکن خدا تعالیٰ کی حفاظت ہے اور قیامت تک حسب وعدہ مخبر صادق علیہ الصلوٰۃ والسلام برابر رہے گی باقی ان لوگوں نے اپنے اجتہاد سے پورا کام لے لیا ہے یاد رکھو قرآن مجید کی تفسیر کرنا آسان کام نہیں اس کے لئے چودہ علم میں مہارت کاملہ ہونے کی شرط ہے جیسا صاحب کشاف نے لکھا ہے پس آپ کسی آیت کی تفسیر نہیں سمجھ سکتے پس اب وہ شبہ جو یسارعون فی الخیرات سے ہوا تھا دفع ہو گیا۔

امام اور مقتدیوں کی حالت:۔

بعض لوگ تو تراویح سے جلدی فارغ ہونے کے لئے اس قدر عجلت کرتے ہیں کہ سُبْحٰنَکَ اللّٰھُمَّ بھی نہیں پڑھتے۔ اور التحیات کے بعد درود شریف تو شاید کوئی اللہ کا بندہ پڑھتا ہوگا اور التحیات بھی بہت تیز پڑھتے ہیں۔ ان سب امور سے معلوم ہوتا ہے کہ مقصود صرف قرآن خوانی کو سمجھتے ہیں نماز کو مقصود نہیں جانتے ورنہ اس کے اجزاء میں یہ کتر بیونت نہ کرتے۔ اور قرآن بھی اس قدر تیز پڑھتے ہیں کہ بجز غفورا اور شکورا کے کچھ سمجھ نہیں آتا کیا پڑھا۔ غرض یہ چاہتے ہیں کہ جلدی سے خلاصی ہو۔ جیسے ایک سررشتہ دار ایک ان کے نائب دونوں ایک کچہری میں تھے۔ انگریز

ان کو نماز کے وقت اجازت دے دیتا تھا کہ تم نماز پڑھ آؤ۔ تو سررشتہ دار صاحب تو نمازی تھے وہ تو بہت دیر میں نماز خشوع وخضوع سے پڑھ کر آتے تھے اور نائب صاحب بے نمازی تھے وہ تھوڑی دیر میں واپس آجاتے صاحب نے ایک دن پوچھا کہ تم بہت جلدی آجاتا ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ تم نماز نہیں پڑھتا۔ کہا حضور! سررشتہ دار صاحب نئے نمازی ہیں نماز ان کو آتی نہیں وہ سوچ سوچ کر پڑھتے ہیں اور مجھ کو نماز کی مشق ہے نماز میری گھٹی میں ہے پرانا نمازی ہوں بالکل خوب یاد ہے اس لئے جلدی پڑھ کر آتا ہوں مولانا محمد یعقوب صاحب فرمایا کرتے تھے کہ ہماری نماز کی مثال ایسی ہے جیسے گھڑی کہ اس کو کوکنے کی تو ضرورت ہوتی ہے مگر ایک مرتبہ جب کوک دی تو پورے چوبیس گھنٹہ کے بعد وہ بند ہوگی اسی طرح ہماری نماز ہے کہ شروع کرنے کی دیر ہے جب شروع کر دی بس پھر تو مشین کی طرح آپ سے آپ تمام ارکان ادا ہو رہے ہیں۔ السلام علیکم ہی پر جا کر خبر ہوتی ہے۔ خصوصاً تراویح کا بہت ہی ناس کرتے ہیں حالانکہ نماز کی ہیئت اور اس کے تمام احکام سے معلوم ہوتا ہے کہ حضور قلب کی بہت ہی رعایت رکھی گئی چنانچہ تراویح میں ہر چار رکعت پڑھنے سے جو تکان ہو گیا ہے اس سے سکون ہو جائے اور نشاط عود کر آوے گا طبیعت تازہ ہو جاوے گی آئندہ چار رکعت اطمینان سے ادا ہوں گی۔ اب بعض حفاظ تو بالکل بیٹھتے ہی نہیں۔ اور بعض جو بیٹھتے ہیں تو پالا سا چھوا دیتے ہیں۔ یہاں تک امام صاحب کی زیادتیوں کا بیان تھا اب مقتدیوں کی سنئے۔ انہوں نے ایک عجیب ترکیب نکالی ہے وہ یہ کرتے ہیں کہ لیٹے رہتے ہیں یا بیٹھے سویا کرتے ہیں جب دیکھا کہ امام صاحب رکوع میں جائے گا تو فوراً نیت باندھ کر کھڑے ہو گئے اور بعضے جو اول سے شامل بھی ہوتے ہیں تو محض سستی کی وجہ سے قیام چھوڑ دیتے ہیں بیٹھے بیٹھے پڑھتے ہیں اور پڑھتے کیا ہیں بعضے تو اچھی خاصی طرح سوتے ہیں۔ غرض امام اور مقتدی سب نے مل کر تراویح کی یہ گت بنائی ہے۔ پس یہ ساری خرابی اس کی ہے کہ نماز کو مقصود ہی نہیں سمجھا۔ زیادہ ختم قرآن ان کا پیش نظر ہے اس لئے ضروری ہوا کہ ان دونوں کا فرق بیان کیا جاوے۔

مقصود اعظم:۔

سو یاد رکھو کہ ان دونوں عبادتوں میں مقصود اعظم نماز ہے ختم قرآن تابع ہے اور یہ فرق میں نے اپنی طرف سے نہیں گھڑا اس لئے کہ ہم تعیین کرنے والے کون ہوتے ہیں فقہاء نے تراویح کو سنت موکدہ لکھا

ے اس سے ظاہراً معلوم ہوتا ہے کہ یہ دونوں ہم پلہ ہیں لیکن آگے چل کر ایک جزئیہ لکھا ہے اس سے میرے قول کی تصدیق ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ اگر کسی قوم پر کسل غالب ہو اور گمان غالب ہو کہ اگر یہاں قرآن پاک پڑھا جائے تو لوگ نہ سنیں گے تو ایسی جگہ پورا قرآن شریف نہ پڑھا جاوے۔ اور بیس رکعت تراویح الم ترکیف سے پڑھ لیں۔ یہ نہیں فرمایا کہ رکعتوں میں اختصار کر دیں مثلاً بیس کی جگہ آٹھ ہی پڑھ لیں یا بلا نماز ہی قرآن ختم کر لیں۔ فقہاء نے لوگوں کی حالت کو ہمیشہ پیش نظر رکھا ہے۔ انہوں نے دیکھا کہ اگر قرآن ختم کیا جائے گا۔ تو لوگ تراویح ہی چھوڑ دیں گے۔ چنانچہ اسی بناء پر وہ فرماتے ہیں۔

من لم یعرف اھل زماننا فھو جاھل (جو اہل زمانہ کو نہ پہچانے وہ جاہل ہے)

غرض اس جزئیہ سے معلوم ہوا کہ مقصود اعظم نماز ہے اور ختم قرآن تابع ہے جب فقہاء کے قول سے تائید ہوگئی اب ہم کو گنجائش ہے کہ ہم دوسری جگہ سے تائید اس کی بیان کریں۔ وہ یہ ہے کہ نماز اور قرآن کی وضع کے اندر جو غور کیا جاتا ہے اور دیکھا جاتا ہے تو اس سے بھی یہی معلوم ہوتا ہے کہ قراءۃ قرآن تابع ہے اور صلوٰۃ متبوع۔ اس لئے کہ صلوٰۃ نام ہے قیام قراءۃ رکوع، سجدہ، قومہ، جلسہ کے مجموعہ کا اور قرآن اس کا جزو ہے اور قاعدہ عقلی ہے کہ

والکل اشرف من الجزء۔ (اور کل جز سے افضل ہوتا ہے)

اس لئے کہ جو فضیلت قرآن مجید کی ہے نماز میں وہ بھی حاصل ہوگی اور دوسرے ارکان کی فضیلت اور شامل حال ہو جائے گی۔ باقی اس پر ایک شبہ ہوتا ہے وہ یہ ہے کہ قرآن جو موقوف علیہ اور تابع نماز کا ہے۔ اسی درجہ میں توقف ہو اور موقوف علیہ صرف تین آیتیں ہر رکعت میں ہیں۔ یہ طویل مقدار موقوف علیہ نہیں ہے۔ پس ختم قرآن کا تابع ہونا کیسے مقصود ہوا اور گفتگو اسی میں تھی پس ممکن ہے کہ تین آیت کی قدر تو قرآن کے تابع ہو اور اس سے زیادہ تابع نہ ہو اس کا جواب دیتا ہوں وہ یہ ہے کہ فقہاء نے تصریح کی ہے کہ یہ جو کہا جاتا ہے اس قدر قرآۃ فرض اور اس قدر واجب اور اس قدر مستحب ہے اس کے معنی ہیں کہ اتنی مقدار پر کفایت کرنا فرض و واجب ہے اور زیادہ پڑھنا مستحب ہے۔ پس یہ فعل فرض یا مستحب ہوگا۔ باقی قراءۃ جو اس قدر پڑھی جائے گی سب کو یوں ہی کہیں گے کہ یہ سب فرض ہی واقع ہوگا۔ پس اب تمام قرآن جزو صلوٰۃ بن کر تبعیت ثابت ہوگئی۔ غرض اس تقریر سے ثابت ہوگیا کہ مقصود اعظم نماز ہے اور یہ بھی معلوم ہوا کہ تراویح جس میں قرآن پڑھا جاتا ہے اس کے حقوق مطلق تلاوت قرآن سے زیادہ ہوں گے۔ اس لئے

کہ جس قدر حقوق مطلق کے ہوں گے وہ سب بھی اس نماز کے ہوں گے۔ لجزئیہ اور نماز کے حقوق علیحدہ ثابت ہوں گے۔ پس اس کا بہت زیادہ اہتمام اور رعایتیں کرنا چاہئے۔

توسط کی رعایت:۔

منجملہ ان حقوق اور رعایت کے کہ جس میں فروگذاشت ہو رہی ہے تعدیل ارکان ہے اس کا خیال رکھنا چاہئے کہ ارکان اطمینان کے ساتھ ادا ہوں دوسرے یہ کہ قرآن اس قدر پڑھا جائے کہ جو مقتدیوں کو گراں نہ ہو اور اگر مقتدیوں کو گراں ہو تو ان کو منافقین سے مشابہت ہو جاوے گی جن کی نسبت ارشاد ہے۔

وَاِذَا قَامُوْٓا اِلَی الصَّلٰوۃِ قَامُوْا كُسَالٰی. (جب نماز کیلئے کھڑے ہوتے ہو تو سستی سے کھڑے ہوتے ہیں۔)

جس کا سبب یہ امام ہوا۔ عبادت مستحبہ وہی بہتر ہے جو نشاط کے ساتھ ہو۔ حدیث شریف میں وارد ہے کہ حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ ہفتہ میں ایک مرتبہ وعظ فرمایا کرتے تھے لوگوں نے عرض کیا حضرت ہفتہ میں دو بار فرمایا کیجئے فرمایا کہ

کان رسول الله صلى الله عليه وسلم يتحولنا بالموعظته. (الصحیح للبخاری ۱:۲۷، ۸:۱۰۹، سنن الترمذی:۲۸۵۵)

یعنی جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم گاہ گاہ وعظ سے ہماری خبر گیری فرمایا کرتے تھے اور اس لئے ایسا فرماتے تھے کہ لوگوں کو ملال عارض نہ ہو۔ اور بھاگیں نہیں۔ آج کل لوگ دو طرح سے ظلم کرتے ہیں۔ بعضے تو یہ کرتے ہیں کہ تین تین چار چار پارے پڑھتے ہیں اور بعضے پڑھتے تو ہیں سوا ہی پارہ مگر بہت ہی آہستہ پڑھتے ہیں رمضان میں تو ان حفاظ کی عملداری ہوتی ہے جس طرح چاہتے ہیں بیچارے مقتدیوں کو دق کرتے ہیں توسط کی رعایت ہر حال میں ہونا چاہئے نہ تو اتنی تطویل ہو کہ گرانی ہو اور نہ اس قدر تعجیل ہو کہ حقوق نماز اور قرآن کے فوت ہوں۔

کلام الٰہی کا کمال:۔

بہر حال مقصود میرا یہ ہے کہ اس ماہ میں دو عبادتیں مشروع کی گئی ہے ان آیتوں میں دونوں

کا ذکر ہے۔ اوپر سے اہل کتاب کا ذکر ہے اور اس کے اوپر سے امت محمدیہ کا ذکر ہے اس کے بعد اس تقریب سے اہل کتاب کی نسبت ارشاد ہے

وَلَوْ اٰمَنَ اَهْلُ الْكِتٰبِ لَكَانَ خَيْرًا لَّهُمْ.

یعنی اگر اہل کتاب ایمان لے آتے تو ان کے لئے بہت بہتر ہوتا آگے ان پر عتاب اور غضب کا مضمون ہے۔

لَنْ يَّضُرُّوْكُمْ اِلَّا اَذًى سے يَعْتَدُوْنَ. (آل عمران آیت نمبر ۱۱۲)

تک برابر یہی مضمون چلا گیا۔ لیکن بعض اہل کتاب ایمان بھی لے آئے تھے اس لئے لیسوا سواء سے ان کا ذکر ہے۔ کیا عجیب کلام ہے۔ واقعی بات یہ ہے کہ ایسا کلام بشر کا ہرگز نہیں ہوسکتا۔ تفصیل اس اجمال کی یہ ہے کہ ہم کو جب کسی فریق پر غصہ آ دے گا اور غصہ کا ہم اظہار کریں گے تم ہم کو اس طرح ستاتے ہو اور تم لوگوں نے یہ کیا وہ کیا تو ان میں جو مطیعین ہیں وہ بالکل نظر انداز ہو جائیں گے اور ایک ہی جانب کلام کا رخ ہو کر انتہائی طاقت اس میں صرف کر دیں گے بلکہ اگر کوئی شخص ان مطیعین میں سے بھی اس وقت آ جائے اور اگر سلام کرے تو اس پر بھی برسنے لگیں گے کہ تم کو سلام بھی اسی وقت سوجھا تھا تو اس کی وجہ کیا ہے کہ ہم ممکن اور حادث اور متاثر ہیں۔ ہمارے اندر انفعالات رکھے گئے۔ جب ایک اثر سے طبیعت منفعل ہوتی ہے اور بعینہ اس وقت دوسری طرف ہماری توجہ مصروف نہیں ہوسکتی۔ حق تعالیٰ انفعال اور تاثر سے پاک ہیں ابھی غضب کا اظہار ہو رہا ہے کہ

ضُرِبَتْ عَلَيْهِمُ الذِّلَّةُ اَيْنَ مَا ثُقِفُوْٓا اِلَّا بِحَبْلٍ مِّنَ اللّٰهِ وَحَبْلٍ مِّنَ النَّاسِ وَبَآءُ وْ بِغَضَبٍ مِّنَ اللّٰهِ. الخ

ترجمہ:۔ ان پر ذلت اور پستی چھا گئی اور وہ غضب الٰہی کے مستحق ہو گئے۔

اور اسی وقت دوسرا پہلو بھی نظر انداز نہیں ہوا بلکہ ساتھ ساتھ وہ بھی چل رہا ہے یا تو خفگی ہو رہی تھی اور یا اب ان میں سے مؤمنین کے اوصاف ارشاد ہوتے ہیں چنانچہ ارشاد ہے۔

لَيْسُوْا سَوَآءً. الخ

یعنی یہ اہل کتاب سب برابر نہیں ہیں۔ سب کو ایک لکڑی نہ ہانکنا۔ ان میں سے ایک جماعت ایسی ہے جو حق پر قائم و ثابت ہیں۔ یہ تو عقائد کی طرف اشارہ ہے آگے

يتلون ايات الله

یہ اعمال کی طرف اشارہ ہے یعنی پڑھتے ہیں وہ اللہ کی آیتوں کو ساعات شب میں اور وہ نماز پڑھتے ہیں۔ اس ترجمہ سے معلوم ہوا ہوگا کہ ان آیتوں میں دونوں چیزوں کا ذکر ہے تلاوت قرآن کا اور نماز کا بھی لیکن مفصلاً ذکر نہیں بلکہ اجتماعی طور سے ذکر ہے یعنی نماز میں قرآن پڑھنے کا ذکر ہے اس لئے کہ اس آیت کی دو تفسیریں ہو سکتی ہیں ایک تو یہ کہ۔

وَهُمْ يَسْجُدُونَ. (اور وہ نماز بھی پڑھتے ہیں)

میں واؤ عاطفہ ہو۔ اس وقت تو اقتران پر یہ آیت نص نہ ہوگی۔ گو متحمل ہو اور دوسری تفسیر یہ ہے کہ واؤ حالیہ ہو اور ذوقاً راجح یہی معلوم ہوتا ہے اس صورت میں اقتران اس کا مدلول ہوگا یعنی مطلب یہ ہے کہ وہ لوگ اللہ کی آیتیں ساعات لیل میں تلاوت کرتے ہیں اس حالت میں کہ سجدہ کرتے ہیں پس اس تفسیر کے موافق اس آیت کا مضمون تراویح کے نہایت مناسب ہو گیا۔ بہر حال اس آیت سے اس عمل کی بڑی فضیلت ثابت ہوتی ہے۔ اور نیز دوسری وجہ فضیلت کی یہ ہے کہ شروع رکوع

كُنْتُمْ خَيْرَ أُمَّةٍ. (اور تم سب امتوں سے افضل ہو۔)

میں اس آیت کی خیریت کا ذکر ہے۔ پس آگے ان اعمال کا ذکر ہوگا۔ جنکو خیریت میں دخل ہوگا۔ اور یہاں خیریت کا معنی یہ نہ سمجھنا کہ بولا کرتے ہیں کہ تمہارے یہاں خیریت ہے بلکہ خیریت کے معنی ہیں بہت اچھا ہونا خیر صیغہ افعل التفضیل کا ہے۔ پس حاصل یہ ہوگا کہ اگر تم یہ اعمال کرو گے تو بہت اچھے ہو جاؤ گے حق تعالیٰ جن کو بہت اچھا کہے ان سے بڑھ کر کون ہوگا۔

خواب کی باتیں:۔

بہت اچھا کے لفظ پر ایک بات یاد آ گئی کہ وہ اس احقر پر ایک نعمت ہے میں اس کو تفاخراً نہیں کہتا بلکہ تحدیث بالنعمۃ کے طور پر عرض کرتا ہوں۔ وہ یہ ہے کہ ایک دوست نے خواب میں دیکھا جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اور یہ بھی دیکھا کہ حضورؐ اس شخص سے کچھ پوچھ رہے ہیں۔ اثناء کلام میں اس دوست نے یہ کہا کہ میں شخص (حضرت مولانا صاحب) سے بیعت ہوں حضور نے سن کر فرمایا کہ وہ بہت اچھا آدمی ہے۔ اپنا بہت اچھا ہونا تو سمجھ میں نہ آیا کہ اپنے ظاہر پر ہے یا مؤول ہے اس لئے کہ اپنے اعمال گندے پیش نظر ہیں شہوت غضب ریا بہت سی بلائیں ہیں۔ ان کے ہوتے ہوئے بہت اچھا کس طرح ہو جاؤں گا۔ ہاں یہ اللہ تعالیٰ کا شکر ہے کہ ایمان ہے اور

اہل اللہ سے محبت ہے لیکن میں تو اس بات سے خوش ہوا کہ حضور کے یہاں تذکرہ تو آیا۔ اگرچہ اس خواب کا یہاں موقع بیان کا نہ تھا اس لئے کہ یہاں جن لوگوں کو بہت اچھا کہا گیا وہ بیدار تھے اور یہ خواب ہے کہاں خواب کہاں بیداری اور اول تو بیداری ہی میں ہو تو بھی قابل ناز نہیں پھر خواب کا معاملہ ہی جدا ہے پھر دوسرے یہ کہ اپنے مطلب کی بات ہے۔ اس میں احتمال ہے خیال کے مل جانے کا یعنی زیارت حضور میں نہیں بلکہ کلام کے سمجھنے یا یاد رکھنے میں۔ مجھ کو اس پر ایک حکایت یاد آئی وہ یہ ہے کہ حضرت سلطان نظام الدین اولیاء قدس سرہ صاحب سماع تھے یعنی گانا سنتے تھے مگر ایسا گانا نہیں جیسے آجکل لوگ سنتے ہیں بلکہ شرائط کے ساتھ سنتے تھے۔ ان شرائط کے ساتھ آجکل کوئی بھی نہیں سنتا اور نہ ان کا ہر وقت کا شغل تھا۔ وہ منع کرتے تھے چنانچہ قاضی ضیاء الدین صاحب سنامی نے روکا اور فرمایا کہ بدعت ہے اور سنت کے خلاف ہے۔ حضرت سلطان جی خود بھی عالم تھے درسیات پڑھی تھی۔ چنانچہ ایک بار مقامات حریری حضرت نے حفظ یاد کی تھی اور پھر اس کے کفارہ کے لئے مشارق الانوار حفظ فرمائی تھی لیکن قاضی صاحب روکتے تھے۔ ایک مرتبہ سلطان جی نے فرمایا کہ اچھا اگر میں جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے کہلوا دوں اس وقت تو مانو گے۔ جی تو یہی تھا کہ دلائل سے میں حق پر ہوں نہ مانوں گا۔ لیکن یہ سمجھ کر کہ حضور کی زیارت تو ہوگی کہا کہ اچھا سلطان جی متوجہ ہوئے اور قاضی صاحب پر ایک غنودگی سی طاری ہوئی دیکھتے ہیں کہ حضور تشریف لائے ہیں اور فرماتے ہیں کہ فقیر کو کیوں تنگ کرتے ہو۔ قاضی صاحب وہاں بھی نہ چوکے عرض کیا۔ یا رسول اللہ! آپ کا ارشاد سر آنکھوں پر ہے لیکن وہ جو آپ کے بیداری کے احکام ہیں مجھے ان پر اس حالت کے حکم سے زیادہ وثوق ہے میں نہیں کہہ سکتا کہ اس وقت میری یہ کیا حالت ہے جب اس حالت سے افاقہ ہوا تو سلطان جی نے فرمایا کہ دیکھا ہم نے کہلا بھی دیا قاضی صاحب نے فرمایا کہ ہم نے جواب بھی دے دیا۔ قاضی صاحب نے حقیقت میں بہت عجیب بات کہی محویت کی کہ جو نیند سے کم ہے۔ اس کے احکام کا محققین نے اعتبار نہیں کیا۔ ایسے ہی کشف کا بھی اگر خلاف شریعت ہو اس کا بھی اعتبار نہیں اور خواب کا تو بدرجہ اولی اعتبار نہیں۔ چنانچہ ایک دفعہ مصر میں ایک شخص نے خواب میں دیکھا کہ حضور فرما رہے ہیں اشرب الخمر۔ (شراب پی) اس وقت سب علماء نے کہا کہ اس شخص کے سننے میں غلطی ہوئی حضورؐ نے یقیناً لاتشرب الخمر (شراب نہ پیو) فرمایا ہے۔ تو صاحبو! خواب کوئی قابل فخر نہیں ہے ہاں اس بات کی خوشی ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ذکر تو فرمایا یہ بھی بہت بڑی نعمت ہے۔

صالح کے معنی:۔

بہر حال حق تعالیٰ کا امت محمدیہ کو بہت اچھا فرمانا بہت بڑی فضیلت ہے یہ تو سیاق آیت سے فضیلت فرمائی اور آخر میں فرماتے ہیں۔ اُولٰٓئِکَ مِنَ الصّٰلِحِیْنَ۔

یہ سیاق سے فضیلت ثابت ہوئی یعنی یہ لوگ صالحین میں سے ہیں۔ صالح عربیت میں ایسے موقع میں بولتے ہیں جہاں ہماری زبان میں لفظ لائق بولا جاتا ہے خدا تعالیٰ جس کو لائق فرمادیں اس کی فضیلت کا کیا ٹھکانہ پس حاصل مقام کا یہ ہوا کہ جوان کاموں یعنی نماز میں قرآن پڑھتے ہیں وہ بہت اچھے اور لائق ہیں۔ اللہ اکبر جن کو خدا تعالیٰ بہت اچھے اور لائق فرمادیں ان کو کیا کیا نہ ملے گا اور جوان کو ملے گا اس کو بھی حضور نے ایک حدیث قدسی میں ارشاد فرمایا ہے۔ فرماتے ہیں۔

اعددت لعبادی الصالحین مالا عین رأت ولا اذن سمعت ولا خطر علی قلب بشر. (المسند للامام احمد بن حنبل ۲:۳۳۸، الترغیب والترھیب للمنذری ۴:۵۲۱، ۵۵۷)

"یعنی میں نے بندوں صالحین کے لئے وہ شے تیار کی ہے جو نہ کسی آنکھ نے دیکھی نہ کسی کان نے سنی اور نہ کسی کے دل پر ان کا گذر ہوا" آپ بہت سے بہت وہ نعمتیں چاہیں گے جو کچھ آپ کے دل میں آویں گی اور جن اشیاء کا وعدہ ہے وہ اس سے بھی بڑھ کر ہیں جو تمہارے ذہن میں آتی ہیں اس سے زیادہ آپ کیا چاہیں گے اور ثمرات تو ان لوگوں کے لئے ہیں جو طالب ثمرات ہیں۔ ورنہ جو محبین ہیں ان کے لئے تو محبوب کا اتنا فرمادینا کہ بہت اچھے آدمی ہیں تمام ثمرات سے بڑھ کر ہے اہل قلب سے اس

کنتم خیر امة.

فرمانے کی قدر پوچھو کہ وہ اس سے کیا مزہ لیتے ہیں۔ ایک صاحب حال کہتے ہیں اگر یکبار گوید بندہ من از عرش بگذرد خندہ من۔ خوب کہا ہے کسی نے

فی الجملہ نسبتے بتو کافی بود مرا ۔۔۔ بلبل ہمیں کہ قافیہ گل شود بس ست

ترجمہ:۔ سردست ہمیں یہی کافی ہے کہ تجھ سے نسبت ہے بلبل کیلئے یہی کافی ہے کہ وہ پھول کے ساتھ قافیہ شعر میں تو ہے۔

اور وہ تو یوں کہتے ہیں۔

نسبت خود بسگت کردم وبس منفعلم ۔۔۔ زانکہ نسبت بسگ کوئے تو شد بے ادبی

ترجمہ:۔ میں نے اپنی نسبت تیرے کتے سے کی اور میں اس پر بہت شرمندہ ہوں کہ تیرے کتے کے ساتھ بھی نسبت کرنا سخت بے ادبی ہے۔

جو اپنے کو اس لائق بھی نہ سمجھتے ہوں کہ اس کے کوچہ کے کتے کی طرف اپنے کو منسوب کر لیا تو کیا ٹھکانہ رہے گا ان کی مسرت کا لیکن ہم لوگ جو اس کی قدر نہیں کرتے تو بات کیا ہے کہ ہم کو دین مفت مل گیا۔ مولانا فرماتے ہیں۔

اے گراں جاں خوار دیدستی مرا　　زانکہ بس ارزاں خریدستی مرا

ہر کہ او ارزاں خرد ارزاں دہد　　گوہرے طفلے بقرص ناں دہد

ترجمہ:۔ اے سخت جاں تو نے مجھ کو ذلیل دیکھا صرف اس وجہ سے کہ میں بہت سستا خریدا گیا ہوں۔ اور جو کوئی سستا خریدتا ہے وہ سستا بیچ بھی دیتا ہے جیسے کہ ایک بچہ موتی کو روٹی کے ایک ٹکیا کے عوض بیچ دیتا ہے۔

بچہ کیا جانے موتی کیا ہوتا ہے، ایک بسکٹ دے کر موتی لے سکتے ہیں، پس ایسے ہی دین ہم لوگوں کو مفت مل گیا ہے۔ مفت کی چیز کی کون قدر کرتا ہے۔ نہ شکر ہے نہ نیاز ہے نہ عاجزی ہے۔ اللہ اکبر! کس قدر سنگدلی اور ناقدردانی ہے۔ غرض وہ اعمال جن پر بشارتیں ہیں ان میں سے دو اعمال یہ ہیں:

يَتْلُوْنَ اٰيٰتِ اللّٰهِ اٰنَآءَ الَّيْلِ وَهُمْ يَسْجُدُوْنَ. (یعنی اللہ کی آیتیں اوقات شب میں پڑھتے ہیں اور وہ نماز بھی پڑھتے ہیں۔)

یہ عمل مدار خیریت و صلاحیت ہیں لیکن یہ سمجھ لینا چاہئے کہ اچھے اسی وقت ہوں گے جبکہ کام کو اچھی طرح ڈھنگ سے کرو گے اور اگر بری طرح کیا تو اچھا ہونا تو علیحدہ رہا خوف مواخذہ کا ہے۔

الفاظ پرستی:۔

اس کی ایسی مثال ہے جیسے چند مزدور کام کرنے والے ہیں مثلاً سڑک کوٹنے والے ہیں ان سے کہا کہ تم سڑک کوٹو تم کو انعام ملے گا بعض نے تو ان میں سے ایسی خراب کوٹی کہ جگہ جگہ گڑھے اور ٹیلے رہ گئے برابر نہیں ہوئی اب اس صورت میں نام تو کوٹنے کا ہوا مگر کام تو نہ ہوا اور نام سے کچھ کام نہیں چلتا مولانا علیہ الرحمۃ فرماتے ہیں۔

میم واؤ میم نون تشریف نیست　　لفظ مومن جز پے تعریف نیست

ترجمہ:۔ میم واؤ میم نون کہنے سے کوئی مؤمن نہیں ہوتا لفظ مؤمن محض عنوان ہے جب تک حقیقت نہ ہو۔
یعنی لفظ مومن کوئی خلعت نہیں یہ تو محض پتے کے واسطے ہے اور وصف عنوانی ہے۔ان لفظوں میں کچھ نہیں ہے جب تک کہ اس کا مدلول تم کو حاصل نہ ہو دیکھو لڈو پیڑے کا اگر کوئی وظیفہ پڑھا کرے۔تو اس سے منہ میں کچھ نہ آئے گا۔ایک احمق کی حکایت یاد آئی ایک شخص نے مرنے کے وقت بیٹے کو چند وصیتیں کیں کہ بیٹا میں تو مرتا ہوں میرے بعد لوگ تعزیت کے لئے آئیں گے جو کوئی آوے اس کی خوب مدارات کرنا اونچی جگہ اس کو بٹھلانا، بھاری پوشاک پہن کر اس سے ملنا، نرم اور شیریں گفتگو کرنا اور قیمتی کھانا کھلانا۔یہ چار وصیتیں کیں ابا جان تو یہ کہہ کر مر گئے بیٹے ضرورت سے زیادہ عقلمند تھے چنانچہ ایک شخص کی کم بختی آئی وہ ان کے یہاں آنکلا نوکروں کو فوراً حکم دیا کہ اسے مچان پر بٹھا دو۔چنانچہ نوکروں نے اس کو مجوائے پادست دگرے دست بدست دگرے چاروں طرف سے پکڑا اور بیچارے ہر چند ہائیں ہائیں کرتے رہے مگر انہوں نے ایک نہ سنی اور فوراً ان کو بلند مچان پر بٹھلا دیا اور زینہ وہاں سے علیحدہ کر لیا اب وہ بیچارہ بندر سا وہاں چڑھا بیٹھا ہے اور حیران ہے کہ یہ کیا معاملہ ہے اس کے بعد میاں صاحب کو ملنے کے لئے تشریف لائے تو اس ہیئت سے کہ ایک بہت بڑی جاجم تو باندھے اور ایک اوڑھے ہوئے وہ مہمان بیچارے حیران ہوئے کہ یہ کیا عجائب المخلوق جانور ہے خیر آئے مہمان صاحب نے کلمات تعزیت فرمائے کہ آپ کے والد ماجد صاحب کی وفات کی خبر سن کر بہت رنج ہوا تو آپ فرماتے ہیں ''گڑ'' اس کے بعد انہوں نے کچھ اور فرمایا تو فرماتے کہ ''روئی'' غرض ایک بات کے جواب میں وہ گڑ فرماتے اور دوسری بات کے جواب میں روئی خیر اس پر بھی صبر کیا اس کے بعد حکم دیا کہ ان کو اتار لو چنانچہ اتار لئے گئے کھانا آیا بوٹی گوشت کی ذرا سخت تھی مہمان بولے کہ گوشت گلا نہیں کہنے لگے کہ واہ صاحب میں نے تو آپ کے لئے اپنا پچاس روپے کا کتا ذبح کر ڈالا آپ نے اس کی یہ قدر کی مہمان نے فوراً ہاتھ کھانے سے کھینچ لیا اور کہا کہ خدا تعالیٰ تیرے یہاں کسی کو نہ لاوے۔خیر یہ تو فرمایئے کہ معاملہ کیا ہے؟ کہا کہ میرے والد ماجد صاحب نے چند وصیتیں کی تھی میں نے ان پر عمل کیا ہے انہوں نے فرمایا تھا کہ مہمان کو اونچی جگہ بٹھانا تو میرے یہاں اس مچان سے زیادہ کوئی اونچی جگہ نہیں ہے اور یہ فرمایا تھا کہ بھاری کپڑا پہن کر ملنا تو میں نے اس جاجم سے زیادہ بھاری کپڑا کوئی نہ دیکھا اور یہ کہا تھا کہ نرم اور شیریں بات بولنا تو جناب گڑ سے زیادہ میٹھی اور روئی سے زیادہ نرم کوئی شے نہیں اور یہ

وصیت فرمائی تھی کہ قیمتی کھانا کھلانا تو کتے سے زیادہ قیمتی جانور میرے یہاں کوئی نہ تھا اس مہمان نے کہا کہ خدا تم کو سمجھ دے اور کسی بھلے مانس کو تمہارے یہاں نہ لائے تو حضرت یہ اس بے وقوف کا مشرب تھا۔ کہ گڑ اور روئی کے نام ہی کو بجائے ان کے مسمی کے سمجھا تھا اگر آپ بھی صرف نام ہی پر کفایت کرتے ہیں تو اس شخص پر ہنسیئے ہمارے اندر اس زمانہ میں الفاظ پرستی بہت آ گئی ہے یہی وجہ ہے کہ حقائق تک نہیں پہنچتے ایک حکایت مجھے اس پر یاد آئی پر اندھوں کے مجمع میں ہاتھی آ گیا تھا سب نے اس کو ٹٹولا کہ دیکھیں ہاتھی کیسا ہوتا ہے کسی کا ہاتھ تو سونڈ پر پڑا اس نے تو یہ کہا کہ ہاتھی مثل موسل کے ہوتا ہے کسی کا ہاتھ کان پر پڑا اس نے کہا کہ ہاتھ مثل چھاج کے ہوتا ہے کسی کا دم پر پڑا اس نے کہا مثل جھاڑو کے ہوتا ہے خوب آپس میں اختلاف ہوا اور حقیقت کی ایک کو بھی خبر نہ ہوئی اگر حقیقت تک پہنچ جاتے تو سکون ہو جاتا کوئی اختلاف نہ رہتا مولانا فرماتے ہیں۔

اختلاف خلق از نام اوفتاد   چوں بمعنی رفت آرام اوفتاد

ترجمہ:۔ لوگوں میں کسی چیز کے اختلافات محض نام کے اختلاف کی وجہ سے ہوتے ہیں اور جب ان پر حقیقت کھل جاتی ہے سب مطمئن ہو جاتے ہیں۔

اختلاف جب ہی ہوتا ہے جب تک کہ الفاظ میں مبتلا ہیں اور جب حقیقت تک پہنچ گئے تو سب اختلاف اٹھ جاتا ہے مولانا نے اسی مضمون کی ایک حکایت مثنوی شریف میں لکھی ہے کہ چار آدمی جمع ہوئے فارسی، عربی، رومی، ہندی یا ترکی کسی نے ایک کو ایک درہم دیا ان کا دل چاہا کہ انگور خریدیں۔ رومی نے کہا ہم تو استافیل (ترکی میں بمعنی انگور) خریدیں گے عربی نے کہا ہم عنب (انگور) لیں گے فارسی نے کہا ہم انگور لیں گے چوتھے نے کچھ اور کہا (شاید اوزم لکھا ہے) آپس میں خوب لڑائی ہوئی اگر معنے تک رسائی ہوتی تو کچھ بھی اختلاف نہ تھا لفظوں میں پھنسنے سے حقیقت مستور ہو جاتی ہے حافظ شیرازی فرماتے ہیں۔

جنگ ہفتاد و دو ملت ہمہ را عذر بنہ   چوں ندیدند حقیقت راہ افسانہ زدند

ترجمہ:۔ اسلام کے بہتر فرقوں میں جو آپس میں جنگ ہو رہی ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ انہوں نے حقیقت کی راہ نہیں دیکھی اس لئے یہ افسانوں کے پیچھے پڑے ہوئے ہیں۔

یہی وجہ ہے کہ اہل اللہ کسی کے ساتھ نہیں جھگڑتے اس لئے کہ وہ ایسے مشغول ہیں کہ ان کو جھگڑوں کی مہلت ہی نہیں ملتی۔

چہ خوش گفت بہلول خندہ جو | چو بگذشت بر عارف جنگ جو
گرایں مدعی دوست بشناختی | بہ پیکار دشمن نہ پرداختی

ترجمہ:۔ نیک سیرت بہلولؒ نے کیا اچھی بات کہی ہے کہ ایسا عارف جو دوست کو پہچانتا ہو دشمن کے ساتھ لڑائی میں مشغول نہیں ہوتا۔ اگر یہ مدعی دوست کو پہچانتا تو دشمن کے ساتھ لڑائی مول نہ لیتا۔

دیکھو بہت موٹی بات ہے کہ اگر ہمارا کوئی محبوب ہو اور مدتوں سے وہ نہ ملا اور دفعۃً کہیں مل جائے تو ہم کو اس وقت لڑنے کی فرصت بالکل نہ ملے گی بلکہ اس وقت اگر اس کو کوئی برا بھلا بھی کہے گا حتیٰ کہ اگر مالی ضرر بھی پہنچائے گا تو یہ بالکل نہ بولے گا اس لئے کہ وہ خیال کرے گا کہ جتنی دیر میں اس سے لڑوں گا میرا حرج ہو گا خدا جانے پھر محبوب ملے نہ ملے وہ اپنے دوست کے دیکھنے میں محو رہے گا جبکہ محبوب مجازی تمام جھگڑوں اور لڑائیوں کو قطع کر دیتا ہے تو جس شخص کو تو محبوب حقیقی کا وصل دائم اور مشاہدہ ہر وقت رہتا ہے اس کو کسی سے لڑنے کی کہاں فرصت اور اگر لڑنے بھڑنے میں وہ لگا ہوا ہے تو وہ عارف نہیں ہے مدعی ہے۔

ایں مدعیاں در طلبش بے خبر اند | آں را کہ خبر شد خبرش باز نیاید

ترجمہ:۔ دعویداران اس کی راہ طلب میں غافل ہیں کیونکہ جو باخبر ہو جاتا ہے پھر اسکی خبر نہیں ہوتی۔ بلکہ اگر کوئی اس محبوب کے سوا دوسرے کی بات بھی کرنا چاہے گا تو وہ اسکے جواب میں کہے گا۔

فائیم تحیر و خاموشی

ترجمہ:۔ ہم سراپا حیرت اور خموشی بھی ہیں۔

پس معنی شناس اور حق شناس کی تو یہ شان ہوتی ہے اس لئے میں کہتا ہوں کہ تم پر لفظ

يَتْلُوْنَ ايٰتِ اللّٰهِ اٰنَآءَ الَّيْلِ وَهُمْ يَسْجُدُوْنَ.

ترجمہ:۔ وہ اللہ کی آیتیں اوقات شب میں پڑھتے ہیں اور نماز بھی پڑھتے ہیں۔

صادق بھی آ گئے تو اس سے کیا ہوتا ہے حقیقت تلاوت و سجدہ کی حاصل ہونے کی کوشش کرو اور اس کا طریق یہی ہے کہ حقوق ان دونوں عبادتوں کے ادا کرو۔

تراویح کی فضیلت:۔

قبل اس کے کہ میں ان کے حقوق بیان کروں ایک بات اور بتلاتا ہوں، وہ یہ ہے کہ اس مقام

پر ایک سوال اور اشکال متوجہ ہوتا ہے، وہ یہ ہے کہ جن اعمال کی فضیلت بیان کی گئی ہے آیا یہ اعمال فرض ہیں یا نہیں، اگر فرض نہیں ہیں تو فرض کا ذکر بہ نسبت نفل کے اہم ہے۔ اور ذوق لسانی اور قرائن سے بھی یہی معلوم ہوتا ہے کہ مراد نفل ہے، اس لئے کہ اسلوب کلام اور الفاظ سے متبادر یہ ہوتا ہے کہ مقصود کثرت تلاوت و نفل ہے تو کثرت تلاوت اور نفل دونوں فرض نہیں ہیں۔ اور اگر کہا جاوے کہ مراد صلوۃ تہجد ہے، تو صلوٰۃ تہجد بھی فرض نہیں ہے۔ غرض بہر صورت نفل ہے، پھر فرائض کو چھوڑ کر نفل کی فضیلت کیوں بیان فرمائی۔ اور اگر کہو کہ مراد فرض ہے تو میں عرض کر چکا ہوں کہ ذوق لسانی اور قرائن اس سے آبی ہیں۔ اس اشکال کا جواب میری سمجھ میں یہ آتا ہے کہ مراد تو نفل ہی ہے۔ باقی رہی یہ بات کہ فرائض کی اہمیت ان کے ذکر کو مقتضی ہے یہ صحیح ہے، لیکن ذکر کے انواع مختلف ہیں صریحی اور لازمی۔ فرائض کی اہمیت اس نفل کی فضیلت بیان کرنے سے اور زیادہ بڑھ گئی، تفصیل اس اجمال کی یہ ہے کہ جب وہ لوگ نفلوں میں کوتاہی نہیں کرتے تو فرائض میں تو بطریق اولیٰ کوتاہی نہ کریں گے۔ پس فرائض کا ذکر گو عبارۃ النص سے فرائض کی اہمیت زیادہ محفوظ ہو گئی ہے۔ اور اس زمانہ کے لوگ ایسے نہ تھے جیسے آجکل بعض ہیں کہ نوافل کا تو اہتمام کریں اور فرائض کی پروانہ کریں۔ ایک شخص کہتے تھے کہ میں اپنے پیر کا اس قدر اتباع کرتا ہوں کہ فرض نماز چاہے قضا ہو جائے مگر پیر کا بتلایا ہوا وظیفہ ناغہ نہیں ہوتا۔ اگر ایسے ہی لوگ اس وقت بھی ہوتے تو واقعی فرض کی اہمیت پر اس آیت کی دلالت ظاہر نہ ہوتی۔ حاصل یہ ہے کہ اس آیت میں مراد نفل ہے پس اس تفسیر کے موافق اس آیت میں قیام لیل یعنی تہجد کا ذکر ہوا اور تراویح کا لقب ہے قیام رمضان۔ قیام لیل تو بعینہ محفوظ رہا۔ صرف اس میں ایک مضاف الیہ اور بڑھ گیا ہے یعنی قیام لیلۃ رمضان۔ پس جبکہ اس آیت کا مدلول قیام لیلۃ ہے قیام لیل رمضان بھی اس میں ضرور داخل ہوگا۔ پس اب میں دعویٰ کر سکتا ہوں کہ اس آیت سے تراویح کی بھی فضیلت ثابت ہوتی ہے اور وہ بھی مدار خیریت کا ہے۔ پس ان کو ایسا پڑھئے کہ آپ کی خیریت محفوظ رہے اور جو اس میں منکرات ہیں اس سے بچئے۔

رونے کی فضیلت:۔

اب مختصر فہرست حقوق کی بیان کرتا ہوں۔ قرآن مجید کا ایک حق یہ ہے کہ جی لگا کر اس کو پڑھا جاوے کہ اس پر

خَرُّوْا سُجَّدًا وَّ بُكِيًّا ۔ (سجدہ کرتے ہوئے روتے ہوئے گر جاتے ہیں)

کا اثر مرتب ہو جاوے۔ اور دوسری جگہ ارشاد ہے:

يَخِرُّوْنَ لِلْاَذْقَانِ يَبْكُوْنَ وَيَزِيْدُهُمْ خُشُوْعًا.

ترجمہ:۔ اور ٹھوڑیوں کے بل گرتے ہیں روتے ہوئے اور قرآن ان کا خشوع اور بڑھا دیتا ہے۔

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ بکاء اور خشوع تلاوت قرآن کے وقت ہونا چاہیے یہاں پر طالب علموں کو ایک شبہ ہوگا وہ یہ کہ رونا تو اختیاری نہیں ہے اور سالکین کو یہ شبہ ہوگا کہ جب یہ صفت ایمان والوں کی ہے اور ہم کو رونا آتا نہیں، تو ہمارے اندر ایمان نہیں ہے، ایک دوست نے بھی مجھ کو لکھا تھا کہ جب سے میں حج کر کے آیا ہوں رونا نہیں آتا اور پہلے رونا آتا تھا۔ میں نے ان کو جواب لکھا کہ رونے سے مراد آنکھوں کا رونا نہیں اس لئے کہ وہ غیر اختیاری ہے۔ اور غیر اختیاری کو اللہ تعالیٰ تکلیف نہیں دیتے:

لَا يُكَلِّفُ اللّٰهُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَهَا. (البقرہ)

ترجمہ:۔ اللہ کسی پر طاقت سے زیادہ بوجھ نہیں ڈالتے۔

بلکہ مراد دل کا رونا ہے۔ پس تم کو آنکھوں سے گو رونا نہیں آتا لیکن دل کا رونا تم کو حاصل ہے باقی اختیار سے رونے کی عورتیں مشاق ہیں۔ کسی کے یہاں تعزیت کے لئے جائیں گی اور اپنے کسی مردہ کو یاد کر کے بس رونا شروع کر دیں گی۔ اور ان کا کوئی تازہ مرا ہوا نہ ہوگا تو یہ حکمت کریں گی کہ کپڑے سے منہ چھپالیں گی، اور جھوٹ موٹ ہوں ہوں کرنے لگیں گی۔ لیکن مردوں کا اختیاری نہیں ہے۔ اسی واسطے حدیث شریف میں آیا ہے کہ رونا نہ آوے تو رونے کی شکل بنالو۔ یہاں بھی دل کا ہی رونا مقصود ہے اس لئے ظاہر کا باطن پر اثر پڑتا ہے جب رونے کی شکل بنائے گا تو دل میں بھی رونا آ ہی جائے گا۔ پس حق تعالیٰ کے عذاب اور وعید کو دل میں حاضر کرو اور رونے کی شکل بناؤ تا کہ سخت دلی کم ہو مولانا علیہ الرحمۃ اسی رونے کی فضیلت میں فرماتے ہیں۔

اے خوشا چشمے کہ آں گریان اوست ۔۔۔ اے خوشا آں دل کہ آں بریان اوست

در تضرع باش تا شاداں شوی ۔۔۔ گریہ کن تا بے تہاں خنداں شوی

درپس ہر گریہ آخر خندہ ایست ۔۔۔ مرد آخر بین مبارک بندہ ایست

ترجمہ:۔ وہ آنکھ اچھی ہے جو اس کیلئے روتی ہے اور وہ دل اچھا ہے جو اس کیلئے جلتا ہے اگر تو خوش رہنا چاہتا ہے تو رویا کرتا کہ تیرا دل بغیر دین کے ہنستا رہے۔ ہر رونے کے بعد خوشی کا مقام

آتا ہے جو آدمی سب سے بعد میں آتا ہے وہ مبارک بندہ ہوتا ہے۔

اوراگررونانہ آوے تواس پررونا چاہئے کہ رونا نہیں آتا۔ایک بزرگ بہت رویا کرتے تھے ۔کسی نے کہا حضرت اتنا نہ روئیے،آنکھیں جاتی رہیں گی۔انہوں نے کیا خوب فرمایا۔

زاہدے راگفت یارے درعمل کم گری تا چشم را نائد خلل

گفت زاہد از دو بیروں نیست حال چشم بیند یا نہ بیند یا آں جمال

گر نہ بیند نور حق راچہ غم ست در وصال حق دودیدہ کے کم ست

ورنہ بیند نور حق راگو برو ایں چنیں چشم شقی گو کورشو

ترجمہ:۔ایک دوست نے زاہد سے کہا کہ اپنے اعمال کے واسطے ذرا کم روتا کہ تیری آنکھیں خراب نہ ہوجائیں زاہد نے کہا کہ ان دوباتوں کے علاوہ اورکوئی بات نہیں ہوگی خواہ میری آنکھ میں جمال کودیکھے یا نہ دیکھے۔اگرآنکھ ٹھیک ہےاورنورحق کودیکھتی ہےتوکوئی غم نہیں اوراگر آنکھ خراب ہوگی اورنورحق مل گیا توبھی کیا کروں۔اوراگروہ نورحق کونہیں دیکھتی ہےتواس سے کہہ دوکہ جاچلی جا،اس شقی آنکھ سے کہہ دوکہ وہ اندھی ہوجائے۔

دیکھئے!ان بزرگ کودونوں احتمال پرخواہ وصل ہویا نہ ہورونا ہی سوجھا۔اگرکوئی کہے کہ وصل میں رونا کیسا۔اس کاجواب عارف شیرازی نے دیا ہے۔وہ فرماتے ہیں۔

بلبلے برگ گلے خوش رنگ درمنقار داشت واندراں برگ ونوا خوش نالھائے رازداشت

گفتمش درعین وصل ایں نالہ وفریاد چیست گفت ماراجلوہ معشوق دریں کارداشت

ترجمہ:۔ایک بلبل اپنی چونچ میں ایک خوبصورت پھول کی پتی لئے ہوئے تھی اورزاروقطار رورہی تھی میں نے پوچھا کہ عین وصل میں یہ نالہ وفریاد کیا ہے اس نے جواب دیا کہ ہمیں جلوہ معشوق نے اس کام میں ڈال رکھا ہے۔

تجلی محبوب کا مقتضی ہی یہ ہے کہ سوختہ وگداختہ رہے۔حق تعالیٰ کے یہاں اس رونے کی بہت بڑی قدر ہے جوقطرہ آنکھ سے نکلا دوزخ کی آگ اوروہ قطرہ جمع نہ ہوگا اورنارجہنم کوبجھانے کے لئے کافی ہوجائے گا اوردوزخ کہے گی۔

جزیا مومن فان نورک اطفاء ناری۔

یعنی اے مومن جلدی چل اس لئے کہ تیرے نورنے میری آگ کوبجھادیا اوریہ آنسو عام

ہے خواہ آنکھ سے ہو یا دل سے ہو۔ چنانچہ اس کی تائید اس سے ہوتی ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی مجلس وعظ میں کچھ لوگ اپنے کپڑے پھاڑنے لگے۔ عیسیٰ علیہ السلام کو اللہ تعالیٰ نے وحی بھیجی کہ ان سے کہہ دو کہ دل کے ٹکڑے ٹکڑے کرو کپڑوں کے پھاڑنے سے کیا ہوتا ہے۔ حق تعالیٰ کی نظر تو قلوب پر ہے بلکہ بعض مرتبہ ایسا ہوتا ہے کہ جب زیادہ اثر ہوتا ہے تو وہ سب گھٹ کر قلب ہی پر جمع ہو جاتا ہے اور آنکھ سے ایک قطرہ بھی نہیں نکلتا۔ پس جبکہ دل پر اثر ہو تو آنسو نہ نکلنا مضر نہیں۔

حضرت جنید رحمۃ اللہ علیہ بیٹھے ہوئے تھے۔ ایک صوفی پر حالت طاری ہوئی۔ حضرت جنید سے لوگوں نے کہا کہ آپ پر کبھی اثر نہیں ہوتا۔ حضرت جنیدؒ نے فرمایا:

وَتَرَى الْجِبَالَ تَحْسَبُهَا جَامِدَةً وَّهِيَ تَمُرُّ مَرَّ السَّحَابِ.

"یعنی دیکھے گا تو اے مخاطب پہاڑوں کو کہ گمان کرے گا ان کو ٹھیرے ہوئے حالانکہ وہ ابر کی طرح چلتے ہوں گے" مطلب یہ ہے کہ غایت اثر سے ہمارا یہ حال ہے کہ ہم کو تم ٹھیرا ہوا جانتے ہو حالانکہ ہم بے حد اثر لئے ہوئے ہیں۔ ہمارے مشائخ میں سے حضرت شیخ عبدالحق ردولوی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ:

منور بچہ بود کہ از یک قطرہ بفریاد آمد اینجا مردانند کہ دریا ہا فرو برند و آروغ نہ زنند

ترجمہ:۔ منصورؒ بچہ تھے کہ ایک قطرہ سے فریاد کرنے لگے اور یہاں ایسے مرد ہیں کہ دریا تک پی گئے اور ڈکار تک نہ لیا۔

بات یہ ہے کہ بزرگوں کی شانیں مختلف ہوتی ہیں۔ چنانچہ ایک اور بزرگ رونے کے بارہ میں فرماتے ہیں۔

یارب چہ چشمہ ایست محبت کہ من ازاں یک قطرہ آب خوردم دریا گریستم

ترجمہ:۔ اے خدا یہ محبت کون سا چشمہ ہے کہ جس سے میں نے ایک قطرہ پیا ہے اور دریا رو کر بہا دیئے ہیں۔

ایک اختلاف اور رنگا رنگی شان وحال کی نسبت یہ شعر ہے۔

بگوش گل چہ سخن گفتہ کہ خنداں است بعندلیب چہ فرمودہ کہ نالان است

ترجمہ:۔ پھول سے تو نے کیا کہہ دیا ہے کہ ہنس رہا ہے اور بلبل سے کیا فرما دیا کہ رو رہی ہے۔

غرض قرآن شریف پڑھنے کے وقت حق تعالیٰ کے خوف یا شوق سے آنکھ یا دل سے رونا بڑی نعمت اور علامت اہل ایمان کی ہے۔

قرآن کے حقوق:۔

لیکن یہ جب ہی حاصل ہوتا ہے کہ قرآن کو بتدبر پڑھا جاوے۔ اور اگر ڈاک گاڑی بلکہ اسپیشل کی طرح پڑھا تو راستہ کے باغ و بہار کی وہ کیا سیر کرے گا۔ ایک حق تو قرآن کا یہ تھا دوسرا حق وہ ہے جس کی نسبت ارشاد ہے۔

وَرَتِّلِ الْقُرْاٰنَ تَرْتِيْلًا.

"یعنی قرآن کو ٹھہرا کر پڑھنا" دیکھو! آپ اگر کسی حاکم سے ہمکلام ہوں یا وہ حاکم تم سے باتیں کرے تو اول الفاظ دل میں سوچ لو گے پھر بہت ادب سے ان کو زبان سے ادا کرو گے، بخلاف اس کے کہ تم اپنے دوستوں سے یا نوکروں سے ہمکلام ہو، ان کے ساتھ بے تکلف جلدی جلدی بولتے ہو، تو قرآن پڑھنا در حقیقت حق تعالیٰ سے باتیں کرنا ہے اور یا یوں کہو کہ حق تعالیٰ تمہاری زبان سے باتیں کرتے ہیں۔ غرض جو کچھ بھی ہو دونوں امر ایسے ہیں کہ مقتضی ہیں غایت ادب کو کسی شاعر نے کہا ہے۔

بخت اگر مدد کند دامنش آورم بکف گر بکشد زہے طرف ور بکشم زہے شرف

ترجمہ:۔ اگر میرا نصیب مدد کرے اور اس کا دامن میرا ہاتھ آ جائے تو وہ کھینچ لے تو خوشی کی بات ہے اور میں کھینچ لوں تو خوشی کی بات ہے۔

اگر باتیں کرتے ہو تو ظاہر ہے کہ ادنیٰ حاکم کے ساتھ جب وقار سے بولتے ہو تو احکم الحاکمین اور حاکم حقیقی سے تو نہایت ادب اور وقار سے باتیں کرنا چاہئے اور شاید یہ بات تمہاری سمجھ میں اچھی طرح نہ آئی ہو۔ اس لئے میں اس کی بقدر ضرورت شرح کرتا ہوں۔ وہ یہ ہے کہ آدمی کے تمام افعال کے خالق اللہ تعالیٰ ہیں۔ پس کلام اور چلنا پھرنا جو کچھ کہ یہ کرتا ہے خالق ان افعال کے اللہ تعالیٰ ہیں اور کاسب بندہ ہے۔ اتنا تو ظاہر ہے مگر اس میں جب غایت غلبہ فنا سے عبد کی طرف نسبت متحضر نہ رہے۔ اس وقت استحضار نسبت مع اللہ سے گویا وہ فعل حکماً حق تعالیٰ کا ہو گا۔ پس جس وقت یہ قرآن پڑھے گا تو گویا اللہ تعالیٰ کلام فرما رہے ہیں اور اس کا ظہور اس کی زبان سے ہو رہا ہے جیسے شجرہ موسیٰ سے کلام اللہ کا ظہور ہو رہا تھا۔ پس اس کی زبان بمنزلہ ایک باجہ کے ہوئی۔ پس باجہ بجانے والے کے ذمہ ہے کہ وہ گت ایسی لگا دے کہ وہ سچ مچ گانے والا ہے۔ اس کی آواز کے ساتھ ملا دے۔ پس قرآن شریف ایسا پڑھو کہ جو گویا حق تعالیٰ کے تکلم کے موافق ہو اور اس کے لئے

ان کی خوشنودی کا سبب ہو۔ میں نے کئی دوستوں کو یہ تصور بتلایا اور یہ الہامی ہے کہ جب کلام اللہ پڑھے تو یوں سمجھے کہ حق تعالیٰ پڑھ رہے ہیں اور میرے بدن سے مثل باجہ کے آواز نکل رہی ہے۔ اپنی آواز کی طرف توجہ اس حیثیت سے کرے کہ یہ مظہر ہے کلام قدیم حق تعالیٰ کا اور جس قدر ہو سکے اس تصور کو بڑھائے۔ پھر دیکھئے قرآن شریف میں کیا لطف آتا ہے۔ چنانچہ جس جس نے اس پر یہ عمل کیا بہت کامیابی ہوئی۔ حاصل یہ ہے کہ ترتیل سے قرآن پڑھو۔ بہت سے ایسے لوگ ہیں کہ قرآن کو صحیح کر سکتے ہیں۔ لیکن نہیں کرتے۔ بریلی میں ایک طالب علم تھے وہ مِنَ الْجِنَّةِ وَالنَّاس کو من الجنات والنس پڑھا کرتے تھے۔ غضب کی بات ہے کہ زواید ثلثہ اور صدراو شمس بازغہ کا تو ایک حرف بھی نہ چھوٹے اور قرآن کی ایک سطر بھی درست کر کے نہ پڑھیں اور عذر یہ کرتے ہیں کہ ہم کو اب کیا آوے گا۔ بڈھے طوطے بھی کہیں پڑھتے ہیں۔ صاحبو! تمہاری رائے کا اعتبار نہیں۔ قرآن کا سیکھنا فرض ہے۔ اس کا آ جانا فرض نہیں۔ تم کوشش تو کرو۔ جب واقف کار قاری یہ کہہ دیں کہ تم کو نہ آوے گا تو تم فرض ادا کر چکے ہو، اس کے بعد چھوڑ دیجیو۔

چوں کہ برمیخت بہ بندو بستہ باش   چوں کشاید چابک و برجستہ باش

یعنی جب تم کو کسی کھونٹے سے وہ باندھیں تو بندھے رہو اور جب کھولیں تو چالاک رہو کود و، لیکن سیکھنے سے پہلے تو ہر ایک کو چاہئے کہ وہ اور کوشش کرے۔ جب ایک دو ہفتہ کے بعد استاد فتویٰ دیدے کہ تم کو نہ آوے گا پھر نہ سیکھنا۔ اس وقت نہ سیکھنے سے تم کو گناہ نہ ہوگا۔ اور صاحبو میں تو کہتا ہوں کہ یہ سب حیلے اور عذر ہیں کہ ہم کو نہ آوے گا۔ واللہ! اگر ابھی گورنمنٹ کی طرف سے حکم ہو جائے کہ سب سیکھو ورنہ سزا ہوگی۔ یا یہ حکم ہو جائے کہ فی حرف صحیح ہونے پر پانچ روپے ملیں گے۔ تو ابھی سب سیکھ لیں اور تمام عذر جاتے رہیں محنت عجیب شے ہے۔ جانوروں پر محبت کرتے ہیں اور سدھ جاتے ہیں، تم تو آدمی ہو تم کو نہ آنے کے کیا معنے؟

طبیب کا فقدان:۔

اگر بالفرض بعد محنت اور کوشش کے تم کو نہ آوے اور ناکامی ہو تو یہ ناکامی کامیابی سے بڑھ کر ہے اس لئے کہ یہ ناکامیابی حق تعالیٰ کی طرف سے ہوگی۔

گر مرادت را مذاق شکر ہست   بے مرادی نے مراد دلبر است

ترجمہ:۔ اگر تیری مراد پوری ہو جاتی ہے اور تجھے شکر کی عادت ہے تو بے مرادی بھی اچھی ہے کیونکہ یہ اللہ کو پسند ہے۔

سیکھنے سے پہلے کی غلطی یہ تو تمہاری غلطی ہے اور اگر سیکھ کر اور کوشش کر کے ناامید ہو جاؤ گے تو غلطی اللہ تعالیٰ کی بنائی ہوئی ہوگی ایسی غلطی پر ہزاروں صحت قربان ہیں جیسے کوئی بزرگ فرماتے ہیں۔

براشہد تو خندہ زند اسہد بلالؓ

ترجمہ:۔ حضرت بلال رضی اللہ عنہ کا غلط تلفظ آپ کے صحیح تلفظ سے کہیں بہتر ہے۔

بہت سے بزرگ ایسے ہیں کہ ان کی غلطیاں ہی پسند ہیں بشرطیکہ ان کے اختیار کو اس میں دخل نہ ہو پس ایسے غلط خواں بہت سے صحیح خوانوں سے بھی بڑھ کر ہوں گے مثنوی شریف میں حکایت ہے کہ موسیٰ علیہ السلام کا ایک چرواہے پر گزر ہوا کہ وہ کہتا تھا

تا کجائی تا شم من چاکرت چارقت دوزم کنم شانہ سرت

یعنی تو کہاں ہے تا کہ میں تیرا چاکر ہوں تیری جوتیاں سیئوں تیرے سر میں کنگھی کروں۔

جامہ ات دوزم سپشہائے کشم شیر مشیت آورم اے محتشم

یعنی تیرے کپڑے سیئوں تیری جوئیں نکالوں تیرے لئے بکریوں کا دودھ لاؤں

ورترا بیماری آید ز پیش من ترا غمخوار باشم ہمچو خویش

اور اگر تجھ کو کوئی بیماری پیش آوے تو میں تیرا غم خوار ہوں گا اپنے کی طرح

دستکت بوسم بمالم پائکت وقت خواب آید بروبم جائکت

تیری دست بوسی کروں گا تیرے پاؤں سہلاؤں گا سونے کا وقت آوے گا تو تیری جگہ صاف کروں گا

گر بہ بینم خانہ ات رامن دوام روغن و شیرت بیارم صبح و شام

اگر میں تیرا گھر دیکھ لوں تو تیرے واسطے دودھ و گھی صبح وشام ہمیشہ لاؤں گا۔

زیں نمط بیہودہ میگفت آں شباں گفت موسیٰ با کیستت اے فلاں

اس طرز سے وہ چرواہا بیہودہ بکتا تھا۔ موسیٰ علیہ السلام نے فرمایا کہ یہ باتیں تو کس سے کر رہا ہے۔

گفت باآں کس کہ ماراآفرید ایں زمین و چرخ از او آمد پدید

کہا! میں اس سے کہہ رہا ہوں کہ جس نے ہم سب کو پیدا کیا ہے۔ یہ زمین اور فلک اس

سے ظاہر ہوئے ہیں۔

گفت موسیٰ ہائے خیرہ شدی　　　خود مسلمان ناشدہ کافر شدی

موسیٰ علیہ السلام نے فرمایا کہ ہائے تو تو تباہ ہو گیا، مسلمان نہیں رہا کافر ہو گیا۔ اس کے بعد موسیٰ علیہ السلام نے اس کو بہت دھمکایا اور سمجھایا کہ حق تعالیٰ ان سب حاجات سے پاک ہے، اس کے بعد وہ چرواہا کہتا ہے۔

گفت اے موسیٰ دہانم دوختی　　　وز پشیمانی تو جانم سوختی

کہا اے موسیٰ آپ نے تو میرا منہ سی دیا اور ندامت اور پشیمانی سے میری جان پھونک دی، اس کے بعد کپڑے پھاڑ کر جنگل کو چل دیا۔ اس کے بعد موسیٰ علیہ السلام پر وحی آئی۔ چنانچہ مولانا رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں

وحی آمد سوئے موسیٰ از خدا　　　بندہ مارا چرا کردی جدا

یعنی موسیٰ کی طرف خدا تعالیٰ کی طرف سے وحی آئی کہ ہمارے بندہ کو آپ نے جدا کیوں کر دیا۔

تو برائے وصل کردن آمدی　　　نے برائے فصل کردن آمدی

یعنی آپ ہم سے ملانے کے لئے آئے ہیں نہ کہ جدائی ڈالنے کے لئے۔

موسیا آداب داناں دیگر اند　　　سوختہ جاں درد داناں دیگر اند

اے موسیٰ عارفین کے آداب اور ہیں اور سوختہ جان و دل کے آداب اور ہیں۔ دیکھئے شبان موسیٰ باوجودیکہ غلطی کر رہا تھا۔ مگر چونکہ دل محبت واخلاص سے لبریز لئے ہوئے تھے اس لئے وہ غلطی اور بے ادبی ہی پسند آئی۔ اسی طرح سے تمہاری غلطیاں مشق کرنے سے بھی نہ گئیں تو شبان موسیٰ تو بن جاؤ گے۔ اور اگر غلطیاں جاتی رہیں تو وزیر موسیٰ علیہ السلام ہو گے۔ بلکہ وزیر محمد صلی اللہ علیہ وسلم بنو گے۔ اور یہ مت کہو کہ ہم تو گنوار ہیں۔ ہماری زبان موٹی ہے۔ بعضے گنوار بھی محنت سے عالم ہو گئے ہیں۔ حضرت مولانا گنگوہی کی خدمت میں ایک گوجر آئے۔ ان کی زبان سے الف بھی درست نہ نکلتا تھا، الف کو الف بفتحہ لام کہتے تھے۔ ایک وقت وہ آیا کہ حدیث کا درس دیتے تھے۔ ناامید نہ ہونا چاہئے۔ مولانا فرماتے ہیں۔

تو مگو مارا بداں شہ بار نیست　　　با کریماں کارہا دشوار نیست

ترجمہ:۔ تو یہ بات مت کہہ کہ ہماری اس بادشاہ تک پہنچ نہیں ہے کیونکہ کریموں کے ساتھ کوئی کام دشوار نہیں ہوتا۔

اور یہ یاد رکھو کہ بلا محنت مشقت کچھ نہیں ہوتا اور شاذ و نادر کا اعتبار نہیں چنانچہ ایک بزرگ کی حکایت ہے کہ ان پڑھ تھے۔ ایک روز جو صبح کو اٹھے تو اچھے خاصے عالم تھے۔ چنانچہ انہوں نے عربی میں طویل خطبہ پڑھ دیا جس کی ابتداء یہ تھی۔

الحمدللہ الذی امسیت کر دیا واحبت بفضلہ عربیاً.

ان پر ایک ہی میں خدا کا فضل ہو گیا لیکن ایسے قصے شاذ و نادر ہی ہوتے ہیں جس نے پیا ہے محنت مشقت ہی سے پایا ہے اور محنت سے مل جانا یہ بھی بڑا فضل ہے لیکن یہاں تو طلب ہی نہیں۔ ورنہ

عاشق کہ شد کہ یار بحالش نظر نہ کرد — اے خواجہ درد نیست وگرنہ طبیب ہست

ترجمہ:۔ ایسا کون سا عاشق ہے جس کے حال پر اسکے محبوب نے نظر نہ کی ہو اے شخص تیرے پاس درد نہیں ورنہ طبیب موجود ہے۔

ہمارے اندر درحقیقت طلب نہیں ورنہ ان کے یہاں تو ناکامی بھی کامیابی ہے افسوس اتنی عطا اور کوئی لینے والا نہیں ایک ہفتہ بھی تو کوئی قرآن کی مشق نہیں کر لیتا اگر ابھی گورنمنٹ کا حکم آوے کہ بقدر ضرورت انگریزی سیکھو ورنہ برخاست کر دیئے جاؤ گے۔ تو سب ملازمین ابھی انگریزی دان بن جائیں گے اگر اللہ میاں کے یہاں بھی یہی حکم ہوتا کہ قرآن صحیح کرو ورنہ روٹی بند ہو جائے گی تو ابھی سب کے قرآن صحیح ہو جاتے اور جو حیلے بہانے کرتے ہیں وہ سب رہ جاتے لیکن حق تعالیٰ کی تو وہ شان ہے کہ سب کچھ دیکھتے ہیں اور دو وقتہ روٹی دیتے ہیں۔

خدائے راست مسلم بزرگواری وحلم — کہ جرم بیند وناں برقرار میدارد

ترجمہ:۔ اللہ تعالیٰ کی بزرگی وعظمت اور بردباری مسلم ہے کہ جرم دیکھتا ہے اور رزق برقرار رکھتا ہے۔

تلاوت وتجارت:۔

حاصل یہ ہے کہ قرآن کا حق یہ ہے کہ قرآن کو صحیح کرنا چاہئے تیسرا حق یہ ہے کہ ایسی طرح نہ پڑھو کہ جی گھبرا دے اور لوگ اکتا جاویں یعنی بہت زیادہ نہ پڑھو اور نہ بہت کم پڑھو اس سے بعض اوقات دل تنگ ہوتا ہے اور زیادہ سننے کا اشتیاق ہوتا ہے اور خوش الحانی سے پڑھو چوتھا حق یہ ہے

کہ قرآن کی تجارت نہ کرواس کو سن کرلوگ گھبرائے ہوں گے کہ کیا قرآن کی تجارت بھی ناجائز ہے صاحبو! مکتوب قرآن کی تجارت کو میں نہیں کہتا کہ وہ تو جائز ہے میں ملفوظ قرآن کی تجارت کو ناجائز کہتا ہوں بعض حفاظ روپیہ ٹھہرا کر پڑھتے ہیں کہ دس روپیہ لیں گے تو پڑھیں گے ایسے حفاظ نے قرآن کی قدر کچھ نہ سمجھی قرآن تو وہ شے ہے اوراس کی قیمت یہ ہے۔

ہر دو عالم قیمت خود گفتہ　　　نرخ بالا کن کہ ارزانی ہنوز

ترجمہ:۔ تو نے اپنی قیمت دونوں عالم بتلائی ہے اپنے دام اور بڑھا کہ تو بھی سستا ہے۔

قرآن پڑھ کر کچھ لینا ناجائز ہونے کے علاوہ بہت ہی کم ہمتی کی بات ہے لکھنؤ میں ایک بزرگ تھے کہیں سفر میں تھے چوروں نے ان کو لوٹ لیا صرف ایک لنگی ان کے بدن پر رہ گئی کسی مسجد میں آئے قرآن شریف بے انتہا عجیب پڑھتے تھے ایک رئیس کو خبر ہوئی کہ ایک شخص آئے ہیں اوراس حالت میں ہیں قرآن بہت اچھا پڑھتے ہیں ان کو رحم آیا جوڑے اور نقد روپیہ اور کھانا ہمراہ لائے اوران سب کو ایک طرف رکھ دیا لیکن تھے بے عقل اور تمیز نہ تھی بزرگوں کے صحبت یافتہ نہ تھے آ کر بیٹھے اور کہا کہ حضرت میری درخواست ہے کہ آپ مجھے کچھ قرآن سنایئے انہوں نے قرآن شریف سنایا اس نے قرآن سن کر وہ سامان پیش کیا انہوں نے فرمایا بیشک مجھ کو حاجت ہے اور میں ضرور لے لیتا لیکن اس وقت تو مجھ کو آیت:

تَشْتَرُوْا بِاٰیٰتِیْ ثَمَنًا قَلِیْلًا.　　(میری آیات کا حقیر معاوضہ نہ لو)

اس کی اجازت نہیں دیتی اگر آپ پہلے دیتے تو لے لیتا اب تو میں ہرگز نہ لوں گا سبحان اللہ کیسے مخلص تھے ایک اور خلوص کی حکایت یاد آئی مولانا اسمٰعیل شہیدؒ نے ایک مجمع میں وعظ فرمایا وعظ فرما کر نکل رہے تھے کہ ایک شخص ملا اس نے عرض کیا حضرت میں نے وعظ سنا ہی نہیں فرمایا اچھا پھر کہدوں گا سنو! چنانچہ پھر اکیلے کے سامنے وہی وعظ کہہ دیا اللہ اکبر کس قدر خلوص ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ حضرات جو کچھ کرتے ہیں محض اللہ ہی کے واسطے کرتے تھے اس میں نفس کی آمیزش نہ ہوتی تھی ہم تو اپنی کہتے ہیں ہم سے اگر کوئی اس طرح درخواست کرے تو ہم پھر کبھی نہ کہیں بلکہ اگر مجمع کم ہو جب بھی دل نہ لگتا الغرض ان بزرگ نے وہ سامان باوجود اصرار کے نہ لیا یہ لوگ تھے امراء دولتمند جن کی نظروں میں ہفت اقلیم کی سلطنت بھی گرد تھی اور گرد کیوں نہ ہو جس کے پاس حق تعالیٰ کی دی ہوئی اتنی بڑی دولت ہو وہ سلطنت کی کیا قدر کرے۔

حفاظ کو ہدایت:۔

پس اے حفاظ! آپ اپنی قدر کیجئے اور دس دس پندرہ پندرہ روپیہ پر رال نہ ٹپکائیں بڑا افسوس ہے کہ قرآن کو بیچا بھی تو کتنے میں دس روپیہ میں۔ مولوی فیض الحسن صاحب سہارنپوری بڑے ظریف تھے ایک مرتبہ آپ شیعوں کی مجلس میں پہنچے اور فرمانے لگے اللہ تعالیٰ رحم کرے حضرت یزید پر اللہ تعالےٰ بخشے حضرت شمر ذی الجوشن کو بڑے عالی ہمت تھے شیعہ سن کر کہنے لگے کہ حضرت توبہ کیجئے کن کافروں کی آپ بات کر رہے ہیں کہنے لگے کچھ ہو مگر تھے بڑے عالی ہمت ایمان انہوں نے بیچا تو مگر شام کی سلطنت کے بدلے اب تم کم ہمت بھی ہو اور بے ایمان بھی کہ آدھ آدھ سیر حلوے پر ایمان بیچتے ہو شیعہ سن کر بہت کچے ہوئے ایک عربی کی مثل مشہور ہے۔

ان سرقت فاسرق الدرة وان زنیت فاذن بالحرة

ترجمہ:۔اگر چوری کرنا ہے تو نادر موتی چراؤ اور اگر زنا کرنا ہی ہے تو کسی آزاد سے کرو۔ نعوذ باللہ

امیر احمد صاحب مرحوم تھانوی جلال آباد میں امام عیدین تھے ایک مرتبہ عید کی نماز کے بعد ایک خان صاحب نے پانچ روپیہ نذر پیش کئے قاضی صاحب نے فرمایا کہ یہ آپ اپنے لائق دیتے ہیں یا میرے لائق اگر آپ اپنے لائق دیتے ہیں تو آپ کی لیاقت اس سے بہت زیادہ ہے اگر میرے لائق دیتے تو میری لیاقت تو اتنی بھی نہیں اور واپس فرمادیئے غرض عوض بھی لیا تو اتنا کم کہ دس یا پندرہ روپے

اے حفاظ! تم تو اللہ کے واسطے پڑھو اور اپنے ثواب کو برباد نہ کرو ایک مسئلہ اور ہے اس میں مجھ سے غلطی ہو چکی ہے وہ یہ ہے کہ میں سمجھتا تھا کہ سامع کو روپیہ لینا جائز ہے میں اس کو تعلیم پر قیاس کیا کرتا تھا لیکن پھر سمجھ میں آیا کہ سامع کو روپیہ میں داخل کرنا صحیح نہیں اس لئے کہ تعلیم سے نماز فاسد ہو جاتی ہے اور سامع کو بتلانے سے نماز فاسد نہیں ہوتی اور نیز بھولے ہوئے کو بتلانا یہ نماز کی اصلاح اور اصلاح نماز "عبادت" ہے اس لئے قاری کو جائز ہے اور نہ سامع کو قواعد کلیہ سے یہ دونوں فتوے دیئے ہیں اگر اس کے خلاف کسی کو جزئیہ معلوم ہو تو میں اس سے بھی رجوع کرلوں گا علاوہ جواز کے میں نے یہ دیکھا ہے کہ پڑھنے پر لینے کی حرص پیدا ہو جاتی ہے اگر جائز بھی ہوتا تو اس مرض سے بچنے کے لئے بھی اس سے پرہیز ہی بہتر ہے اور تعلیم قرآن پر جو فقہاء نے فتویٰ دیدیا ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ اگر اس پر لینا جائز نہ ہو تو تعلیم قرآن کم ہو جائے اور اس کا باقی رکھنا ضروری ہے اگر تراویح میں قرآن نہ

سنائیں تو کسی ضروری امر میں خلل نہیں پڑتا بعض لوگ تاویل کرتے ہیں کہ اگر روپیہ نہ دیں گے تو تراویح کا ترک لازم آوے گا یہ قیاس صحیح نہیں تراویح ترک نہ ہوں گی بلکہ ختم قرآن چھوٹ جاوے گا اور وہ ضروری نہیں بعض یہ تاویل کرتے ہیں کہ ہم اللہ کے واسطے پڑھیں گے تم اللہ کے واسطے دے دیجئو صاحبو یہ نرے الفاظ ہی ہیں مطلب صاف یہی ہوتا ہے کہ پڑھنے کی وجہ سے لیتے ہیں یہ نیت نہیں ہوتی کہ اللہ کے لئے دونوں کام نہیں ہوں گے بلکہ یہ محض الفاظ اصطلاحی ہو گئے ہیں یہ الفاظ بول کر ان کے معنی وموضوع لہ مراد نہیں لیتے اور علامت اس کی یہ ہے کہ اگر اس کے کہنے کے بعد حافظ جی کو یہ معلوم ہو جائے کہ یہ لوگ کچھ نہ دیں گے تو اسی وقت بھاگ جاویں گے یا اگر ختم پر کچھ نہ دیں گے تو پھر دیکھئے کیا مزہ آتا ہے خوب لڑائی ہو۔ یا حافظ جی اگر کچھ مہذب ہوئے تو لڑائی تو نہ ہو گی لیکن دل میں یہ ضرور سمجھیں گے کہ ان لوگوں نے حق تلفی کی غرض کہ کچھ بھی مت لو۔

ختم قرآن کی رسوم:۔

منجملہ منکرات کے مٹھائی تقسیم کرنا ہے اس کو لوگ چونکہ ضروری سمجھنے لگے ہیں اس لئے اس کو بھی چھوڑنا چاہئے اگر تم کو قرآن شریف ختم ہونے کا شکریہ ادا کرنا ہے گھر جا کر اور مٹھائی منگا کر سب کے یہاں حصہ لگا کر بھیج دو مسجد میں تقسیم نہ کرو اور ایسے ہی خرچ کرنے والے ہو تو اناج تقسیم کرو، روپیہ تقسیم کرو۔ کوئی بکرا گائے ذبح کر کے تقسیم کر دو۔ مٹھائی ہونا فرض نہیں حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کی جب سورۃ البقرۃ ختم ہوئی تو انہوں نے ایک اونٹنی ذبح کی تھی۔ مسجد میں تقسیم کرنے سے بڑی بے لطفی اور مسجد کی بے ادبی ہوتی ہے اور بڑا شور وغل ہوتا ہے لکھنؤ میں ہمارے ایک دوست تھے وہ کبھی مجلس مولد کیا کرتے تھے مگر منکرات سے خالی گو ہم مفاسد عوام کے سبب اس کو بھی پسند نہیں کرتے غرض وہ یہ عمل کرتے اور جس جس کو بلانا ہوتا فہرست کے ساتھ مٹھائی بھیج دیتے تھے اب جس کا جی چاہے آوے اور جس کا جی چاہے نہ آوے اور نیز اب جو کوئی آوے گا تو خلوص سے آوے گا۔ مٹھائی کے لالچ میں نہ آوے گا اور ختم قرآن کے موقع پر بیس پچیس روپے کے پیسے غرباء ومساکین کو تقسیم کر دیتے اور پھر کچھ مٹھائی ہونا ضروری نہیں ہم نے ایک مرتبہ اپنے ختم قرآن کے شکریہ میں کباب تقسیم کئے تھے اور تقسیم کا وقت بھی بدل دیا افطار کے وقت تقسیم کر دیئے ایک قاری صاحب تھے وہ گوشت روٹی کی دعوت کیا کرتے تھے بعض لوگ کہتے ہیں کہ ان

مولویوں نے سب خرچ بند کر دیئے صاحبو! خرچ کو کون بند کرتا ہے میں نے تو بہت سی صورتیں خرچ کی بتا دیں مٹھائی کو جو منع کیا جاتا ہے سو منکرات کی وجہ سے روکا جاتا ہے منجملہ منکرات کے یہ بھی ہے کہ اس کا التزام ہوتا ہے کہ کوئی آدمی محروم نہ جائے ورنہ بڑی بدنامی ہوگی عرب کے لوگ خوب ہیں جہاں تک شئے تقسیم ہوسکتی ہے کرتے ہیں ورنہ کہہ دیتے ہیں کہ بس خلاص وہاں اس کی پروانہیں ہے کہ بدنامی ہوگی اور اس مٹھائی کی بدولت کیا ہوتا ہے کبھی ایک صاحب امام کے پاس آتے ہیں کہ حافظ جی کچھ عرض کرنا ہے آہستہ سے کہا کہ بازار آدمی گیا ہے مٹھائی کے لئے ذرا تھام تھام کر پڑھیو اب حافظ صاحب اور دنوں میں تو آدھ گھنٹہ میں دو پارہ پڑھتے تھے آج خوب کھینچ کھینچ کر اور آواز بنا بنا کر پڑھتے ہیں جب دیکھا کہ آ گیا پھر جلدی جلدی پڑھ کر ختم کر دیا ایک سب سے بڑھ کر خرابی یہ ہے کہ مٹھائی کے لئے چندہ ہوتا ہے اور وجیہہ آدمی وصول کرنے والے ہوتے ہیں جو اپنی وجاہت سے غرباء کو دبا کر وصول کرتے ہیں اگر کسی نے ۴ آنے دیئے تو کہتے ہیں کہ میاں تم چار ہی آنہ دیتے ہو تم سے تو ایک روپیہ لیں گے وہ بیچارہ شرما جاتا ہے جب اس مٹھائی کے اندر یہ خرابیاں ہیں تو بتلائیے کہاں تک صبر کیا جائے کیوں نہ روکا جائے۔

اگر بینم کہ نابینا وچاہ است　　　اگر خاموش بنشینم گناہ است

ترجمہ:۔ اگر میں دیکھوں کہ سامنے ایک اندھا اور کنواں ہے اور اس پر اگر خاموش بیٹھوں تو گناہ ہے۔

غرض یہ مٹھائی کیا ہے مجذوب کا لنگوٹا ہے جس کی وجہ سے بہت سے منکرات پیدا ہوتے ہیں ایک مجذوب صاحب برہنہ رہا کرتے تھے معتقدوں نے عرض کیا کہ حضور آپ ننگے برے معلوم ہوتے ہیں کم از کم لنگوٹا باندھ لیجئے کہنے سننے سے انہوں نے لنگوٹا باندھ لیا اب جو کچھ کھاتے پیتے چونکہ ہوش تو درست نہ تھے وہ لنگوٹے پر بھی گر جاتا اور چکنا ہو جاتا اس کو چوہے کاٹنے لگے چوہوں کو دفع کرنے کیلئے ایک بلی پالی گئی اس نے یہ خرابی کہ جو کچھ شاہ صاحب کے لئے دودھ دہی رکھا ہوتا وہ کھا جاتی اس لئے حفاظت کے لئے ایک کتا رکھا گیا کتا بھی کچھ نقصان کرنے لگا تو ان سب کی نگرانی کے لئے ایک آدمی رکھا گیا وہ آدمی آوارہ سا تھا ادھر ادھر جاتا تھا یہ تجویز ہوا کہ اس کا نکاح کر دینا چاہئے چنانچہ اس کا نکاح کر دیا گیا اس کے کئی بچے ہو گئے ایک روز مجذوب صاحب جو افاقہ کی حالت میں آئے تو دیکھا بلی ہے کتا ہے مرد اور عورت بہت بکھیڑا جمع ہے پوچھا کہ یہ کیا ہے سارا قصہ سنایا مجذوب صاحب نے کہا کہ آہا یہ سب اس لنگوٹ کیوجہ سے ہوا جاؤ ہم لنگوٹا نہیں رکھتے اور یہ کہہ کر

لنگوٹا کھول کر پھینک دیا تو صاحبو! جس مٹھائی کی وجہ سے اس قدر منکرات لازم آئیں اس کو ترک کر دینا چاہئے ختم کے روز ایک اور خرابی ہوتی ہے وہ یہ ہے کہ اس روز حافظ جی کا مصلّی کیا ہوتا ہے پنساری کی دوکان ہوتی ہے، کہیں اجوائن کی پڑیاں رکھی ہیں کہیں سیاہ مرچیں۔ کوئی ان صاحبوں سے پوچھے کہ حافظ صاحب نے قرآن تمہاری اجوائن ہی کے لئے پڑھا تھا یاد رکھو کہ اجوائن پر دم کرنا یہ دنیا کا کام ہے۔ دین کے کام کی غایت دنیا کو بنانا بہت نازیبا ہے اور تعویز و نقش لکھنا اس کے حکم میں نہیں ہے کیونکہ وہ خود دنیا ہی کا کام ہے، تو اس کی غایت دنیا ہونا مضائقہ نہیں، وہ تو ایسا ہے جیسے حکیم جی کا نسخہ لکھنا عبادت نہیں ہے اس پر اگر اجرت بھی لے تو کچھ حرج نہیں اور قراءت قرآن عبادت ہے۔ اس کی غایت اور ثمرہ آخرت میں ملے گا۔ اس کی صریح دلیل یہ ہے کہ حدیث میں ہے۔

اقرءوا القرآن ولا تاکلوا به.

یعنی قرآن پڑھو اور اس کے عوض میں کھاؤ نہیں۔ ایک حدیث یہ ہے اور ایک دوسری حدیث شریف میں ایک اور قصہ آیا ہے وہ یہ ہے کہ چند صحابہ رضی اللہ عنہم سفر میں تھے ایک گاؤں میں گزر رہوا۔ ان گاؤں والوں نے ان کو کھانا تک نہ کھلایا۔ وہاں اتفاقاً ایک شخص کے سانپ نے کاٹ لیا۔ ایک شخص ان کے پاس آیا اور پوچھا:

افیکم راق

یعنی کیا تمہارے میں کوئی منتر پڑھنے والا ہے ایک صحابی تشریف لے گئے اور یہ کہا کہ ہم جب دم کریں گے جب کہ ہم کو سو بکریاں دو۔ انہوں نے وعدہ کر لیا۔ انہوں نے سورۃ فاتحہ پڑھ کر دم کر دیا۔ سبحان اللہ! ان حضرات کی کیا پاکیزہ زبان تھی شفا ہوگئی، ایسا ہوگیا جیسے رسی میں کھول دیتے ہیں اس نے حسب وعدہ سو بکریاں دیں وہ لیکر اپنے ساتھیوں میں آئے۔ بعض نے کہا کہ لینا ان کا حرام ہے بعض نے کہا حلال۔ جب حضورؐ کے یہاں حاضر ہوئے تو اس کا استفتاء کیا گیا۔ فرمایا:

ان احق ما اخذتم علیه کتاب الله

یعنی جس شے پر تم اجرت لیتے ہو اس میں سب سے احق کتاب اللہ ہے اور بلا اندیشہ کھاؤ بلکہ میرا حصہ بھی لگاؤ۔ اب بظاہر اس حدیث میں اور حدیث سابق میں تعارض معلوم ہوتا ہے۔ لیکن فی الواقع کچھ بھی تعارض نہیں۔ اس قصہ میں تو قرآن جھاڑ پھونک کے طور پر پڑھایا گیا ہے۔ اس طور سے پڑھنا عبادت نہیں، اس لئے اس پر معاوضہ لینا جائز ہے اور:

اقراء وا القرآن لا تاکلوا به. (قرآن پڑھو اور اسکے عوض میں کھاؤ نہیں)

میں قرأۃ قرآن سے مراد قراءۃ بطور عبادت ہے، اس لئے اس پر معاوضہ لینا حرام اور دین کو دنیا سے بدلنا ہے۔ اسی طرح اجوائن پر قرآن کو دم کرانا یہ دین کی غایت دنیا کو بنانا ہے اور بہت بے ادبی ہے اور قرآن کو اسکے مرتبہ سے گھٹانا ہے میں تو یہ نہیں کہتا کہ ناجائز ہے لیکن پیٹ بھر کر بے ادبی ہے۔

قرآن کی غایت:۔

صاحبو! یہ قرآن تو وہ ہے، اس کی نسبت ارشاد ہے۔

ان تخلطه بلحمی ودمی وعظمی.

اے اللہ! قرآن کو میرے گوشت، خون، ہڈیوں میں خلط کر دیجئے'' یعنی میرے تمام جسم کو قرآن سے متاثر کر دیجئے۔ یہ ہے قرآن کی غایت اگر کوئی کہے کہ یہ تو نیا مسئلہ ہے۔ صاحبو! یہ نیا نہیں۔ یہ پرانی بات ہے اگر نئی ہے تو بتلاؤ یا کسی تاریخ میں دکھلاؤ۔ کہ صحابہ نے قرآن کو عبادت کے طور پر ختم کر کے اجوائن پر دم کیا ہو۔ اس کے علاوہ اور بہت سے منکرات ہیں اس وقت اسی پر اکتفا کرتا ہوں۔ نماز کے حقوق اول بیان ہو چکے ہیں۔ یہ قرآن کے حقوق ہیں۔

خلاصہ یہ ہے کہ ان حقوق کو پوری طرح ادا کرنا چاہئے۔ جب حقوق ادا کئے جائیں گے تو ان شاء اللہ تعالیٰ وہ مصالح اور حکمتیں کہ جن کے لئے یہ عبادتیں موضوع ہوئیں ان پر مرتب ہوں گی۔ اور اگر حقوق ادا نہ کئے تو وہ خاصیتیں ظاہر نہ ہوں گی۔ مجھ کو بس اسی قدر بیان کرنا تھا۔ اس سے پہلے حقوق صوم بیان ہو چکے ہیں جو کہ فرض ہیں اور یہ سنت کے حقوق ہو گئے۔ باقی ایک اور مضمون بیان کرنے والا تھا وہ یہ ہے کہ ایک خاصیت تو روزہ اور نماز کی ان کی صورۃ نوعیہ کے اعتبار سے ہے۔ اس میں تخصیص فرض اور سنت کی نہیں ہے دونوں کو عام ہے وہ تو بیان ہو گئی ہے اور ایک خاصیت ان کی فرض اور سنت ہونے کے اعتبار سے ہے، یعنی نماز اور روزہ فرض کی خاصیت جدا ہے اور نماز اور روزہ سنت کی خاصیت جدا۔ اور یہ خواص ''قرب فرائض اور قرب نوافل'' اصطلاح میں کہلاتے ہیں۔ لیکن چونکہ وقت نہیں رہا۔ اس لئے اگر کسی موقع پر یاد رہا تو کیا عجب ہے کہ بیان ہو جائے ورنہ جس کی ضرورت تھی وہ مضمون بیان ہو گیا ہے۔ اب اللہ سے دعاء کیجئے کہ توفیق عطا فرماویں۔ فقط۔ آمین!

خیر الارشاد لحقوق العباد

اگر کسی جگہ بدعت ہی لوگوں کے دین کی حفاظت کا ذریعہ ہو جائے تو وہاں اس بدعت کو غنیمت سمجھنا چاہیے جب تک کہ ان کی پوری اصلاح نہ ہو جائے۔

اہتمام حقوق العباد کے متعلق یہ وعظ تحصیلدار صاحب جلال آباد ضلع مظفر نگر کے مکان پر ۲۴ جمادی الاول ۱۳۴۳ھ بروز شنبہ بوقت چاشت تخت پر کرسی رکھوا کر کرسی پر بیٹھ کر فرمایا جو ۲ گھنٹے پچاس منٹ میں ختم ہوا۔ ۵۰ کے قریب مرد اور عورتیں علاوہ موجود تھیں۔ مولانا ظفر احمد صاحب نے قلمبند فرمایا۔

خطبہ ماثورہ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

الحمدللہ نحمدہ ونستعینہ ونستغفرہ ونؤمن بہ ونتوکل علیہ ونعوذ باللہ من شرور انفسنا ومن سیئات اعمالنا من یھدہ اللہ فلا مضل لہ ومن یضللہ فلا ھادی لہ ونشھدان لا الٰہ الا اللہ وحدہ لا شریک لہ ونشھدان سیدنا ومولانا محمداً عبدہ ورسولہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وعلیٰ آلہٖ واصحابہ وبارک وسلم۔

اما بعد فاعوذ باللہ من الشیطان الرجیم، بسم اللہ الرحمٰن الرحیم، اِنَّمَا السَّبِیْلُ عَلَی الَّذِیْنَ یَظْلِمُوْنَ النَّاسَ وَیَبْغُوْنَ فِی الْاَرْضِ بِغَیْرِ الْحَقِّ ط اُولٰٓئِکَ لَھُمْ عَذَابٌ اَلِیْمٌ

پس الزام تو انہی لوگوں پر ہے جو آدمیوں پر ظلم کرتے ہیں اور زمین پر ناحق تکبر کرتے ہیں۔ ان لوگوں کے لئے دردناک عذاب ہے۔

تمہید: یہ ایک آیت ہے سورۃ شوریٰ کی اس میں حق تعالیٰ نے حقوق العباد کے متعلق ایک ضروری مضمون ارشاد فرمایا ہے جو سیاق وسباق کے لحاظ سے ایک خاص حق العباد کے متعلق وارد ہے۔

(کیونکہ اس سے اوپر یہ آیت ہے)

وَالَّذِیْنَ اِذَآ اَصَابَھُمُ الْبَغْیُ ھُمْ یَنْتَصِرُوْنَ وَجَزٰٓؤُا سَیِّئَةٍ سَیِّئَةٌ مِّثْلُھَا فَمَنْ عَفَا وَاَصْلَحَ فَاَجْرُہٗ عَلَی اللّٰہِ ط اِنَّہٗ لَا یُحِبُّ الظّٰلِمِیْنَ وَلَمَنِ انْتَصَرَ بَعْدَ ظُلْمِہٖ فَاُولٰٓئِکَ مَا عَلَیْھِمْ مِّنْ سَبِیْلٍ اِنَّمَا السَّبِیْلُ عَلَی الَّذِیْنَ یَظْلِمُوْنَ النَّاسَ

اور اس کے بعد یہ آیت ہے ولمن صبر وغفران ذالک لمن عزم الامور اس

ماقبل وما بعد کے ملانے سے معلوم ہوتا ہے کہ آیہ مذکورہ فی الوعظ میں ظلم سے مراد انتقام کے وقت ظلم کرنا ہے مگر الفاظ آیت خود عام ہیں نیز جب ظلم بوقت انتقام کی یہ حالت اور اس پر یہ وعید ہے تو ابتدائے کلام تو اس سے اشد ہے اس پر بدرجہ اولیٰ وعید ہے۔)

مگر عموم الفاظ سے مطلقاً حق العباد کے متعلق بھی ہے بلکہ یوں کہنا چاہئے کہ عبارۃ النص سے تو اس دلالت معنی مسوق لہ پر جو کہ ایک خاص حق العبد ہے اور اشارۃ النص سے مطلق حقوق العباد پر دلالت ہے۔ یعنی مطلق حقوق العباد پر اس کی دلالت اشارۃ ہے نہ کہ قصداً مگر دست خفی نہیں بلکہ صریح ہے اور اس کو میں نے اس لئے اختیار کیا ہے کہ جی یوں چاہا کرتا ہے کہ ہر موقع پر خواہ موقع زمانی ہو یا مکانی مضمون ضرورت کے موافق بیان ہو اور یوں تو شریعت کے بارے مضامین ہی ضروری ہیں مگر ان میں سے بھی جن کی شدید ضرورت ہو اس کا بیان کیا جائے اور یہ شدت ہماری غفلت اور بے التفاتی سے بڑھ جاتی ہے کہ ایک حکم ضروری العمل ہو اور اس غفلت اور بے التفاتی برتی جا رہی ہو چنانچہ اس وقت میرے خیال میں اس جگہ حقوق العباد کے متعلق بیان کی ضرورت ہے بلکہ جب مجھ سے کئی ہفتے پہلے بیان کے لئے کہا گیا تھا تو اسی وقت دل میں یہ بات یاد آئی کہ اس جگہ حقوق العباد کے متعلق بیان کی ضرورت ہے مگر اس وقت باحتمال بارش کے یہاں آنے کی ہمت نہ ہوئی اور میں نے کہہ دیا تھا کہ جس دن بادل نہ ہو اس دل چلوں گا چنانچہ اس جمعہ کو جو مجھ سے تاریخ پوچھی گئی تو میں نے پیر کا دن اسی شرط کے ساتھ معین کر دیا تھا گو آج بھی بادل گھرا ہوا تھا۔(۱)

(۱)۔ اس وقت بھی جبکہ میں یہ مقام لکھ رہا ہوں اتفاق سے بادل گھرا ہوا ہے اور بارش کی ضرورت ہے حق تعالیٰ شانہ امن وعافیت ورحمت کی بارش نازل فرمائیں۔۱۲۔ظ۔

اور ہمت آنے کی نہ ہوتی تھی مگر جب سواری آ گئی تو میں نے بار بار سواری کو واپس کرنا گوارا نہ کیا اور خدا کے نام پر چلا اور بحمد اللہ بادل کے وقت گئے تھے اور کھلے میں واپس آئے۔ لوٹتے وقت بادل نہ رہا۔۱۲ظ تو اس مضمون کا خیال مجھے درخواست کے ساتھ ہی آ گیا تھا چنانچہ آج اس کو بیان کرنے کا موقع ملا ہے تو بیان کرتا ہوں اور شروع ہی سے میں نے اطلاع بھی کر دی کہ میں یہ بیان کروں گا، میری عادت ہے کہ جس مضمون کو بیان کرنا مقصود ہوتا ہے میں اس کو پہلے ہی صاف صاف کہہ دیتا ہوں تاکہ روح بیان اور خلاصہ کے علم سے باقی مضمون سہولت سے سمجھ میں آ جاوے۔ نیز اس میں چونکہ تفصیل بعد الاجمال ہوتی ہے اس لئے وہ واقع فی النفس بھی ہوتی ہے، بخلاف عام مقرروں کے کہ ان میں

بعض دفعہ بیان کرنے والا مقصود کو توطیہ وتمہید کے بعد ادا کرتا ہے اور اس میں بھی ایک حکمت ہے وہ یہ کہ اس میں دیر تک سامعین کو مضمون مقصود کا اشتیاق رہتا ہے اور اشتیاق کے بعد جو بات معلوم ہوتی ہے اس کی وقعت ہوتی ہے اور دوسرے یہ بھی حکمت ہے کہ اگر وہ مضمون ایسا ہو جس سے طبائع پر گرانی ہوتی ہو تو پہلے ہی سے اس مضمون کو سن کر لوگوں پر گرانی نہ ہو اور بعض سامعین اٹھ اٹھ کر نہ چل دیں جیسا کہ چندہ کے متعلق بیان کرنے والے پہلے ہی سے یہ نہیں کہتے کہ آج چندہ کا بیان ہوگا بلکہ اول مذہب کے حقوق اور علم کے فضائل بیان کرتے ہیں۔ پھر یہ کہتے ہیں کہ حفاظت اسلام کی بہتر صورت مدارس کا قیام ہے۔ پھر کہتے ہیں کہ ان کا قیام سب مسلمانوں کی توجہ وہمت سے ہوسکتا ہے اب چندہ کی ترغیب دیتے ہیں مگر میں ایسا نہیں کرتا، اول میں تو چندہ کے متعلق بیان ہی نہیں کرتا اور اگر کبھی کرتا ہوں تو اول ہی کہہ دیتا ہوں کہ آج چندہ کا بیان ہوگا جس کا جی چاہے بیٹھے اور جس کا جی نہ چاہے اٹھ کر چلا جائے۔ میں چندہ کے مضمون کو توطیہ وتمہید کے بعد اس لئے نہیں کہتا کہ اس سے سننے والوں کو دھوکہ ہوتا ہے کیونکہ وہ تو یہ سمجھ کر بیٹھتے ہیں کہ ہم سے کچھ مانگا نہ جائے اور جب اخیر میں ان سے چندہ کو کہا گیا تو بعض کو ناگوار ہوتا ہے اور وہ اپنے دل میں کہتے ہیں کہ ہم کو پہلے سے یہ معلوم ہوتا کہ اخیر میں ہم سے چندہ مانگا جائے گا تو ہم اتنی دیر تک اپنا وقت ضائع نہ کرتے۔ دوسرے اس طرز سے تمہیدی مضامین کی ساری وقعت سامعین کے دل سے نکل جاتی ہے اور وہ یہ سمجھتے ہیں کہ بس یہ سارا زور وشور اس لئے تھا کہ ہمیں چندہ دو۔ سو میں مسلمانوں کو دھوکا نہیں دینا چاہتا اور نہ احکام علوم شرعیہ کی وقعت کھونا چاہتا ہوں جس مضمون کے متعلق مجھے یہ شبہ ہوتا ہے کہ اس میں بعض سامعین پر گرانی ہوگی میں پہلے اس کو ظاہر کر دیتا ہوں اس کے بعد جو کوئی بیٹھے گا اور مجھ پر اس کے بیٹھے رہنے کا کچھ احساس نہ ہوگا اور نہ وہ میرے اجمال وابہام کی وجہ سے بندھے گا ان وجوہ سے میں ابہام کو پسند نہیں کرتا اور اگر کسی کو توطیہ وتمہید سے صرف دفع وحشت عن المضمون مقصود ہو اور کوئی نیت نہ ہو تو تمہید کے بعد مقصود کے بیان کرنے کا بھی مضائقہ نہیں کیونکہ دفع وحشت سامع بھی مطلوب ہے مگر جہاں تک میں دیکھتا ہوں اس پیشہ والوں کی نیت توطیہ وتمہید سے یہ نہیں ہوتی کہ سامعین کی وحشت مضمون سے دفع ہو بلکہ زیادہ تر اپنی مصلحت مدنظر رکھتے ہیں کہ کہیں لوگوں کو ہم سے وحشت نہ ہو جائے اس لئے وہ چندہ کے مضمون کو ایسی رنگ آمیزی اور تمہید کے بعد زبان پر لاتے ہیں کہ لوگوں کو ان حضرت واعظ سے وحشت نہ ہو۔

مخاطبین کی رعایت

مگر میں اسے خیانت سمجھتا ہوں کہ واعظ اپنے مصالح کا لحاظ کر کے وعظ کہے اس کو مخاطبین کی مصلحت کا لحاظ کرنا چاہیے۔ ان کی اصلاح کس طرز میں زیادہ ہے چاہے اپنی مصلحت رہے یا جائے مجھ کو تو اس سے غیرت آتی ہے کہ اپنی مصالح کا لحاظ کر کے بیان کروں۔

ایک بار میں جودھ پور گیا اور مجھ سے اہل شہر نے وعظ کی درخواست کی تو ایک صاحب مجھ سے کہنے لگے کہ وعظ میں امام ابوحنیفہ کے فضائل زیادہ بیان کیجئے گا کیونکہ یہاں کے لوگ آپ کو اور آپ کی جماعت کو ضعیف فی الحنفیہ سمجھتے ہیں۔ (یعنی غیر مقلدی کی طرف مائل سمجھتے ہیں) میں نے کہا کہ اب تو میں ہرگز یہ مضمون بیان نہیں کروں گا۔ اس کا تو یہ مطلب ہوا کہ میں لوگوں کو اپنا معتقد بنانے کے لئے وعظ کہوں کہ بھائیو! ہمیں حنفیت میں ضعیف نہ سمجھو کیونکہ دیکھو ہم امام صاحب کے ایسے معتقد ہیں تو یہ تو محض اپنی مصلحت ہوئی، سامعین کی اس میں کیا مصلحت ہوئی۔ البتہ اگر سامعین میں کوئی امام صاحب سے غیر معتقد ہوتا تو اس صورت میں امام صاحب کے فضائل بیان کرنے میں بیشک مخاطبین کی مصلحت تھی کہ ایک امام صاحب کے ساتھ بدگمانی کرنے سے لوگوں کو رکاوٹ ہو جاتی۔ مگر جب سامعین میں امام صاحب سے غیر معتقد کوئی نہیں تو اب مضمون ان کی مصلحت سے نہ ہوا بلکہ اسمیں محض اپنی مصلحت رہ گئی اور مجھ کو اس سے غیرت آتی ہے کہ لوگوں کو اپنا معتقد بنانے کیلئے کوئی مضمون بیان کروں۔ چنانچہ میں نے یہ مضمون (فضائل امام کو) نہیں بیان کیا بلکہ میرے نزدیک سامعین کی اصلاح کے لئے جس مضمون کی ضرورت تھی وہ بیان کیا اور شروع میں یہ بھی کہہ دیا کہ بعض خیرخواہوں کی یہ رائے تھی کہ آج فضائل امام ابوحنیفہ بیان کیے جائیں اور اس میں مصلحت یہ بتلائی گئی کہ مجھے یہاں پر بعض لوگ ضعیف فی الحنفیہ سمجھتے ہیں تو ان کے اس خیال کی اصلاح ہو جائے۔ مگر میں اس کو گوارہ نہیں کرتا کہ اپنی نصرت و مصلحت کے لئے مریضوں کی مصلحت کو فوت کروں۔ فضائل امام کے بیان سے آپ لوگوں کو کچھ نفع نہ ہوگا کیونکہ آپ میں امام صاحب سے غیر معتقد کوئی نہیں۔ ہاں بظاہر میرا ایک نفع تھا سو میں اپنے نفع کے واسطے بیان کرنا نہیں چاہتا، وہ طبیب طبیب نہیں جو نسخہ لکھتے ہوئے اپنی مصالح کی رعایت کرے (مثلاً ایسی دوائیں دے جو اس کے پاس ملتی ہوں) اور مریض کی مصالح کو نظر انداز کر دے۔ اس لئے میں اس مضمون کو چھوڑ کر وہ مضمون اختیار کرتا ہوں جو آپ کے لئے نافع ہے اور جو کچھ بیان کروں گا قرآن وحدیث سے بیان کروں گا جس پر ہر مسلمان عمل کرنے کا طالب ہے اس لئے آپ مضمون پر نظر رکھیں اس کو نہ دیکھیں کہ بیان کرنے والا کیسا ہے میرے اندر ہزاروں عیب سہی لیکن ان شاء اللہ آپ کو وہی راستہ بتلاؤں گا جو آپ کے واسطے نافع ہے۔

اور اس کو نافع میرے ہی کہنے سے نہ سمجھو، خالی الذہن ہو کر سن لو پھر خود غور کرو جس سے عقیدت ہو اس سے تحقیق کر لو۔ اس کے بعد بھی اگر کوئی غلطی ہو گی، معذور ہو اس کے بعد پھر جو بیان ہوا تو سامعین پر بہت بڑا اثر ہوا۔ تجربہ یہ ہے کہ جب مخاطبین کی مصلحت کا لحاظ کر کے بیان کیا جائے گا تو اس کا ضرور اثر ہو گا۔ اس لئے میں ہمیشہ مخاطبین کی مصلحت و ضرورت کا لحاظ رکھتا ہوں اور خلاف ضرورت بیان نہیں کرتا اس لئے میں نے اس وقت یہ مضمون ''حقوق العباد'' کا اختیار کیا ہے کیونکہ میرے خیال میں اس مقام پر یہ سامعین کی مصلحت و ضرورت کا مضمون ہے۔ شاید کسی کو یہ خیال ہوا ہو گا کہ یہ تو پھیکا مضمون ہو گا تو صاحب بیان تو علاج ہے اور علاج دوا میں یہ نہیں دیکھا جاتا کہ یہ دوا پھیکی ہے یا میٹھی بلکہ ضرورت اور نفع کو دیکھا جاتا ہے اگر کوئی دوا پھیکی ہی ہو یا اس سے بڑھ کر کڑوی ہی ہو مگر ضرورت کے موافق ہو کہ اس سے زیادہ نافع کوئی دوا نہ ہو تو بتلایئے اس وقت اس کو ترجیح ہو گی یا اس میٹھی دوا کو جو نہ ضرورت کے موافق ہے نہ زیادہ نافع ہے اس لئے اس کو مت دیکھو کہ یہ مضمون پھیکا ہے یا جوشیلا بلکہ اس کو دیکھئے کہ یہ آپ کی ضرورت کا ہے بھی یا نہیں۔

درستی معاملات کی ضرورت

سو ضرورت کا اندازہ اس سے ہو گا کہ دیندار لوگ بھی عبادات میں تو فرائض و واجبات بلکہ مستحبات تک کا اہتمام کرتے ہیں۔ یعنی جو لوگ کام کرنے والے ہیں اگرچہ بعض ایسے بھی ہیں کہ سب ہی اعمال میں کوتاہی کرتے ہیں مگر جو کام کرنے والے ہیں وہ عبادات میں تو فرائض و واجبات کے لئے بھی کوشش کرتے ہیں، مستحبات کی بھی پابندی کرتے ہیں۔ درود شریف اور تسبیحات حتیٰ کہ دلائل الخیرات اور وظائف تک کا اہتمام کرتے ہیں اور گو یا دلائل وحزب برکت کی چیزیں ہیں اور ان میں ثواب بھی ہے مگر دلائل الخیرات اور حزب البحر وغیرہ یہ جتنے وظائف آج کل معمول بہا ہیں حدیث کے اوراد کے برابر ہرگز نہیں، غرض بعض لوگ ان زوائد کے پابند ہیں مگر حقوق العباد کا ان کو بھی خیال نہیں بس آج کل لوگوں نے محض نوافل اور تسبیحات پڑھنے کو دینداری سمجھ لیا ہے حالانکہ اصل دینداری معاملات سے معلوم ہوتی ہے چنانچہ سلف کے نزدیک دینداری کا معیار زیادہ تر معاملات ہی تھے۔ صرف نماز، روزہ کرتے ہوئے دیکھ کر کسی کے دیندار ہونے کا حکم نہ لگاتے تھے۔ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے دربار میں ایک مقدمہ پیش ہوا جس میں مدعی کے پاس دو گواہ تھے۔ ایک گواہ کی عدالت تو حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو معلوم تھی، دوسرے گواہ کی

عدالت کا انہیں علم نہ تھا تو آپ نے حاضرین سے دریافت فرمایا کہ اس گواہ کی عدالت کے متعلق تم میں سے کوئی گواہی دیتا ہے ایک شخص کھڑا ہوا اور اس نے کہا کہ میں اس کے عادل ہونے پر گواہی دیتا ہوں۔ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے پوچھا کہ تجھ کو اس کا عادل ہونا کیسے معلوم ہوا۔

هل جاورته ام صحبت معه في السفر الذي يسفر عن الحقيقة ام عقدت معه عقدا.

''کیا تو اس کے پڑوس میں کبھی رہا ہے یا سفر میں کبھی تیرا اور اس کا ساتھ ہوا ہے جس سے انسان کی مخفی حقیقت ظاہر ہوتی ہے یا تو نے اس کے ساتھ کوئی معاملہ بیع وشراء کیا ہے، اس نے کہا نہیں۔''

قال فلعلك رائيته خارجا من المسجد بعد الصلوٰة.

''فرمایا تو شاید تم نے اس کو نماز پڑھ کر مسجد سے نکلتا ہوا دیکھ لیا ہوگا، اس نے کہا جی ہاں''

فرمایا **فانت لا تعرف** (تم اس کو نہیں پہنچانتے)

محض اتنی بات سے کسی کا دیندار اور عادل ہونا نہیں ہوسکتا۔ تو دیکھئے حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے محض نماز اور تسبیحات کو دینداری کے لئے کافی نہیں سمجھا بلکہ اس کے ساتھ معاملات کی درستی کو بھی ضروری سمجھا۔ مگر آج کل ہم لوگوں نے اس کو دین سے بالکل خارج سمجھ رکھا ہے حالانکہ یہ دین کا ایسا جزو ہے کہ اس کے بدوں آدمی گواہی دینے کے قابل نہیں ہوتا۔ اس سے آپ کو اس مضمون کی ضرورت معلوم ہوگئی ہوگی کیونکہ جس بات سے اتنی غفلت ہو کہ باوجود ضرورت کے لوگ اس کو ضروری نہ سمجھتے ہوں وہ بہت زیادہ اہتمام کے قابل ہوگا۔ اس لئے غور سے اس مضمون کو سننا چاہیے گو اس میں لطف نہ آئے۔

تاکد حق کا سبب

وہ مضمون یہ ہے کہ ہم لوگوں نے ''حقوق العباد'' کو بالکل ہی پس پشت ڈال رکھا ہے اور اس مرض کا ایک سبب ہے۔ پہلے اس کو معلوم کر لینا چاہیے اور سبب کے علم سے ایک گونہ ان لوگوں کا عذر بھی معلوم ہو جائے گا جن کی میں شکایت کر رہا ہوں اور عذر کے بعد ان کا جرم بھی ہلکا ہو جائے گا۔ گو ان لوگوں کو اپنا عذر بھی معلوم نہیں مگر میں تبرعاً خود ان کا عذر بتلائے دیتا ہوں کیونکہ عذر کا جواب دے دینے سے پھر حجت تام ہو جاتی ہے اس لئے میں اتمام حجت کے لئے ان کا عذر بیان کر کے ان کا جواب دینا چاہتا ہوں۔ دوسرے سبب مرض کے جاننے سے مرض کا ازالہ بھی سہل ہو جائے گا کیونکہ

انما الاصلاح تبدیل المزاج (بے شک اصلاح مزاج بدل جاتا ہے)

اصلاح کا طریقہ یہی ہے کہ مریض کے مزاج کو بدل دیا جائے جس کی حقیقت یہ ہے کہ جو سبب ہے اس کے مرض کا اس کو زائل کر دیا جائے تو سنئے تاکد حق کے دو سبب ہوتے ہیں۔ کبھی تو عظمت حق کی وجہ سے حق کا تاکد ہوتا ہے اور کبھی حاجت کی وجہ سے عظمت حق کی وجہ سے حق کا موکد ہونا تو ایسا ہے جیسے باپ کسی کام کو کہے کہ یہ کر اور پڑوسی کہے کہ مت کر۔ یہاں عقلاً اور شرعاً باپ کی اطاعت واجب ہے کیونکہ اس کی عظمت پڑوسی کی عظمت سے زیادہ ہے اس لئے پڑوسی کی بات پر عمل نہ کیا جائے گا بلکہ باپ کی بات پر عمل کیا جائے گا خواہ اس کام میں باپ کا ذاتی نفع بھی نہ ہو۔ جیسے باپ کہے کہ میرا بدن دبا اور پڑوسی کہے کہ میرا بدن دبا، تو بتلایئے اس صورت میں پڑوسی کا حق زیادہ ہوتا یا باپ کا۔ سب عقلاء یہاں متفق ہیں کہ باپ کا حق زیادہ ہے اور حاجت کی وجہ سے تاکد کی مثال یہ ہے، جیسے ایک سائل آ کر آپ سے روپیہ مانگے کہ مجھے ایک روپیہ دیدو، میں برف کی قلفیاں کھاؤں گا (جیسا کہ بعض بھنگڑ رئیسوں سے ایسی فرمائش کیا کرتے ہیں اور وہ ان کو مجذوب سمجھ کر سب کچھ کھلاتے ہیں۔۱۲) اور ایک سائل آ کر یہ کہے کہ مجھے ایک روپیہ دیدو، میرے یہاں آٹھ دن کا فاقہ ہے، بچے بھوکے تڑپ رہے ہیں، بتلایئے اس صورت میں کس کا حق زیادہ ہے، آیا اس شخص کا جو برف کی قلفیاں کھانے کو مانگتا ہے، یا اس غریب کا جس کے یہاں آٹھ دن کا فاقہ ہے۔ یقیناً اس غریب فاقہ زدہ کا حق زیادہ ہے۔ ایسے ہی ایک رئیس کے یہاں شادی ہو جس میں سو روپیہ نیوتہ دینے کے لئے آپ لے جا رہے ہیں حالانکہ اس کو آپ کے سو روپیہ کی کچھ بھی ضرورت نہیں اور اس وقت ایک غریب آدمی پر جو شریف خاندان کا ہے کوئی مقدمہ قائم ہو گیا جس میں ضمانت نہ داخل کی گئی تو اس شریف آدمی کی آبرو جاتی رہے گی تو بتلایئے اس وقت نیوتہ میں امیر کو سو روپیہ دینا چاہیے جس کو اس کی کچھ بھی پرواہ نہیں یا اس غریب کی آبرو بچانی چاہیے تو جس کو حس ہوگا وہ سمجھے گا کہ اس صورت میں روپیہ دینے سے زیادہ ضروری اس غریب کی آبرو کو بچانا ہے۔ یہاں بھی حاجت کی وجہ سے حق کا تاکد ہو گیا۔ غرض آپ دنیا کے معاملات میں غور کر لیں تو معلوم ہوگا کہ تاکد حد کا سبب کبھی عظمت ہے، کبھی حاجت۔ مگر دین کے بارے میں اس قاعدہ پر کوئی بھی خیال نہیں کرتا۔ یہاں سب لوگوں نے تاکد حق کو صرف عظمت میں منحصر کر لیا ہے جس کی عظمت قلب میں ہے۔ اسی کے حقوق ادا کرتے ہیں، حاجت کو تاکد حق کا سبب نہیں سمجھتے اور اگر حاجت کی وجہ سے کسی کا حق ادا بھی کرتے ہیں تو وہ بھی جبکہ اپنے ملنے والوں میں کسی امیر کو حاجت پیش آ جاوے۔

امیر وغریب کا فرق

بھائی غریب کی حاجت تو کوئی چیز نہیں کیونکہ آج کل غریب ہونا بھی ایک جرم ہے۔ خصوصاً اس چودھویں صدی میں۔ چنانچہ ایک شخص کہتے تھے کہ آج کل غریبوں کی ایسی حقارت ہے کہ کسی امیر کی ریح صادر ہو جائے تو تبارک سلامت ہوتی ہے کہ صحت ہوئی اور غریب کی ریح صادر ہو تو کہا جاتا ہے کہ دماغ سڑا دیا اور اس سے بڑھ کر یہ کہ غریبوں کی روح کی بھی وہ قیمت نہیں جو امیروں کی ریح کی ہے۔ چنانچہ غریب کے مرنے کا لوگوں کو اتنا رنج نہیں ہوتا جتنا کسی امیر کی ریح بند ہو جانے کا ہوتا ہے۔

کسی شہر میں ایک بیگم صاحبہ نے اپنے محلّہ میں سے کسی کے رونے، چلانے کی آواز سنی تو ماما سے کہا دیکھنا کیا بات ہے۔ اس نے کہا محلہ میں فلاں غریب آدمی مر گیا ہے اس کے بیوی بچے رو رہے ہیں تو بیگم صاحبہ کہتی ہیں کہ ادئی میں تو سمجھی کہ کوئی آدمی بیمار ہو گیا ہے (یعنی کوئی رئیس) گویا ان کے نزدیک وہ غریب تو آدمی ہی نہ تھا۔ غرباء تو ان کے نزدیک گدھے ہی ہیں بلکہ دیکھا جاتا ہے کہ امیروں کے بیمار ہونے سے بھی رنج ہوتا ہے اور غریبوں کے مرنے کی بھی پروا نہیں۔ (یہی وجہ ہے کہ امیروں کو زکام بھی ہو جائے تو سو آدمی ان کی عیادت کو آتے ہیں اور کوئی غریب مر جاوے تو اس کی بیوی بچوں کی تعزیت کو بھی کوئی جاتا، الا قلیل) اور بعض لوگ تھوڑے سے غریبوں کی بھی کچھ ہمدردی کرتے ہیں، بشرطیکہ مسلمان ہو اور اگر مسلمان نہ ہو بلکہ ہندو ہو جیسے چمار، بھنگی اور اس کے حقوق تو سمجھتے ہی نہیں وہ تو گویا بہائم میں کہ جو چاہا انہیں کہہ دیا اور جس طرح چاہا مار پیٹ لیا۔

حقوق الخلق

صاحبو! اس وقت کیا ہوگا جبکہ یہ ثابت ہو جائے کہ بہائم کے بھی حقوق ہیں۔ میرا ارادہ ہوا تھا کہ اس وقت حقوق العباد کی بجائے حقوق الخلق بیان کروں جس میں تمام مخلوق کے حقوق کا بیان ہو جائے، کافروں کے بھی اور جانوروں کے بھی، مگر سارا قاعدہ بغدادی آج ہی کیونکر ختم کرا دوں! اس لئے میں حقوق بہائم کی تفصیل کرنا نہیں چاہتا مگر اجمالاً کہے دیتا ہوں کہ شریعت میں جانوروں کے بھی حقوق ہیں تو انسانوں کے حقوق کیوں نہ ہوں گے جن کو آپ جانور سمجھتے ہیں پس خوب سمجھ لو کہ غریب اگر کافر بھی ہو اس کے بھی حقوق ہیں کچھ ایسے ہی کوئی مسلمان فاسق و فاجر ہو تو اس کے بھی حقوق ہیں، گناہ کرنے سے یا کفر کرنے سے وہ وقف نہیں ہو گیا کہ آپ جو چاہیں اس کے ساتھ

معاملہ کریں۔ایک بزرگ نے کسی شخص کو حجاج بن یوسف کی غیبت کرتے ہوئے دیکھا تھا تو فرمایا کہ جس طرح حق تعالیٰ حجاج سے ان لوگوں کا بدلہ لے گا جن پر اس نے ظلم کیا تھا، ایسے ہی حجاج کا بدلہ ان لوگوں سے لے گا جنہوں نے اس کی غیبت وغیرہ کی ہوگی۔حجاج خدا کی نافرمانی کر کے سب کے لئے وقف نہیں ہو گیا کہ جو بھی چاہے اس کو برا بھلا کہے۔سبحان اللہ! ایسا کون سا قانون ہے جس میں باغیوں کے بھی حقوق ہیں، یہ خدا ہی کا قانون ہے، اس میں باغیوں تک کے حقوق ہیں۔چنانچہ بیٹے کو جائز نہیں کہ وہ جہاد میں اپنے کافر باپ کو قتل کرے، گو وہ خدا کا باغی ہے مگر خدا تعالیٰ نے بیٹے پر اس کا یہ حق رکھا، غرض ہم لوگوں نے تاکد حق کا سبب محض عظمت کو سمجھ لیا ہے اور یہ مرض دینداروں میں بھی ہے کہ وہ بھی اہل عظمت ہی کے حقوق کو زیادہ ادا کرتے ہیں۔میں نے ایک دفعہ دیوبند کے مدرسے میں طلبہ سے کہا تھا کہ تم لوگ اساتذہ کی عظمت نہیں کرتے نہ ان کے حقوق کی رعایت کرتے ہو۔پھر میں نے کہا شاید آپ اپنے دل میں کہتے ہوں کہ ہم تو حضرت مولانا محمود حسن صاحب قدس سرہ کی بہت عظمت کرتے ہیں اور ان کی خدمت بھی کرتے ہیں۔دل میں خیال کر لو کہ مولانا کی یہ عظمت وخدمت محض استاد ہونے کی وجہ سے ہے یا ان کی شہرت وعظمت کی وجہ سے ہے۔ظاہر ہے کہ محض حق استادی کی وجہ سے تم مولانا کی عظمت نہیں کرتے ورنہ اس کی کیا وجہ کہ اور استادوں کی عظمت ووقعت نہیں کی جاتی، آخر وہ بھی تو استاد ہیں۔معلوم ہوا کہ مولانا کی عظمت بوجہ شہرت کے کرتے ہو کہ وہ سب سے زیادہ بزرگی وغیرہ میں مشہور ہیں تو جب اہل علم میں بھی یہ مرض ہے کہ وہ مشاہیر اہل عظمت ہی کے حقوق ادا کرتے ہیں پھر دوسروں کا تو کیا کہنا۔

بالذات وبالعرض کا تفاوت

غرض اس غلطی میں قریب قریب سب ہی مبتلا ہیں کہ لوگوں نے تاکد حق کے مدار کو عظمت ہی میں منحصر سمجھ لیا ہے۔یہی وجہ ہے کہ حقوق اللہ کی تو کچھ رعایت کی بھی جاتی ہے اور حقوق العباد کی رعایت بالکل نہیں کی جاتی کیونکہ عظمت کے لحاظ سے بندہ خدا کے سامنے کچھ بھی نہیں۔حق تعالیٰ کی وہ عظمت ہے کہ اس کے سامنے بندہ "من حیث ھو" بندہ کچھ عظمت نہیں رکھتا، بندہ چاہے کیسا ہی عظیم ہو حق تعالیٰ کی عظمت کے سامنے اس کی عظمت مٹ جاتی ہے جیسے آفتاب کے سامنے چاند اور ستاروں کی روشنی مٹانے کے لئے وہ اب بھی کافی ہے۔

چو سلطان عزت علم برکشد　　جہاں سر بجیب عدم درکشد

(جب محبوب حقیقی کی تجلی قلب پر وارد ہوتی ہے سب چیزیں فنا ہو جاتی ہیں)

دیکھئے جگنو رات کو تو چمکتا ہے مگر دن کو نہیں چمکتا۔ کسی نے اس سے پوچھا کہ تو دن میں کہاں رہتا ہے تو نظر نہیں آتا۔ کہا میں تو دن میں اسی جگہ رہتا ہوں جہاں رات کو ہوتا ہوں مگر دن میں آفتاب کے سامنے چمک نہیں سکتا۔ شیخ سعدی اسی کو فرماتے ہیں۔

مگر دیدہ باشی کہ درباغ وراغ ۔۔۔ بتابد ہمی کرمکے چوں چراغ
کسے گفتش اے کرمک شب فروز ۔۔۔ چہ بودت کہ بیروں نیائی بروز
نہ بینی کہ آں کرمک پاک زاد ۔۔۔ جواب از سر روشنائی چہ داد
کہ من روز و شب جز بصحرا نیم ۔۔۔ ولے پیش خورشید پیدا نیم

(شاید تم نے دیکھا ہوگا کہ باغ وصحرا میں رات کے وقت جگنو مثل چراغ کے چمکتا ہے تو اس سے کسی نے پوچھا تو دن میں کیوں نہیں نکلتا، دیکھو اس خاک نما کیڑے نے کیسا بصیرت افروز جواب دیا کہ میں رات دن یہیں صحراء میں رہتا ہوں مگر آفتاب کے سامنے گم ہو جاتا ہوں)

اسی لیے حق تعالیٰ شانہ ارشاد فرماتے ہیں: فَاِنَّ الْعِزَّةَ لِلّٰهِ جَمِيْعًا کہ عزت وعظمت تمامھا حق تعالیٰ کے لئے ہے اس کی عظمت کے سامنے کسی کی کچھ عظمت نہیں۔ کسی کو یہ شبہ ہو کہ دوسری جگہ تو حق تعالیٰ یوں فرماتے ہیں کہ:

وَلِلّٰهِ الْعِزَّةُ وَلِرَسُوْلِهٖ وَلِلْمُؤْمِنِيْنَ

کہ عزت اللہ کے لئے ہے اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے اور مؤمنین کے لئے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے سوا دوسروں کے بھی عزت ہے اس کا جواب یہ ہے کہ پہلی آیت میں عزت بالذات کا ذکر ہے اور دوسری جگہ عام ہے۔ بالذات اور بالواسطہ رسول صلی اللہ علیہ وسلم اور مؤمنین کے لئے بھی ہے۔ غرض بالذات اور بالعرض کا فرق ہے۔ بالذات کے درجہ میں سوائے حق تعالیٰ کے کسی کے لئے بھی عظمت نہیں۔ انسان چاہے کتنا ہی بڑا عظیم ہو اسکی عزت بالذات نہیں بلکہ بالعرض ہے جو کہ عظمت الٰہی کے سامنے سلب ہو جاتی ہے۔ یہی تو وہی بات ہے جس کو مولانا شہید رحمۃ اللہ علیہ نے بیان کیا تھا جس پر آج اعتراض ہو رہے ہیں، انہوں نے بھی وہی کہا جو

فَاِنَّ الْعِزَّةَ لِلّٰهِ جَمِيْعًا سے مفہوم ہو رہا ہے۔ اتنا فرق ہے کہ حق تعالیٰ نے:

فَاِنَّ الْعِزَّةَ لِلّٰهِ جَمِيْعًا (بے شک عزت وعظمت تمامھا حق تعالیٰ کے لئے ہے)

عربی میں فرمایا اور مولانا شہید نے اس مضمون کو اردو میں کہہ دیا ہے۔ باقی بات ایک ہی ہے، زبان بدلنے سے حکم نہیں بدل جاتا، زبان تو وہ چیز ہے کہ حق تعالیٰ کے یہاں اس کا کچھ بھی اعتبار نہیں ان کی نظر تو حقیقت پر رہتی ہے اور یہی حال اہل اللہ کا ہے۔

بے زبان کا اثر

ہمارے حاجی صاحب قدس اللہ سرہ العزیز کے پاس ایک رومی شیخ آئے تھے۔ اس وقت حاجی صاحب مثنوی کا درس دے رہے تھے اور حاجی صاحب کی عادت تھی کہ تقریر اردو میں فرمایا کرتے تھے۔ گو حضرت کو فارسی پر بھی پوری قدرت تھی اور وہ شیخ فارسی سمجھ بھی لیتے مگر بے تکلف زبان اردو ہی تھی اس لئے اپنی ہی زبان میں تقریر فرمارہے تھے مگر بایں ہمہ وہ رومی درس سے محظوظ ہورہے تھے حالانکہ وہ اردو بالکل نہ سمجھے تھے۔ درس کے وقت کسی خادم نے حضرت سے عرض کیا کہا اگر یہ اردو سمجھتے تو انہیں کتنا لطف آتا جو بغیر سمجھے بھی اس قدر محظوظ ہورہے تھے۔ حاجی صاحب نے فرمایا میاں! ان مضامین کے لئے اس زبان کی قید نہیں وہاں تو کوئی دوسری ہی زبان ہے۔ پھر مولانا نے یہ شعر پڑھے۔

پارسی گو گوچہ تازی خوشتراست　　　عشق را خود صد زبان دیگراست

بوئے آں دلبر چو پراں می شود　　　ایں زبانہا جملہ حیراں می شود

(فارسی میں کہو اگرچہ عربی بہتر ہے، عشق کی خود سینکڑوں زبانیں دوسری ہیں، اس دیر کی بُو جب اڑتی ہے یہ تمام زبانیں حیران ہوتی ہیں)

بلکہ بعض اوقات بے زبانی میں وہ اثر ہوتا ہے جو زبان دانی میں نہیں ہوتا۔ میں نے ابھی وعظ سے پہلے مجمع عام میں کہا تھا کہ ریل کے سفر میں ایک ڈپٹی صاحب مجھ سے ملے اور بہت دیر تک باتیں ہوتی رہیں۔ میں اخلاق کے ساتھ کھل کر ان سے باتیں کررہا تھا کہ اتنے میں مغرب کی نماز کا وقت آگیا تو میں اور خواجہ صاحب اور چند رفقاء نماز کے اہتمام میں مشغول ہوگئے۔ وہ ڈپٹی صاحب نماز نہ پڑھتے تھے ویسے ہی اپنی جگہ بیٹھے رہے۔ خواجہ صاحب مجھ سے کہنے لگے کہ ان ڈپٹی صاحب کو نماز کے لئے کہنا چاہیے کیونکہ یہ آپ سے محبت ظاہر کرتے ہیں۔ آپ کا کہنا ان کو ناگوار بھی نہ ہوگا اور امید ہے کہ اثر بھی زیادہ ہوگا اور باوجود قدرت کے امر بالمعروف کو ترک کرنا شاید نامناسب ہو، میں نے کہا امر بالمعروف اس موقع پر واجب نہیں کیونکہ ان کو نماز کا فرق ہونا معلوم ہے اور یہ بھی دیکھ رہے ہیں کہ چند آدمی نماز کو اٹھے ہیں اب بھی اگر ان کو توفیق نہ ہو تو یہ

ان کی کوتاہی ہے۔ باقی میں تو زبان سے کچھ نہ کہوں گا کیونکہ میرے کہنے سے اگر انہوں نے نماز پڑھ بھی لی تو پڑھیں گے اپنے واسطے اور احسان ہوگا میری گردن پر سو مجھ کو تو اس سے غیرت آتی ہے کہ دین کے کام میں ان کا احسان اپنے سر لوں، اگر آپ کو امر بالمعروف کا ایسا ہی جوش ہے تو آپ خود کیوں نہیں کہتے؟ باقی اتنا میں کہے دیتا ہوں کہ اس وقت نماز کے لئے کہنے کا ان پر وہ اثر نہ ہوگا جو نہ کہنے کا اثر ہوگا۔ خیر خواجہ صاحب نے بھی ان سے کچھ نہ کہا اور میں نماز پڑھ کر پھر ان کے پاس آ بیٹھا اور جس بشاشت سے پہلے باتیں کر رہا تھا اسی بشاشت سے اب بھی کرنے لگا، میں نے ظاہری برتاؤ سے یہ بات بالکل ان پر ظاہر نہیں ہونے دی کہ مجھے آپ کے نماز نہ پڑھنے سے انقباض ہوا یا آپ کی حقارت میرے دل میں ہے ہرگز نہیں اس کے بعد دوسری نماز کا وقت آیا اور ہم اسی طرح نماز کو اٹھے اور بعد نماز کے میں پھر انہی ڈپٹی صاحب کے پاس آ بیٹھا اور اسی نشاط سے پھر باتیں کرنے لگا۔ اس کا ان کے دل پر بے حد اثر ہوا اور وہ شب نماز کے سخت پابند ہو گئے اور ایک صاحب سے کہتے تھے کہ صاحب ریل کے سفر میں جب مولانا نماز کو اٹھے تو مجھے یہ معلوم ہوتا تھا کہ گویا میرے سر پر جوتیاں پڑ رہی ہیں اور غضب یہ کہ مولانا نے مجھ سے ایک دفعہ بھی زبان سے یہ نہ فرمایا کہ آؤ تم بھی نماز پڑھ لو (اگر یہ فرما دیتے تو میں کچھ عذر ہی کر دیتا جس سے شرمندگی کم ہو جاتی ۱۲) اور اس وقت میں خیال کر رہا تھا کہ شاید اب نماز پڑھ کر جو مولانا آئیں گے تو نہ میرے پاس بیٹھیں گے نہ مجھ سے بات کریں گے مگر جب وہ نماز سے فارغ ہو کر بدستور میرے پاس آ بیٹھے اور اسی بشاشت سے گفتگو کرنے لگے جیسے پہلے کر رہے تھے تو واللہ اس ادا نے تو مجھے ذبح کر ڈالا۔ بھائی اس روز سے میں نماز کا پورا پابند ہو گیا ہوں۔

راوی نے جب ان کا یہ قول مجھ سے نقل کیا تو میں نے لوگوں سے کہا۔ بتلاؤ اس وقت امر بالمعروف کا زیادہ اثر ہوتا یا خاموش رہنے کا زیادہ اثر ہوا۔ امر بالمعروف سے اتنا ہو جاتا کہ وہ صرف اس وقت نماز پڑھ لیتے مگر یہ جو اثر ہوا کہ وہ شرمندگی سے ذبح ہو گئے اور عمر بھر کے لئے نمازی بن گئے، یہ بے زبانی ہی کا اثر تھا۔ تو دیکھئے اس وقت ان کو کچھ نہ کہنے کا اثر وہ ہوا جو کہنے سے نہ ہوتا۔ یہاں بے زبانی سے زیادہ اثر ہوا اور واقعی گو میں نے ان کو زبان سے نماز کے لئے نہ کہا تھا مگر دل میں یہی نیت تھی کہ ان شاء اللہ میرے سکوت سے ان پر زیادہ اثر ہوگا۔ (چنانچہ ایسا ہی ہوا واقعی حکیم ہر کام کا موقع خوب سمجھتا ہے، سیاست اسی کا نام ہے کہ ہر شخص کی تربیت اس کے مناسب طریق سے کی جائے اور یہ بات حضرت اقدس میں باکمل وجوہ بحمد اللہ نمایاں ہے۔ ۱۲ جامع)

غرض کبھی بے زبانی بھی زبان سے زیادہ کام دیتی ہے۔اس سے معلوم ہوا کہ زبان پر اثر کا مدار نہیں پس محض زبان کے بدلنے سے دوسرا اثر لے لینا عجیب بات ہے، جو لوگوں کی کم فہمی پر دال ہے۔

ہمارے ملنے والوں میں ایک بزرگ تھے۔امیر شاہ خان صاحب وہ پرانے بزرگوں کے دیکھنے والے تھے، تحریکات حاضرہ میں ان کی رائے وہی تھی جو میری رائے ہے۔ان کا قیام مینڈھوں میں رہتا تھا جہاں کچھ دنوں سے مولوی حبیب احمد صاحب کیرانوی بھی مدرس ہو کر پہنچ گئے۔ان کی رائے بھی تحریک حاضرہ میں میرے موافق ہے۔(بلکہ وہ ہم سے بھی زیادہ پختہ ہیں ۱۲ جامع) مگر لوگوں کی یہ حالت تھی کہ مولوی حبیب احمد صاحب کی باتوں پر اعتراض کرتے تھے اور امیر شاہ خان صاحب سے خوش تھے۔ایک دفعہ امیر شاہ خان صاحب نے مجھے لکھا کہ میرا مسلک بھی وہی ہے جو مولوی حبیب احمد صاحب کا ہے جو وہ کہتے ہیں میں وہی کہتا ہوں مگر اتنا فرق ہے کہ وہ اردو میں کہتے ہیں اور میں فارسی میں کہتا ہوں اس لئے لوگ میری باتوں سے متوحش نہیں ہوتے اور ان پر اعتراض وطعن کرتے اور برا بھلا کہتے ہیں۔تو حقیقت میں یہ عوام کی کم فہمی ہے ورنہ خدا تعالیٰ کے یہاں زبان کی کچھ قید نہیں اس لئے زبان کے بدلنے سے شرعاً حکم نہیں بدلتا۔ چنانچہ مولانا شہید بھی حقیقت میں وہی کہتے تھے جو حق تعالیٰ نے فرمایا: فَاِنَّ الْعِزَّةَ لِلّٰهِ جَمِيعًا (بیشک عزت وعظمت تمام کی تمام حق سبحانہ وتعالیٰ کیلئے ہے) میں فرمایا ہے مگر انہوں نے اس کو اردو میں کہہ دیا۔(۱)

(۱)۔میں کہتا ہوں کہ حفظ الایمان کی عبارت دوبارہ مسئلہ علم غیب پر جو اہل بدعت نے شور مچایا ہے اس کی بھی یہی اصل ہے کہ مضمون حفظ الایمان کا وہی ہے جو شرح مقاصد وشرح مواقف وغیرہ میں سلف نے بیان فرمایا ہے بلکہ ان کے الفاظ سے حفظ الایمان کے الفاظ بہت کم ہیں مگر سلف نے عربی میں کہا تھا اس لئے ان پر کچھ اعتراض نہ ہوا اور حفظ الایمان میں وہی مسئلہ اردو میں ظاہر کیا گیا تو شور وشغب ہونے لگا۔اسی طرح بہشتی زیور کا مسئلہ نسب کتب فقہ میں مصرح ہے۔عالمگیری اور درمختار ملاحظہ ہو مگر ان پر کوئی اعتراض نہیں کرتا کیونکہ انہوں نے عربی میں لکھا ہے اور بہشتی زیور پر بعض علماء کا الجھلا نے خواہ مخواہ زبان طعن دراز کی ہے خدا ان کو ہدایت دے۔۱۲ جامع)

اس سے لوگ متوحش ہونے لگے اور بیچاروں پر فتوے لگانے لگے۔بہر حال چونکہ حق تعالیٰ کی عظمت کے سامنے بندہ کی عظمت کچھ بھی نہیں اس لئے لوگوں کو حقوق العباد کا اہتمام نہیں کہ وہ صاحب عظمت نہیں۔

حقوق العباد کی فوقیت

مگر میں نے بتلادیا ہے کہ تاکد حق کا سبب صرف عظمت میں منحصر نہیں بلکہ حاجت بھی تاکد حق کا ایک سبب ہے۔ پس حقوق اللہ کا تاکد تو عظمت کی وجہ سے ہے اور حقوق العباد کا تاکد حاجت کی وجہ سے ہے۔ فقہاء نے اس کو سمجھا ہے اور واقعی فقہاء حکمائے امت ہیں۔ اسی طرح صوفیاء بھی اور فقہ کی تعریف تصوف کو بھی شامل ہے۔ سلف میں فقہ احکام ظاہرہ کے علم کا نام نہ تھا بلکہ مجموعہ احکام ظاہرہ و باطنہ کے علم کو فقہ کہتے ہیں۔ چنانچہ امام صاحب نے فقہ کی تعریف یوں فرمائی ہے۔

معرفة النفس مالها وما عليها (نفس کا پہچاننا نفع ونقصان کے کاموں میں)

جس میں تصوف بھی داخل ہے تو فقہاء جا بجا فرماتے ہیں

حق العبد مقدم علی حق اللہ۔

کہ بندہ کا حق اللہ تعالیٰ کے حق پر مقدم ہے۔ ان کا یہ مطلب نہیں کہ (نعوذ باللہ) عظمت کی وجہ سے ایسا ہے بلکہ احتیاج کی وجہ سے حق العبد کو حق اللہ پر مقدم کہا گیا ہے کیونکہ بندہ محتاج ہے اور حق تعالیٰ احتیاج سے بری ہیں۔ مگر فقہاء کا یہ جملہ ظاہر میں ایسا وحشت ناک ہے کہ اگر کوئی صوفی ایسا کہہ دیتا تو کفر کے فتوے لگ جاتے مگر فقہاء بے دھڑک فرماتے ہیں کہ حق العبد حق اللہ پر مقدم ہے کیونکہ وہ منتظم ہے، ان کو حقوق کا انتظام کرنا ہے اور واقعی حقوق العباد کا اہتمام بدوں اس طرح صاف صاف کہے بغیر نہیں ہوسکتا تھا مگر ان پر کوئی فتویٰ نہیں لگاتا، لوگ ان کو قانونی سمجھتے ہیں۔ اس لئے ان سے ڈرتے ہیں، جانتے ہیں کہ اگر ان پر اعتراض کیا گیا تو جھاڑ کی طرح پیچھے لگ جائیں گے اور ایک مسئلہ کے ثابت کرنے کو رسالے کے رسالے تصنیف کر دیں گے اور صوفیاء بیچارے غریب ہیں کسی سے بحث مباحثہ نہیں کرتے اس لئے ان کو سب دباتے ہیں اور ان کی بات بات پر فتوے لگائے جاتے ہیں وہ تو ایسے غریب ہیں کہ کوئی ان کو غریب کہہ بھی دے تب بھی برا نہیں مانتے اور ذرا اہل ظاہر کو تو غریب کہہ دو دیکھو کیسے چڑتے ہیں۔ اس پر مجھے ایک حکایت یاد آئی کہ ایک نواب نے کسی مصلحت سے ایک گنوار کو مجسٹریٹ بنا دیا تھا۔ وہ مقدمات کا فیصلہ کرنے لگا۔ ایک دفعہ کسی نے عرضی پیش کی کہ اس میں لکھا تھا کہ غریب پرور سلامت! تو آپ بہت برہم ہوئے اور کہا نواب صاحب تو ہم کو مسفق (بسین مہملہ) مہربان کہتے ہیں اور یہ نالائق ہم کو گریب (غریب ۱۲)

لکھتا ہے۔ اچھا پانچ روپے جرمانہ، اس اُلو کی سمجھ میں غریب ہی آیا۔ پرور کو وہ سمجھا ہی نہیں اور شاید یہ خیال کیا ہو کہ پرور بھی کوئی تحقیر کا لفظ ہے جبھی تو غریب کے ساتھ ملایا گیا ہے۔ غرض آج کل غریب کہنے سے بھی لوگ چڑتے ہیں۔ مگر صوفیاء اس سے بھی برا نہیں مانتے۔ بلکہ کوئی انہیں جاہل بھی کہہ دے جب بھی برا نہیں مانتے۔ کیمیا گر کو اگر کوئی یوں کہہ دے کہ اسے کیمیا نہیں آتی ویسے ہی جھوٹ موٹ کیمیا گر بنا ہوا ہے تو وہ کبھی ناخوش نہ ہوگا بلکہ خوش ہوگا کہ اچھا ہے لوگ یوں ہی سمجھتے ہیں تاکہ میں پولیس کی دست برد سے بچا رہوں۔ اسی طرح کسی صوفی کو کوئی جاہل کہہ دے تو وہ خوش ہوتے ہیں کہ اچھا ہوا میں رجوع خلائق سے بچا ورنہ لوگ ہجوم کر کے خلوت مع المحبوب سے روک دیتے اور کبھی ان کو جواب کا جوش بھی ہوتا ہے تو اندر سے کوئی یوں کہتا ہے۔

بامدعی مگوئید اسرار عشق مستی　　بگزار تا بمیرد در رنج خود پرستی

(مدعی کے سامنے عشق و مستی کے اسرار مت بیان کرو اس کو خود پرستی اور تکبر میں مرنے دو)

غرض صوفیاء حق العبد کو حق اللہ پر مقدم کہہ دیتے تو ان پر فتویٰ لگ جاتا مگر فقہاء کو کوئی کچھ نہیں کہتا وہ صاف کہتے ہیں کہ "حق العبد مقدم علی حق اللہ" اور منشاء اس کا صرف یہی ہے کہ بندہ محتاج ہے مگر اس کا یہ مطلب نہیں کہ آج سے حقوق اللہ کو ترک کر کے حقوق العبد ہی کو لے لو بلکہ مطلب یہ ہے کہ جہاں دونوں میں تعارض ہو وہاں حق العبد مقدم ہے اور یہ بھی شریعت کا حکم اور حق اللہ ہی ہے اور جہاں تعارض نہ ہو وہاں ہر ایک کو اپنے اپنے موقع پر ادا کرنا چاہیے۔ دیکھو اگر باپ بیٹے سے یوں کہے کہ کھانا کھالے اور ماں کہے کہ پانی پی لے تو اس وقت ان دونوں باتوں پر عمل کیا جائے گا کیونکہ دونوں میں تعارض کچھ نہیں دونوں کا جمع ممکن ہے اور اگر باپ کہے کہ پہلے نمکین کھاؤ اور ماں کہے کہ پہلے میٹھا کھاؤ تو یہاں البتہ سوال ہوگا کہ دونوں میں سے کس کا حق ادا کیا جائے۔ غرض مقدم و مؤخر کو وہیں دیکھا جاتا ہے جہاں تعارض ہو اور عدم تعارض کے وقت دونوں کو اختیار کیا جاتا ہے۔ بس اب بتلاؤ کہ کیا نماز پڑھنے اور قرض ادا کرنے میں کیا تعارض ہے، کچھ بھی نہیں پس دونوں کو بجالاؤ نماز بھی پڑھو اور قرض بھی دو۔ تعارض کی صورت یہی ہے کہ مثلاً ایک شخص کے پاس سو روپے ہیں جن پر سال بھی گزر گیا ہے تو قاعدہ ہے اس میں دو روپے آٹھ آنے زکوٰۃ کے واجب ہونے چاہئیں مگر اس شخص پر کسی کا دین بھی ہے تو اس وقت حق تعالیٰ فرماتے ہیں کہ اگر تم پر کسی کا دین بھی ہے تو پہلے بندہ کا حق ادا کرو۔ زکوٰۃ ساقط ہے یہاں فقہاء فرماتے ہیں کہ حق العبد حق اللہ پر مقدم ہے۔

حق النفس

یہ بھی حقیقت میں حق اللہ ہی ہے کیونکہ بندوں کے حقوق ادا کرنا حق تعالیٰ ہی کے حکم کی وجہ سے تو لازم ہے۔ حق تعالیٰ نے خود حکم دیا ہے کہ بندوں کے حقوق ادا کرو، اس بناء پر یوں کہنا چاہیے کہ اس وقت ایک حق اللہ دوسرے حق اللہ پر مقدم ہو گیا اس لئے حق اللہ و حق العبد میں تعارض بھی نہیں۔ مگر چونکہ ظاہر میں وہ حق العبد معلوم ہوتا ہے اس لئے یہ کہا جاتا ہے کہ حق العبد حق اللہ پر مقدم ہے مگر یہ محض ظاہری تقدیم ہے اور ایک حقیقت کی بناء پر یہ ظاہری تقدیم بھی رفع ہو جاتی ہے اور وہ حقیقت حق تعالیٰ نے میرے قلب پر وارد فرمائی ہے۔ میں نے منقول کہیں نہیں دیکھا۔ وہ یہ کہ حق اللہ سے مراد حق النفس ہے کیونکہ جن امور کو حق اللہ کہا جاتا ہے وہ طاعات و عبادات ہیں اور ظاہر ہے کہ بندہ کے افعال سے حق تعالیٰ کا نہ کوئی نفع ہے نہ کوئی ضرر بلکہ نفع یا ضرر جو کچھ ہے بندہ ہی کا ہے تو یقیناً حق اللہ میں جو اضافت ہے یہ اضافت نفع یا ضرر کی نہیں ہو سکتی کہ حق العبد میں اضافت نفع یا ضرر کے لئے ہے کہ وہ ایسا حق ہے جس کا ادا کرنا بندہ کو نافع اور تلف کرنا بندہ کو مضر ہے۔ اس طرح یہاں نہیں کہہ سکتے کہ یہ طاعات و عبادات ایسے حق اللہ ہیں کہ ان کا ادا کرنا بندہ کو نافع اور تلف کرنا بندہ کو مضر ہے۔ اس طرح یہاں نہیں کہہ سکتے کہ یہ طاعات و عبادات ایسے حق اللہ ہیں کہ ان کا ادکرنا خدا کو نافع اور تلف کرنا ان کو مضر ہے۔ (نعوذ باللہ) پس میرے نزدیک حق اللہ سے مراد حق النفس ہے اور حق العبد سے مراد حق الغیر ہے اس تقریر پر دونوں جگہ اضافت یکساں ہو گی۔ یعنی ہر جگہ اضافت نفع و ضرر ہے پس حق اللہ یعنی حق النفس تو وہ ہے جس کا ادا کرنا اپنے آپ کو نافع اور ضائع کرنا اپنے آپ کو مضر ہے اور حق العبد یعنی حق الغیر وہ ہے جس کا ادا کرنا دوسروں کو نافع اور تلف کرنا دوسروں کو مضر ہے۔

پس اس تفسیر پر حق اللہ و حق العبد میں کہیں تعارض نہیں ہوا اور جو اشکال حق العبد کو حق اللہ پر مقدم کرنے میں ہوتا تھا وہ بھی نہ رہا کیونکہ اس تفسیر پر جس کو حق اللہ کہا جاتا ہے وہ حقیقت میں حق النفس ہے پس جہاں حق اللہ پر حق العبد کو مقدم کیا جاتا ہے وہاں در حقیقت حق الغیر کو حق النفس پر مقدم کیا گیا ہے اور اس میں کچھ بھی اشکال نہیں بلکہ یہ تو ایثار ہے جس کا ذکر اس آیت میں ہے۔

وَ يُؤْثِرُوْنَ عَلٰى اَنْفُسِهِمْ وَلَوْ كَانَ بِهِمْ خَصَاصَةٌ

(وہ اپنے نفسوں پر دوسروں کو ترجیح دیتے ہیں اگرچہ خود بھوکے رہیں)

ایثار کے آثار

اس میں حق تعالیٰ نے بعض صحابہ رضی اللہ عنہم کی (یعنی حضرت ابوطلحہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی) مدح فرمائی ہے کہ اپنے نفسوں پر دوسروں کو ترجیح دیتے ہیں اگر چہ خود بھوکے رہیں ان کا قصہ ہوا تھا کہ ایک بار یہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے مہمانوں کو اپنے گھر لے آئے تھے اور انہوں نے اپنی بیوی سے کہا کہ یہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے مہمان ہیں، ان سے کوئی چیز بچانا نہیں۔ انہوں نے کہا ہمارے گھر تو آج اتنا ہی کھانا ہے جو صرف بچوں کو کافی ہوسکتا ہے تو حضرت ابوطلحہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا کہ پھر بچوں کو بہلا پھسلا کر سلا دینا اور ہم دونوں بھی کھائیں گے نہیں جو کچھ کھانا تیار ہے سب مہمانوں کے سامنے رکھ دینا مگر وہ مہمان ایسے ہیں کہ بدوں ہمارے کچھ کھائیں گے نہیں تو تم یہ کام کرنا کہ جس وقت مہمان گھر میں آئیں اسی وقت چراغ گل کر دینا، پھر میں کہہ دوں گا کہ چراغ گل ہوگیا ہے اور روشن کرنے کا سامان اس وقت دشوار ہے (کیونکہ اس زمانہ میں دیا سلائی کہاں تھی چقماق وغیرہ سے کام کرتے تھے ۱۲) اس لئے اندھیرے ہی میں کھانا کھا لیجئے ہم بھی ان کو دکھلانے کے لئے ساتھ بیٹھ جائیں گے اور منہ چلاتے رہیں گے تاکہ وہ سمجھیں کہ یہ بھی کھا رہے ہیں۔ چنانچہ ایسا ہی کیا کہ دونوں میاں بیوی خود بھوکے رہے اور مہمانوں کو کھلا دیا۔ یہ ایثار ہے جس پر حق تعالیٰ نے ان کی مدح فرمائی۔ صوفیاء کو اس کا بہت اہتمام رہتا ہے، وہ ہمیشہ اس کا خیال رکھتے ہیں کہ اپنے نفس پر دوسروں کو مقدم کریں اور اپنے متعلقین کو بھی اس کی تعلیم دیتے ہیں مگر اس واقعہ مذکورہ پر ایک اشکال ہے۔ میں اس کو بھی رفع کیے دیتا ہوں ان علماء وطلباء کی بڑی مشکل ہے ان کو ہر جگہ شبہے پڑتے ہیں اور ہمیں صوفیاء کی بھی رعایت کرنی پڑتی ہے کیونکہ ہم ان کو بھی مجتہد وفقیہ سمجھتے ہیں اس لئے اس کا بھی خیال رہتا ہے کہ ان کا فعل خلاف شرع نہ ہو چنانچہ ایثار کرنا صوفیاء کا طرز ہے اور اس لئے وہ اس آیت سے استدلال کرتے تھے، اس پر یہ اشکال آتا ہے کہ ان صحابیؓ نے (جن کا واقعہ شان نزول میں مذکور ہوا ہے) مہمانوں کو اپنے نفس پر اور بچوں پر جو مقدم کیا تو یہ جائز کہاں تھا کیونکہ اپنے نفس کے بھی تو کچھ حقوق ہیں۔

ان لنفسک علیک حقا. (المسند الامام احمد ۶: ۲۶۸)

(تیرے نفس کا بھی تجھ پر حق ہے)

اس کا جواب علماء اہل ظاہری نے بہت اچھا دیا ہے کہ ان کو اس وجہ کی بھوک نہ تھی جیسی مہمانوں

کوتھی (یعنی انہوں نے اپنے نفس کے حق کو ضائع نہیں کیا بلکہ یوں کہو کہ اپنے کو زیادہ راحت نہیں دی کہ اس میں کچھ اشکال نہیں کہ دوسروں کی کلفت رفع کرنے کو اپنی راحت میں کچھ کمی کردی جائے ۱۲) اب یہ شبہ رہا کہ بچوں پر مہمانوں کو کیسے مقدم کیا۔ ان کی تو اجازت بھی معتبر نہ تھی۔ اس کا جواب دیا گیا کہ بچوں کو بھوک نہ تھی وہ تمہارے بچوں کی طرح نہ تھے جن کا پیٹ بھرتا ہی نہیں اور اس بات کو ماں باپ خوب سمجھ سکتے ہیں کہ اس وقت بچہ کو بھوک ہے یا محض کھانا دیکھ کر حرص کرنے لگے ہیں تو حضرت ابوطلحہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو قرائن سے معلوم ہوگیا ہوگا کہ بچوں کو بھوک نہیں ہے۔ وقت پر اچھی طرح کھا چکے ہیں اور رات کو نہ کھانے سے انہیں کلفت نہ ہوگی اس لئے بہلا پھسلا کر سلوا دیا۔ اب اگر یہ سوال ہو کہ اس پر کیا دلیل ہے کہ حضرت ابوطلحہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے نزدیک بچے بھوکے نہ تھے محض حرص ہی کا درجہ باقی تھا۔ اس کا جواب یہ ہے کہ معقول پڑھ کر آؤ تو معلوم ہوگا، دلیل مستدل کے ذمہ ہے یا مانع کے ظاہر ہے کہ مانع کے ذمہ دلیل نہیں بلکہ منع کے لئے ابداء احتمال کافی ہے، اب مستدل کا فرض یہ ہے کہ اگر اس کو یہ احتمال تسلیم نہ ہو تو دلیل سے اس کو باطل کرے۔ غرض فقہاء نے جو یہ فرمایا ہے کہ

حق العبد مقدم علی حق اللہ (حق العبد حق اللہ پر مقدم ہے)

درحقیقت اس میں ایثار کی تعلیم ہے اور مطلب یہ ہے کہ اپنے نفس کے حقوق پر غیروں کے حقوق کو مقدم کرنا چاہیے۔ فقہاء اس کو اس عنوان سے تعبیر فرماتے ہیں صوفیاء اس کو ایثار سے تعبیر کرتے ہیں۔ حاصل دونوں کا ایک ہی ہے۔

ایثار کی حقیقت

اتنا فرق ہے کہ فقہاء نے صرف معاملات میں اس کا اہتمام کیا ہے اور صوفیاء نے ہر امر میں اس کی سعی کی ہے۔ حتیٰ کہ عبادات میں بھی فرائض و واجبات کے اندر تو نہیں مگر مستحبات و فضائل میں وہ ایثار کرتے ہیں۔ چنانچہ اگر کبھی کوئی صوفی صف اول میں کھڑا ہو جائے اس کے بعد کوئی بزرگ آ جائیں استاد یا شیخ تو وہ پیچھے ہٹ کر اپنے بزرگ کو صف اول میں جگہ دے دیتے ہیں۔ اسی طرح یہ حضرات خاص حالات میں صف اول میں دائیں جانب کھڑا ہونے کا زیادہ اہتمام نہیں کرتے بلکہ بائیں جانب کا زیادہ اہتمام کرتے ہیں اور عام عادت یہ ہے کہ لوگ صف لوگ میں دائیں طرف کا بہت اہتمام کرتے ہیں حتیٰ کہ بائیں طرف بہت ہی کم لوگ ہوتے ہیں اور اس کو افضل سمجھتے ہیں

حالانکہ یہ غلط ہے پس سب سے افضل تو وہ شخص ہے جو امام کے پیچھے ہے اس کے بعد وہ افضل ہے جو اس کے دائیں طرف ہو پھر وہ جو اس کے بائیں طرف ہو اسی طرح جب اس کے بعد ایک آدمی دائیں طرف اور آ جائے تو اب دوسرے کو بائیں طرف کھڑا ہونا چاہیے اس وقت اس کا بائیں طرف کھڑے ہونا دائیں طرف کھڑے ہونے سے افضل ہے کیونکہ اس صورت میں بائیں طرف ہو کر یہ امام کے زیادہ قریب ہوگا اور دائیں طرف کھڑے ہونے سے بعد ہو جائے گا۔ غرض بائیں طرف کھڑا ہونے سے اگر امام کے اور اس کے درمیان میں چار آدمی کا واسطہ ہو اور دائیں طرف ہونے سے پانچ کا واسطہ ہو تو اس وقت بائیں طرف کھڑا ہونا افضل ہوگا وعلی ہذا القیاس پس صف کو اس طرح بھرنا چاہیے کہ ایک آدمی امام کے بالکل پیچھے ہو پھر ایک اس کے دائیں اور پھر ایک اس کے بائیں کھڑا ہوتا چلا جائے مگر عوام یہ سمجھتے ہیں کہ پہلے دائیں جانب کو بھرنا چاہیے۔ جب اس طرف جگہ نہ رہے پھر بائیں طرف آنا چاہیے یہ غلط ہے بلکہ دونوں طرف برابر آدمی ہونے چاہئیں مگر صوفیاء کو دیکھا جاتا ہے کہ وہ خاص حالات میں زیادہ کوشش بائیں

قلت قال العلامة الشعرانی العهود المحمديه اخذ علينا العهد العام من رسول الله صلی الله عليه وسلم اينا ميسرة المسجد قد عطلت من صلوٰة الناس فيها ان كرمها بالصلوٰة فيها جبرالها قال وقدروى ابن ماجه وغيره عن ابن عمر قال قيل للنبی صلی الله عليه وسلم ان ميسرة المسجد قد تعطلت فقال النبی صلی الله عليه وسلم من عمر ميسرة المسجد كتب الله له كفلين من الاجر وفی روايته للطبرانی مرفوعا من عمر جانب المسجد الايسر لقلة اهله اجر ان قلت وهذا هو السر فی اهتمام الصوفيه بالجانب الايسری تعلته رغبته الناس فيه وامام اهتمامهم بالصف الموخرمع كونه خلا فاللحديث خير صفوف الرجال اولها وشرهيها اخرها فالسر فيه ماقاله الشعرانی ايضا اخذ علينا العهد العام من رسول الله صلی الله عليه وسلم اذا صفت سرائرنا من جميع مايسخط الله عزوجل بحثيت لم يبق فی سرائرنا وظواهرنا الا ما يرضی ربنا ان نواظب علی الصلوٰة فی الصف الاول عملا بقوله صلی الله عليه وسلم ليلينی منكم اولو الاحلام والهنی ای العقل ولا يكون العبد عاقلا الا اذا كان لهذا الوصف الذی ذكرنا فمن كان فی ظاهره اوباطنه صفته يكرمها الله تعالٰی فليس يعاقل كامل (ای وليس اهلا للقرب من الامام ايضا بدلالة

الحدیث ۱۲) ولا یتقدم للصف الاول بین یدی اللہ فی مواکب الالھیئة الا انبیاء والملائکته ومن کان علی اخلاقھم واما من تخلف عن اخلاقھم فیقف فی اخرایات الناس خیراله ٥ (۳۵) قال فاما حدیث خیر صفوف الرجال اولھا فالمر ادبالرجال الکمل ٥. (۳٦) ای الکاملون فی الاحلام والنھی کیلا تتضاد اثار فان حدیث لیلنی منکم اولو الاحلام والنھی کما یفید طلب اللنومن ھؤلاء یفید طلب التاخر عمن لیس علی منزلتھم ایضا اویقال خیر صفوف الرجال اولھا خبر بمعنی انشاء ای لیجعل الامام خیر الرجال فی الصف الاول واللہ اعلم فاذا رای احد غیرہ افضل منه فتاخر له من الصف الاول وقدمه فقد عمل بقوله صلی اللہ علیه وسلم لیلنی اولو الاحلام والنھی فای یوم علیه اذا قدم من کان احق بالصف الاول منه فافھم ولا تعجل بالانکار علی القوم فتندم ۱۲ جامع.)

طرف کھڑا ہونے کی کرتے ہیں اور دائیں طرف کیلئے دوسروں کو اپنے اوپر ترجیح دیتے ہیں۔

اسی طرح صف اول پر بھی مزاحمت نہیں کرتے بلکہ خاص حالات میں دوسروں کو صف اول میں جگہ دے دیتے ہیں اور خود صف ثانی میں کھڑے ہوجاتے ہیں یا ثالث اور جنازہ کی نماز میں بھی وہ ایسا ہی کرتے ہیں کہ اکثر پچھلی صف میں کھڑے ہوتے ہیں اس کی ایک وجہ تو منقول ہے وہ یہ ہے کہ صف آخر میں کھڑا ہونے والا مکمل صفوف زوائد ہے اور حدیث میں ہے کہ جس میت پر مسلمانوں کی تین صفیں نماز کی ہوجائیں اس کی مغفرت ہوجاتی ہے تو صف ثالث میں کھڑا ہونے والا علت تامہ کا جز واخیر ہے جو بسبب مغفرت ہے اور ایک وجہ میرے قلب میں آئی ہے وہ یہ کہ صف اول والے بلاواسطہ میت کے لئے دعا کرتے ہیں اور صف اخیر والا اگلی صف کے مسلمانوں کو بھی واسطہ بناتا ہے اور سب کے واسطے دعا کرتا ہے اس لئے صوفیہ پیچھے کھڑے ہوتے ہیں تاکہ اگلوں کو واسطہ بنا کر دعا کریں۔ خیر جماعت جنازہ کا ذکر تو تبعاً تھا میں یہ کہہ رہا تھا کہ صوفیاء جماعت صلوٰۃ مفروضہ بھی صف اول میں ایثار کرتے ہیں۔ اگر کوئی ان کا بزرگ آجائے تو اس کو مقدم کردیتے ہیں اس پر فقہاء خشک اعتراض کرتے ہیں کہ تم نے صف اول کے ثواب کو چھوڑ دیا جس میں استغناء عن الثواب ہے۔ صوفیاء کہتے ہیں کہ ایک ثواب تو صف اول میں کھڑے ہونے کا اور دوسرا ثواب تعظیم اہل اللہ کا جو اس سے بھی بڑھا ہوا ہے تو ہم ظاہر میں گو ایک ثواب کے تارک ہوئے مگر باطن میں دوسرے بڑے ثواب کے جامع ہوئے۔ تو استغناء عن الثواب کہاں ہوا اس میں بھی تو طلب ثواب ہی ہے پھر شرعی قاعدہ ہے۔

قلت وقد علمت مما ذكرنا سابقا ان فی ذالک عملا بقوله صلی الله علیه وسلم لیلنی منکم اولو الاحلام والنهی رواه مسلم فی صحیحه وقال فی ردالمختار حاشیة الاشباه للحموی عن المضمرات عن النصاب وان سبق احدالی الصف الاول فدخل رجل اکبر منه سنا او اهل علم ینبغی ان یتاخره ویقدمه تعظیما له فهذا یفید جواز الایثار بالقرب بلا کرابة خلافا للشافعیه وقال فی الاشباه لم اره لاصحابنا ونقل علامته البیری فروعاً تدل علی عدم الکراهته ویدل علیه قوله تعالیٰ یؤثرون علی انفسهم ولو کان بهم خصاصة وما فی صحیح مسلم من انه علیه الصلوٰة والسلام اتی بشراب فشرب منه وعن یمینه اصغرا لقوم وهوا بن عباس وعن یساره اشیاخ فقال صلی الله علیه وسلم للغلام اتاذن لی فی ان اعطی هؤلاء فقال الغلام لا والله فاعطاه والغلام اذا لاریب ان مقتضی طلب الاذن مشروعیة ذلک بلاکراهة وان کان غیره افضل ه (ای لو کان اثر الغلام غیره بحقه کان ذلک جائزاله) اقوال ینبغی تقید المسئلة (ای مسئلة جواز الایثار) بما اذا عارض تلک القربة ما هوا فضل منهما کا حترام اهل العلم والاشیاخ کما افاده الفرع السابق والحدیث فانهما یدلان علی انه افضل من القیام فی الصف الاول اومن اعطاء الاتامن لاللحق فیکون الایثار بالقربة انتقالا من قربة ای ما هوا افضل منهما وهو الاحترام المذکور امالو اثر علی مکانه فی الصف مثلاً من لیس کذلک یکون اعراض عن القربة بلا داع وهو خلاف المطلوب شرعاً اه (۵۹۴۰ ج ا) قلت وکون الرجل لیس کذالک یختلف باختلاف الذوق فمن ذاق کونه احسن الخلق کله وان کل مسلم افضل منه فله، تقدیم کل مسلم علی نفسه ویکون فی ذالک عملاً لقوله علیه السلام لیلینی منکم الخ بتقدیم الافضل منه عنده فافهم والله تعالیٰ اعلم ۱۲ جامع.)

الدال علی الخیر کفا عله (مجمع الزوائد للهیثمی ۱:۱۶۶، ۳:۱۳۷، تفسیر القرطبی ۲:۴۲، تفسیر ابن کثیر ۳:۱۱)

اس بناء پر جس کو ہم نے صف اول میں کھڑا کیا ہے اس کو جو فضیلت صف اول کی ہماری وجہ سے حاصل ہوگی اس کا ثواب بھی ہم کو ملے گا تو ہم ثواب صف اول سے بھی محروم نہ ہوئے اور اس کے ساتھ دوسرے ثواب کے جامع ہوگئے ہمیں اس صورت میں دہرا ثواب ملا۔

غرض ایثار حضرات صوفیاء کا بہت بڑا معمول ہے۔ بھلا بزرگوں کے ساتھ تو وہ کیونکر ایثار نہ کرتے۔ ان کا تو مذاق یہ ہے کہ وہ جانوروں کے ساتھ بھی ایثار کرتے ہیں۔ حضرت شاہ عبدالرحیم صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی حکایت ہے جو حضرت شاہ ولی اللہ صاحب کے والد ہیں یہ بڑے بزرگ صاحب باطن ہیں اور اس کے ساتھ ہی بڑے عالم اور محدث بھی ہیں۔ ہندوستان میں علم حدیث یہی لائے۔ گو شہرت شاہ ولی اللہ صاحب کی زیادہ ہے مگر اصل حدیث کے لانے والے یہاں پر یہی ہیں۔ یہ علامہ ابوطاہر محدث مدنی کے شاگرد ہیں ان کی ایک حکایت ایثار کے متعلق ہے۔

بزرگوں کے طریقے

مگر اس سے پہلے ایک دوسرا واقعہ بیان کردوں (کیونکہ دونوں میں ارتباط ہے ۱۲) سو ایک واقعہ تو ان کا یہ ہے کہ ایک دفعہ وہ بہت عمدہ اور قیمتی لباس پہنے ہوئے دربار شاہی میں جارہے تھے۔ صوفیاء ناقصین تو ہر حالت میں تقشف سے رہتے ہیں اور یوں کہتے ہیں کہ ہم تو ظاہر میں جیسے اپنے گھر رہا کرتے ہیں ویسے ہی بادشاہوں کے سامنے رہیں گے، ہم سلاطین کی عظمت کے لئے لباس کیوں تغیر کریں اور ایسے صوفیاؤں کی عوام کی نظر میں زیادہ وقعت ہوتی ہے مگر کامل کی یہ حالت ہوتی ہے کہ

من چو کلکم درمیان اصبعین   نیستم درصف طاعت بین بین

(میں قلم کی طرح دو انگلیوں میں ہوں صف طاعت میں، بین بین نہیں ہوں)

وہ اپنے لئے کوئی خاص وضع و ہیئت تجویز نہیں کرتا وہ ہر حالت میں حکم کا تابع ہوتا ہے اس لئے کبھی خستہ حال رہتا ہے کبھی بنا ٹھنا رہتا ہے۔ یہ لوگ سلاطین کی ملاقات کے لئے قیمتی لباس بھی پہن لیتے ہیں کیونکہ اس میں مزورلہ کا اکرام ہے اور اکرام مزورلہ مطلوب ہے اس لئے وہ ان کی خاطر اپنی وضع کو چھوڑ کر اس وقت شاہی وضع اختیار کر لیتے ہیں، عوام ان کی اس حالت پر طعن کرتے ہیں کہ یہ بادشاہوں کی ملاقات کے لئے کیسے بنے ٹھنے جارہے ہیں مگر ان کو کیا خبر کہ وہ کس حالت میں ہیں اس لئے کامل کا پہچاننا دشوار ہے کیونکہ وہ کسی حالت و وضع کا پابند نہیں ہوتا تو عوام کو اس میں ظاہراً دوسروں سے وہ خاص امتیاز نظر نہیں آتا۔

درنیابد حال پختہ ہیچ خام   پس سخن کوتاہ باید والسلام

(ناقص کامل کی حالت کو نہیں پہنچ سکتا، پس کلام کوتاہ کرنا چاہیے اسی میں سلامتی ہے)

ایک بزرگ بی بی کا قصہ ہے کہ وہ رات کو بعد نماز عشاء کے خوب زینت کرتیں، عمدہ لباس پہنتیں، زیور سے آراستہ ہو کر کنگھی، سرمہ لگاتیں اور اس حالت میں شوہر کے پاس آ کر ان سے دریافت کرتیں کہ تم کو میری حاجت ہے اگر وہ کہہ دیتے کہ ہاں تو ان کے پاس کچھ دیر لیٹ جاتیں اور اگر وہ کہتے کہ مجھے حاجت نہیں تو پھر کہتیں کہ اچھا اب مجھے اجازت دو کہ میں اپنے خدا کے ساتھ مشغول ہوں چنانچہ شوہر کی اجازت کے بعد وہ اپنا لباس اور زیور وغیرہ اتار کر رکھ دیتیں اور کمبل اور ٹاٹ کا لباس پہن کر تمام رات عبادت کرتیں۔ تو دیکھئے یہ بزرگ بی بی ایک وقت میں کیسی زینت کرتیں اور دوسرے وقت کمبل اور ٹاٹ میں رہتیں، اب اگر کوئی زینت کے وقت ان کو دیکھتا تو یہی کہتا کہ یہ کیسی بزرگ ہیں جو اس قدر زیب و زینت کا اہتمام کرتی ہیں مگر کسی کو کیا خبر کہ وہ کس لیے زینت کرتی تھیں وہ نفس کی خواہش کے لئے ایسا نہ کرتیں تھیں بلکہ حکم شریعت کی وجہ سے زینت کرتی تھیں کیونکہ شریعت کا حکم ہے کہ عورت کو شوہر کے لئے زیب و زینت کرنا چاہیے۔ اس صورت میں اس کو زینت کرنے سے ثواب ملتا ہے مگر آج کل عورتوں کی یہ حالت ہے کہ شوہر کے سامنے تو بھنگیوں کی طرح رہتی ہیں اور جب کہیں برادری میں جاتی ہیں تو سر سے پیر تک آراستہ ہوتی ہیں اور اگر کوئی بیچاری شوہر کی خاطر زینت کرلے تو اس کو نکو بتاتی ہیں کہ ہائے اسے حیاء و شرم ذرا نہیں کہ یہ اپنے میاں کے واسطے کیسے کیسے چوچلے کرتی ہے۔ افسوس کہ جس جگہ زینت کا حکم تھا وہاں تو اس پر طعن ہوتا ہے اور جہاں ممانعت ہے وہاں اہتمام کیا جاتا ہے تو وہ بزرگ بی بی ایسی نہ تھیں وہ تو حکم کے تابع تھیں جہاں شریعت کا حکم ہوتا وہاں وہ خوب زینت کرتیں کیونکہ جب شوہر زینت کو کہے دلہن کو خراب و خستہ رہنے کا کیا حق ہے مگر جب شوہر کو کچھ غرض نہ ہوتی تو وہ اپنے نفس کے لئے زینت کا اہتمام نہ کرتی تھیں بلکہ وہی کمبل اور ٹاٹ پہن لیتی تھیں۔ اسی طرح کاملین زینت اور ترک زینت میں حکم کے تابع ہوتے ہیں وہ اپنے نفس کے لئے کچھ نہیں کرتے چنانچہ شاہ عبدالرحیم صاحب دربار میں جانے کے لئے عمدہ بیش قیمت لباس پہن کر جا رہے تھے اس حالت سے تو ظاہر بینوں کو کچھ کچھ شبہات ہوئے ہوں گے۔ اب دوسری حالت دیکھئے کہ راستہ میں آپ نے ایک کتے کے بچہ کو دیکھا جو نالی میں سردی کے مارے جاڑے میں سکڑ رہا تھا۔ آپ سے یہ حالت دیکھ کر رہا نہ گیا، فوراً کھڑے ہو گئے اور خادم سے فرمایا کہ اس کو نالی سے نکال لو، اس نے کچھ ناک منہ چڑھایا تو آپ نے آستین چڑھا کر اسے خود نکالا اور ایک حمام قریب تھا، وہاں لے جا کر گرم پانی سے اس کو غسل دیا۔ پھر آگ میں تاپا، یہاں تک کہ اس کی سردی کم ہو گئی اور اچھی طرح چلنے پھرنے لگے۔ پھر آپ نے اہل محلہ سے فرمایا کہ اگر تم اس

کی راحت کا انتظام کر سکو اور نگہداشت کا وعدہ کرو تو میں اس کو یہیں چھوڑ دوں ورنہ اس کو اپنے ساتھ لے جاؤں اور میں خود اس کا انتظام کروں گا۔ اہل محلہ نے وعدہ کیا تو آپ نے اس کو چھوڑ دیا اور پھر دربار میں تشریف لے گئے۔ (بھلا یہ شخص فخر و تکبر کے لئے زینت کرتا ہو، کیا اس سے یہ ہو سکتا ہے کہ ایک کتے کے بچہ کو اپنے ہاتھ سے اس طرح دھوئے اور یوں اس کو راحت پہنچائے، ہرگز نہیں، مگر شاہ صاحب نے بے تکلف اس کی خدمت کی، خادم نے بھی ناک منہ چڑھایا مگر آپ کو ذرا بھی اس سے انقباض نہ ہوا۔ یہ اس بات کی دلیل تھی کہ وہ اپنے نفس کے لئے زیب و زینت نہ کرتے تھے) یہ قصہ تمہید ہے۔ دوسرے قصہ کی اور وہ دوسرا قصہ جو مقصود ہے وہ یہ ہے کہ ایک بار آپ بٹیا پر جا رہے تھے ایک موقع ایسا آیا کہ دونوں طرف پانی اور کیچڑ تھا، صرف بٹیا ہی کا راستہ سوکھا تھا، سامنے سے ایک کتا بھی اسی بٹیا پر آ گیا، اب وہاں اس کی ضرورت تھی کہ دونوں میں سے ایک کیچڑ میں اترے تو دوسرا بٹیا کے راستہ سے نکلے کیونکہ بٹیا پتلی تھی اور اس میں اتنی وسعت نہ تھی کہ دونوں برابر کو نکل جائیں چنانچہ شاہ صاحب کھڑے ہو گئے اور وہ کتا بھی سامنے کھڑا ہو گیا، پھر اشارات میں گفتگو شروع ہوئی (بعض اہل اللہ جمادات و حیوانات سب کی گفتگو سمجھ لیتے ہیں ۱۲) چنانچہ شاہ صاحب نے کتے سے کہا بھائی تم پانی میں اترو اس نے کہا کیوں مجھ میں اور آپ میں کیا فرق ہے، آپ کیوں نہیں اترتے اور یہ کہا افسوس! پہلے بزرگوں کا مذہب ایثار تھا اور اس وقت کے بزرگوں کا مذہب اختیار ہے، فرمایا نہیں تو نے بدگمانی کی بلکہ میں تجھ کو اترنے کے لئے اس لئے کہتا ہوں کہ تو مکلف نہیں ہے اور میں مکلف ہوں اگر تو اس پانی اور کیچڑ سے ناپاک بھی ہو جائے گا تو تھوڑی دیر میں خشک ہو کر پھر پاک ہو جائے گا پھر تیرے ذمہ نہ وضو ہے، نہ نماز اور میں اتروں گا تو مجھے سارے کپڑے اور بدن کا دھونا اور پاک کرنا لازم ہوگا جس میں بہت دیر لگے گی ممکن ہے نماز میں دیر ہو جائے۔ اس نے جواب دیا کہ بہت اچھا میرا تو کچھ حرج نہیں، میں پانی میں اترتا ہوں مگر یہ یاد رکھو کہ تمہارے کپڑے ناپاک ہو جائیں تو ایک دو لوٹے پانی سے پاک ہو سکتے ہیں لیکن اگر میں اس وقت پانی میں اترا اور تمہارے دل میں یہ خیال آیا کہ میں اس کتے سے افضل ہوں تو اس سے تمہارا قلب ایسا ناپاک ہوگا جس کی ناپاکی ہفت قلزم سے بھی نہ دھل سکے گی۔ یہ سن کر شاہ صاحب پر ایک حالت طاری ہو گئی اور فوراً پانی میں اتر کر راستہ سے ہٹ گئے اور کتا بٹیا پر سے چلا گیا اور آپ اس کے بڑے احسان مند ہوئے کہ اس کے ذریعے سے ایک علم عظیم عطا ہوا، اب شاہ صاحب پر غیب سے الہام ہوا کہ عبدالرحیم! خبر بھی ہے کہ ہم نے یہ علم عظیم کتے کے ذریعے کیوں دیا، یاد کرو تم نے ایک دن ایک کتے کے بچے پر احسان کیا تھا کہ اس کو پانی

سے نکال کر گرم پانی سے دھویا پھر آگ سے تاپا تھا تو ہم نے اس احسان کا آج بدلہ کر دیا ہے کہ اس کی ابن النوع کے ذریعے سے تم کو یہ علم عظیم عطا کیا تاکہ اس کتے کے بچہ پر اپنا احسان نہ رکھیں۔

حق العبد کی فوقیت

ان علوم کی قدر صوفیہ ہی سمجھتے ہیں کہ ان کو ان میں ایسا مزہ آتا ہے کہ واللہ جب کوئی علم جدید عطا ہوتا ہے تو اس سے ایسا حظ آتا ہے کہ ہفت اقلیم کی سلطنت بھی اس کے سامنے گرد ہوتی ہے، غرض صوفیاء نے ایثار سے یہاں تک کام لیا ہے کہ جانوروں کے ساتھ بھی ایثار کیا۔ صوفیاء نے ہر مقام پر اس کی رعایت کی ہے اور بعض مقامات پر شریعت نے بھی اس کو واجب کیا ہے۔ چنانچہ حقوق نفس پر حقوق غیر کو مقدم کیا گیا ہے۔ بشرطیکہ اپنی ہلاکت اپنے اہل بیت کی پریشانی کا اندیشہ نہ ہو پس جہاں ایثار واجب ہے صوفیاء وہاں کیوں نہ کرتے وہ تو جہاں واجب بھی نہیں وہاں بھی اس کا بہت لحاظ رکھتے ہیں اور اس سے ان کو علوم حاصل ہوتے ہیں اور ان کو بڑا مزا ان علوم ہی میں آتا ہے مگر اب لوگ چاہتے ہیں ان سے دنیوی ترقی کرانا بھلا اس کام کے کہاں

تا بدانی ہر کرا یزداں بخواند   از ہمہ کار جہاں بیکار ماند

(جس شخص کو اللہ تعالیٰ اپنا بنا لیتے ہیں اس کو تمام دنیا کے کاروبار سے بیکار کر دیتے ہیں)

صاحبو! جس کو ان علوم کا مزا حاصل ہو گیا وہ واقعی ہی دنیا کے کام کا نہیں رہتا۔ ہاں جو ایسے باہمت ہوں کہ دونوں کو جمع کر سکیں۔ جیسے ابوبکر و عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہما وہ البتہ دونوں میں مشغول ہوتے ہیں اور ان کو دنیا کے مشاغل ان علوم سے مانع نہیں ہوتے بلکہ دنیا بھی ان کے ہاتھ میں دین بن جاتی ہے مگر ایسے بہت کم ہیں زیادہ تو ایسے باہمت نہیں ہوتے ان کا تو وہی حال ہوتا ہے۔

تا بدانی ہر کرا یزداں بخواند   از ہمہ کار جہاں بیکار ماند

(جس شخص کو اللہ تعالیٰ اپنا بنا لیتے ہیں اس کو تمام دنیا کے کاروبار سے بیکار کر دیتے ہیں)

بہر حال لوگوں نے حقوق العباد سے بہت ہی غفلت کر رکھی ہے حالانکہ حق العبد کا تقدم معلوم ہو گیا اور یہ بھی معلوم ہو گیا کہ حق اللہ پر حق العبد کا تقدم بوجہ عظمت کے نہیں ہے بلکہ محتاط و حقیر کے حق کو کریم غنی نے اپنے حق پر مقدم کر دیا ہے کہ جب دونوں میں تعارض ہوتا ہے تو وہ فرما دیتے ہیں کہ ہمارے حق کو چھوڑ دو، ہمیں کچھ ضرورت نہیں اور بندے کے حق کو ادا کر دو وہ محتاج ہیں۔ اگر اس کا حق ادا نہ ہو گا تو پیٹ پھاڑ کر مر جائے گا۔ یہ وجہ ہے تقدم کی۔ پس لوگوں کا تاکد حق کے سبب کو صرف عظمت

میں منحصر کر دینا صحیح نہیں بلکہ حاجت بھی تاکد حق کا ایک سبب ہے جب سبب مرض کا میں نے ازالہ کردیا تو اب مرض کا علاج سہل ہوگیا، پس بندہ کے حقوق کو اس کی حاجت کی وجہ سے ادا کرو اور جب میں نے آپ کے عذر کا جواب دے دیا تو حجت تام ہوگئی اب کسی کے پاس حقوق العباد سے غفلت کرنے کا کوئی عذر نہیں رہا۔ یہ تو ان لوگوں کی غفلت کا علاج تھا جو حقوق العباد کا بالکل ہی اہتمام نہیں کرتے۔

حق العبد کی اقسام

اب دوسری غلطی بعض لوگوں میں یہ ہے کہ وہ حق العبد کو صرف مال میں منحصر کرتے ہیں کہ چوری کرنا، غصب کرنا، قرض لے کر انکار کر دینا کسی کی امانت رکھ کر مکر جانا بس یہی جرم ہے ان کے علاوہ حق العباد میں اور کوئی جرم نہیں حالانکہ حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ حق العبد مال ہی میں منحصر نہیں بلکہ اور بھی حقوق ہیں اور وہ حقوق مالیہ کے برابر بلکہ ان سے بھی معظم ہیں۔ چنانچہ حجۃ الوداع میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ رضی اللہ تعالیٰ عنہم سے دریافت فرمایا کہ یہ کون سا دن ہے؟ صحابہ رضی اللہ تعالیٰ عنہم نے ادب کی وجہ سے عرض کیا "اللہ و رسولہ اعلم" فرمایا "الیس یوم عرفہ" کیا یہ عرفہ کا دن نہیں ہے، صحابہ رضی اللہ تعالیٰ عنہم نے عرض کیا "بلیٰ" بیشک یہ عرفہ کا دن ہے پھر پوچھا یہ کونسا مہینہ ہے۔ صحابہ رضی اللہ تعالیٰ عنہم نے ادب سے وہی جواب دیا "اللہ و رسولہ اعلم" آپ نے فرمایا "الیس ذی الحجہ" کیا یہ حج کا مہینہ نہیں ہے۔ صحابہ رضی اللہ تعالیٰ عنہم نے عرض کیا بیشک یہ حج کا مہینہ ہے پھر دریافت کیا فرمایا یہ کونسا شہر ہے اس پر بھی صحابہ رضی اللہ تعالیٰ عنہم نے ادب سے "اللہ و رسولہ اعلم" ہی کہا آپ نے فرمایا "الیس بالبلد الحرام" کیا یہ بلد حرام نہیں ہے۔ صحابہ رضی اللہ تعالیٰ عنہم نے عرض کیا بیشک یہ بلد حرام ہے اس تمہید کے بعد آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

الا ان اموالکم ودمائکم واعراضکم علیکم حرام کحرمۃ یومکم ھذا فی شھرکم ھذا فی بلدکم ھذا من یومکم الی یوم القیامۃ (او کمال قال) (الصحیح للبخاری فی کتاب الحج باب الخطبۃ ایام منی رقم: ۱۷۴۱، ۳:۵۷۳)

"سن لو! تمہارے اموال اور جانیں اور آبروئیں آج سے قیامت تک ویسی ہی حرام ہیں جیسے اس یوم معظم، شہر معظم اور بلد معظم میں حرام ہیں، ہمیشہ کیلئے ان کی حرمت ویسی ہے جیسی آج ہے۔"

اس سے معلوم ہوا کہ حقوق العباد کی تین قسمیں ہیں ایک حقوق نفس، دوسرے حقوق مال،

تیسرے حقوق عرض، جب شریعت سے حقوق معلوم ہوتے ہیں تو آپ کو صرف مال میں حق العبد کو منحصر کرنے کا کیا حق ہے۔ صاحبو! جان کا بھی حق ہے آبرو کا بھی حق ہے، مال کا بھی حق ہے، جان کا حق تو یہ ہے کہ کسی کو ناحق قتل نہ کرو، خیر تو اس بادشاہت میں بکثرت کون کر سکتا ہے اس کی طاقت تو یہاں کسی کو نہیں، گو شاذ ونادر کبھی ایسا ہو جاتا ہے مگر وہ چھپ نہیں سکتا، فوراً مقدمہ قائم ہو کر پھانسی ہو جاتی ہے اس لئے اس سے سب ڈرتے ہیں ہاں یہ حق البتہ باقی ہے کہ کسی غریب کے دو چار ڈنڈے لگا دیئے گو ہمارے قصبہ میں یہ حق بھی باقی نہیں رہا وہاں کسی کی مجال نہیں کہ جو کسی بھنگی کو بھی مار سکے یا بیگار میں کام لے سکے۔ ہمارے بھائی کے ایک کارندہ ہیں حاجی حاجی، اب تو کارندگی سے انہوں نے استعفیٰ دیدیا ہے مگر جس زمانہ میں وہ کارندہ تھے اس زمانہ کا قصہ بیان کرتے تھے۔ ایک دن میں نے سڑک صاف کرنے والے بھنگی سے کہا کہ جب تو سڑک پر جھاڑو دیا کرے تو ذرا ہمارے دروازہ پر بھی جھاڑو دے دیا کر، تو وہ کیا کہتا ہے کہ حاجی جی! کنون تو ہے نہیں خیر تمہاری خاطر سے دے دیا کروں گا تو وہاں کے بھنگی بھی قانونی ہیں۔ ہر شخص بجائے خود رئیس ہے اور اس کا حاصل یہ ہے کہ وہاں کوئی رئیس نہیں (ہر شخص رئیس وہیں ہوتا ہے جہاں کوئی رئیس نہ ہو ۱۲) میں تو اس حالت سے بڑا خوش ہوں گو اپنی قوم کی حالت تنزل سے افسوس بھی ہوتا ہے کہ ان کی وقعت بھنگیوں کے دلوں میں بھی نہیں رہی مگر اس سے خوش ہوں کہ ان کے ہاتھ سے اب ظلم نہیں ہو سکتا۔ ریاست تو وہی اچھی ہے جس میں ظلم نہ ہو اور جس ریاست کا یہ نتیجہ ہو کہ غریبوں پر ظلم کیا جائے اس کے ہونے سے نہ ہونا اچھا۔ چنانچہ اب ہمارے قصبہ میں زوال ریاست سے یہ بات تو ہو گئی کہ کوئی کسی پر ظلم نہیں کر سکتا اور جو کوئی کسی کو کچھ کہتا ہے تو جواب میں دس باتیں وہ ان کو سنا لیتا ہے، پس ظالمانہ ریاست سے ان کی یہی حالت اچھی ہے ان کو اگر تھوڑی سی ریاست ملتی ہے تو چوگنا ظلم کرتے ہیں۔

کان پور کے ضلع میں ایک قصبہ ہے "بارہ" وہ پٹھانوں کی بستی ہے وہاں کے پٹھان بہت شریف ہیں مگر آخر رئیس ہیں کبھی کسی غریب کو کچھ کہہ بھی لیتے ہیں ایک پٹھان نے کسی جولاہے سے تمسخراً پوچھا کہ میاں جی! کس حال میں ہو، کہا خدا کی نعمتوں کا شکر ادا کرتا ہوں کہ خدا نے مجھ کو جولاہا بنا دیا جس سے مجھ کو کوئی کچھ کہہ لیتا ہے کوئی دو چار ڈنڈے لگا دیتا ہے تو قیامت کے دن مجھے کسی کی نماز ملے گی کسی کے روزے ملیں گے، پٹھان نہیں بنایا اگر پٹھان ہوتا تو قیامت میں دوسرے لوگ میرے سب اعمال لے جاتے اور میں مفلس بن کر کھڑا رہ جاتا تو میں اس بات پر خدا تعالیٰ کا بہت

شکر یہ ادا کرتا ہوں کہ اس نے مجھے پٹھان نہ بنایا، یہ جواب سن کر کوئی دوسرا ہوتا تو نہ معلوم اس جولاہے کی کیا گت بناتا مگر وہاں کے پٹھان شریف ہیں، انہوں نے کچھ نہیں کہا برا نہ مانا۔

بدعت وسنت

ان لوگوں کی شرافت کا ایک اور اس سے بھی زیادہ عجیب قصہ ہے وہ یہ کہ میں کئی سال ہوئے ایک دفعہ کان پور گیا تھا تو مجھے معلوم ہوا کہ نواح کان پور میں بعض دیہات کے نومسلم راجپوت مرتد ہونے والے ہیں۔ آریہ ان کو بہکا رہے ہیں تو میں نے اپنے احباب میں سے کچھ علماء اور رؤساء کو ساتھ لیا اور موضع گجیر میں قیام کیا جو سب دیہات میں بڑا گاؤں تھا پھر وہاں سے دو دو تین عالموں کو متفرق دیہات میں تبلیغ کے لئے بھیجا گیا اور ان کے چودھریوں کو بلایا اور کہا کہ بھائی ہم نے سنا ہے کہ تم آریہ ہونے والے ہو، اگر کوئی شبہ اسلام میں ہو رفع کر لو، ایک نے جواب دیا کہ ہم آریہ کیوں ہوتے، انکے یہاں تو نیوگ کا بڑا فحش طریقہ ہے جس کو کوئی شریف ہرگز گوارہ نہیں کر سکتا پھر ہم نے کہا کہ ہاں بھائی بس تم مسلمان ہی رہنا وہ کہنے لگے کہ ہم مسلمان بھی نہیں ہوتے ہم تو نومسلم ہی اچھے رہیں گے، میں نے کہا اچھا تو نومسلم ہی رہو پھر باتوں باتوں میں ان سے پوچھا گیا تم ہماری طرح مسلمان کیوں نہیں ہوتے تو کہنے لگے اصل بات یہ ہے کہ ہم تمہاری طرح مسلمان ہو جائیں تو ڈر یہ ہے کہ ہمیں تم میں سے کوئی اپنی لڑکی نہ دے گا نہ ہماری لڑکی لے گا اس لیے ہم تمہارے ساتھ بھی نہیں مل سکتے اور نہ آریوں کے ساتھ ملیں گے۔ اس جواب پر میں ذرا خاموش ہوا تھا کیونکہ اس کا وعدہ میرے اختیار سے باہر تھا، خدا بھلا کرے قصبہ بارہ کے پٹھانوں کا وہ بھی خبر سن کر آ گئے تھے ان میں سے ایک رئیس کھڑے ہوئے اور فرمایا کہ صاحبو! تم بے فکر رہو تم کو ہم اپنی لڑکیاں دیں گے اور تمہاری لڑکیاں لیں گے گو اس سے برادری میں ہماری ذلت ہوگی مگر اسلام کی وقعت و خدمت کے لئے ہماری جان و آبرو سب فدا ہیں، میں اس جواب سے بڑا خوش ہوا اور ان کو بہت دعا دی کہ شاباش!

ایں کارزار تو آید و مرداں چنیں کنند

(یہ کام تم سے ہوا اور مردان خدا ایسا ہی کرتے ہیں)

مگر یہاں آ کر چودھری لاجواب تو ہو گیا لیکن اپنی حالت کے بدلنے پر آمادہ نہ ہوا۔ معلوم ہو گیا کہ یہ بات اس نے محض شرارت کی راہ سے کہی تھی جس سے ہم کو صرف لاجواب کرنا مقصود تھا اور

حقیقت میں ان لوگوں کو اپنی حالت کا بدلنا منظور نہیں وہ اپنے اسی طرز میں خوش ہیں دراصل وہ مسلمان بھی برائے نام ہی ہیں۔ حالت ان کی یہ ہے کہ ان کے نام ہندوؤں جیسے ہیں چنانچہ ایک چودھری کا نام ننوسنگھ تھا اور دوسرے چودھری کا نام ادھار سنگھ تھا۔ یہ بہ نسبت پہلے کے ذرا سمجھدار تھا، بڑے چودھری سے کہا گیا کہ تجھے کلمہ بھی آتا ہے کہنے لگا ہاں آتا ہے کہا گیا سناؤ تو کہنے لگا کہ بس تو مت پوچھ گاؤں کے لوگ یوں کہیں گے کہ بڈھا سٹھیا گیا جو کلمہ پڑھتا ہے ان کو کلمہ پڑھنے سے بھی رکاوٹ تھی۔ وہ ایسے مسلمان تھے بس چند باتیں ان میں اسلام کی موجود تھیں۔ ایک تو وہ ختنہ کراتے تھے، دوسرے مردوں کو دفن کرتے تھے، تیسرے نکاح قاضی سے پڑھواتے تھے مگر ساتھ ہی ہندوؤں کی طرح پھیرے بھی کرتے تھے اور ایک یہ بات ان میں اسلام کی تھی کہ محرم میں تعزیہ بناتے تھے اور اس کو اتنا بڑا اشعار سمجھتے تھے کہ ادھار سنگھ نے یوں کہا تھا کہ ہم آریہ کیسے بنت۔ ہمارے یہاں تو تاجیہ (تعزیہ) بنت ہے میں نے یہ سن کر کہا کہ دیکھو تعزیہ مت چھوڑنا کہنے لگے اجی بھلا اسے ہم کب چھوڑنے لگے۔ بعض علماء کو میری اس بات پر خیال ہوا کہ اس نے ایک بدعت کی، مسلمانوں کو اجازت دی میں نے کہا بس چپکے بیٹھے رہو یہ کانپور اور لکھنؤ میں ہی شرک و بدعت ہے مگر یہاں فرض ہے کیونکہ اس جگہ تعزیہ ہی ان لوگوں کے دین کا وقایہ ہے ابھی تو ان لوگوں کا تعزیہ بناتے رہنا ہی ان کے اسلام کے محافظ ہے۔ پھر جب رفتہ رفتہ یہ پکے مسلمان ہو جائیں گے اس وقت بدعت وسنت کی تعلیم دے دینا۔ ہمارے ایک دوست نے عجیب بات کہی میں نے اسے کہا کہ کالج علی گڑھ میں مولود شریف ہوا کرتا ہے جو کہ بدعت ہے وہ دوست فرمانے لگے کہ یہ مولود شریف (بہیئہ معروفہ) اور جگہ تو بدعت مگر کالج میں جائز و اجب ہے کیونکہ اس بہانہ سے کبھی وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ذکر شریف اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے فضائل و معجزات سن لیتے ہیں تو اچھا ہے اسی طرح حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی عظمت ومحبت ان کے دلوں میں قائم رہے ورنہ وہ تو سال بھر ایسی خرافات میں مبتلا رہتے ہیں کہ بھول کر بھی خدا اور رسول کا نام ان کی زبان پر نہیں آتا مجھے ان کی یہ بات پسند آئی کیونکہ واقعی اگر کسی جگہ بدعت ہی لوگوں کے دین کی حفاظت کا ذریعہ ہو جائے تو وہاں اس بدعت کو غنیمت سمجھنا چاہئے جب تک کہ ان کی پوری اصلاح نہ ہو۔ غرض بارہ کے پٹھان بڑے شریف ہیں اور ان کی شرافت ہی ہے کہ اس جولاہے کا جواب ناگوار نہ ہوا اور نہ کوئی دوسرا ہوتا تو خوب مرمت کرتا مگر واقعی بڈھے نے بات سچی کہی کہ اللہ کا شکر ہے جو میں جولاہا ہو گیا، پٹھان نہ ہوا ورنہ پھر میں ظلم کرتا اور لوگ میرے نیک

اعمال چھین لیتے سو ہمارے قصبہ میں تو یہ ریاست اب نہیں رہی کہ کوئی کسی کے ڈنڈے لگا سکے، گو تھوڑا سا کہیں ہو بھی جاتا ہے مگر پھر کم ہے جس سے میں خوش ہوں لیکن اور قصبات میں، جہاں تھوڑی بہت ریاست ہے وہاں اس قسم کا ظلم زیادہ ہوتا ہے اور افسوس یہ ہے کہ اس سے غرباء بھی بچے ہوئے نہیں ان میں بھی بہت تکبر ہوتا ہے گو امیروں کے برابر دوسرے نہ ہو مگر اینٹھ مروڑ ان میں بھی ہے چنانچہ خود اقرار کرتے ہیں کہ کوئی مال مست ہے کوئی کھال مست اور یہ بہت سخت بات ہے۔

عند اللہ قابل نفرت لوگ

حدیث میں ہے کہ اللہ کو تین شخصوں سے بہت زیادہ بغض و نفرت ہے ایک ملک کذاب، بادشاہ جھوٹ بولنے والا کیونکہ آدمی اس لئے جھوٹ بولا کرتے ہیں کہ اس کے ذریعے سے اپنا کام نکالے اور اس کی ضرورت وہاں ہوتی ہے جہاں کوئی اپنے سے زیادہ زبردست ہو جس کے سامنے سچ بولنے سے کچھ اندیشہ ہوتا ہے تو بادشاہ سے اوپر تو کوئی نہیں ہوتا، اس کو جھوٹ بولنے کی کیا مار آئی، دوسرے "شیخ زانی" یعنی بڈھا زنا کار کیونکہ جوان میں تو ایک داعی زنا کا موجود ہے جس کا روکنا ہمت کی بات ہے مگر بڈھے میں تو وہ داعی بھی موجود نہیں یہ تو زبردستی اپنے نفس کو سوچ سوچ کر آمادہ کرے گا تو اس کا زنا کرنا محض حرص اور خباثت و شرارت ہی ہے۔ تیسرا عائل متکبر یعنی غریب تکبر کرنے والا کیونکہ امیر کے پاس تو تکبر کا کچھ سامان بھی ہے اور یہ خواہ مخواہ فرعون بے سامان بنا ہوا ہے، غرض جس شخص میں جس گناہ کا سبب اور داعی موجود ہے اس کا جرم اس شخص سے کم درجہ کا ہے جس میں کوئی سبب اور داعی موجود نہیں اس لئے غریبوں کا تکبر امیروں کے تکبر سے اشد ہے۔ مگر حالت یہ ہے کہ غریب بھی اپنی کھال میں ایسے مست ہے جہاں ان کا بس چلتا ہے وہاں یہ بھی دوسروں کی ایذاء رسانی سے نہیں چوکتے۔ ہمارے قصبہ میں ایک رئیس کے یہاں تقریب ہوئی تھی جس میں بہت کچھ سامان کیا گیا تو برادری کے ایک غریب شریف زادہ نے اس کی آبرو ہی بہانا چاہی اور سوچتے رہے کہ کسی بات پر موقع ملے تو اس کی خوشی میں کھنڈت ڈالوں مگر وہاں ایسا عمدہ انتظام تھا کہ کسی بات میں ان کو بولنے کا موقع نہ ملا۔ اتفاق سے سقہ پانی کی مشک لیے ہوئے ان کے پاس سے گزرا اور مشک کی ایک باریک دھار سے کچھ چھینٹے ان کے کپڑوں پر پڑ گئے بس یہ کہاں تھے، فوراً جھلا کر کھڑے ہو گئے اور رئیس کو برا بھلا کہنا شروع کیا کہ نو آموز دولت ہے، انتظام کا سلیقہ تھا، برادری کے بھائیوں کے سامنے سقوں کو نکالا جاتا ہے جس سے سب کے کپڑوں میں

چھیننے پڑتے ہیں اوران کوذلیل کیا جاتا ہے ہم ایسے اوچھے کی تقریب میں شریک نہیں ہوسکتے یہ کہہ کر چلتے ہوئے۔ پھراس رئیس بیچارہ نے ان کی خوشامد کی، ٹوپی اس کے پیروں میں ڈالی جب آپ تشریف لائے کیونکہ مقصود یہی تھا کہ ذرا اس کو ذلیل کردیں اور اپنے پیروں میں اس کی ٹوپی ڈلوائیں مگر یہ اینٹھ مروڑ بھی اس کی بدولت تھا کہ جانتے تھے وہ ہماری خوشامد کرے گا، آگے ہاتھ جوڑے گا اس لئے اس پر ناز تھا اوراس رئیس کی یہ تواضع بھی ریاست ہی کی بدولت تھی کیونکہ رؤساء جانتے ہیں کہ ہماری شان اتنی بڑی ہے جوایسی باتوں سے نہیں گھٹتی پس غرباء میں بھی تکبر اور ایذاء رسانی کا مرض موجود ہے اس لئے میں اب اہل دولت کا لفظ چھوڑ کر ”اہل قدرت“ کہوں گا تو جس کو جتنی بھی قدرت حاصل ہے اس میں دوسرے کی جان پر دست اندازی کرنے سے باک نہیں کرتا گو زیادہ دست اندازی رؤساء ہی کے ہاتھ سے ہوتی ہے کیونکہ ان کو قدرت زیادہ ہے، غریب آدمی کسی پر زیادتی کرتا ہے تو دوسرا اس کا بدلہ لے سکتا ہے اور امراء پر اول تو غرباء نالش نہیں کر سکتے کیونکہ اس کے لئے روپیہ کی ضرورت ہے اور غریبوں کے پاس اتنا روپیہ کہاں اور اگر نالش کریں بھی تو کامیابی دشوار ہے کیونکہ حکام بھی امراء کی رعایت کرتے ہیں بس وہی حال ہو جاتا ہے۔

ہم نے سوچا تھا کہ حاکم سے کریں گے فریاد   وہ بھی کمبخت ترا چاہنے والا نکلا

خصوصاً حکومت غیر عادلہ میں تو امراء کی بہت ہی رعایت ہوتی ہے۔

حکومت عادلہ کی مثال

ہاں حکومت عادلہ ہو تو وہاں کسی کی پرواہ نہ ہوگی چاہے کوئی کتنا ہی امیر اور مالدار ہو۔ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے زمانے میں جبلۃ الایہم شاہ غسان اسلام لایا تھا۔ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو اس کے اسلام سے خوشی ہوئی تھی کیونکہ بادشاہ کے مسلمان ہونے سے اس کی رعیت کے بہت سے لوگ اسلام میں داخل ہو جاتے ہیں۔ دوسرے اس سے مخالفین پر بھی رعب پڑتا ہے مگر اس خوشی کا اثر نہ تھا کہ جبلہ کی ایسی رعایت کی جاتی کہ وہ جس پر چاہے ظلم کرنے لگے اور کچھ باز پرس نہ ہو چنانچہ ایک مرتبہ جبلہ لنگی باندھے ہوئے خانہ کعبہ کا طواف کر رہا تھا، لنگی باندھنا اہل عرب کا عام شعار تھا، بادشاہ اور غریب سب لنگی باندھتے تھے تو اس وقت اتفاق سے کسی غریب کے پیر سے جبلہ کی لنگی کا کونہ دب گیا، جبلہ نے جو قدم آگے بڑھایا دفعتہ لنگی کھل گئی، غصہ سے سرخ ہو گیا اور اس غریب مسلمان کے بڑی زور سے طمانچہ مارا اس کا دانت ٹوٹ گیا، اس نے جبلہ کو تو کچھ نہ کہا سیدھا حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ

عنہ کے اجلاس میں جا کر دعویٰ دائر کر دیا۔ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے جبلہ کو بلایا اور پوچھا کہ تو نے اس مسلمان کو طمانچہ مارا ہے اس نے اقرار کیا آپ نے مدعی سے فرمایا کہ تم جبلہ سے قصاص لے سکتے ہو جبلہ نے کہا اے امیر المؤمنین اس بازاری کو مجھ جیسے بادشاہ کے برابر کس چیز نے کر دیا جو اس کو مجھ سے قصاص لینے کا حق حاصل ہو گیا۔ آپ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا اسلام نے تم دونوں کو برابر کر دیا، جبلہ نے کہا اچھا مجھے کل تک کی مہلت دی جاوے میں کل قصاص دیدوں گا۔ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا میں مہلت نہیں دے سکتا یہ مدعی کا حق ہے اگر وہ چاہے مہلت دے یا نہ دے بیچارہ غریب آدمی ذرا سی بات پر پسیج جاتا ہے۔ مدعی نے کہا کہ مجھے کل تک کی مہلت دینا منظور ہے پھر رات کو وہ کمبخت چپکے سے نکل کر بھاگ گیا اور مرتد ہو کر نصرانیوں سے جا ملا مگر حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو ذرا بھی پروا نہ ہوئی اور نہ اسلام کو جبلہ کے ارتداد سے کچھ نقصان پہنچا بلکہ اگر حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ اس کی رعایت کرتے تو اس سے بیشک اسلام کو ضرر پہنچتا۔ کیونکہ عقلاء کو یہ کہنے کا موقع ملتا کہ اسلام میں ضعیف کا حق قوی سے نہیں دلایا جاتا بلکہ زبردستوں کی رعایت کی جاتی ہے اور یہ خلاف عدل ہے اور اب تو گو ظاہر میں ایک جبلہ اسلام سے نکل گیا مگر عدل اسلامی کی نظیر تمام دنیا کے سامنے قائم ہو گئی اور سب کو معلوم ہو گیا کہ قانون اسلام میں کوئی زبردست کسی کمزور کا حق نہیں دبا سکتا جس سے ہزاروں لاکھوں آدمی عدل اسلامی کے شیدا بن گئے۔ ۱۲ جامع) اور تواریخ سے معلوم ہوتا ہے کہ بعد میں جبلہ بھی اپنے ارتداد پر بہت پچھتاتا تھا اور باوجودیکہ نصرانیوں میں اس کی بڑی عزت اور آؤ بھگت ہوتی تھی اور ہر قسم کے سامان عیش اس کے لئے مہیا تھے مگر بعض دفعہ وہ رو کر یہ کہتا تھا کہ اے کاش میں اس دن قصاص کو گوارا کر لیتا تو وہ میرے لئے اس عزت سے ہزار درجہ بہتر ہوتا۔ اسلام واقعی ایسی چیز ہے کہ اس کو چھوڑ کر کبھی چین نہیں مل سکتا تو جہاں حکومت مسلمہ عمریہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ ہو وہاں کسی رئیس یا بادشاہ کی کسی غریب کے مقابلہ میں کچھ رعایت نہ ہوگی۔

وسعت اختیار کا اثر

میں مسلمانوں کو وصیت کرتا ہوں کہ اگر کوئی بڑا ہندو یا عیسائی مسلمان ہو جایا کرے تو اس کو نچاتے نہ پھرا کرو وہاں اس کی خدمت اور خاطر کرو بلکہ ایسی دھوم دھام نہ کیا کرو، جس سے کسی کو عجیب بات معلوم ہو کیونکہ کوئی رئیس ہو، بادشاہ ہو جو کوئی بھی اسلام لاتا ہے اپنی نجات اور اپنی فلاح کے لئے لاتا ہے، مسلمانوں پر کیا احسان کرتا ہے یہ تو جملہ معترضہ تھا میں کہہ رہا تھا کہ حضرت

عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ جیسی حکومت ہو تو خیر ورنہ غیر عادل حکومتوں کی یہی حالت ہے کہ ان میں رؤسا و امراء کی غریبوں کے مقابلہ میں بہت رعایت کی جاتی ہے تو غرباء نالش کر کے بھی مال داروں سے انتقام نہیں لے سکتے۔ اس لئے مال داروں کے ہاتھ سے مخلوق کی جان پر زیادہ ظلم ہوتا ہے اور ایک ظلم حکام کے ہاتھ سے یہ ہوتا ہے کہ کسی کے دو چار بیدیں بلا وجہ لگوا دیں ان کی تو کون نالش کرتا ہے اور بعضے اس طرح ظلم نہیں کرتے تو یوں کرتے ہیں کہ مقدمہ میں ایک فریق سے رشوت لے کر کسی کا حق ضائع کر دیا، ایک ڈپٹی صاحب کی یہ حالت تھی کہ دونوں فریق سے رشوت لے لیا کرتے تھے مگر ان سے سب خوش تھے بلکہ ایماندار مشہور تھے کیونکہ جس فریق کے خلاف وہ فیصلہ کرتے تھے ان کی رشوت واپس کر دیا کرتے تھے اور بعضے یہ کرتے ہیں کہ جس نے زیادہ رشوت دیدی اس کے موافق فیصلہ کر دیا اور دوسرے کی رقم بھی ہضم کر لی مقدمہ تو حاکم کے ہاتھ میں ہوتا ہے جس کے چاہے موافق کر دے حاکم کو مقدمہ کا بدلنا کیا مشکل ہے، ہیر پھیر کر جس طرح چاہے بنا دے۔ اسی وسعت خیال پر نظر کر کے میں مسلمانوں کو کہا کرتا ہوں کہ حکام وقت کو ناراض نہ کرو یہ طریقہ بہت مضر ہے اس پر بعض نوجوان کہا کرتے ہیں کہ ہم تو جو کچھ کرتے ہیں قانون کے اندر کرتے ہیں، خلاف قانون کچھ نہیں کرتے پھر حکام کیا کر سکتے ہیں؟ میں نے کہا کہ حکام کو تمہاری نیت تو معلوم ہے جب وہ یہ جانیں گے کہ یہ لوگ ہم کو ناراض اور تنگ کرنے کے لئے یہ حرکت کر رہے ہیں تو قانون ان کے ہاتھ میں ہے جس بات کو تم خلاف قانون نہیں سمجھتے ہو وہ اس کو بھی کسی ترکیب سے خلاف قانون کر دیں اور شریعت کا امر ہے۔

لاتلقوا بایدیکم الی التھلکۃ کہ اپنے کو ہلاکت میں نہ ڈالو تو ایسا کام نہ کرنا چاہیے جس میں حاکم کی ناراضی ہو کیونکہ اس کا انجام قریب بہ ہلاکت ہے اور مدت دراز تک مسلمانوں کو اس کا خمیازہ بھگتنا پڑتا ہے اور ایسے خطرات سے حفاظت نفس شرعاً مطلوب ہے مگر اتنا فرق ہے کہ عوام تو اپنی جان سمجھ کر اپنے نفس کی حفاظت کرتے ہیں اور اہل اللہ خدا کی امانت سمجھ کر حفاظت کرتے ہیں کہ اس کو خلاف منشاء حق صرف نہ کیا جاوے (اس لئے عارف ایسے موقع میں جہاں شریعت نے حفاظت نفس کا حکم دیا ہوا اپنی جان کی بہت حفاظت کرتا ہے گو عوام اس کو بزدلوں و ڈرپوک کہیں اور جہاں شریعت نے بذل نفس کا حکم دیا ہو وہاں اہل اللہ سے زیادہ جانبازی کرنے والا کوئی نہیں ہوتا ۱۲ جامع) تو دو طبقے تو یہ ہیں جو ظلم میں زیادہ بدنام ہیں یعنی رؤسا اور حکام۔

زیادتی کی تلافی کی صورت

ایک طبقہ اور ہے میانجیوں کا یہ بچوں کے ساتھ بہت ظلم کرتے ہیں ان کو جب کسی بچہ پر غصہ آتا ہے تو قہر عام کی طرح سب پر برستا ہے کہ ایک طرف سے سب کی خبر لیتے چلے جاتے ہیں اس سے میاں جی بہت کم بچے ہوئے ہیں۔ ہاں اگر کوئی ایسا ہو جیسے حافظ علی حسن صاحب کیرانوی مقیم گنگوہ تھے تو بیشک وہ اس ظلم سے بچ سکتا ہے مگر ان میں افراط نہ تھا تو یہ تفریط تھی کہ بچوں کو مار کر ان سے کہتے تھے کہ تم مجھ سے بدلہ لے لو اور بعضے لڑکے ایسے شریر تھے کہ بدلہ بھی لے لیتے اور حافظ جی کو قمچی سے سڑا سڑ مارتے تھے اور وہ ایسے سیدھے تھے کہ بچوں کے ہاتھ سے مار کھا لیتے تھے ان کے سیدھے پن کی یہ حالت تھی کہ ایک دفعہ سقے کہیں بارات میں چلے گئے اور کئی روز تک محلہ والوں کو پانی کی تکلیف رہی تو آپ اپنے لڑکے سے فرماتے ہیں کہ ارے سعید تو ہی ایک مشک بنا لے اور گھروں میں پانی بھر دیا کر حافظ جی تو پرانے زمانے کے آدمی تھے ان کو تو باوجود سیدزادے اور شریف ہونے کے ایسے کاموں سے عار نہ تھا مگر ان کے صاحبزادے بڑے خفا ہوئے کہ لو ابا جان تو ہمیں سقہ بنانا چاہتے ہیں۔ غرض وہ بڑے سیدھے تھے اور نیک بھی بہت ہی تھے، نماز تو ایسی اچھی پڑھتے تھے کہ سبحان اللہ بڑی لمبی نماز پڑھتے تھے اور ہر رکن کو اعتدال و آرام سے اطمینان کے ساتھ ادا کرتے تھے مگر عدم علم کی وجہ سے وہ جماعت میں بھی ایسی ہی تطویل کرتے تھے جس سے نمازیوں کو تکلیف ہوتی تھی۔ بہرحال وہ تو ایک میاں جی ہم نے ایسے دیکھے ہیں جو بچوں پر ظلم نہ کرتے تھے اور کبھی ذرا سی زیادتی ہو گئی تو اس کی تلافی اس طرز سے کرتے تھے گو یہ طریقہ اچھا نہیں اس سے لڑکوں کی شرارت اور بد دماغی اور بدخلقی بڑھ جاتی ہے اور معلم کو اس کی رعایت بھی ضروری ہے، بچوں کے اخلاق خراب نہ ہوں تو اب اگر کوئی اپنی زیادتی کی تلافی کرنا چاہے تو اس کی تدبیر یہ ہے کہ سزا کے بعد بچوں کے ساتھ شفقت کرو اور جس پر زیادتی کی ہے اس کے ساتھ احسان کرو یہاں تک کہ وہ خوش ہو جائے جیسے میرٹھ کے ایک رئیس نے ایک غریب نوکر کے طمانچہ مار دیا تھا پھر اس کو اپنی غلطی پر تنبہ ہوا تو اس کو ایک روپیہ دیا پھر دوسرے نوکر سے کہا کہ اس سے پوچھ اب کیا حال ہے، کہنے لگا میں تو دعا کر رہا ہوں کہ ایسا طمانچہ روز لگ جایا کرے۔ بس یہ طریقہ تلافی کا بہت اچھا ہے اس سے بچوں کے اخلاق پر بھی برا اثر نہ ہوگا اور ظلم کا دفعیہ بھی ہو جائے گا اور جب میاں جی کا ایک دو دفعہ کرنے میں کچھ خرچ ہوگا تو آئندہ کو وہ خود بھی ذرا سنبھل کر مارا کریں گے، نیز سزا کے بعد بچوں کو خوش کرنے کی بھی ضرورت ہے کہ ان کے دل میں معلم سے بغض و عداوت نہ پیدا ہو

جاوے جو علم سے محرومی کا سبب ہے اس راز کو ایک رئیس نے سمجھا تھا، قصہ ان کا یہ ہے کہ میں جب کانپور میں تھا تو ہمارے مدرسہ میں ان رئیس کا بھانجا پڑھتا جو بہت ہی شریر تھا اس کی یہ حالت تھی کہ پائے خانہ کی دیواروں پر اساتذہ مدرسہ کے نام لکھتا تھا، لوگوں کو فکر ہوئی کہ کون نالائق ہے۔ آخر لوگوں نے خفیہ طور پر تفتیش کی اور پہلا لکھا ہوا سب مٹا کر یہ انتظام کیا کہ جو شخص پاخانہ سے نکلتا اس کے نکلنے کے بعد فوراً دیکھا جاتا کہ کچھ لکھا ہوا تو نہیں آخر وہ لڑکا جو ایک دفعہ نکلا تو دیوار پر نام لکھے ہوئے پائے گئے اور اس کو پکڑ کر مدرسین کے پاس لایا گیا تو ایک مدرس نے سخت سزا دی حتیٰ کہ مارتے مارتے بیہوش کر دیا اور اس کی جان کا خطرہ ہو گیا، بعض لوگوں نے اس کے ماموں کو اطلاع دی، فوراً کانپور آئے تو واقعی لڑکے کی حالت نازک تھی مگر علاج معالجہ سے افاقہ ہوا اور بچنے کی امید ہوگئی، شہر کے لوگوں نے ان کو بہت بہکایا کہ پولیس میں رپٹ لکھوادو مگر وہ سمجھدار آدمی تھے انہوں نے گوارا نہ کیا کہ ایک دینی مدرسہ کی شکایت غیروں کے پاس لے جاؤں وہ میرے پاس آئے اور کہنے لگے کہ صاحب میری عدالت تو آپ ہیں، میں آپ کے یہاں استغاثہ کرتا ہوں، میں نے چپکے سے ان مدرس صاحب کے پاس رقعہ تو لکھا کہ تم اسی وقت اپنا استعفیٰ داخل کر دو چنانچہ انہوں نے ایسا ہی کیا پھر میں نے رئیس صاحب سے کہا کہ میرے پاس ان صاحب کا استعفیٰ ملازمت سے آ گیا ہے اور وہ آپ کے سامنے ہے اب ہم کو ان پر کوئی حق مواخذہ کا نہیں رہا کیونکہ وہ مدرسہ کے ملازم ہی نہ رہے اس لئے میں کچھ نہیں کر سکتا۔ آپ کا جہاں جی چاہے استغاثہ دائر کر کے انتقام لے لیجئے۔ وہ کہنے لگے کہ کیا آپ نے اس کا استعفیٰ منظور کر لیا ہے، میں نے کہا اور رد کرنے کا ہم کو کیا اختیار ہے وہ بیچارے بہت بڑے اہل آدمی تھے، کہنے لگے کہ یہ تو میری بڑی نحوست ہوئی کہ میری وجہ سے ایک عالم مدرسہ سے الگ ہوتے ہیں اور ان کا فیض مدرسہ سے بند ہو جاتا ہے، میں اپنا استغاثہ واپس لیتا ہوں اور آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ میں کہیں استغاثہ نہ کروں گا، میں نے اپنا حق معاف کیا آپ ان کا استعفیٰ واپس کر دیں ان کی اس اہلیت سے میں بہت خوش ہوا کہ شاباش مسلمان کو دین سے اتنی ہی محبت ہونا چاہئے۔ اس کے بعد ان کی عجیب خوش فہمی یہ تھی کہ مجھ سے کہنے لگے کہ میرا خیال یہ تھا کہ اس لڑکے کو اپنے ہمراہ لے جاؤں اور گھر پر اس کی تعلیم کا انتظام کروں مگر اب میں یہ چاہتا ہوں کہ اس کو کچھ دنوں مدرسہ ہی میں رکھو کیونکہ ابھی اگر میں اسے گھر لے گیا تو یہ اس حالت میں جائے گا کہ اس کے دل میں ایک عالم سے کینہ اور بغض ہوگا اور یہ اس کی آخرت کو مضر ہے اس لئے چند روز اس کو مدرسہ ہی میں رکھا جاوے اور انہیں حضرت کے سپرد کیا جائے جنہوں نے اس کو مارا تھا اور ان کو کہہ دیا جائے کہ اب اس کے ساتھ شفقت و ملاطفت کا

ایسا برتاؤ کریں جس سے اس کے دل کا خار نکل جائے اور ان سے اس کو محبت ہو جائے پھر میں اس کو گھر بلالوں گا۔ واقعی میں اس کی سلامت فطرت پر حیران رہ گیا اور بے ساختہ میرے دل سے ان کے لئے دعا نکلی اور اس وقت ہی میری سمجھ میں یہ تدبیر آئی کہ بچوں پر زیادتی ہو جائے تو اس کی تلافی اس طرح کرنا چاہیے (دیکھئے بعضے دنیا دار بھی کیسی سمجھ کے ہوتے ہیں)۔

معلمین کی زیادتیاں

بعضے میاں جی بچوں پر مار کا ظلم نہیں کرتے مگر اور طرح ظلم کرتے ہیں، وہ یہ کہ ان سے اپنے گھر کی خدمت لیتے ہیں، کہیں پانی بھرواتے ہیں، کہیں آٹا پسواتے ہیں، کبھی مٹی ڈھواتے ہیں۔ یاد رکھو والدین کی اجازت کے بغیر نابالغ بچوں سے ایسی خدمت لینا جائز نہیں۔ بعضے میاں جی یہ کرتے ہیں کہ گرمیوں کی دوپہر میں خود تو سورہتے ہیں اور بچوں سے پنکھا جھلواتے ہیں، یہ کتنا بڑا ظلم ہے، آخر جس طرح تم کو نیند آتی ہے ان کو بھی تو آتی ہے مگر بعضے لڑکے ان کے بھی چچا ہوتے ہیں۔ لوہاری میں ایک میاں جی تھے ان کے پاس جہاں سے کچھ مٹھائی آتی اور وہ حفاظت کے ساتھ رکھتے، لڑکے سب کھا جاتے اور کوئی ثبوت ہوتا نہ تھا۔ ایک مرتبہ کہیں سے بتاشے آئے انہوں نے بتاشوں کو لوٹے میں رکھ کر اوپر سے آٹا لگا کر منہ بند کر دیا جو سوکھنے کے بعد بچوں سے وقت کے ساتھ کھلتا اور راز ظاہر ہو جاتا۔ اب لڑکے آئے اور سوچنے لگے کہ آج تو میاں نے بڑا انتظام کیا ہے اگر منہ کو کھولتے ہیں پتہ چل جائے گا، ایک لڑکے نے کہا میں اس کی ترکیب بتاتا ہوں، اس کی ٹونٹی میں پانی ڈالو، اس سے بتاشے گھل جائیں گے۔ پھر شربت کو سب پی جاؤ۔ چنانچہ ایسے ہی کیا اور لوٹا بند رہا۔ اب جو میاں جی نے کسی دن خوش خوش اس کے منہ کو کھولا وہاں کچھ بھی نہ تھا تو بعض لڑکے ان میاں جیوں کی بھی خوب گت بنا دیتے ہیں مگر اکثر یہی زیادتی کرتے ہیں۔ بعضے میاں جی دوسروں کے کام بھی بچوں سے لیتے تھے۔ مثلاً کوئی مر گیا تو اس کا تیجہ بچوں سے پڑھواتے ہیں اور بعضے میت کے گھروں پر بھی بھیج دیتے ہیں۔ کانپور میں بھی یہ رواج تھا کہ بچوں کو تیجے کے لئے لے جاتے ہیں، میں نے روک دیا کہ بچے مدرسہ میں تیجے کے واسطے نہیں آتے بلکہ نتیجہ کے واسطے آتے ہیں۔ یہاں سے اس کام کے لئے کوئی نہ جائے گا تب یہ سلسلہ بند ہوا۔ غرض بچوں سے ایسی خدمت لینا جائز نہیں جس میں والدین کی رضا نہ ہو اور اگر رضا بھی ہو تو جو خدمت بچوں کی طاقت سے باہر ہو یا خدمت خلاف سنت ہو (جیسے تیجہ کے دانے پڑھوانا ۱۲) وہ بھی جائز نہیں۔ میاں جیوں کو اس کا خیال رکھنا چاہیے۔

رسمی مشائخ کا ظلم

ایک طبقہ اور ہے جو بچوں کی جان و مال پر ظلم کرتا ہے وہ رسمی مشائخ کا طبقہ ہے یہ تو مریدوں کو اپنی ملک سمجھتے ہیں اور ان سے آئے دن فرمائش کرتے ہیں، کبھی پاؤں دبواتے ہیں، کبھی پنکھا جھلواتے ہیں، کبھی کہتے ہیں کہ اب کے آؤ تو انگور لانا، بعضے گھوڑے کے لئے گھاس منگواتے ہیں اور ایسی خدمتیں لیتے ہیں جو اکثر ان پر بار ہوتی ہیں۔ یاد رکھو یہ بھی جائز نہیں ہے۔ کیسا ہی مخلص مرید ہو از خود اس سے کوئی فرمائش نہ کرنا چاہیے ورنہ تمہاری وہ حالت ہوگی جیسے ایک مرید نے کہا تھا کہ میں نے خواب دیکھا ہے کہ آپ کی انگلیاں تو شہد میں بھری ہوئی ہیں اور میری انگلیاں پاخانے میں، وہ بڑے خوش ہوئے کہنے لگے کیوں نہ ہو، بحمد اللہ ہم پاک صاف ہیں اور تم دنیا دار گندگیوں کے اندر بھرے ہوئے ہو، کہنے لگا حضور یہ تو سچ ہے مگر ابھی خواب پورا نہیں ہوا۔ پھر میں نے دیکھا کہ آپ کی انگلیاں میں چاٹ رہا ہوں اور میری انگلیاں آپ چاٹ رہے ہیں۔ اب تو وہ بڑے جھلائے کہ نالائق ہے مردود ہے، کہنے لگا حضور میں نے خواب بیان کیا ہے جو دیکھا تھا وہی عرض کر دیا۔ واقعی اگر یہ خواب تھا تو اس کی تعبیر ظاہر ہے کہ مرید تو شیخ سے دین حاصل کر رہا ہے اور شیخ مرید سے دنیا وصول کر رہا ہے اگر اس نے گڑھا تھا تو بہت ہی موقع کے مطابق گڑھا۔ اس لئے مشائخ کو اس کا خیال رکھنا چاہیے کہ مریدوں کی دنیا پر نظر نہ کریں اور از خود کسی سے کچھ فرمائش نہ کریں، ہاں کسی سے بہت ہی بے تکلفی ہو جہاں بار ہونے کا مطلق احتمال نہ ہو۔ اس سے کوئی بہت ہی ہلکی فرمائش کا مضائقہ نہیں مگر ایسے مخلص ہزار میں ایک دو ہی ہوتے ہیں۔ عام حالت یہی ہے کہ لوگوں کو فرمائش سے گرانی ہوتی ہے بلکہ خود ہدایا میں بھی جن کی خود فرمائش بھی نہیں کی جاتی، خلوص و محبت کی رعایت سخت ضروری ہے، ہر وقت ہدیہ قبول کرنے کو تیار نہ بیٹھے رہا کریں کیونکہ بعض لوگ محض اس خیال سے ہدیہ دیتے ہیں کہ اگر نہ دیں گے تو شیخ کو یہ خیال ہوگا کہ اس کو ہم سے محبت نہیں یا دوسرے یہ سمجھیں گے کہ اس کا تعلق نہیں اور ظاہر ہے کہ اس صورت میں خلوص کہاں (خلوص و محبت کے تو یہ معنی ہیں کہ ہدیہ دینے والے کو دنیا کی غرض سے تو کیا آخرت کی بھی غرض مقصود نہ ہو یعنی ثواب کا بھی قصد نہ ہو کیونکہ ثواب کے لئے کچھ دینا صدقہ ہے ہدیہ نہیں ہے، ہدیہ وہ ہے جو محض تطییب قلب مہدی لہ کے لئے دیا جائے۔ گو تطییب قلب مسلم بھی ثواب کا موجب ہے اور اس سے ثواب کی نیت مذموم نہیں مگر ثواب اعطاء کا قصد نہ ہونا چاہئے۔ (کذا قالہ الشیخ) اور فکر کے بعد خلوص محبت کی پہچان ہو جاتی ہے پھر دھوکہ کم ہوتا ہے، ہمیشہ سے اس کی فکر ہے، گو کبھی دھوکہ بھی ہو

جاتا ہے۔ چنانچہ بحمد اللہ مجھے اس کی پہچان میں ملکہ ہوگیا ہے، بہت کم دھوکہ ہوتا ہے کیونکہ ہمیشہ سے اس کی فکر ہے، گو کبھی دھوکہ بھی ہوجاتا ہے کیونکہ آخر بشر ہوں اور وہ بھی باء جارہ کے ساتھ نہ کہ فاء فعل کے ساتھ مگر ایسا شاذ و نادر ہوتا ہے۔ میرے پاس آج کل ہی میں تین خط آئے اور تینوں ساتھ ہی آئے اور ایک ہی جگہ سے چلے ہوئے تھے غالباً بہار کی طرف سے آئے تھے اور تینوں کا طرز خط بھی یکساں تھا۔ ایک خط میں لکھا تھا کہ میں ڈیڑھ سو روپیہ ہدیہ بھیجنا چاہتا ہوں جس کے لئے اجازت کا طالب ہوں، دوسرے میں ایک سو اٹھارہ روپے لکھے تھے اور تیسرے میں شاید صرف اٹھارہ روپے تھے، مجھے ایک ہی دن میں تین خطوط کے آنے سے شبہ ہوا۔ پھر مضمون اور رسم الخط یکساں دیکھ کر یہ شبہ قوی ہوگیا کہ شاید ان سب میں کچھ مشورہ ہوا ہے یا ایک ہی شخص نے بدل کر تین خط بھیجے ہیں۔ اب میں بڑا پریشان ہوا کہ کیا جواب دوں، اگر منظور کرلوں کہ ہاں بھیج دو تو اس کے ساتھ یہ شبہ ہوا کہ شاید یہ محض باہمی مشورہ اور ان لوگوں کو امتحان مقصود ہو تو اس جواب سے دین کی سبکی ہوگی اور اگر انکار کروں تو شبہ تھا کہ شاید ان لوگوں نے خلوص سے لکھا ہو۔ سو محض اپنے گمان پر میں مخلصین کی دل شکنی کیسے کروں، اگر پھر گمان بھی اتنا ہی ہوا تھا کہ شاید باہم مشورہ ہوا ہے۔ سو مشورہ میں بھی خلوص ہوسکتا ہے۔ ممکن ہے یہاں کسی طالب علم کو یہ شبہ پیدا ہوا ہو کہ جب عدم خلوص کا علم نہ تھا تو قبول کرنا حلال تھا۔ وہاں بیشک یہ صحیح ہے مگر جب تھوڑی سی کوشش سے علم حاصل ہوسکے تو سستی کیونکر جائز ہوگی۔ بات یہ ہے کہ باہم مشورہ میں گو خلوص ہوسکتا ہے مگر بعض دفعہ ایسا بھی ہوتا ہے کہ ایک کی رائے ہوتی ہے ایک کی نہیں ہوتی، وہ محض شرما شرمی سے شریک ہوجاتا ہے اور یہی اغلب و اکثر ہے۔ مشورہ میں سب کا خلوص نادر ہے تو اس احتمال قوی کے ہوتے ہوئے ان ہدایا کا مطلقاً قبول کرلینا کیونکر جائز ہوتا اور ترجیح کے لئے کسی مرجح کی ضرورت تھی، یہاں مرجح کوئی تھا نہیں کیونکہ میں ان کاتبین میں سے کسی سے بھی واقف نہ تھا اس لئے میں نے اس شبہ کے زائل کرنے کی تدبیر سوچی اور جو شخص اللہ اور رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی اتباع کرنا چاہتا ہے حق تعالیٰ اس کی امداد فرماتے ہیں۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے میری امداد فرمائی اور یہ دل میں آیا کہ ابھی نہ اقرار کرنا چاہیے نہ انکار بلکہ ان لوگوں سے استفسار کرنا چاہیے کہ مجھ کو یہ شبہ ہوا ہے آیا صحیح ہے یا نہیں۔ اس کے بعد جو کچھ جواب آئے گا اسے اصل حقیقت معلوم ہوجائے گی چنانچہ میں نے ہر شخص کو یہی لکھ دیا کہ آپ کا خط آیا ہے اور تعجب ہے کہ اس کے ساتھ اسی دن کی ڈاک میں دو خط اسی مضمون کے اور آئے اور جن کا رسم الخط بھی اسی خط سے ملتا ہوا تھا۔ اس اتفاقی اجتماع سے مجھے یہ شبہ ہوتا ہے کہ شاید باہم کچھ مشورہ ہوا ہے۔ آیا میرا یہ خیال صحیح ہے یا غلط، اس جواب کو لکھے ہوئے تقریباً دس بارہ دن ہوگئے مگر آج

تک بھی ان کا خط نہیں آیا بس سب خاموش ہو کر بیٹھ رہے ہیں۔ میں نے خدا تعالیٰ کا بہت شکر ادا کیا کہ اس نے دنیاداروں کی چالاکی و تحقیر سے بچالیا اور صاحب ہماری عزت تو کیا چیز ہے مگر اہل علم کی حرص وغیرہ سے لوگ دین اور علم کو حقیر سمجھنے لگتے ہیں۔ پس مشائخ کو اس میں بہت احتیاط کرنا چاہیے اور بدوں سوچے سمجھے ہر ایک کا ہدیہ قبول نہ کیا کریں کیونکہ التزام میں خلوص نہیں ہوتا۔

خالی آنے جانے کا مسئلہ

اور یہ مشہور ہے کہ خالی جاوے خالی آوے، اس کا مطلب یہ ہے کہ جو خلوص سے خالی جاویں وہ فیوض سے خالی آوے۔ یہ مطلب نہیں کہ جو فلوس سے خالی جاوے وہ بھی محروم ہی آتا ہے اور اگر کسی کو ایسا ہی التزام کا شوق ہے تو اس کی صورت یہ ہے کہ اس کا اہتمام نہ کرے کہ ہر دفعہ بڑھیا چیز ہی لے جاوے بلکہ کبھی کبھی معمولی چیزیں بھی لے جایا کرے (مثلاً مسواک لے گئے یا ایک دو پیسہ کی روشنائی ہی لے گئے، یا ایک دو قلم لے گئے، کبھی دو چار خوشبودار پھول لے آئے وغیرہ وغیرہ ۱۲) بزرگان سلف ایسا ہی کرتے تھے کہ جب ہدیہ کا شوق ہوا تو جو چیز بھی ملی خواہ کیسی ہی معمولی ہو وہی لے گئے اس کے لئے اہتمام اور تکلف نہ کرتے تھے۔ حضرت حاجی صاحب رحمۃ اللہ علیہ فرماتے تھے کہ ایک بزرگ دوسرے بزرگ سے ملنے گئے، راستہ میں خیال ہوا کہ کچھ ہدیہ لے چلنا چاہیے، کوئی دوسرا ہوتا تو گھر واپس آتا مگر انہوں نے یہ کیا کہ جنگل میں سے کچھ سوکھی ہوئی لکڑیاں اٹھالیں اور لا کر ان بزرگ کے سامنے رکھ دیں کہ یہ لکڑیاں حضرت کے لئے پانی گرم کرنے کو لایا ہوں، وہ بزرگ اس ہدیہ سے بڑے خوش ہوئے اور اس کی ایسی قدر کی کہ فوراً اپنے خادم کو بلایا اور کہا کہ لکڑیاں بہت حفاظت سے رکھو جب ہم مر جائیں تو ہمارے غسل کے لئے اس سے پانی گرم کیا جاوے۔ امید ہے کہ حق تعالیٰ اس ہدیہ حلال وخالص کی برکت سے میری مغفرت فرمادیں۔ سبحان اللہ! کیسے قدردان لوگ تھے تو اس طرح اگر التزام بھی کرو تو کچھ مضائقہ نہیں اگر گھاس پھوس نہ ملے تو کم از کم دو چار مٹی کے ڈھیلے ہی استنجاء کے لئے لے جائے اور اگر یہ خیال ہو کہ ایسے حقیر ہدیہ سے شیخ ناخوش ہوں گے اور اس کی قدر نہ کریں گے تو یاد رکھو ایسا شخص شیخ بنانے کے قابل نہیں جس کو خلوص کی قدر نہ ہو، فلوس ہی کی قدر ہو۔ صاحب تم کر کے دیکھو محبت کی قدر ضرور ہو جاتی ہے، چاہے ہدیہ ظاہر میں قلیل ہی ہو اور دنیا میں قدر نہ ہو تو خدا کے یہاں تو ضرور قدر ہو گی۔ حضرت سلطان نظام الدین رحمۃ اللہ علیہ نے حضور پرنور صلی اللہ علیہ وآلہ

وسلم (فداہ ابائنا وامھاتنا وارواحنا ، وما بایدنا ۱۲) کی روح پر فتوح کو ثواب پہنچانے کے لئے کھانا پکوایا تھا (کیونکہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ہدیہ ثواب سے زیادہ اور کس چیز میں وہ خرچ کرتے ۱۲) کھانا تیار ہوگیا تو خدام نے اجازت چاہی کہ اس کو اٹھا کر تقسیم کر دیا جائے۔ سلطان جی نے فرمایا کہ ابھی ذرا ٹھہرو، پھر کچھ دیر کے بعد پوچھا تو فرمایا ابھی ٹھہرو، کچھ دیر کے بعد فرمایا کہ اب تقسیم کرو۔ کسی خادم نے وجہ پوچھی کہ آپ کو کس کا انتظار تھا، پہلے بار بار انکار کیوں تھا اور اب اجازت کیسے دے دی، فرمایا اس وقت میرے بھائی علی احمد صابر نے بھی حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی روح پر فتوح کی ثواب کے لئے بھونے ہوئے چنے تقسیم کئے تھے تو اپنا کھانا تقسیم کرنا نہیں چاہا بلکہ میں نے یہ چاہا کہ ذرا حضور ادھر متوجہ ہوں تو کھانا اٹھاؤں، تو دیکھئے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو حضرت صابر کے چنے اس قدر محبوب تھے کہ آپ ہمہ تن اس طرف متوجہ تھے حالانکہ حضرت سلطان جی کے کھانے ظاہر میں ان سے بہت بڑھے ہوئے تھے مگر چونکہ حضرت صابر رحمۃ اللہ علیہ کے پاس زیادہ سامان نہ تھا انہوں نے ساری عمر گولر اور درخت کے پتے کھا کر ہی گزار دی حتیٰ کہ چند سیر سے زیادہ اناج عمر بھر میں بھی ان کے پیٹ میں نہیں پہنچا۔ واقعی بڑے صابر تھے مگر آج کل لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ جیسا ہدیہ ہوگا ویسا ہی ثواب ہوگا، اگر ہدیہ قلیل ہو تو ثواب بھی قلیل ہوگا۔ صاحبو! یہ صحیح نہیں بلکہ وہاں تو خلوص کو دیکھا جاتا ہے اگر ہدیہ قلیل ہو مگر خلوص زیادہ ہو تو ثواب زیادہ ملے گا اور ہدیہ زیادہ ہو تو خلوص کم ہو تو ثواب کم ہوگا۔ البتہ اگر دونوں زیادہ ہوں، خلوص بھی اور ہدیہ بھی تو بے شک یہ نور علیٰ نور ہوگا۔ ہاں اس کے بعد پھر اس کو بھی دیکھا جاتا ہے جس نے زیادہ دیا ہے، وہ صاحب وسعت ہے اور جس نے کم دیا ہے وہ صاحب وسعت نہیں، تو باوجود خلوص میں برابر ہونے کے بھی کم وسعت والے کا ہدیہ صاحب وسعت کے ہدیہ سے بڑھ جائے گا۔۱۲)

ایصال ثواب میں اعتقادی غلطی

بعض لوگوں میں ایک غلطی اعتقادی یہ بھی ہے کہ ثواب کی نوعیت میں بھی کھانے کے موافق سمجھتے ہیں۔ چنانچہ شیر خوار بچوں کے لئے ایصال ثواب میں دودھ دیتے ہیں، گوشت نہیں دیتے یہ سمجھتے ہیں کہ انکے دانت کہاں ہیں جو گوشت کھائیں، اسی طرح شہداء کو سبیل میں شربت کا ثواب پہنچاتے ہیں کیونکہ وہ پیاسے شہید ہوئے تھے اس کے علاوہ اس اعتقادی غلطی کے دوسری غلطی یہ بھی ہے کہ گویا ان کے نزدیک شہداء اب تک پیاسے ہی ہیں۔ نعوذ باللہ! اے صاحب انہوں نے

تو مرتے ہی جنت کا ایسا شربت پیا ہوگا جس سے عمر بھر بھی پیاس نہ لگے، اس کے متعلق خیر آباد کے ایک بزرگ کا قصہ مشہور ہے کہ ان کے ایک مرید نے زندگی میں ان کی فاتحہ کی تھی۔ جب وہ فاتحہ دلا کر ان سے ملنے آیا تو فرمانے لگے کہ بھائی ذرا فاتحہ دیتے ہوئے گرم ٹھنڈے کا تو خیال کر لیا کرو، تم نے فاتحہ میں فرینی ایسی جلتی ہوئی دی کہ اب تک میری زبان میں چھالے پڑے ہوئے ہیں حالانکہ مرید نے اپنے گھر پر فاتحہ دی تھی مگر وہ جلتی جلتی ہی فقیروں کے منہ سے پیر صاحب کے منہ میں پہنچ گئی ہمیں یہ قصہ گھڑا ہوا معلوم ہوتا ہے، واہیات بھلا ایصال ثواب سے دوسروں کو ثواب پہنچتا ہے یا وہی کھانا پہنچتا ہے۔ یقیناً ثواب پہنچتا ہے اور ثواب گرم ٹھنڈا ہوتا نہیں بلکہ وہ نیکیاں ہیں جو مہدی لہ کے نامہ اعمال میں لکھی جاتی ہیں جس کا صلہ جنت کے درجات ہوتے ہیں۔ بہر حال یہ قصہ محض لغو ہے، ثواب کے لئے تو نص قطعی ہے۔

لَنْ يَّنَالَ اللّٰهَ لُحُوْمُهَا وَلَا دِمَآؤُهَا وَلٰكِنْ يَّنَالُهُ التَّقْوٰى مِنْكُمْ

کہ خدا کے یہاں نہ قربانی کے جانوروں کا گوشت پہنچتا ہے نہ خون بلکہ وہاں تو تقویٰ (اور خلوص) پہنچتا ہے۔ اس نص سے عوام کی غلطی ظاہر ہوگئی جو ثواب کو کھانے کے موافق سمجھتے ہیں اور اسی نص کے موافق اہل اللہ کے یہاں بھی خلوص کی قدر ہوتی ہے۔ گو ظاہر میں ہدیہ قلیل ہو۔ چنانچہ ان بزرگ نے لکڑیوں کے گٹھڑ کی یہ قدر کی کہ اس کو اپنے جنازہ کے غسل کے لئے احتیاط سے رکھوایا۔ بعض دفعہ اہل اللہ تو کسی کے ہدیہ کی تحقیر نہیں کرتے مگر ان کے خدام تحقیر کرتے ہیں تو خدام کی رعایت نہ کرنا چاہیے اور مشائخ کو چاہیے کہ کسی کو اپنا خادم خاص نہ بنائیں جس کو ان کے کاموں میں زیادہ دخل ہو۔ بعض دفعہ یہ حواشی غضب کرتے ہیں کہ مریدوں کے ہدایا کی تحقیر کرتے ہیں اور بعض مریدوں کی شکایتیں شیخ سے کرتے رہتے ہیں جس کو چاہتے ہیں بڑھا دیتے ہیں اور جس کو چاہتے ہیں گرا دیتے ہیں۔ پھر شیخ بھی آخر بشر ہے، سنتے سنتے کچھ اثر اس کا قلب پر بھی ہو ہی جاتا ہے اس لئے میں تو بجائے حواشی کے ان کو مواشی کہتا ہوں۔ غرض ظلم سے بہت کم لوگ بچے ہوئے ہیں۔ مشائخ تو مریدوں کی جان میں تصرف کرتے ہیں اور میاں جی بچوں کی جان میں اور رؤسا غریبوں کی جان میں۔

صفائی معاملات

بعض جگہ رؤسا میں یہ دستور ہے کہ چوپال میں بیٹھے ہوئے ہیں اور سامنے سے کوئی غریب مزدور سر پر بوجھ رکھے ہوئے گزرا تو اس کو بلا کر کہہ دیا کہ بوجھ تو یہاں رکھ دے اور فلاں جگہ جا کر یہ کام

کرآ، یہ صریح ظلم ہے کیونکہ اس سے لوگوں پر عموماً ناگواری ہوتی ہے۔ وہ غریب بیچارہ رئیس کے ڈر سے کچھ نہیں کہتا مگر اس کا دل ہی جانتا ہے کہ اس کا وقت کیسا کھوٹا ہوا۔ اگر کام ہی لینا ہے تو اس کا طریقہ یہ ہے کہ اس سے کہو کہ ہم کو فلاں جگہ ایک آدمی بھیجنے کی ضرورت ہے اور اتنی مزدوری دیں گے اگر تجھے مزدوری لینا ہو تو بوجھ رکھ کر یہ کام کر لے۔ غرض غریب کا دل خوش کر کے پھر کام اور غریب کا خوش کر دینا ہی کیا مشکل کام ہے دو چار آنے کے پیسوں میں بے چارہ خوش ہو جاتا ہے مگر تراضی طرفین سے ہو۔

بعض لوگ یہ کرتے ہیں کہ ٹم ٹم اور گاڑی کا کرایہ طے نہیں کرتے نہ قلی کی مزدوری چکاتے ہیں۔ بعض بے کہے سنے سوار ہو گئے یا مزدور کے سر پر بوجھ لاد دیا اور بعد میں سرکاری نرخ کے موافق کرایہ دیتے ہیں تو یاد رکھو یہ جائز نہیں بلکہ کرایہ اول چکانا چاہیے۔

اس پر بعض لوگوں کو شبہ ہوگا کہ لیجئے حکومت نے تو ٹم ٹم والوں اور قلیوں کی زیادتی سے مسافروں کو محفوظ کرنے کے لئے ایک نرخ مقرر کیا تھا، شریعت نے اس کو بھی ناجائز کر دیا جس کا مطلب یہ ہے کہ بس جتنا بھی کوئی مانگے وہی دو چاہے لٹ ہی جاؤ۔ اس کا جواب یہ ہے کہ شریعت نے ظلم کو روکنا چاہا۔ نیز اس سے بھی بچانا چاہا کہ بعد میں نزاع نہ ہو۔ سو ظاہر ہے کہ مزدور سے بلا رضامندی کام لینے کا کسی کو کیا حق ہے۔ باقی حکومت نے جس مصلحت سے نرخ نامے مقرر کیے ہیں شریعت اس کو فضول نہیں کہتی مگر اس کی صورت شریعت کے موافق یہ ہے کہ ٹم ٹم والے سے یا قلی سے کام لینے سے پہلے صاف کہہ دو کہ ہم سرکاری نرخ نامے کے موافق تم کو کرایہ یا مزدوری دیں گے اس سے زیادہ نہ دیں گے۔ اگر خوشی ہو قبول کر لو، اگر وہ اس پر بھی آپ کو بٹھا لے یا سامان اٹھا لے تو پھر سرکاری نرخ کے موافق کرایہ دینا جائز ہے کیونکہ آپ نے اب معاملہ صاف کر لیا اور دوسرے نے بخوشی اس کو منظور کر لیا ہے۔ پس تم سرکاری نرخ نامے کے موافق ہی دو مگر پہلے کہہ دو۔ یہ نہیں کہ اول تو خاموش سوار ہو جاؤ اور بعد میں سرکاری نرخ کے حساب سے دو کیونکہ ممکن ہے کہ ٹم ٹم والے نے اس مزدوری کے خیال سے آپ کو نہ بٹھایا ہو بلکہ ٹم ٹم والوں کے عام رواج کے موافق مزدوری لینا چاہتا ہو، پھر بعد میں نزاع ہوگا۔ چنانچہ ہم نے اکثر لوگوں سے نزاع ہوتے ہوئے دیکھا ہے (اگر انسان میں تھوڑی سی بھی شرافت ہو تو وہ بعد کے نزاع کو ہرگز گوارا نہ کرے گا۔ یہی شریعت کی تعلیم ہے کہ مزدوری اور کرایہ اول طے کر لو چاہے سرکاری نرخ ہی کے موافق طے کر لو، بدون صفائی کے کسی چیز سے منتفع نہ ہو)

حکام کا ظلم

اسی طرح بعض حکام یہ ظلم کرتے ہیں کہ دورہ کے وقت کہیں سے بلا قیمت دودھ منگواتے ہیں، کہیں سے پھل منگواتے ہیں اور بعض جگہ قصبات کے روساان کے لئے یہ چیزیں بھیجتے ہیں۔ پہلی صورت تو صریح ظلم ہے اور دوسری صورت رشوت میں داخل ہے اور اس میں بھی اکثر ظلم کر کے ان سے لیتے ہیں اور حکام کے ڈیرہ پر پہنچاتے ہیں۔ جب حکومت کی طرف سے دورہ کرنے والوں کو ماہوار تنخواہ ملتی ہے اور دورہ کا بھتہ بھی ملتا ہے پھر ان کو بستی والوں سے یہ چیزیں لینے کا کیا حق ہے۔ مسلمانوں کو اس طریقہ سے بچنا چاہیے۔

بعض دفعہ یہ ہوتا ہے کہ حاکم خود تو منتظم ہوتا ہے کسی سے رشوت نہیں لیتا نہ کسی پر ظلم کرتا ہے مگر ان کے متعلقین چپڑاسی وغیرہ ظلم کرتے ہیں۔ اس لئے حاکم تنہا اپنی احتیاط سے نجات نہیں پا سکتا بلکہ اس کا انتظام بھی اس کے ذمہ ہے کہ متعلقین بھی ظلم نہ کرنے پائیں جس کی صورت یہ ہے کہ عام طور سے اشتہار دے دے کہ میرے یہاں رشوت کا بالکل کام نہیں اس لئے اگر میرے عملہ میں سے کوئی شخص کسی سے رشوت لے تو ہرگز کوئی نہ دے بلکہ ہم سے اس کی اطلاع کرے۔ پھر اطلاع کے بعد جس نے ایسی حرکت کی ہو اس سے رقم واپس کرائے اور کافی سزا دے۔ نیز جو شخص حاکم سے ملنے آئے اس کو خود جا کر دروازہ سے باہر تک پہنچائے تاکہ نکلتے ہوئے کوئی چپڑاسی وغیرہ اس کو تنگ نہ کرے۔ قرآن میں نص ہے:

وَاِنْ اَحَدٌ مِّنَ الْمُشْرِكِيْنَ اسْتَجَارَكَ فَاَجِرْهُ حَتّٰى يَسْمَعَ كَلٰمَ اللّٰهِ ثُمَّ اَبْلِغْهُ مَاْمَنَهٗ

(اور اگر کوئی شخص مشرکین میں سے آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے پناہ کا طالب ہو تو آپ اس کو پناہ دیجئے تاکہ وہ کلام الٰہی سن سکے پھر اس کو اسکے امن کی جگہ پہنچا دیجئے)۔

علت سے اس کے عموم میں یہ صورت بھی قیاسا داخل ہے۔ نیز حکام کو بھی یہ چاہیے کہ لوگوں کے تعلقات براہ راست اپنے سے رکھیں، کسی شخص کو واسطہ نہ بنائیں کیونکہ یہ واسطے بہت ستم ڈھاتے ہیں۔ اگر یہ کہو کہ صاحب! یہ تو بڑا مشکل ہے تو میں کہوں گا ہاں بیشک بڑا مشکل ہے مگر حکومت کرنا آسان نہیں۔ یہ منہ کا نوالہ نہیں، حاکم ہر وقت جہنم کے کنارے پر ہے۔ اگر جہنم کے عذاب سے بچنا چاہتے ہو تو اس کی صورت یہی ہے اور تم نے تو یہ بلا خود اپنے سر لی ہے۔ تم نے

کوششیں کر کے اور سفارشیں کرا کے حکومت حاصل کی ہے پھر اس کے حقوق ادا کرنے سے کیوں جان چراتے ہو جو بلا خود تم نے اپنے سر لی ہے اس کا مزہ چکھو۔

صاحبو! حکومت وہ چیز ہے کہ حضرات سلف تو اس سے بھاگتے تھے، ماریں کھاتے تھے اور قبول نہ کرتے تھے۔ امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ جن کے آپ مقلد کہلاتے ہیں اسی پر شہید کئے گئے۔خلیفہ وقت نے ان کو کئی دفعہ عہدہ قضا پر مامور کیا مگر انکار کر دیا کیونکہ ان کو یہ حدیث یاد تھی کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے:

من جعل قاضیا فقد ذبح بغیر سکین. (المسند الامام احمد ۲:۳۶۵، شرح السنة للبغوی ۱۰:۹۲)

یعنی جو شخص قاضی بنا دیا گیا وہ بدوں چھری کے ذبح کر دیا گیا۔ اس لئے امام صاحب عذر کرتے تھے۔ آخر اسی بات پر امام صاحب قید کئے گئے اور قید خانہ ہی میں زہر دے کر شہید کیے گئے۔ یہ سب کچھ گوارہ تھا مگر حکومت منظور نہ تھی۔

صاحبو! سلف کی یہ حالت تھی کہ جب خلفاء کسی عالم کو قاضی بنانا چاہتے اور وہ قضا کی مذمت اور وعید میں ان کو احادیث سناتے تو سلاطین ان کی خوشامد کرتے تھے کہ اچھا ہم تم کو چھوڑے دیتے ہیں مگر للہ یہ باتیں دوسروں سے نہ کہنا ورنہ سب لوگ قضاء کو چھوڑ دیں گے۔

لیکن یہ وعیدیں اسی حاکم کے لئے ہیں جو حکومت کے حقوق ادا نہ کرے اور جو عدل وانصاف کا اہتمام کر کے اس کے حقوق ادا کرے تو اس کے لئے قیامت میں عرش کا سایہ بھی ہے۔

مثالی حکام

مگر اب دیکھئے کہ جن لوگوں نے اس کے حقوق ادا کیے ہیں ان کی کیا حالت تھی، حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے جب شام کا دورہ کیا ہے تو آپؓ کے ساتھ کل یہ سامان تھا کہ ایک غلام تھا اور ایک اونٹ، اسی پر آقا اور غلام دونوں باری باری سوار ہوتے تھے اور کھانے کے لئے ستو کا ایک تھیلا تھا اور ایک کھجور کا، بس سارے راستہ اسی کو گھول کر پی لیا اور دو چار کھجوریں کھالیں نہ ساتھ میں خیمہ تھا نہ گھوڑے تھے نہ بہت لاؤ لشکر تھا۔ پھر راستہ میں جہاں ٹھہرتے تھے وہاں استقبال کرنے کی ممانعت تھی نہ کسی سے ہدیہ لیتے تھے نہ کسی گاؤں سے دودھ اور جنس منگاتے تھے۔ یہ تو خلیفہ کی حالت تھی۔

اب سردار لشکر کی حالت سنئے! جس وقت حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ ملک شام میں پہنچے اور

حضرت ابوعبیدہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ امیر العساکر الاسلامیہ کے خیمہ میں داخل ہوئے تو دیکھا نہ وہاں فرش وفروش ہیں نہ کچھ زیب وزینت ہے، بس چمڑہ کا بستر تھا اور خیمہ کی چوب میں ایک تھیلا لٹکا ہوا تھا۔ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے پوچھا کہ ابوعبیدہ! اس تھیلا میں کیا ہے فرمایا: اس میں روٹی کے سوکھے ہوئے ٹکڑے ہیں، افطار کے وقت ان کو بھگو کر کھالیتا ہوں۔ فرمایا: اے ابوعبیدہ! تم اس وقت ملک شام میں ہو جہاں قسم قسم کی نعمتیں ہیں، ہر چیز ارزاں ہے، تم یہ سوکھے ٹکڑے کس لئے کھاتے ہو، اپنے کو راحت کیوں نہیں دیتے، کہا اے امیر المؤمنین! کیا آپ کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی معیشت یاد نہیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے کس طرح زندگی بسر کی ہے، بس میں بھی یہی چاہتا ہوں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی طرح زندگی گزاروں۔ امیر المؤمنین! زندگی ایک دن ختم ہونے والی ہے چاہے اس کو راحت سے گزارو یا مشقت سے، اس وقت متنعم اور غیر متنعم سب یکساں ہوں گے۔ یہ باتیں سن کر حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ بھی رونے لگے اور وہ بھی روتے رہے۔

اس مضمون میں ایک بزرگ کا قطعہ عجیب ہے جو انہوں نے ایک رئیس کے جواب میں لکھا ہے۔ غالباً رئیس نے ان کی تکلیف کا حال سن کر لکھا تھا کہ آپ میرے پاس آجائیں تو یہاں آپ کو خوب راحت ملے گی۔ وہ جواب میں لکھتے ہیں۔

خوردن تو مرغ مسمی و مے   خوردن ماناں جوین ما

پوشش تو اطلس ودیبا حریر   بخیہ زدہ خرقہ پشمین ما

(تیری غذا مرغ مسلم ہے ہماری خوراک نان جویں ہے، تیرا لباس اطلس ودیبا وحریر کا ہے ہمارا خرقہ پیوند زدہ ہے)

اسی طرح سب چیزوں کا موازنہ کر کے فرماتے ہیں۔

نیک ہمیں است کہ می بگورد   راحت تو محنت دوشین ما

فرماتے ہیں کہ ہاں بے شک اس وقت تیرا کھانا ہمارے کھانے سے اچھا اور لباس ہمارے لباس سے اچھا ہے مگر یہی حالت اچھی ہے جو گزر رہی ہے۔

باش کہ تا طبل قیامت زنند   آں تو نیک آمد و یا این ما

قیامت آنے دو اس وقت معلوم ہو جائے گا کہ کس کی حالت اچھی ہے۔ (اہل اللہ کو خدا پر بھروسہ ہوتا ہے اس سے یہ فرمادیا، فخر کی نیت نہ تھی کیونکہ وہ آپ سے زیادہ ترساں ولرزاں رہتے ہیں۔

ان کو فخر کی کہاں مہلت ہے۔ کبھی تحدث بالنعمۃ کے طور پر کچھ کہہ دیتے ہیں جو صورت دعویٰ میں ہوتا ہے مگر واقع میں دعویٰ نہیں ہوتا) سرمد اسی مضمون کو اسی طور سے فرماتے ہیں۔

منعم کہ کباب می خورد می گزرد　　　　در بادہ ناب می خورد می گزرد

یعنی کباب و شراب کھانے والے بھی مریں گے اور فاقہ کرنے والے بھی مریں گے جس کا آگے ذکر ہے۔

سرمد کہ بکاسہ گدائی نان را　　　　ترکرد بآب می خورد می گزرد

(سرمد فقیری کے پیالہ میں روٹی کو تر کر کے کھاتا ہے اور ایام گزارتا ہے)

غرض سلف کے پیش نظر یہ باتیں تھیں۔ ان کو حکومت میں مزا کہاں تھا۔ عارف شیرازی فرماتے ہیں۔

مرا در منزل جاناں چہ امن وعیش چوں ہر دم　　　　جرس فریاد می دارد کہ بربندید محمل ہا

(منزل محبوب میں امن وسکون کہاں ہے جبکہ ہر وقت کوچ کی گھنٹی بجتی ہے کہ سامان سفر باندھ)

واقعی جس کو یہ فکر ہو کہ یہاں سے ایک دن جانا ہے وہ کس طرح چین سے بیٹھ سکتا ہے۔

احساس ذمہ داری

حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ ایک مرتبہ دوپہر کو سخت گرمی میں سر پر چادر ڈالے ہوئے ایک اونٹ کی تلاش میں جا رہے تھے۔ اس وقت حضرت عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ اپنے بالا خانے پر بیٹھے تھے۔ دور سے دیکھ کر یہ خیال ہوا کہ شاید امیر المؤمنین جا رہے ہیں۔ جب قریب آئے تو پکارا اے امیر المؤمنین! آپ اس دھوپ اور لُو میں کہاں جا رہے ہیں۔ فرمایا: بیت المال کا ایک اونٹ گم ہو گیا ہے اس کی تلاش میں جا رہا ہوں۔ عرض کیا کہ تھوڑی دیر کے بعد بھی تلاش ممکن تھی اس دھوپ میں کیوں تکلیف کی۔ فرمایا: جہنم کی آگ اس سے بھی سخت ہے۔ حضرت عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے عرض کیا کہ اچھا میں اپنے غلام کو بھیج دیتا ہوں آپ یہاں آرام کیجئے۔ فرمایا کہ قیامت میں تم سے یا تمہارے غلام سے باز پرس نہ ہوگی۔ بیت المال کے متعلق باز پرس تو مجھی سے ہوگی اس لئے میں اپنی رہائی کی فکر میں خود ہی کرنا چاہتا ہوں۔ یہ فرما کر تشریف لے گئے اور دوپہر کی دھوپ ہی میں اس کو تلاش کیا۔

عرب کی گرمی اور دھوپ مشہور ہے۔ اندازہ کر لیجئے کیسی سخت دھوپ ہوگی مگر امیر المؤمنین اس وقت

خود تلاش کے واسطے نکلے، دوسروں پر بھی بھروسہ نہ کیا تو حضرت جن کو حکومت میں جہنم سے بچنے کا خیال ہے وہ ایسی ایسی تکالیف برداشت کر کے حکومت کرتے ہیں۔ آپ نے اس کو منہ کا نوالہ سمجھا ہے اور باوجودیکہ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے عدل وانصاف و جفاکشی کی یہ حالت تھی کہ دنیا میں اس کی نظیر ملنا مشکل ہے اور خود حضرت ابوبکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو فخر تھا کہ میں نے ایسے شخص کو اپنا خلیفہ بنایا ہے جس کی کوئی نظیر نہیں ملتی۔ چنانچہ جب حضرت صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے ان کو اپنا خلیفہ بنایا تو ایک شخص نے کہا اے ابوبکرؓ تم نے مسلمانوں پر ایک سخت مزاج شخص کو خلیفہ بنادیا، خدا کو اس کا کیا جواب دو گے تو حضرت صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فخر کے ساتھ فرمایا کہ تو مجھے کیا ڈراتا ہے اگر مجھ سے سوال ہوا تو میں حق تعالیٰ سے عرض کروں گا کہ میں نے ایسے شخص کو خلیفہ بنایا تھا کہ روئے زمین پر اس سے بہتر کوئی نہ تھا۔

صاحبو! خدا کے یہاں ایسی ویسی بات نہیں چل سکتی، خدائے تعالیٰ کے سامنے پکی ہوئی بات کوئی کہہ سکتا ہے، پس حضرت صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو کوئی وثوق تھا جو وہ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے متعلق حق تعالیٰ کے سامنے شہادت دینے کو تیار تھے مگر اس پر بھی کسی صحابی نے حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو وصال سے دس یا پندرہ سال بعد خواب میں دیکھا کہ پیشانی سے پسینہ پونچھتے ہوئے آرہے ہیں، پوچھا: اے امیر المؤمنین! آپ کا کیا حال ہے فرمایا: عمرؓ قریب بہلاکت ہوگیا تھا، مرنے کے بعد سے جو حساب شروع ہوا ہے تو آج حساب سے فراغت ہوئی ہے۔ الحمدللہ کہ خدا تعالیٰ نے مجھے بخش دیا۔

تو حضرت حکومت کوئی مزہ کی چیز نہیں ہے جس کو جتنی بھی حکومت حاصل ہے اسی قدر اس کے ذمہ حقوق ہیں جن کا ادا کرنا اس کے ذمہ لازم ہے۔ پس حکام پر لازم ہے کہ جو شخص ان سے ملنے آئے اس کو جائے امن تک پہنچائیں تاکہ عملہ والے اس کو پریشان نہ کریں یہ تو جان ومال کے حقوق تھے۔

خلوص کی پہچان

ایک حق آبرو کا ہے یہ بھی حق العباد کی ایک فرد ہے جس کے ضائع کرنے میں ہم لوگ بہت مبتلا ہیں۔ خصوصاً علماء مشائخ کیونکہ عوام تو عوام ہی کی غیبت کرتے ہیں اور یہ لوگ اولیاء اللہ اور مشائخ کی غیبت اور آبروریزی کرتے ہیں تاکہ لوگ ادھر سے ہٹ کر ان کی طرف آویں۔ یاد رکھو یہ خلوص کے بالکل خلاف ہے۔ خلوص کی پہچان تو یہ ہے جو شیخ علی خواص رحمۃ اللہ علیہ نے بیان فرمائی ہے کہ اگر کوئی شخص کسی بستی میں دین کا ایک کام کر رہا ہو پھر اس سے اچھا کام کرنے والا آجاوے تو اس کام کو چھوڑ کر اس دوسرے ہی شخص

کے سپرد کردے اور اپنے متعلقین سے اس کے یہاں بھیج دیئے اور آپ کسی دوسرے کام میں لگے اور اس سے خوش ہو کہ الحمدللہ! دین کا کام کرنے والا اس بستی میں دوسرا آ گیا جس سے میرا بوجھ ہلکا ہو گیا۔ اب مجھے خلوت وذکر کا خوب موقع ملے گا۔ ہائے عارفین اہل اللہ تو ہر وقت اس کو ترستے ہیں کہ کوئی وقت فراغت اور خلوت کا ملے جس میں یہ محبوب حقیقی کے ساتھ مشغول ہوں اور ان کا تو مذاق یہ ہے کہ

دلا رامے کہ داری دل درو بند وگر چشم از ہمہ عالم فرو بند

(جس محبوب سے تم نے دل لگا رکھا ہے پھر تمام دنیا سے آنکھیں بند کرلو)

اسی کو عارف جامی فرماتے ہیں:

چہ خوش وقتے خرم روز گارے کہ یارے برخورد از وصل یارے

(وہ کیا اچھا وقت اور اچھا زمانہ ہے کہ اس میں کوئی عاشق اپنے محبوب کے وصل سے متمتع ہو)

حضرت گو شغل علمی بھی دین ہے اور ثواب کا کام ہے مگر پھر بھی عارفین خلوت کے لیے ترپتے رہتے ہیں کیونکہ ان کے مشاغل میں کوئی نہ کوئی بات دین کے خلاف سرزد ہو ہی جاتی ہے تو ان سے قلب کی پوری اصلاح نہیں ہوتی۔ اصلاح قلب کے لئے ایک وقت خلوت کا ضرور ہونا چاہیے اس لئے عارف شیرازی فرماتے ہیں:

از قیل وقال مدرسہ حالے دلم گرفت یک چند نیز خدمت معشوق می کنم

(مدرسہ کی قیل وقال سے میرے دل کا حال گرفت ہو گیا، کچھ زمانہ خدمت محبوب بھی کرتا ہوں)

بھلا اور عارفین تو کس شمار میں ہیں جب سیف العارفین سیدنا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو بھی حق تعالیٰ خلوت کا امر فرما رہے ہیں:

فَإِذَا فَرَغْتَ فَانْصَبْ وَإِلَىٰ رَبِّكَ فَارْغَبْ

(تو جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم فارغ ہو جایا کریں تو محنت کیا کیجئے اور اپنے رب کی طرف توجہ رکھئے)

جن لوگوں کو خلوت کا لطف حاصل ہو چکا ہے ان کے دل سے اس کی قدر پوچھو۔ حضرت نواب شیفتہ کا ایک شعر اس کے متعلق مجھے بہت ہی پسند آیا۔

چہ خوش است با تو بزمے بنہفتہ ساز کردن در خانہ بند کردن سر شیشہ باز کردن

(کیا اچھا ہو کہ تو محفل میں اکیلا ہو، گھر کا دروازہ ہو اور شراب کا شیشہ کھلا ہو)

اس میں بنہفتہ ساز کردن ایک عجیب تعبیر ہے (ایسے ہی سر شیشہ باز کردن میں حضور

قلب کی کیفیت کا فوٹو کھینچا ہے)

غرض مخلص کی شان یہ ہے کہ وہ محض ضرورت دینی کی وجہ سے کسی منصب کو ادا کرتا ہے خواہ وہ درس وتدریس ہو یا تعلیم وتربیت باطن ہو یا وعظ وامامت ہو۔ اپنے نفس کی بڑائی کے لئے کسی منصب پر پیش قدمی نہیں کرتا اور اس کی علامت یہ ہے کہ جب کوئی دوسرا اس کام کا کرنے والا آ جاتا ہے اور یہ دیکھ لیتا ہے کہ دینی ضرورت اس سے پوری ہوگئی ہے تو اب وہ اپنے کو اس منصب سے علیحدہ کر لیتا ہے اور خود خلوت وذکر میں مشغول ہو جاتا یا دین کا کوئی دوسرا کام لے لیتا ہے جس کا کرنے والا اس بستی میں کوئی دوسرا نہیں ہے۔

مگر اب تو یہ حالت ہے کہ جو شخص کسی جگہ پڑھاتا ہے وہاں دوسرا پڑھانے والا آ جائے تو یہ اس سے جلتا ہے، کوئی واعظ ہے اور اس کی بستی میں کوئی دوسرا واعظ آ جائے تو یہ اس سے حسد کرتا ہے۔ کسی جگہ ایک مدرسہ ہے، وہاں دوسرا مدرسہ ہو جائے تو پہلے مدرسہ والے اس کے مٹانے کی کوشش کرتے ہیں۔ کوئی شیخ ایک مقام میں تربیت باطن کر رہا ہے وہاں دوسرا شیخ آ جاوے تو اس کو گراں گزرتا ہے۔ پھر ایک دوسرے کی آبروریزی اور غیبت میں مشغول ہوتے ہیں۔ وہ چاہتا ہے کہ یہ نہ رہے یہ چاہتا ہے کہ وہ نہ رہے۔

صاحبو! کیا اسی کا نام دین ہے۔ کیا اسی کو خلوص کہتے ہیں، پھر تماشا یہ ہے کہ باوجود اس بد دینی کے ہر ایک بجائے خود نازاں ہے اور سمجھتا ہے کہ میں دنیا سے الگ ہوں اور دین کا کام کر رہا ہوں حالانکہ اس کے دل میں سراسر دنیا بھری ہوئی ہے اور اس کا مصداق بنا ہوا ہے۔

اَلَّذِيْنَ ضَلَّ سَعْيُهُمْ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَهُمْ يَحْسَبُوْنَ اَنَّهُمْ يُحْسِنُوْنَ صُنْعًا

(یہ وہ لوگ ہیں جن کی دنیا میں کری کرائی محنت سب گئی گزری ہوگئی اور وہ اس خیال میں ہیں کہ وہ اچھا کام کر رہے ہیں)

غرض کیا خاص کیا عام سبھی نے آبرو کے حق سے غفلت کر رکھی ہے اور غیبت وشکایت کو کچھ گناہ ہی نہیں سمجھتے۔ اس تقریر سے صاف واضح ہو گیا ہوگا کہ حقوق العباد صرف اموال ہی میں منحصر نہیں بلکہ مال کا بھی حق ہے، آبرو کا بھی حق ہے، پس باہم ایک دوسروں کی اتلاف جان، اتلاف مال، اتلاف آبرو سے بچو۔

اتلاف دین

ایک چوتھی چیز اور ہے جو ان تینوں سے بھی اہم ہے مگر لوگ اس کو بہت کمتر اور معمولی بات سمجھتے

ہیں۔وہ کیا چیز ہے؟ اتلاف دین ہر مسلمان کا دوسرے مسلمان پر یہ بھی حق ہے کہ اس کے دین کا ضرر نہ کرے۔ یعنی اپنی وجہ سے کسی کا دین ضائع نہ کرے، یہ سب سے مقدم ہے اس کے بعد آبرو کا درجہ ہے پھر جان کا، پھر مال کا کیونکہ شریف آدمی جان کو مال سے مقدم سمجھتا ہے۔اور جان بچانے کے لئے مال کو خرچ کر دیتا ہے۔مگر آبرو کو جان سے بھی مقدم سمجھتا ہے۔ چنانچہ شریف آدمی آبرو کے لئے جان پر کھیل جاتا ہے اور جو شریف دیندار ہوگا اور مسلمان سبھی دیندار ہیں وہ آبرو اور جان سے زیادہ دین کو سمجھتا ہے چنانچہ دیندار آدمی دین کی حفاظت کے لئے آبرو کی پروا نہیں کرتا۔

حضرت مولانا عبدالحئی صاحب رحمۃ اللہ علیہ جو حضرت (مجدد زماں) سید احمد صاحب بریلوی قدس سرہ کے خلفاء میں سے ہیں۔ایک مرتبہ لشکر کے ساتھ جا رہے تھے اور خود امیر عسکر تھے کہ راستہ میں نماز کا وقت آ گیا تو آپ نے اپنی بی بی صاحبہ کو برقع اوڑھا کر نماز کے لئے سب کے سامنے بہلی سے اتارا اور بلند آواز سے فرمایا کہ صاحبو! دیکھ لو یہ عبدالحئی کی بیوی ہے جو نماز کے واسطے سب کے سامنے کھڑی ہوئی ہے۔

حضرت! دیندار کی یہی حالت ہوگی کہ وہ عرفی آبرو کو دین کے لئے نافذ کر دے گا مگر لوگ یہ کرتے ہیں کہ آبرو کو دین سے زیادہ سمجھتے ہیں اسی واسطے تقریبات میں محض اپنی آبرو کے لئے دین کے خلاف بہت سے کام کرتے ہیں حالانکہ آبرو سے دین مقدم ہے اور آبرو جان و مال سے مقدم ہے مگر بعضے ایسے بھی ہیں جو مال کو آبرو سے مقدم کرتے ہیں جیسے بعضے رذیل بھیک مانگ کر مال جمع کرتے ہیں اور آبرو کی پروا نہیں کرتے ،بعضوں نے مسجد اور مدرسہ کے چندہ کی آڑ پکڑ لی ہے کیونکہ ویسے بھیک مانگنے سے تو کون دیتا ہے مسجد اور مدرسہ کے نام سے کچھ مل ہی جاتا ہے پھر جو کچھ ملتا ہے وہ اسی مانگنے والے کے پیٹ کو لگ جاتا ہے نہ مسجد کو ملتا ہے نہ مدرسہ کو۔

کسی مقام میں ایک صاحب تھے وہ مسجد کے لئے چندہ کیا کرتے تھے اور چند روز کے بعد پھر آ دھمکتے اور قسمیں کھا جاتے کہ میں سارا چندہ مسجد ہی کو لگا آیا ہوں۔ایک شخص ان کے حال سے واقف تھا، اس نے کہا کہ کم بخت جھوٹی قسم تو نہ کھایا کر، مسجد کو کہاں لگاتا ہے، سارا خود ہی کھا لیتا ہے، کہنے لگا کہ واللہ! میں سب مسجد کو لگا دیتا ہوں، آؤ تم کو دکھاؤں چنانچہ روپوں کی تھیلی کو مسجد کی دیوار سے رگڑ کر دکھا دیا، میں اس طرح لگایا کرتا ہوں اس لئے میری قسم جھوٹ نہیں ہوتی۔

یہ ویسی ہی تاویل ہے جیسی ایک دودھ والے نے کی تھی، وہ بھی قسم کھایا کرتا تھا کہ واللہ! میں دودھ میں پانی نہیں ملاتا۔ایک شخص نے کہا کہ کم بخت تو نے میرے سامنے پانی ملایا ہے تو آپ

کہتے ہیں کہ میں نے دودھ میں پانی نہیں ملایا، پانی میں دودھ ملایا ہے۔ وہ یہ کرتا تھا کہ ایک برتن میں پانی پہلے سے بھر لیا اور اس میں دودھ ڈال لیا تو اس صورت میں پانی میں دودھ ملایا گیا نہ کہ دودھ میں پانی اس لئے اپنے نزدیک وہ اس قسم میں سچا تھا کہ میں دودھ میں پانی نہیں ملاتا۔

آج کل لوگ ایسی ایسی استادیاں کرتے ہیں اور چندہ والے اس میں زیادہ مبتلا ہیں مگر ان کو تو مال سے غرض ہے چاہے دین اور آبرو ضائع ہوتی رہے۔

ایک محصل چندہ سفر کانپور میں مجھ سے ملے اور شکایت کرنے لگے کہ فلاں رئیس نے مدرسہ کے لئے چندہ مانگنے پر مجھے بہت مارا، اب میں کیا کروں، میں نے کہا تم اس نوکری پر لعنت بھیجو کوئی اور کام کرو۔ کہنے لگے یہ تو دین کا کام ہے اسے کیونکر چھوڑدوں، میں نے کہا پھر جاؤ ایسی تیسی میں، اگر یہ دین کا کام ہے تو شکایت کیوں کرتے ہو ماریں کھاتے رہو اور صبر کرو، کوئی قسم لے کر ان سے پوچھے کہ وہ دین ہی کے لئے تو محصل چندہ بنے ہوئے تھے۔ یہ بھی محض ایک بہانہ ہے ورنہ اصل مقصود تنخواہ ہے اگر پچاس ساٹھ روپے ان کو گھر بیٹھے مل جایا کریں تو پھر ہم دیکھیں کہ وہ پھر بھی دینی خدمت کے لئے یہ ذلت گوارا کرتے ہیں مگر اب کیا کریں پیٹ کو بھی کس طرح دیں۔ اس واسطے یہ ساری ذلت گوارا کیا کرتے ہیں۔

دین کی حالت تو یہ تھی کہ وہی محصل چندہ اس رئیس کے یہاں بھی آئے تھے جہاں میں مقیم تھا۔ ان سے چندہ مانگا تو انہوں نے دس روپے دیدیئے تو محصل چندہ کہتے ہیں کہ جناب آپ تو ہر سال بیس روپے دیا کرتے تھے اب کے دس کیوں دیئے یہ طریقہ تھا ان کے چندہ کا جس میں سب کے سامنے وہ دینے والے کو ذلیل کرتے تھے۔ بس کسی رئیس کے ساتھ یہی حرکت کی ہوگی اس نے مارا پیٹا ہوگا ورنہ محض مانگنے پر کون مارتا ہے۔ ہاں ان کے مانگنے کے بعد اگر دوسرا عذر کر دے یا تھوڑا سا دیدے اور اس پر اس کو ذلیل کیا جاوے تو بے شک کوئی دل جلا مار بھی دیتا ہے۔

چندہ کا یہ طریقہ بالکل خلاف شریعت ہے اور حرام ہے آج کل زیادہ تر چندہ کے طریقے حرام ہی ہیں مگر محصلین چندہ اس کو دین سمجھتے ہیں کچھ نہیں، اس کا نام تو بے حسی ہے کہ مال کے واسطے نہ آبرو کی پرواہ ہے نہ دین کی، ہاں چندہ کا ایک طریقہ جائز بھی ہے کہ مسلمانوں کو اطلاع کردو کہ فلاں جگہ مدرسہ ہے اور فلاں شخص کے پاس اس کے لئے چندہ جمع ہورہا ہے جس کا جی چاہے وہاں اپنی رقم جمع کردے۔ پھر دیکھیں کتنے آدمی دیتے ہیں، غرض بعضے ایسے بے حس بھی ہیں جو آبرو کو مال کے واسطے ضائع کردیتے ہیں بعضے ایسے بھی ہیں جو مال کے واسطے جان بھی دے دیتے ہیں۔

عذاب قبر کا واقعہ

تھانہ بھون کا ایک قصہ ہے کہ ایک میاں جی کے پاس دو سو روپیہ جمع ہو گئے تھے جن کو ایک لوٹے میں رکھ کر زمین کے اندر گاڑھ رکھا تھا مگر محبت مال کی یہ حالت تھی کہ روزانہ اس کو گنا کرتا تھا، کسی دن لڑکوں نے بھانپ لیا، وہ موقع کے منتظر رہے۔ آخر ایک دن ملا جی کہیں دعوت میں گئے ہوئے تھے پیچھے لڑکوں نے وہ روپیہ نکال لیا اور خوب عمدہ عمدہ کھانے پکوائے اور ملا جی کے حال پر اتنا رحم کیا کہ ان کی بھی دعوت کر دی۔ ملا جی خالی الذہن تھے، خوشی خوشی دعوت کو چلے گئے، انہیں ایسے عمدہ کھانے کب ملے تھے، بڑے خوش ہوئے، کھاتے جاتے اور پوچھتے جاتے کہ بھائی آج کیا تقریب تھی جو ایسے کھانے پکوائے گئے۔ لڑکوں نے کہا حضور یہ سب آپ ہی کی جوتیوں کا طفیل ہے۔ تھوڑی دیر کے بعد ملا جی نے پھر کہا کہ آج کیا بات ہے، کون مہمان آ گیا ہے جس کے لئے یہ اہتمام ہوا ہے، پھر بھی لڑکوں نے وہی جواب دیا کہ سب حضور ہی کا طفیل ہے۔ اس پر ایک لڑکے کو ہنسی آ گئی تو ملا جی کھٹک گئے کہ شاید میرے روپوں میں ہاتھ پڑ گیا ہے جبھی یہ بار بار اس کو میرا طفیل بتلاتے ہیں۔

بس اب تو کھانا پینا سب بھول گئے، اندھے باؤلوں کی طرح سیدھے حجرے میں آئے، کھولا تو روپے ندارد، بس فوراً ہی جان نکل گئی، لوگ دوڑے کہ یہ قصہ کیا ہے معلوم ہوا کہ روپے گم ہونے کا اتنا صدمہ ہوا۔ یہ قصہ بستی میں مشہور ہوا تو اس وقت تھانہ بھون میں ایک عالم مولانا سعدالدین علی صاحب موجود تھے۔ انہوں نے فرمایا کہ یہ روپیہ منحوس ہے جس نے ایک مسلمان کی جان لے لی اس کو کوئی ہاتھ نہ لگائے بلکہ جنازہ کے ساتھ ہی قبر میں دفن کر دیا جائے۔ چنانچہ اہل محلّہ نے اس کی تعمیل کی اور کسی نے ان روپیوں کو ہاتھ نہ لگایا بلکہ سب کو ایک تھیلی میں باندھ کر قبر میں میاں جی کے ساتھ دفن کر دیا۔

کفن چوروں کو خبر لگی انہوں نے کہا کہ مولوی کی تو عقل جاتی رہی خواہ مخواہ اتنا روپیہ زمین گاڑ دیا چلو اس کو نکالنا چاہیے۔ چنانچہ رات کو ایک شخص نے قبر کھودی تو دیکھا کہ سب روپے کفن سے باہر سینے کے اوپر ترتیب وار رکھے ہوئے ہیں اور چمک رہے ہیں۔ یہ خوش ہوا کہ اب تو اور آسانی ہو گئی، اوپر ہی سے سب سمیٹ لوں گا۔ پس انگلی ہی روپوں سے لگی تھی کہ چیخ مارتا ہوا بھاگا، وہ روپے عالم برزخ کی آگ سے دہک رہے تھے جن سے میت کو عذاب دیا جا رہا تھا۔ پھر اس کفن چور کی عمر بھر یہ حالت رہی کہ ہر وقت ایک آبخورہ ہاتھ میں لیے پھرتا تھا جس میں وہ انگلی ہر وقت ڈوبی رہتی تھی۔ اس طرح

سین رہتی اور جہاں پانی بدلنے کو انگلی آبخورہ سے نکالی فوراً چیخیں مارتا تھا کہ ہائے میں جلا ہائے مرا۔

تو بعض ایسے بے حس بھی ہیں جو مال کے واسطے جان دے دیتے ہیں مگر ایسے کم ہیں زیادہ حالت تو یہی ہے کہ مال سے جان کو زیادہ سمجھتے ہیں اور جان سے زیادہ آبرو کو سمجھتے ہیں مگر دین کو سب سے کم تر کر رکھا ہے۔

اضرار دین

اسی لیے کسی کے اضرار دین سے کچھ باک نہیں، کسی کی خوشامد میں آ کر غلط فتویٰ دے دیا جیسا ہمارے یہاں ایک جاہل نے دنیوی خوشامد میں مطلقہ الثلاث کو حلال کر دیا۔ دنیادار مولوی اس مرض میں بہت مبتلا ہیں اور ان کے غلط فتویٰ سے عوام کے لئے حرام چیز حلال نہیں ہو جاتی کیونکہ فتوے کی غلطی چھپی نہیں رہا کرتی۔ ایک اضرار دین یہ ہے کہ کسی کو دین کا راستہ معلوم نہیں تربیت کا طریقہ جانتا نہیں اور خواہ مخواہ شیخ و مرشد بن کر بیٹھ گیا ہے اور لوگوں کی راہ مارتا ہے۔

ایک اضرار دین یہ ہے جس میں اہل مدارس مبتلا ہیں کہ کسی طالب علم نے کسی سے مشورہ کیا کہ میں کون سے مدرسہ میں پڑھوں تو ہر مدرسہ والا اپنے ہی مدرسہ کا مشورہ دیتا ہے، گو جانتے ہیں کہ اس کا نفع دوسرے مدرسہ میں زیادہ ہے۔ افسوس! آج کل اہل علم بھی غلط مشورے دینے لگے ہیں اور پہلے زمانہ میں کفار بھی غلط مشورے نہ دیتے تھے۔ چنانچہ ایک بزرگ کا قصہ ہے کہ ان کی ایک لڑکی تھی جس کے شادی کے پیام جابجا سے آ رہے تھے تو انہوں نے اپنے ایک پڑوسی سے جو کہ یہودی تھا، مشورہ کیا کہ میری لڑکی کے فلاں فلاں جگہ سے پیام آ رہے ہیں، تمہارے نزدیک کونسی جگہ اچھی ہے؟ اس نے اول تو عذر کیا کہ آپ کو مجھ سے مشورہ نہ کرنا چاہیے کیونکہ میں دین میں آپ کا مخالف ہوں، مخالف کے مشورہ کا کیا اعتبار تو بزرگ نے فرمایا کہ شریف آدمی ہو گو مسلم نہیں ہو اس لئے غلط مشورہ نہیں دو گے۔ اس لئے تم بے تکلف مشورہ دو تو وہ یہودی کہنے لگا کہ میں نے سنا ہے کہ آپ کے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ:

تنكح المراة لاربع لمالها وجمالها وحسبها ودينها فاظفر بذات الدين تربت يداك. (الصحیح للبخاری ۷:۹، الصحیح مسلم: الرضاع: ۵۳، مشکوٰۃ: ۳۰۸۲)

''عورت سے نکاح کرنے میں چار باتوں کو دیکھا جاتا ہے مال کو اور جمال کو اور حسب کو اور دین کو، پھر آپ نے فرمایا کہ تم دیندار سے نکاح کرنے کی کوشش کرو۔''

اس سے معلوم ہوا کہ آپ کے مذہب اسلام میں سب سے زیادہ دیکھنے کی چیز دین ہے تو میرے خیال میں جتنے لوگوں نے بھی پیام بھیجا ہے دین پورا پورا کسی میں بھی نہیں ہے، میرے نزدیک تو ایک طالب علم جو آپ کی مسجد میں رہتا ہے وہ بڑا دیندار ہے، ہر وقت خدا کے کام میں لگا رہتا ہے، پس آپ اپنی بیٹی کو اس سے بیاہ دیں۔ ان شاء اللہ تعالیٰ بہت برکت ہوگی چنانچہ ان بزرگ نے ایسا ہی کیا اور عمر بھر ان کی لڑکی راحت سے رہی۔

مشورہ کی اہمیت

حدیث میں آتا ہے "المستشار مؤتمن" (سنن ابی داؤد: ۱۵۲۸، سنن ترمذی ۲۸۲۲، ۲۸۲۳) جس سے مشورہ لیا جاتا ہے اس کو امانت دار سمجھا جاتا ہے پس مشورہ غلط دینا خیانت ہے اس سے بہت احتراز کرنا چاہیے۔

ہماری بستی میں ایک صاحب اپنا گھر فروخت کرنا چاہتے ہیں۔ پہلے مجھے بھی اس کے خریدنے کا خیال تھا مگر بعد میں ان کی رائے بدل گئی۔ پھر کچھ ایسے واقعات بستی میں ان کے ساتھ پیش آئے جن سے گھبرا کر انہوں نے باہر ملازمت کر لی اور گھر بیچنے کا پھر ارادہ کر لیا۔ اس وقت بھی میرا خیال تھا کہ یہ اگر فروخت کریں گے تو میں ضرور لے لوں گا کیونکہ اس مکان کے نہ لینے سے مجھے گونہ تکلیف ہے لیکن اس دفعہ انہوں نے مجھ سے مشورہ کیا کہ میں گھر بیچنا چاہتا ہوں اس میں آپ کی کیا رائے ہے۔ اس وقت اگر میں اپنی غرض کا لحاظ کر کے ان کو یہ مشورہ دے دیتا کہ ہاں فروخت کر دو تو فوراً بیچ دیتے کیونکہ ان کی زیادہ رائے اسی طرف مائل تھی مگر جب مجھ سے مشورہ کیا تو میں نے اپنی مصلحت پر نظر کرنا اور ان کی مصلحت کو نظر انداز کر دینا خیانت سمجھا اور وہی رائے دی جو ان کے لئے مناسب تھی۔ میں نے کہا کہ آپ گھر کو ہرگز فروخت نہ کریں کیونکہ دوسری جگہ چاہے کیسی راحت ہو مگر کسی وقت پھر وطن یاد آتا ہے اور جب باہر جا کر ٹھوکریں لگتی ہیں تو اس وقت اپنے وطن سے زیادہ عزیز کوئی چیز نہیں ہوتی چنانچہ اس رائے کی وجہ سے انہوں نے اپنا ارداہ ملتوی کر دیا۔

اس پر بعض لوگوں نے مجھے بیوقوف بھی بنایا کہ تم نے یہ رائے دے کر ساری عمر کی مصیبت پھر اپنے سر لی، میں نے کہا کچھ بھی ہو یہ تو مجھ سے کبھی نہ ہوگا کہ ایک شخص امین سمجھ کر مجھ سے مشورہ کرے اور میں اس کی مصلحت کے خلاف مشورہ دوں۔ مجھے دین سب سے مقدم ہے اب چاہے مجھے راحت ہو یا

معت ہو اوران شاء اللہ اس نیت کی برکت سے راحت ہی ہوگی مگر عموماً آج کل مشیروں کی یہ حالت ہے یہ جان جان کر غلط مشورہ دیتے ہیں جس میں ان کے نزدیک صراحۃً دوسرے کا نقصان ہوتا ہے۔

بھکڑہ

یہ ایک قصبہ ہے ضلع مظفر نگر میں جو تھانہ بھون سے تقریباً ۱۵ میل پر ہے، میں ایک شخص ملازمت سے گھر آیا اور ساتھ میں بہت کچھ نقد اور سامان وغیرہ بھی لایا۔ پھر اس کی لڑکی کا بیاہ ہونے لگا تو بستی کے بھائیوں نے اس کے پاس اٹھنا بیٹھنا شروع کیا اور یہ رائے دی کہ ذرا شادی میں خوب دھوم دھام کرو تاکہ لوگوں کی نگاہ میں تمہاری عزت ہو اور خاندان کا نام ہو۔ چنانچہ اس نے ایسی دھوم دھام کی کہ جو کچھ باہر سے کما کر ساتھ لایا تھا سب غارت کر دیا۔ بعد میں ان مشیروں میں سے ایک نے فخراً کہا کہ یہ بہت بڑھ گیا تھا۔ یہ رائے دے کر ہم نے اسکو اپنے برابر کر دیا، آج کل برادری کے بھائیوں کی عام حالت یہی ہے کہ کسی کو اپنے سے بڑھا ہوا دیکھ نہیں سکتے۔ بس جہاں کوئی بڑھا اور انہوں نے اس کو ایسی پٹیاں پڑھانا شروع کیں جس سے چار دن میں وہ ان کے برابر بلکہ کم ہو جائے اور برابر والے غرض سے کرتے ہیں، کبھی حسد سے اور کبھی اس لیئے کہ وہ ہم کو گھٹانے کی فکر نہ کرے کیونکہ آج کل جہاں کوئی ذرا بڑھتا ہے وہ دوسروں کو گھٹانا شروع کر دیتا ہے اس لیئے وہ اپنی جان بچانے کو اس کوشش میں رہتا ہے کہ کسی طرح یہ ہم سے بڑھا ہوا نہ رہے۔

جیسے ایک گاؤں کا آدمی باہر جا کر چار پانچ سو روپیہ کا ملازم ہو گیا تھا۔ اس کے گھر پر ایک میاں جی بچوں کو پڑھانے کو نوکر تھے، وہی سارے گاؤں میں خط پڑھنا جانتے تھے۔ اس شخص کا خط آیا کہ میں اتنے کا ملازم ہو گیا ہوں، تو گھر والوں نے میاں جی کے پاس خط بھیج دیا کہ ذرا اس کو پڑھ دو، کیا لکھا ہے، میاں جی خط کو دیکھ کر رونے لگے تو خط لانے والا گھبرا گیا، کہا میاں جی خیر تو ہے کیا لکھا ہے کہا ایسی ہی بات لکھی جس پر مجھے رونا چاہیئے، اس نے دوڑ کر گھر خبر کی تو اس کی بیوی نے دروازہ پر جا کر پوچھا کیا بات ہے خیر تو ہے، میاں جی نے کہا بتلاؤں گا مگر تو بھی رو، وہ بھی رونے لگی، اتنے میں محلّہ والے آ گئے کہ یہ کیا معاملہ ہے، میاں جی نے کہا کہ تم بھی روؤ وہ بھی رونے لگے۔

پھر پوچھا کہ میاں جی آخر بتاؤ تو سہی کیا لکھا ہے، کوئی مر گیا ہے یا بیمار ہو گیا ہے، کہا نہیں اس میں یہ لکھا ہے کہ میں پانچ سو روپیہ کا نوکر ہو گیا، لوگوں نے کہا لاحول ولا قوۃ، پھر یہ رونے کی بات ہے یا

خوشی کی۔ میاں جی نے کہا یہ رونے ہی کی بات ہے مجھے تو اس لئے رونا چاہیے کہ اب یہ مجھے اپنے بچوں کی تعلیم کے لئے کیوں نوکر رکھے گا، کسی انگریزی جاننے والے ماسٹر کو بلا دے گا اور بیوی کو اس واسطے رونا چاہیے کہ اب وہ اس گاؤں کی عورت کو کیوں اپنے نکاح میں رکھے گا، بس اسے طلاق دے کر کوئی شہر کی تعلیم یافتہ عورت لائے گا اور گاؤں والوں کو اس لئے رونا چاہیے کہ اب وہ سال بھر کے بعد آتے ہی اپنا گھر بہت عالی شان بنائے گا جن میں غریبوں کے مکانات جبراً معمولی داموں میں خرید خرید کر ملائے جائیں گے، پھر زمین جائیداد بہت سی خریدے گا جس میں غریبوں کے حصے دبائے جائیں گے۔ واقعی باتیں تو میاں جی نے سب معقول کہیں، آج کل زیادہ مال و دولت حاصل کر کے لوگ یہی حرکتیں کرتے ہیں۔ اس واسطے بھی لوگوں کو فکر ہوتی ہے کہ کس طرح یہ ہم سے بڑھا ہوا نہ ہو۔

خیر یہ تو وہ ظلم ہے جو انسان اپنی غرض کے واسطے دوسروں پر کیا کرتا ہے اور بعض لوگ یہ کرتے ہیں کہ اپنی غرض سے بھی نہیں محض دوسروں کے آرام کے واسطے مخلوق کا گلا دبا دیا کرتے ہیں۔ جیسے بعض زمیندار حکام کو خوش کرنے کے واسطے گاؤں والوں سے چندہ جبراً وصول کرتے ہیں اور خوشامد کے لئے چندہ کی رقم ان کے سامنے پیش کرتے ہیں اور اسی طرح اور بہت سے قصے لیے جاتے ہیں، فروع کو کہاں تک بیان کروں، میں نے بطور قاعدہ کلی کے یہ حقوق بیان کر دیئے ہیں، فروع انہی سے سمجھ میں آ سکتی ہیں اب یہ سمجھئے کہ جو کچھ حقوق میں نے اب تک بیان کیے ہیں یہ تو حقوق عامہ ہیں۔ ان کے بعد کچھ حقوق خاصہ ہیں۔ جب کسی صاحب حق میں کوئی خاص خصوصیت ہوتی ہے تو اس کے کچھ خاص حقوق ان حقوق عامہ پر بڑھ جاتا ہے یہ حقوق مذکورہ تو ہر انسان کے دوسرے انسان پر بحیثیت عبد ہونے کے ہیں۔

خصوصی حقوق

اب اگر کوئی شخص مسلمان بھی ہے تو اسلام کی وجہ سے اس کا حق اور بھی بڑھ جائے گا مثلاً مسلمان کا دوسرے مسلمان پر یہ حق ہے کہ بیمار ہو تو عیادت کرو، جب ملے تو سلام کرو، اس کو چھینک آوے اور الحمدللہ کہے تو یرحمک اللہ کہو، مر جاوے تو جنازہ کی نماز پڑھو، دفن کفن میں شریک ہو وغیرہ وغیرہ۔ ایک خصوصیت یہ ہے کہ کوئی شخص ہمارا پڑوسی ہے جوار کی وجہ سے اس کا حق بڑھ جائے گا۔ ایک خصوصیت یہ ہے کہ کوئی ہمارا محسن بھی ہے جیسے استاد یا پیر یا کوئی دوست وغیرہ۔ سو احسان کی وجہ سے ان کے حقوق عام مسلمانوں کے حقوق سے زیادہ ہوں گے۔ محسن

ہونے میں باپ ماں کا درجہ سب سے بڑھا ہوا ہے۔ ان کے حقوق سب سے زیادہ ہیں۔

اسی طرح بعض اور رشتے بھی بواسطہ احسان میں داخل ہیں۔ مثلاً سسرالی رشتہ جیسے بیوی کی ماں اس کا باپ وغیرہ کہ وہ بیوی کے محسن ہیں اور بیوی سے دوستی کا رشتہ ہے تو دوست کے محسن گویا اپنے ہی محسن ہیں ان کے حقوق بھی عام لوگوں سے زیادہ ہیں۔ غرض کہ خصوصیات کیوجہ سے حقوق عامہ پر حقوق خاصہ کا اضافہ ہوجاتا ہے اس وقت نہ میں اس کی تفصیل کرسکتا ہوں نہ اتنا وقت ہے۔ علماء کی کتابیں موجود ہیں جن میں سب کے حقوق لکھے ہوئے ہیں۔ غرض اسلام میں سب انسانوں کے لئے کچھ نہ کچھ حقوق ہیں۔

میری ایک کتاب مختصر اس بارے میں طبع ہو چکی ہے جس کا نام حقوق الاسلام ہے اس کو دیکھو۔ اس میں مختصراً سب کے حقوق لکھے ہوئے ہیں۔ ایک مسلمان ڈپٹی نے وہ کتاب ایک انگریز کو دکھائی تھی۔ اس نے جو دیکھا تو اس میں رعایا اور حکام کے بھی حقوق تھے کہ رعایا کو حکام کے ساتھ اس طرح رہنا چاہیے اور حکام کو رعایا کے ساتھ یوں برتاؤ کرنا چاہیے۔ ایک حق تو حاکم مسلم کا ہے وہ الگ ہے۔ اسلام میں مطلق حاکم کا بھی بوجہ معاہدہ کے نیز بوجہ احسان انتظام راحت کے ایک حق ہے چاہے مسلم ہو یا غیر مسلم، تو وہ انگریز بڑا متعجب ہوا کہ اسلام میں حکام کے بھی حقوق ہیں، اس کو اسی پر تعجب ہوا۔ اسے یہ خبر نہ ہوئی کہ اسلام میں بہائم کے بھی حقوق ہیں تو اور زیادہ تعجب ہوتا۔

صاحبو! یہ قانون خداوندی کی ہی خصوصیات ہے جس میں باغیوں کے حقوق بھی ہیں، کفار حالانکہ خدا تعالیٰ کے باغی ہیں اور ان کے بارے میں ارشاد ہے۔ **ان هم الا كالانعام بل هم اضل.** (مگر اس کے ساتھ ان کے کچھ حقوق بھی رکھے ہیں)

بیوی کے حقوق

بہر حال خصوصیات محل وغیرہ سے یہ حقوق بڑھ جاتے ہیں اور خصوصاً ان انسانوں کے حقوق بہت زیادہ ہیں جو کسی سے کچھ نہ کہہ سکیں۔ وہ کون ہیں، وہ بیویاں ہیں، یہ بیچاری عموماً ایسی بے کس اور بے بس ہوتی ہیں کہ کسی سے کچھ شکایت کر ہی نہیں سکتیں اور اگر کسی کے ماں باپ زندہ بھی ہوں جب بھی شریف عورتیں اپنے خاوند کی شکایت کسی سے نہیں کرتیں۔ پھر مردوں کی یہ حالت ہے کہ اپنی بیوی کے سوا اور جگہ ان کی نظر اٹھ جاتی ہے اور بعضے ایسی ایسی جگہ پھنس جاتے ہیں مگر ہندوستان

کی عورتیں عموماً اپنے شوہروں کی عاشق ہوتی ہیں گو شوہر کیسا ہی ہو ہم نے دیکھا ہے کہ بعض مرد بدصورت بھی ہوتے ہیں مگر ان کی بیویاں بجز شوہر کے کسی کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی نہیں دیکھتیں۔

واقعی ہندوستان کی عورتیں تو اس صفت میں حوریں ہیں۔ حق تعالیٰ نے حوروں کی تعریف میں جہاں حسن جمال کو بیان فرمایا ہے وہاں قاصرات الطرف بھی فرمایا ہے کہ وہ اپنی نگاہوں کو شوہر ہی پر منحصر کرنے والی ہوں گی، کسی غیر پر نظر نہ ڈالیں گی، واقعی ہندوستان کی عورتیں تو اس صفت میں تمام ممالک کی عورتوں سے ممتاز ہیں۔ یہ تو نکاح کر کے شوہر کے ساتھ ایسی وابستہ ہو جاتی ہیں کہ اپنے ماں باپ کو بھی بعض دفعہ چھوڑ دیتی ہیں۔ چنانچہ اگر اس کے ماں باپ یا اور کسی عزیز کے ساتھ کبھی شوہر کی ان بن ہو جائے تو عورت عموماً شوہر کا ساتھ دیتی ہے، ماں باپ کا ساتھ نہیں دیتی مگر اس پر بھی بعضے مردان پر بہت زیادتی کرتے ہیں۔ باوجودیکہ وہ ان پر ایسی فدا ہیں مگر بعض لوگ ان کے ساتھ جوتے ہی سے بات کرتے ہیں، باندی اور غلام سے بھی ان کی اوقات بدتر رکھتے ہیں۔

بعضے ایسے بے مروت ہیں کہ ان کی آمدنی ہزاروں کی ہے مگر بیوی کو دس ہی روپیہ کا روزینہ دیتے ہیں اور بعضے تو کھانے، کپڑے کی بھی خبر نہیں لیتے، نہ ہوا عرب یا بعض ہندوستانی ریاستیں کہ وہاں عورت فوراً قاضی کے یہاں جا کر نالش کر دیتی ہے اب یا تو قاضی کی تجویز کے موافق نان ونفقہ دینا پڑتا ہے ورنہ جبراً طلاق دلوائی جاتی ہے جس کے بعد فوراً عورت کی طرف سے مہر کی نالش ہو جاتی ہے اور بعض ممالک میں مہر نکاح کے وقت ہی پیشگی دھروا لیتے ہیں۔ یہ بیچاری ہندوستان کی ہی عورتیں ہیں جو مہر بھی معاف کر دیتی ہیں اور عمر بھر نان ونفقہ کی تکلیف بھی سہتی ہیں۔ خیر کسی کے پاس ہو ہی نہیں تو اس کی شکایت نہیں۔ اس صورت میں تو عورتیں خود محنت مزدوری کر کے شوہر کو بھی کھلاتی ہیں لیکن جس کو خدا تعالیٰ نے سب کچھ دیا ہو وہ بیوی کو تنگ کرے یہ نہایت بے غیرتی اور بے حمیتی ہے۔ سعدی فرماتے ہیں۔

بہ بیں آں بے حمیت را کہ ہرگز نخواہد دید روئے نیک بختی

تن آسانی گزیند خویشتن را زن و فرزند بگذارد بسختی

(اس بے غیرت کو دیکھو کہ وہ نیک بختی کا منہ نہ دیکھے گا، اپنے تن آسانی اختیار کر کے بی بی بچوں کو سختی میں ڈالے)

حالانکہ عورتوں کا ایک حق تو اس واسطے ہے کہ وہ بے کس و بے بس ہیں۔ دوسرے اس واسطے بھی حق ہے کہ وہ تمہاری دوست ہیں اور اوپر معلوم ہو چکا ہے کہ دوستی کی وجہ سے حق بڑھ جاتا

ہے پھر وہ تمہارے دین کی محافظ بھی ہیں۔ اسی لیے صوفیاء نے تقلیل وقاع کو مجاہدہ میں داخل نہیں کیا باوجودیہ کہ وہ تمام لذات میں الذ ہے مگر صوفیاء نے اس کی تقلیل کو مجاہدہ میں شمار نہیں کیا اور نہ کثرت وقاع سے منع کیا ہے گو اور وجہ سے منع کیا ہے مگر مجاہدہ کی حیثیت سے منع نہیں کیا۔

اس سے معلوم ہوا کہ صوفیاء محض ترک لذات نہیں کراتے بلکہ اصلاح قوت بہیمیہ کراتے ہیں۔ اگر ان کا مقصود ترک لذات ہوتا تو کثرت وقاع سے پہلے منع کرتے۔ غرض بیوی اس لحاظ سے بھی قابل قدر ہے کہ اس سے دین کی حفاظت اور خیالات فاسدہ کی روک ہوتی ہے۔ اس درجہ میں وہ بڑی محسن ہے جو لوگ دیندار ہیں وہ اس احسان کی قدر کرتے ہیں۔

مولانا محمد مظہر صاحب رحمۃ اللہ علیہ مدرس مظاہر العلوم کی یہ حالت تھی کہ ان کی بیوی بوڑھی ہوگئی تھیں مگر مولانا کو ان سے ایسا تعلق تھا کہ جب وہ ذرا بیمار ہوتیں تو مولانا فوراً مدرسہ سے رخصت لے کر خود اپنے ہاتھ سے ان کی خدمت کرتے تھے۔ آج کل تو بعض لوگ بوڑھی بیوی سے نفرت کرنے لگتے ہیں حالانکہ تم ہی نے تو اس کو بوڑھا کیا ہے مگر مولانا کی یہ حالت تھی کہ نوکروں اور ماماؤں پر اپنی بیوی کی خدمت کو نہ ڈالتے تھے بلکہ مدرسہ سے رخصت لے کر خود خدمت کرتے تھے۔ اسی لئے تو علماء کو لوگ بیوی کا مرید کہتے ہیں مگر جی ہاں ان کا مرید ہونا تمہاری طرح پیر ہونے سے اچھا ہے۔ تم بیویوں کے پیر ہو مگر خدا کو پیر ہوا اور اصل یہ ہے کہ مولوی بیویوں کے مرید نہیں ہیں بلکہ ان کے دل میں خدا کا خوف ہے۔ وہ حقوق العباد کو ادا کرنے کا اہتمام کرتے ہیں۔ بیوی کے حقوق نصوص میں ان کی نظر سے گزرے ہوئے ہیں۔ حدیث میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی معاشرت کا حال انہوں نے پڑھا ہے اس لئے وہ بیوی کے ساتھ نرمی اور ملاطفت کرتے ہیں ان کو راحت پہنچاتے ہیں بلکہ جتنا حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی بیویوں کے ساتھ اچھا برتاؤ کیا ہے اتنا تو کوئی مولوی کر بھی نہیں سکتا اور اگر کوئی ویسا کرنے لگے تو نا معلوم لوگ اس کو زن مرید سے بڑھ کر کیا خطاب دیں گے۔

حدیث میں آتا ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کے ساتھ ایک بار دوڑے تو اس وقت وہ ہلکی پھلکی تھیں۔ آپ سے وہ آگے نکل گئیں، اس کے بعد کچھ عرصہ میں دوبارہ پھر آپ ان کے ساتھ دوڑے اس وقت حضرت عائشہ بھاری پڑ گئی تھیں اب حضور صلی اللہ علیہ وسلم آگے نکل گئے تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تلک بتلک یہ پہلی بار کا بدلہ ہے۔ میں نے ایک مولوی سے جو بڑے وقار و تمکنت سے رہتے تھے کہا تھا کہ تم نے جس چیز کا نام وقار رکھا ہے یہ تکبر ہے

کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تمہاری طرح کے وقار سے نہ رہتے تھے۔ بتلاؤ کیا تم بھی کبھی اپنی بیوی کے ساتھ دوڑے ہو پس چپ ہو گئے، اس کا کچھ جواب نہ تھا۔ میں نے کہا بس رہو وقار سے جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی معاشرت کے موافق ہو اور جو اس کے خلاف ہو وہ وقار نہیں تکبر ہے۔

غرض مولوی اس واسطے اپنی بیویوں کی خاطر زیادہ کرتے ہیں کہ ان کی نگاہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی معاشرت ہے۔ پھر بیوی کی خاطر کرنے میں دنیا کی بھی تو بڑی مصلحت ہے اور بات تو یہ ہے کہ اس سے زندگی لطف سے گزرتی ہے۔ ایک دوسرے کی راحت ورنج کا شریک ہوتا ہے اور اگر میاں بیوی میں موافقت اور بے تکلفی اور انشراح نہ ہو تو پھر زندگی کا کیا لطف ہے جہاں ہر وقت جوتی بیزار ہو وہاں کوئی خوشی نہیں۔

درخرمی بر سرائے بہ بند | کہ بانگ زن ازوے برآید بلند

(اس گھر پر خوشی کا دروازہ بند کر کہ اس سے عورت کی آواز بلند آئے)

لطف تو اسی میں ہے کہ آدمی دن بھر تھکا ماندہ گھر میں جائے تو گھر والوں کی باتوں سے جی خوش کرے وہ اس کو راحت دیں۔ یہ ان کی راحت کا خیال کرے اور یہ کیا زندگی ہے کہ دن بھر تو کام میں تھکے اب شام کو گھر جا کر بھی رنج وغم ہی کی باتیں کی جائیں مگر آج کل لوگوں کے مذاق بگڑ گئے ہیں، بے حسی چھا گئی ہے۔ وہ اسی حالت میں رہنا پسند کرتے ہیں مگر جن کو ذرا بھی حس ہے وہ تو اس کو دنیا ہی میں دوزخ سمجھتے ہیں اور جن کی معاشرت گھر والوں کے ساتھ عمدہ ہے واقعی ان کو دنیا ہی میں جنت نصیب ہے۔

بہشت آنجا کہ آزارے نباشد | کسے رابا کسے کارے نباشد

(وہ جگہ بہشت ہے جہاں کوئی تکلیف نہ ہو کسی کو کسی سے کوئی کام نہ ہو)

(یعنی کارایذاء نباشد) اور سعدی فرماتے ہیں۔

زن خوب فرماں برو پارسا | کند مرد درویش را پادشاہ

ہمہ روز اگر غم خوری غم مدار | چو شب غمگسارت بود درکنار

(اچھی عورت، فرمانبردار، پارسا، فقیر کو بھی بادشاہ کر دیتی ہے تمام روز اگر تکلیف اٹھائے غم نہ کر جبکہ رات میں تیرا غمگسار بغل میں ہو)

بیوی کی اہمیت

صاحبو! یہ راز ہے اہل اللہ کی دل جوئی میں وہ اس لئے اپنے گھر والوں کو راحت پہنچاتے

ہیں تاکہ زندگی لطف کے ساتھ گزرے اور واقعی خداتعالیٰ نے یہ تعلق ہی ایسا بنایا ہے کہ بیوی سے زیادہ کوئی بھی انسان کو راحت نہیں دے سکتا، بیماری میں بعض دفعہ سارے عزیز الگ ہوکر ناک منہ چڑھانے لگتے ہیں خصوصاً اگر کسی کو دستوں کی بیماری ہوجائے مگر بیوی سے یہ کہیں نہیں ہوسکتا کہ وہ شوہر کو اس حال میں بھی چھوڑ دے وہ بیماری میں سب سے زیادہ راحت پہنچاتی ہے۔

شاہ جہانپور میں ایک رئیس نے بڑھاپے میں شادی کی تھی ان کے لڑکوں نے اعتراض کیا کہ تم کو اس عمر میں شادی کی کیا ضرورت ہے، خدمت کے لئے تو آپ کی اولاد بہت تھی، کہا تم نہیں جانتے بیوی کے برابر مجھے کوئی راحت نہیں دے سکتا، اتفاق سے وہ ایک بار بیمار ہوئے اور دست لگ گئے تو سارے لڑکے اور بہو بیٹیاں چھوڑ کر الگ ہوگئے اور بدبو کی وجہ سے کوئی بھی پاس نہ آتا تھا مگر بیوی اس وقت بھی خدمت گزار تھی وہ بیچاری ہر وقت سہارا لگا کر بٹھاتی، کپڑوں کو دھوتی، صاف کرتی تھی، پھر وہ بیماری سے شفایاب ہوئے تو لڑکوں کو بلایا اور کہا تم نے اپنی خدمت کا حال دیکھ لیا، اسی کے بھروسے پر مجھے کہتے تھے کہ تمہیں شادی کی کیا ضرورت ہے، اب تم نے ضرورت دیکھ لی اگر اس وقت میری بیوی نہ ہوتی تو تم چھوڑ کر الگ ہوگئے تھے، میں اکیلا پڑا سڑتا رہتا۔

حقیقت میں بیماری کے اندر بہو بیٹیاں ہرگز وہ کام نہیں دے سکتیں جو بیوی دے سکتی ہے۔ خداتعالیٰ نے یہ راحت اسی تعلق میں رکھی ہے اس لئے حضرت مولانا شاہ فضل الرحمٰن صاحب نے اپنی پہلی بیوی کے انتقال پر اخیر عمر میں پھر شادی کی تھی حالانکہ اس وقت مولانا کی عمر سو برس سے اوپر تھی کہ بیوی سے دنیا کی راحت پہنچتی ہے۔

دین کی راحت یہ ہے کہ گھر کے انتظام سے بےفکری ہوجاتی ہے جس سے قلب کو فراغ و اطمینان حاصل ہوجاتا ہے، تجربہ ہے کہ بدون بیوی کے گھر کا انتظام درست نہیں ہوسکتا، بس مرد کا کام تو اتنا ہے کہ یہ مادہ جمع کردیتا ہے، پھر ہیئت عورتوں ہی سے بنتی ہے۔ میں نے بعض رؤسا کو دیکھا ہے کہ مال و دولت ان کے پاس بہت کچھ تھا مگر بیوی نہ تھی تو ان کے گھر کا کچھ بھی ڈھنگ نہ تھا۔ لاکھ باورچی رکھو وہ راحت کہاں جو بیوی سے ہوتی ہے۔ باورچی تو تنخواہ کا ملازم ہے، ذرا ایک دن تم نے سخت بات کہہ دی اور وہ ہاتھ جھاڑ کر الگ ہوا پھر مصیبت کا سامنا ہے، پکاؤ روٹی اپنے ہاتھ سے اور چولہا جھونکو، برتن دھوؤ اور بیوی سے یہ کب ہوسکتا ہے کہ مرد کو اپنے ہاتھ سے پکانے دے۔

پھر تجربہ ہے کہ اگر بیوی کے سامنے بھی نوکروں سے کام لیا جائے اور بغیر بیوی کے بھی ان سے

کام لیا جائے تو دونوں صورتوں میں زمین آسمان کا فرق ہوگا۔ گھر کی مالک کے سامنے مامائیں اور نوکر زیادہ چوری نہیں کر سکتے اور اس کے بغیر تو گھر کا پڑا ہو جاتا ہے۔ البتہ اگر کوئی مرد گھر کا کام خود بھی جانتا ہے تو نوکر ذرا دبتے ہیں گو عورت جیسا کام تو پھر بھی نہیں ہوتا، پھر بھی زیادہ سرکشی نہیں کر سکتے۔

اس پر مجھے اپنے والد صاحب کا قصہ یاد آیا کہ جب میرٹھ میں والد صاحب ملازم تھے تو ایک بار سفر میں باورچی کو کھانا پکانے کے لئے ساتھ لے گئے۔ ایک دفعہ والد صاحب اس پر کچھ خفا ہوئے اور کھانا پکانے والے کو جواب دے دیا وہ بھی بیچ میں کھانا چھوڑ کر اٹھ کھڑا ہوا کہ لیجئے میں جاتا ہوں، اپنے نزدیک تو اس نے یہ سوچا تھا کہ اب منشی جی میری خوشامد کریں گے اور کم از کم اس وقت کے لئے کھانا پکا دینے کو تو ضرور کہیں گے مگر والد صاحب نے اسی وقت اس کا حساب کر دیا اور کہا جاؤ رخصت، وہ باورچی تھوڑی دیر کھڑا رہا کہ دیکھوں یہ کھانا پکانے کا اس وقت کیا انتظام کرتے ہیں، والد صاحب نے اسی وقت آستین چڑھائی اور ہاتھ دھو کر چولہے پر جا بیٹھے اور روٹیاں پکانا شروع کیں تو بہت عمدہ پکائیں، نا معلوم کہاں سے سیکھ لیا تھا، بس یہ دیکھ کر باورچی قدموں میں گر پڑا کہ میری خطا معاف کر دو، والد صاحب نے فرمایا کہ نالائق تو نے یہ سمجھا ہوگا کہ اب میں تیری خوشامد کروں گا، خدا کا شکر ہے مجھے سارے کام آتے ہیں، میں صرف آسانی کے لئے دوسروں سے کام لے لیتا ہوں نہ اس لئے کہ مجھے کچھ آتا نہیں۔

والد صاحب کو سینا پرونا بھی آتا تھا اور اپنے سب کام خود کر لیا کرتے تھے، کسی بات سے عار نہ تھا، ایک بار والد صاحب تھانہ بھون میں تشریف لائے تو برسات کی وجہ سے گھر کی چھتوں پر گھاس بہت کھڑا تھا، والد صاحب نے کھرپا اپنے ہاتھ میں لیا اور کوٹھے پر تشریف لے گئے اور مجھ سے بھی کہا کہ آؤ میاں اشرف علی ہم خود گھاس اکھاڑیں گے، غرض تھوڑی دیر میں سب چھتیں صاف کر دیں۔

تو کوئی شخص ایسا صاحب ہمت ہو جو سب کام کر سکتا ہو وہ تو شاید بیوی کے بغیر پریشان نہ ہو مگر ایسے بہت کم ہیں، زیادہ وہی ہیں جو نوکروں کو جواب دینے پر پریشان ہو جاتے ہیں اس لئے بیوی کی قدر کرنا چاہیے کہ وہ دنیا اور دین دونوں کی معین ہے اور اس کے حقوق کی رعایت بہت زیادہ ضروری ہے کیونکہ اس میں چند در چند خصوصیات ہیں جن میں سے ہر ایک کے بہت سے حقوق ہیں چونکہ آج کل لوگ عورتوں پر بہت ظلم کرتے ہیں اس لئے میں نے اس پر تنبیہ کرنا ضروری سمجھا۔

اب میں آیت کا ترجمہ کرتا ہوں حق تعالیٰ فرماتے ہیں:

اِنَّمَا السَّبِيلُ عَلَى الَّذِينَ يَظْلِمُونَ النَّاسَ وَيَبْغُونَ فِي الْاَرْضِ بِغَيْرِ الْحَقِّ

بس الزام تو ان ہی لوگوں پر ہے جو آدمیوں پر ظلم کرتے ہیں اور ناحق تکبر کرتے ہیں۔ عبارۃ النص اور مسوق لہ الکلام تو اس آیت میں انتقام کے وقت ظلم کی وعید کا بیان کرنا ہے مگر اشارۃ ابتداء ظلم کو بھی شامل ہے۔ خواہ انتقام میں ہو یا نہ ہو کیونکہ الفاظ آیت میں عموم ہے اور اسی لیے میں نے اپنی تفسیر میں تعیم پر تنبیہ کر دی ہے بلکہ اشارہ کے ساتھ دلالۃ بھی تحریم ظلم پر دال ہے اور یہ بات بہت ہی ظاہر ہے کیونکہ انتقاماً ظلم کا حرام ہونا۔ ابتداء ظلم کی حرمت کو بدرجہ اولی مستلزم ہے کیونکہ انتقام کے وقت انسان کو جوش غضب ہوتا ہے اس لئے کہ پہلے دوسرے کی طرف سے ظلم ہو چکا ہے اور جوش میں حد سے بڑھ جانا مستبعد نہیں بلکہ حد پہ قائم رہنا بھی بڑی ہمت کا کام ہے تو جب مقام عذر میں بھی ظلم کی اجازت نہیں تو جہاں کوئی سبب اور عذر بھی نہ ہو تو ظلم کی اجازت کیونکر ہو سکتی ہے لہٰذا دلالۃ النص سے بھی یہ آیت ابتداء ظلم کو شامل ہے اس کے بعد فرماتے ہیں:

وَيَبْغُونَ فِي الْاَرْضِ بِغَيْرِ الْحَقِّ (اور سرکشی و تکبر کرتے ہیں زمین میں)

یہ اس لیے بڑھایا کہ بتلا دیا کہ ظلم کا منشاء اور سبب تکبر ہے چنانچہ میں نے کہا تھا کہ حقوق العباد کے عدم اہتمام کا ایک سبب ہے وہ یہ کہ لوگوں نے تاکید حق کا سبب صرف عظمت میں منحصر کر لیا ہے جس کی عظمت دل میں ہے اس کے حقوق تو ادا کرتے ہیں اور جس کی عظمت قلب میں نہیں اس کے حقوق کو ادا نہیں کرتے اور کسی کی عظمت نہ ہونے کا مطلب یہی ہے کہ اس کو اپنے سے حقیر سمجھا جاتا ہے۔

تکبر کا علاج

یہی حاصل ہے تکبر کا اسی کو حق تعالیٰ نے یبغون میں بیان فرمایا اور چونکہ تکبر کا مذموم ہونا عقلاً و نقلاً سب کو مسلم ہے لہٰذا اس کا علاج بھی ضروری ہوا، آگے حق تعالیٰ نے فی الارض میں علاج بتلایا ہے، حق تعالیٰ کی بھی عجیب تعلیم ہے کہ بیماری کے ساتھ ساتھ دوا بھی بتلاتے ہیں، تمام قرآن کو غور سے دیکھا جائے تو معلوم ہوگا کہ جہاں کسی مرض کو بیان فرمایا ہے وہاں ساتھ ساتھ علاج بھی بتلا دیا ہے بس وہ شان ہے کہ

درد از یارست ودرماں نیز ہم — دل فدائے اوشد و جاں نیز ہم

(مرض بھی دوست کی طرف سے اور اس کا علاج بھی، دل بھی اس پر فدا ہے اور جان بھی)

حق تعالیٰ نے کائنات میں بھی یہی طرز رکھا ہے کہ جو چیز کسی بات کو مضر ہے اس کے پاس ہی مصلح بھی موجود ہے ایک سیاح کہتے تھے کہ ایک گھاس سخت زہریلی ہے جس کا نام بچھو ہے اگر کسی کو لگ جائے تو بچھو کے کاٹنے کی سی لہر دوڑ جاتی ہے مگر اس کے پاس ایک دوسری گھاس بھی پیدا ہوتی ہے وہ اس کا تریاق ہے کہ جہاں اس کو ملا فوراً تکلیف زائل ہوگئی۔

اسی طرح یہاں فی الارض میں علاج کبر پر تنبیہ کی گئی ہے کہ حیرت کی بات ہے کہ زمین پر رہ کر اور مٹی سے پیدا ہو کر تکبر کرتے ہو، ذرا سوچو تو تمہاری اصل کیا ہے، یہی زمین تمہاری اصل ہے جس پر آدمی اور جانور چلتے پھرتے، پیشاب، پاخانہ کرتے ہیں۔ یہ تمہاری ماں ہے پس تم کو تو خاک بن کر رہنا چاہیے، ایک دوسرے مقام پر بھی حق تعالیٰ نے اس بات پر تنبیہ کی ہے۔

مِنۡهَا خَلَقۡنٰكُمۡ وَفِيۡهَا نُعِيۡدُكُمۡ وَمِنۡهَا نُخۡرِجُكُمۡ تَارَةً اُخۡرٰى

(اس سے ہم نے تم کو پیدا کیا اور اسی میں تم کو لوٹائیں گے)

اس میں بھی مراقبہ ارض کی تعلیم ہے کہ ہم نے تم کو زمین ہی سے پیدا کیا اور اسی میں لوٹا دیں گے کہ مر کر سب خاک ہو جاؤ گے، سارا بدن گل سڑ جائے گا، پھر کس بات پر تکبر کرتے ہو؟ واقعی تکبر کا یہ عجیب علاج ہے، پس ہم کو اس سے کام لینا چاہیے اور زمین کی حالت میں تفکر کرنا چاہیے اس کو سعدی نے لیا ہے۔

زخاک آفریدت خداوند پاک　　پس اے بندہ افتادگی کن چو خاک

(خداوند تعالیٰ نے تجھ کو خاک سے پیدا کیا پس اے بندہ مثل خاک فروشی کر)

افسوس ہماری ماں کی تو یہ حالت ہے کہ وہ سب کے پاؤں کے تلے ہے اور ہماری یہ حالت ہے کہ آسمان پر چڑھے جاتے ہیں۔ صاحب یہ سارا ناز اسی وقت تک ہے جب تک خدا کی نعمتیں ہمارے پاس ہیں۔ اگر ایک نعمت بھی چھن جائے تو سارا ناز خاک میں مل جائے۔ آخر مجنون میں کس بات کی کمی ہو جاتی ہے جو اس کو جانور سے بدتر سمجھنے لگتے ہو بس دماغ میں کمی ہو جاتی ہے مگر دیکھ لیجئے پھر کیا حشر ہوتا ہے۔

ہمارے ایک دوست کو فالج ہو گیا حالانکہ وہ بہت بڑے عالم تھے مگر دماغ پر فالج پڑنے سے سارا علم غتر بود ہو گیا، الحمد للہ تک بھول گئے تھے، افاقہ کے بعد بچوں کی طرح ان کو الحمد یاد کرائی گئی تو ان کے بھائی کو بڑی خوشی ہوئی اور مٹھائی بانٹی گئی جیسے بچوں کی بسم اللہ میں مٹھائی بانٹی جاتی ہے۔ پھر انسان کا ہے پر تکبر کرتا ہے یہ سب چیزیں خاک میں ملنے والی ہیں، فی الارض میں اس پر متنبہ کیا گیا ہے! زمین میں رہ کر تکبر کرتے ہو تم کو شرم نہیں آتی۔

اس کے بعد ''بغیر الحق'' دونوں کیلئے واقعی قید ہے ظلم کے لئے بھی اور بغی کے لئے بھی کیونکہ ظلم اور تکبر دونوں بغیر الحق اور ناحق ہی ہوتے ہیں۔ اس میں تصریحاً یہ بات بتلادی کہ تم کو تکبر اور ظلم کا کچھ حق نہیں ہے پھر ناحق کیوں ظلم کرتے ہو اور گو اس کے بیان کی ضرورت نہ تھی مگر اس کی تصریح اس لیے کردی کہ بعض لوگ اپنی جہالت کی وجہ سے یہ سمجھتے ہیں کہ ہم کو تکبر کا حق ہے کیونکہ خدا نے ہم کو بڑا بنایا ہے اس لئے تصریحاً بتلادیا کہ خدا نے تو تم کو زمین سے پیدا کیا اور زمین میں رہنے کا حکم دیا ہے تم کو آسمان پر چڑھنے کا کیا حق ہے۔

ظالموں کا انجام

آگے اس سبیل کی تعیین فرماتے ہیں کہ ظلم کرنے والوں پر جو الزام ہے اس کی صورت کیا ہو گی، فرماتے ہیں: ''اُولٰئِکَ لَهُمْ عَذَابٌ اَلِیْمٌ'' ان لوگوں کے لیے دردناک عذاب ہے۔
صاحبو! یہ ظلم کا معاملہ ایسا سخت ہے کہ جب تک بندہ اپنا حق نہ معاف کردے اس وقت تک خدا بھی معاف نہ کرے گا، خدا تعالیٰ اپنے حقوق تو معاف کردیتے ہیں مگر بندہ کے حقوق جب تک وہ معاف نہ کرے معاف نہیں کرتے یہ بہت سخت بات ہے۔

سلطان محمود غزنوی رحمۃ اللہ علیہ بڑے عادل اور غازی بادشاہ تھے ایک دفعہ انہوں نے خواب میں ایک بڑا عالی شان خوبصورت جنت کا محل دیکھا، فرشتوں سے پوچھا کہ یہ محل کس کے واسطے ہے، کہا محمود غزنوی کے لئے ہے۔ انہوں نے کہا کہ پھر مجھے اندر جانے دو، میں اپنے محل کو دیکھوں فرشتوں نے کہا ابھی آپ کو اندر جانے کی اجازت نہیں، آپ کے ذمہ ایک مقدمہ ہے اس کا فیصلہ ہوجائے تو پھر اجازت ہوگی، پوچھا کیا مواخذہ ہے تو انہوں نے ایک چابک جو دیوار میں لٹکا ہوا تھا کہ تم نے اس کوڑے سے ناحق ایک ملازم کو مارا ہے جب تک اس کا حق ادا نہ ہوجائے آپ جنت میں نہیں جاسکتے۔

بس یہ سن کر محمود رحمۃ اللہ علیہ کانپ ہی تو گئے اور گھبراہٹ سے آنکھ کھل گئی، صبح تک بیتابی کے ساتھ کروٹیں بدلتے رہے۔ جب صبح ہوئی تو اس ملازم کو بلایا اور چابک اس کے سامنے ڈال دیا کہ تیرا جتنا جی چاہے مجھے اس سے مارلے اور آگے ہاتھ جوڑے کہ واللہ تو اپنا بدلہ لے لے ورنہ میں جنت سے محروم ہوجاؤں گا، اس نے کہا کہ حضور! مجھ پر ایک تو وہ ظلم ہوا تھا اس سے بڑھ کر آپ دوسرا ظلم یہ کرتے ہیں کہ مجھ سے انتقام کو فرماتے ہیں، وہ قدموں میں گر پڑا اور کہا کہ میں

نے جہاں پناہ کو معاف کیا۔ آپ بالکل بے فکر رہیں مگر محمود کی اس سے تسلی نہ ہوئی اس کو بہت سا انعام واکرام دیا جس سے وہ خوش ہوا تب چین پڑا۔

تو صاحب یہ ظلم ہلکی چیز نہیں ساری عبادتیں اس وقت تک نا کافی ہیں جب تک ظلم سے براءت نہ ہوگی۔ درمختار میں ہے کہ ایک دانگ کے بدلے میں جو درہم کا چھٹا حصہ ہے جس کو تین پیسے سمجھ لیجئے سات سو مقبول نمازیں حقدار کو دلائی جائیں گی۔ مجھے اس روایت کی صحت وضعف کی تحقیق نہیں، ممکن ہے فقہاء کو تحقیق ہوئی ہو پھر دوسرے نصوص بھی تو اس بارہ میں موجود ہیں، غرض ہر حال میں کتنی سخت مصیبت ہوگی، اول تو ہماری نمازیں مقبول ہی کتنی ہیں پھر تین تین پیسہ کے بدلہ میں وہ بھی جاتی رہیں تو بتلایئے قیامت میں کیسی حسرت ہوگی۔

مفلس کی تعریف

حدیث مسلم میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہؓ سے فرمایا: "من المفلس فیکم" (فتح الباری لابن حجر ۴:۱۰۹، سنن الترمذی: ۲۴۱۸) تم مفلس کس کو سمجھتے ہو۔ صحابہ رضی اللہ تعالیٰ عنہم نے عرض کیا کہ ہمارے نزدیک مفلس وہ ہے جس کے پاس درہم ودینار نہ ہو۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اس سے بڑھ کر مفلس وہ ہے جس نے نمازیں بھی بہت پڑھی تھیں، روزے بھی بہت رکھے تھے، حج بھی کیا تھا، زکوٰۃ بھی دی اور صدقات بھی کیے تھے:

ولکن قذف هذا واخذ مال هذا فجاء رجل فذهب بصلواته وجاء اخر فذهب بصيامه (الحديث)

"لیکن تہمت زنا کی اس پر لگائی، اس کا مال لے لیا، پس ایک شخص آیا تو اس کی نمازیں لے لیں، دوسرا آیا اس کے روزے لے لیے۔"

مگر اس کے ساتھ اس نے کسی کو گالی دی تھی، کسی کو مارا پیٹا تھا، کسی کا مال لے لیا تھا۔ اب قیامت میں ایک آیا وہ اس کی نمازیں لے گیا، دوسرا آیا وہ روزے لے گیا، تیسرا آیا وہ حج لے گیا، چوتھا آیا وہ زکوٰۃ وصدقات لے گیا۔ پھر بھی کچھ حق دار بچ گئے اور ان کو دینے کو نیکیاں نہ بچیں تو ان کے گناہ اس پر ڈال دیئے گئے اور یہ طاعات سے خالی ہو کر گناہوں میں لا کر جہنم میں داخل ہوا۔ یہ سب سے بڑا مفلس ہے۔

پہلی روایت میں اگر کچھ کلام ہو تو یہ حدیث تو بالکل صحیح ہے تو کیا یہ بات تھوڑی ہے کہ ذرا

ذرا سے حقوق العباد کے بدلہ میں ساری کی کرائی محنت دوسروں کو مل جائے گی۔ اب تو آپ کو معلوم ہوا کہ حقوق العباد من وجہ نماز روزہ سے بھی مقدم ہیں ان کا بہت اہتمام کرنا چاہیے مگر افسوس آج کل لوگوں کو ان کا بالکل ہی اہتمام نہیں۔

حقوق العباد کی تلافی کا طریقہ

اب یہاں ایک سوال ہے۔ وہ یہ کہ ایک شخص نے کسی پر ظلم کیا ہو اور کسی سے رشوت لی ہو کسی کی غیبت کی ہو اور اب وہ مر چکے ہیں یا لاپتہ ہیں تو انکے حقوق کیونکر ادا کر سکتے ہیں۔

اس کا جواب یہ ہے کہ شریعت میں کوئی صورت لاعلاج نہیں ہے، کرنے والا ہونا چاہیے۔ اس کی تدبیر یہ ہے کہ اول تو پوری کوشش کرے، ان لوگوں کے پتہ لگانے میں اگر ان کا پتہ لگ جائے تب تو ان کو حق پہنچائے۔ اگر معلوم ہوا کہ وہ مر گئے ہیں تو مالی حقوق ان کے ورثاء کو پہنچائے۔ اگر ورثاء کا بھی پتہ نہ لگے تو جتنی رقم تم نے ظلم و رشوت سے لی ہے اتنی رقم خیرات کر دو اور نیت کر لو کہ یہ ہم ان کی طرف سے دے رہے ہیں۔ یہ حقوق مالیہ کا حکم ہے۔

غیبت، شکایت اور جانی ظلم کی تلافی کا طریقہ یہ ہے کہ مظلوم مر گیا ہو یا لاپتہ ہو گیا ہو تو اس کے حق میں دعا کرو، نماز اور قرآن پڑھ کر اس کو ثواب بخشو اور عمر بھر اس کے لئے دعا کرتے رہو۔ ان شاء اللہ حق تعالیٰ ان کو تم سے راضی کر دیں گے جس کی صورت قاضی ثناء اللہ صاحب نے یہ لکھی ہے کہ قیامت میں مسلمانوں کو بڑے بڑے خوبصورت عالی شان محل دکھلائیں جائیں گے اور حق تعالیٰ فرمائیں گے کہ ان محلات کا خریدار کوئی ہے اور ارشاد ہو گا کہ ان کی قیمت یہ ہے کہ جس کا جو حق کسی کے ذمہ ہو اسے معاف کر دے، اس وقت کثرت سے اہل حقوق اپنے حق معاف کر دیں گے، پھر سرکار کی طرف سے مثل داخل دفتر ہو جائے گی۔ قاضی صاحب اپنے زمانے کے محدث اور محقق تھے۔ انہوں نے تحقیق کر کے یہ روایت کہیں سے لکھی ہوگی، ہم کو ان پر اعتماد ہے۔

غرض معذرت کرنے والوں کی وہاں بڑی قدر ہے۔ ان کے حقوق اللہ تعالیٰ خود ادا کر دیں گے، وہاں تو اینٹھ مروڑ پر گرفت ہوتی ہے کہ باوجود ظلم و تعدی کے پھر بھی فکر نہ ہو اور ادائے حقوق کا اہتمام نہ ہو۔

اب ایک سوال اور رہ گیا وہ یہ کہ کسی نے مثلاً دس ہزار روپے سود یا رشوت میں لیے ہیں اور

یہ بھی معلوم ہے کہ کس کس سے لیے ہیں۔ اب وہ چاہتا ہے کہ اس کا حق ادا کرے تو کیونکر کرے اس لئے کہ اس وقت اس کے پاس دس ہزار روپے نہیں ہیں، ساری عمر میں جو حرام مال کھایا تھا آج ایک دن میں سب کیسے ادا کر دے۔

اس کا جواب یہ ہے کہ خدا تعالیٰ کے یہاں کام کا شروع کر دینا اور ادا کا عزم کر لینا بھی مقبول ہے۔ تم اول تو صاحب حق سے معافی کی درخواست کرو، اگر وہ خوشی سے معاف کر دے تب تو جلدی ہلکے ہوئے اور اگر معاف نہ کرے تو اب تھوڑا تھوڑا جتنا ہو سکے اس کا حق ادا کرتے رہو مگر یہ ضروری ہے کہ اپنے فضول اخراجات کو موقوف کر دو۔ بس ضروری ضروری خرچوں میں اپنی آمدنی خرچ کرو اور اس سے جتنا بھی بچے وہ حقدار کو ادا کرو اور اگر وہ مر گئے ہوں تو ان کے ورثاء کو دو اور اگر ورثاء بھی نہ معلوم ہوں تو ان کی نیت سے خیرات کرتے رہو۔ ان شاء اللہ اول تو امید ہے کہ حق تعالیٰ ادا کر دیں گے۔ حق تعالیٰ کے یہاں نیت کو زیادہ دیکھا جاتا ہے جس کی نیت پختہ ہو کہ میں حق ادا کروں گا پھر اس پر عمل بھی شروع کر دے، حق تعالیٰ اس کو بالکل بری کر دیتے ہیں۔

نیت کی برکات

صاف نیت وہ چیز ہے کہ جنت میں جو آپ ہمیشہ ہمیشہ کے لئے رہیں گے، معلوم بھی ہے یہ کس چیز کی برکت ہے یہ نیت ہی کی تو برکت ہے کیونکہ عمل تو انسان زندگی بھر کرتا ہے۔ اس کا صلہ بہت سے بہت یہ تھا کہ ہزار دو ہزار سال تک بہشت میں رہنا ہو جاتا، عمل محدود کی جزاء عقلاً محدود ہوتی ہے مگر یہ غیر محدود جزاء آپ کی نیت ہی کی وجہ سے ہے کہ مسلمان گو عمل کرتا ہے، محدود زمانہ میں مگر اس کی نیت ہوتی ہے کہ اگر میں ابد تک بھی زندہ رہوں تو ہمیشہ اسلام و اعمال صالحہ پر جما رہوں گا اس لیے ان کی جزاء بھی دائمی ہے اور یہی راز ہے، کفار کے عذاب دائمی کا کیونکہ وہ بھی گو زمانہ محدود تک کفر کرتے ہیں مگر نیت ان کی یہی ہوتی ہے کہ ابدالآباد تک بھی زندہ رہیں گے تو اسی طریقے پر جمے رہیں گے۔ پس نیت کو آپ حقیر نہ سمجھیں، ثواب ابدی کے مستحق آپ اسی وجہ سے ہیں۔ لہٰذا اسی وقت سے ادا حقوق کا اہتمام شروع کر دو اور نیت پختہ کر لو کہ ادا کر کے رہیں گے اور تھوڑا تھوڑا ادا کرتے رہو۔ ان شاء اللہ پھر آپ اس بوجھ سے ہلکے ہو جائیں گے ورنہ یاد رکھئے کہ حق دار قیامت میں آپ کی بوٹیاں کھالیں گے اور ساری نیکیاں چھین لیں گے۔ نیز حدیث میں آتا ہے کہ "الظلم

ظلمات یوم القیامه" (کہ ظلم کے لئے قیامت میں بہت ظلمتیں ہیں، خدا اس سے محفوظ رکھے)

اب میں ختم کرتا ہوں۔ بحمد اللہ اس وقت حقوق العباد کی تفصیل اور توضیح کافی ہو چکی ہے اور اشکالات کا حل بھی ہو گیا ہے۔ اب کسی کے پاس کوئی عذر نہیں رہا۔

جو اس پر بھی نہ وہ سمجھے تو اس بت کو خدا سمجھے

حدیث میں ہے کہ حقوق کو دنیا ہی میں ادا کر دیا معاف کرا لو، پہلے اس دن کے جس میں روپیہ پیسہ کچھ نہ ہو گا۔ اب دعا کیجئے کہ حق تعالیٰ ہم کو توفیق دیں اور فہم سلیم عطا فرما دیں۔

وصلی اللہ علی سیدنا ومولانا محمد وعلی اله واصحابه وسلم تم بحمدالله وبنعمته وجلاله تتم الصالحات واخر دعوانا ان الحمدلله رب العالمین.

کف الاذیٰ

حقوق المسلمین کے متعلق یہ وعظ ۲۲ صفر ۱۳۳۱ھ کو مدرسہ مصباح العلوم بانس بریلی میں بیٹھ کر بیان فرمایا جو ۲ گھنٹے میں ختم ہوا۔ مولانا سعید احمد صاحب تھانوی نے اسے قلم بند فرمایا۔

خطبہ ماثورہ

الحمدللہ نحمدہ ونستعینہ ونستغفرہ ونؤمن بہ ونتوکل علیہ ونعوذ باللہ من شرور انفسنا ومن سیئات اعمالنا من یھدہ اللہ فلا مضل لہ ومن یضللہ فلا ھادی لہ ونشھدان لا الہ الا اللہ وحدہ لا شریک لہ ونشھدان محمداً عبدہ ورسولہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وعلیٰ وآلہٖ واصحابہ وبارک وسلم. اما بعد فقد قال النبی صلی اللہ علیہ وسلم المسلم من سلم المسلمون من لسانہ ویدہ.

(الصحیح للبخاری ۱:۹،۸:۱۲۷، الصحیح لمسلم کتاب الایمان:۶۵)

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ پورا مسلمان وہی ہے جس کی زبان اور ہاتھ سے مسلمان سالم رہیں۔

غایت اور خاصیت شریعت

یہ ایک حدیث ہے جس کے الفاظ باوجود نہایت مختصر ہونے کے باعتبار معانی کے نہایت جامع ہیں۔ اس میں ایک ضروری قاعدہ بیان کیا گیا ہے جو مصالح شرعیہ وتمدنیہ دونوں کو شامل ہے مگر اس سے یہ غرض نہیں کہ شریعت کی غرض تمدن کو محفوظ رکھنا ہے بلکہ شریعت کی غرض صرف یہ ہے کہ رضائے خداوندی حاصل ہو اور تعلق ما بین العبد والحق (یعنی اللہ تعالیٰ اور بندہ کے درمیان تعلق) صحیح پیدا ہو لیکن یہ حق تعالیٰ کی عنایت ہے کہ اس نے احکام اس طور پر مقرر فرمائے ہیں کہ ان پر مصالح تمدنی بھی مرتب ہو ہی جاتے ہیں۔ یعنی ان میں حق تعالیٰ نے یہ خاصیت رکھی ہے اور خاصیت کے مرتب ہونے کے لئے قصد کی ضرورت نہیں ہوتی بلکہ وہ بلا قصد ہی مرتب ہو جاتی ہے تو ایک تو غایت ہوتی ہے اور ایک خاصیت۔ یہ دونوں ایک چیز نہیں ہیں ان دونوں میں بڑا فرق ہے۔ مثلاً ماکولات (کھانے کی چیزیں) میں تو بعض اس قسم کی چیزیں ہیں جن کی غرض تو جزو بدن بنانا ہے

لیکن ان میں لذت بھی ہوتو وہ لذت مقصود نہیں مقصود بلکہ وہی جزو بدن بنانا ہے لیکن چونکہ لذت اس کو لوازم اور خاصیات میں سے ہے اس لئے لذت بھی حاصل ہوگی اگر چہ مقصود نہیں ہے۔ اسی طرح اگر کسی ماکول چیز سے محض لذت مقصود ہو تو بھی اس میں طبی منافع جو اس کی خاصیات میں سے حاصل ہوں گے مگر یہ منافع اس وقت مقصود نہیں ہیں بلکہ مقصود صرف لذت حاصل کرنا ہے۔

خلاصہ یہ ہے کہ تغذیہ (غذا دینے) کے لئے جو ماکولات کھائے جاتے ہیں وہاں مقصود جزو بدن بنانا ہے اور لذت وغیرہ خاصیات ہونے کی وجہ سے بلاقصد حاصل ہو جاتی ہے اور جو ماکولات تفکہ (لذت حاصل کرنے) کے لئے کھائے جاتے ہیں ان سے مقصود لذات ہے اور دیگر منافع بلاقصد حاصل ہو جاتے ہیں۔ اسی طرح احکام شرعیہ میں مقصود تو رضائے خداوندی ہے مگر منافع تمدن کی خاصیت ان میں حق تعالیٰ نے رکھی ہے جو بلاقصد بھی حاصل ہوتے ہیں۔

عقلاء کو دھوکہ

اب سمجھئے کہ بعض عقلاء کو اس مقام پر دھوکہ ہوا۔ وہ یہ کہ جب انہوں نے دیکھا کہ احکام شرعیہ میں مصالح تمدنیہ بھی مرتب ہوتے ہیں تو وہ یہ سمجھے کہ اصل غرض یہی منافع تمدن ہیں چنانچہ اس وقت سب سے بڑا حکیم وہ سمجھا جاتا ہے جو احکام دین میں مصالح تمدنیہ بیان کرے حالانکہ اول تو وہ تخمینی ہیں لیکن اگر یقینی بھی ہوں تو وہ لوازم ہیں، مقاصد نہیں سوان عقلاء کو تلبیس ہوئی کہ وہ لوازم کو مقاصد سمجھے۔ مثلاً سفر حج کے لوازم میں سے ہے سیر بمبئی و سیر جہاز تو اگر کوئی اسی کو مقصود سمجھے تو اس کو کچھ بھی ثواب نہ ہوگا کیونکہ حکم شرعی کا یہ مقصود نہیں بلکہ لوازم میں سے ہے اور اسی کو مختصراً جملہ میں فرمایا ہے کہ:

انما الاعمال بالنیات (الصحیح للبخاری ۱:۲،۸:۱۷۵،۹:۲۹، سنن ابن داؤد: ۲۲۱۰)

(اعمال کی مقبولیت نیت پر موقوف ہے) کہ اگر احکام دین میں دنیا کی نیت ہو تو وہ مقبول نہیں اس سے صاف معلوم ہوا کہ منافع دنیویہ مقصود نہیں گو مرتب ہو جاتے ہیں۔ مثلاً جماعت کی نماز پر اتفاق کا مرتب ہونا ایسا ہی ہے جیسا کہ سفر حج پر سیر بمبئی اور سیر جہاز مرتب ہوتا ہے۔ بس خوب سمجھ لینا چاہیے اس میں بڑا دھوکہ ہوا جاتا ہے کہ جن منافع کو احکام پر مرتب ہوتے ہوئے دیکھتے ہیں ان کو احکام کا مقصود سمجھ لیتے ہیں تو سمجھ لینا چاہیے کہ لوازم اور ہیں اور غایت اور ہے تو اگر کوئی جماعت کی نماز محض اتفاق کے حصول کی نیت سے پڑھے تو ثواب نہ ہوگا اور اگر حق تعالیٰ

کی رضا اس سے مقصود ہو تو یہ تو حاصل ہو ہی گئی اور منفعت اتفاق بھی مفت میں ملے گی تو مرتب ہوتے دیکھ کر اس کو مقصود سمجھنا یہ دھوکہ ہے اور اس میں بہت لوگ مبتلا ہیں۔ حتیٰ کہ ان کا مشن یہ ہو گیا ہے کہ ہر حکم میں مصالح کی تلاش کرتے ہیں اور علماء سے بھی ان کی جستجو کرتے ہیں اور علماء میں چونکہ محقق کم ہیں کیونکہ استعداد حل الفاظ کا نام نہیں ہے بلکہ علم کہتے ہیں۔ حقیقت بینی کو تو ایسے لوگ کم ہیں تو اس وقت بہت سے بھولے بھالے اہل علم بھی اس میں مبتلا ہو گئے ہیں اور انہوں نے اپنا بڑا فرض منصبی یہ سمجھ لیا ہے کہ احکام کے مصالح اور اسرار بیان کرتے ہیں۔

تو تین قسم کے لوگ ہوئے ایک تو وہ کہ بالکل منکر ہیں یہ تو تفریط ہے اور ایک وہ کہ ان ہی مصالح کو مقصود سمجھتے ہیں۔ یہ افراط ہے پہلی صورت تو تفریط اس وجہ سے ہے کہ جب اپنی آنکھوں سے دیکھتے ہیں کہ جماعت سے مثلاً اتفاق ہوتا ہے تو پھر مصالح کا کیسے انکار کر دیں اور ان کو مقصود سمجھ لینا افراط اس واسطے ہے کہ اس کو یہ حدیث رد کرتی ہے کہ:

من كانت هجرتهٔ الى الله ورسوله فهجرته الى الله ورسوله ومن كانت هجرتهٔ الى دنيا يصيبها او امراءة يتزوجها فهجرته الى ما هاجر اليه.

''یعنی جس شخص کی نیت اللہ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف ہجرت کرنے کی ہے اس کی ہجرت تو اللہ اور رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف ہے اور جس کی نیت ہجرت میں دنیا حاصل کرنے کی ہے یا کسی عورت سے نکاح کرنے کی ہے تو اس کی ہجرت اللہ اور رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف نہیں بلکہ اسی چیز کی طرف ہے جس کی اس نے نیت کی۔''

تو صاف فرما رہے ہیں کہ ہجرت میں اگرچہ عورت یا دنیا مل ہی جاوے لیکن اگر وہی مقصود ہوا اور اسی کی نیت ہو تو ثواب نہ ہوگا تو معلوم ہوا کہ یہ دونوں مسلک غلط ہیں۔

محققین کی شان

اب محققین کی شان دیکھئے کہ نہ ترتیب مصالح کا انکار کیا اور نہ اس کو مقصود بنایا کہ مصالح کے نفی و اثبات کو اس طرح جمع کیا کہ فرق ہے ترتیب اور قصد میں اور لازم اور غایت میں غایت تو وہ ہے کہ اِلَّا ابْتِغَآءَ وَجْهِ رَبِّهِ الْاَعْلٰى (سوائے رضائے الٰہی کے اور کچھ مقصود نہیں) محب کو محبوب کی اطاعت سے اصل غرض اور مقصود یہی ہوگا کہ محبوب خوش ہو مگر مل جاتی ہے تنخواہ بھی لیکن

اگر یہ مقصود ہو کہ تنخواہ بھی ملے گی تو یہ محبّ نہیں بلکہ اجیراء (مزدور) ہے۔ اسی واسطے کہتے ہیں۔

تو بندگی چوگدایاں بشرط مزدمکن   کہ خواجہ خودروش بندہ پروری داند

(یعنی محبوب حقیقی کی اطاعت ثواب کی غرض سے نہ کرو بلکہ اس سے رضا مطلوب ہو مگر ثواب بھی مل جائے گا۔)

بعض نے اس میں بھی غلو کیا ہے کہ جیسے احکام کے بجالانے میں دنیا مقصود نہیں ثواب بھی مقصود نہیں واقعی اس راستہ میں قدم قدم پر خطرہ ہے پس جو دامن پکڑ لے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا اس کے لئے کچھ خطرہ نہیں سو یہ راستہ آسان بھی ہے اور دشوار بھی، عمل کے لئے تو آسان ہے کہ تحقیق ہونے کے بعد عمل میں کچھ دشواری نہیں ہوتی اور تحقیق کی شان مشکل ہے اسی لیے ہر ایک کو اجتہاد کی ہوس نہ چاہیے تو یہ بھی غلطی ہے کہ ثواب کو بھی مقصود نہ سمجھے اور اس غلطی کی وجہ یہ ہے کہ انہوں نے غور نہیں کیا اور طلب رضا اور طلب جنت میں منافات سمجھے اگر منافات ہوتی تو بے شک دونوں جمع نہ ہو سکتے مگر منافات نہیں کیونکہ جس کو راضی کرنے کی فکر ہے اس سے پوچھو کہ تحقق رضا کی کیا صورت ہے تو وہاں سے یہ جواب ملتا ہے کہ:

یسقون من رحیق مختوم ختامه مسک.

(یعنی خالص شراب پلائی جائے گی، جو مشک سے سربمہر ہوگی)

اس کے بعد فرماتے ہیں وفی ذلک وَفِيْ ذٰلِكَ فَلْيَتَنَافَسِ الْمُتَنَافِسُوْنَ تو امر فرماتے ہیں کہ ان کے اندر رغبت کرو یہ چیزیں قابل تحصیل ہیں اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں:

اللھم انی اسئالک رضاک والجنة (کنز العمال:۳۲۳۴، ۴۷، اتحاف السادة ۹:۶۰۴)

(کہ اے اللہ! میں آپ سے آپ کی رضا اور جنت کا سوال کرتا ہوں) قربان جایئے کہ کیسا اس کو صفا کر دیا کہ ایک ہی دعا میں دونوں کو جمع کر دیا اور بتلا دیا کہ دونوں لازم ملزوم ہیں کیونکہ ان ہی کا حکم ہے کہ جنت مانگو تو وہ جب جنت کے مانگنے کا حکم ہے تو مطلب یہ ہوا کہ جنت کو مانگنے سے وہ راضی ہوں گے۔ پس جب انہی کی یہ خوشی ہے کہ ہم جنت کو طلب کریں تو پھر ہم کیوں اس کے خلاف کریں۔ اسی کو مولانا نے فرمایا ہے:

چوں طمع خواہد زمن سلطان دین   خاک برفرق قناعت بعد ازیں

(یعنی جب سلطان دین ہی ہم سے طمع کرنیکے خواہش مند ہوں تو اسکے بعد قناعت پر خاک ڈالنی چاہیے)

رضائے خداوندی

صاحبو! اس کا ایک راز میں بتلاتا ہوں سنئے! راز اس کا یہ ہے کہ خدا کی شان ہے بہت بڑی اور بندہ ہے بہت محتاج تو براہ راست رضا طلب کرنا دعویٰ ہے بڑائی کا تو اس واسطے حق تعالیٰ نے واسطے رکھے ہیں کیونکہ واسطے نہ ہونے کی حاجت میں چونکہ رضا سے محض حظ روحانی ہوگا تو اگر اس پر اکتفا کریں تو گویا یہ حظ جسمانی سے مستغنی ہے اور یہ شان افتقار کے خلاف ہے تو اس لیے حق تعالیٰ نے یہ واسطہ رکھا کہ جنت کا سوال کیا جائے تاکہ ہر طرح احتیاج ظاہر ہو، حظوظ روحانی میں بھی اور حظوظ جسمانی میں بھی کیونکہ جنت کے اندر دونوں قسم کے حظوظ ہوں گے۔

اگر کوئی کہے کہ اگر یہی بات ہے تو دنیا کی نعمتوں میں بھی یہ تقریر ہوسکتی ہے کہ عبادت میں ان کی طلب بھی اس اظہار کے لئے کرے کہ میں اتنا محتاج ہوں کہ نعماء دنیا (دنیا کی نعمتوں) سے بھی مجھ کو چارہ نہیں۔

تو بات یہ ہے کہ استغنا تو بے شک اس سے بھی نہیں مگر اس کا طریقہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے دعا کو بتایا اور آخرت کے لئے عمل کو مشروع کیا ہے اور یہ صرف حاکم ہی کو اختیار ہے کہ جس کے لئے جو چاہے مقرر کرے تو دعا تو دنیا اور آخرت دونوں کے لئے رکھی اور اعمال دنیا صرف دنیا کے لئے رکھے اور اعمال آخرت صرف آخرت کے لئے جیسے نماز، روزہ وغیرہ۔ تو اعمال تو دونوں کے لئے الگ الگ اور ایک دعا دونوں میں مشترک تو کتنا عدل ہے تو وہ شبہ بھی جاتا رہا کہ عبادات میں نعماء آخرت کی طلب ناجائز ہے اور یہ شبہ بھی جاتا رہا کہ پھر دنیا کی طلب بھی ہونی چاہئے۔

حاصل یہ ہے کہ اعمال آخرت سے دنیا کی طلب ناجائز ہے بلکہ ان سے تو صرف رضائے خداوندی اور جنت کی طلب ہونی چاہیے تو اب معلوم ہو گیا ہوگا کہ یہ خیال کہ دنیا کے مصالح مقصود ہیں، غلط ہے بلکہ مقصود صرف رضا اور جنت ہے۔ البتہ اس میں مصالح دنیا بھی ہیں مگر ان کی ایسی مثال ہے جیسے کہ سفر حج کے لئے سیر بمبئی، تو مصالح کے وجود سے ان کا مقصود ہونا لازم نہیں آتا اس لئے میں نے کہا تھا کہ احکام شرعیہ میں بے شک دنیا کے مصالح بھی ہیں مگر اس سے جو ان کی مقصودیت کا شبہ ہوتا ہے وہ رفع ہو گیا کیونکہ مقصود تو محض آخرت ہوتی ہے، احکام شرعیہ سے مگر مرتب ہوتے ہیں مصالح دنیا بھی یہ حاصل ہے اس مضمون کا۔

مسلمان کی صفت

اب تعیین ان مصالح کی جو اس حدیث کے متعلق ہیں ترجمہ سے ہوگی کہ دنیوی ثمرات بھی اس پر کیا کیا مرتب ہوتے ہیں تو فرماتے ہیں:

المسلم من سلم المسلمون من لسانه ویده (انظر تخریج الحدیث الرقم: ۴۳)

(مسلمان کی صفت یہ ہے کہ نہ اس کی زبان سے کسی کو اذیت پہنچے نہ اس کے ہاتھ سے) یہ حاصل ہے ترجمہ کا اس سے اندازہ ہوا ہوگا کہ اس پر آخرت اور دنیا دونوں ہی کے مصالح کا ترتب ہے مگر ایک قصداً اور دوسرے کا لزوماً یعنی آخرت کا ترتب تو مقصود ہے اور دنیا کا ترتب لازم۔ چنانچہ اول کا مقصود ہونا خود عنوان ہی سے ظاہر ہے کہ مسلم وہ ہے کہ جس کے اندر یہ صفت ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس صفت کی تحصیل سے مقصود اسلام کی تکمیل ہے اور اسلام ایسی شے ہے کہ اس کی نسبت فرماتے ہیں:

اِنَّ الدِّیْنَ عِنْدَاللّٰہِ الْاِسْلَامُ. وَمَنْ یَّبْتَغِ غَیْرَ الْاِسْلَامِ دِیْنًا فَلَنْ یُّقْبَلَ مِنْهُ

(یعنی اللہ تعالیٰ کے نزدیک مقبول دین اسلام ہے اسکے سوا اور کوئی دین انکے یہاں مقبول نہیں)

تو مقصود اسلام سے یہ ہوا کہ مسلم کی اس سے مقبولیت ہو اور اسلام مقبول ہونے کا یہی حاصل ہے اور مقبولیت المسلم عنداللہ (اللہ تعالیٰ کے نزدیک مسلمان کی مقبولیت) کا ثمرہ اخرویہ ظاہر ہے۔ پس آخرت کے ثمرہ کا مرتب ہونا ظاہر ہوا اور دنیا کے لئے بھی دیکھ لیجئے کہ تعلیم اس کی ہے کہ کسی کو اذیت نہ پہنچاؤ تو ظاہر ہے کہ ایسا شخص جب تعلیم پر عمل کرے گا وہ کسی کو تکلیف نہ پہنچائے گا اور اس سے لوگوں کو نفع پہنچے گا تو اس کو بھی لوگوں سے نفع ہوگا کیونکہ یہ اپنی نفع رسانی کے سبب سے لوگوں کا محبوب ہوگا اور جب ان کو اس سے محبت ہوگی تو وہ اس کے ساتھ احسان کریں گے اور چونکہ الانسان عبدالاحسان (انسان احسان کا بندہ ہے) تو اس کو بھی لوگوں سے محبت ہوگی اور جانبین سے محبت ہونا بھی مدار ہے۔ اتفاق کا تو ادنیٰ درجہ یہ نفع ہوگا کہ باہم اتفاق پیدا ہو جائے گا اور اس بات پر سب کا اتفاق ہے کہ اتفاق ہی پر برکات دنیا کا مدار ہے۔ چنانچہ جن قوموں میں اتفاق ہے ان میں برکات دنیا مشاہد ہیں اگرچہ ان کا اتفاق اصول شرعیہ کے اعتبار سے ناتمام ہے اور برکات اس قدر ہوں گی جس قدر اتفاق ہوگا اور اتفاق کی تعلیم اسلام سے زیادہ کہیں ہے نہیں۔

چنانچہ اسلام میں یہاں تک رعایت رکھی گئی ہے کہ اگر ایک جگہ تین آدمی ہوں تو یہ جائز نہیں کہ دو آدمی تنہا باتیں کریں تاکہ تیسرے کو اکیلے رہنے سے رنج نہ ہو۔ البتہ اگر کوئی چوتھا بھی ہو تو جائز ہے تو دیکھئے کیسی رعایت ہے (سبحان اللہ)۔ تو اسلام کی اس تعلیم کے موافق کسی کو رنج نہ ہوگا تو کتنی ایک دقیق امر کی رعایت فرمائی ہے کہ کسی اور دستور العمل میں اس کی رعایت ہے ہی نہیں تو اس اتفاق کے برکات ظاہر ہیں کہ نہایت اکمل ہوں گے۔

اسی طرح سے اگر احادیث کو دیکھا جاوے تو معلوم ہوگا کہ جس امر میں ذرا بھی شائبہ ہو کدورت کا اس کی اجازت نہیں دی اور افسوس ہے کہ اس کو اہل نظر دیکھتے نہیں اور صرف چند وعدوں اور وعیدوں کو دیکھ لیا اور سمجھنے لگے کہ شریعت بس انہی باتوں کا نام ہے جس طرح ان لوگوں نے شریعت کو ناتمام نگاہ سے دیکھا ہے یعنی صرف بعض اجزاء کو اسی طرح ان لوگوں نے اور علماء کو بھی دیکھا تو صرف ایسوں ہی کو جو کہ سخت ہیں اور تمام علماء شریعت کو ان ہی پر قیاس کر کے ان سے وحشت پیدا کر لی۔ چنانچہ مجھے اس پر ایک حکایت یاد آئی کہ ایک منصرم صاحب تھے جو کہ نماز جماعت کے ساتھ نہ پڑھا کرتے تھے ان کے یہاں ایک مولوی صاحب مہمان آ گئے جو کہ امر بالمعروف میں بہت تشدد کرتے تھے حالانکہ حدیث میں ہے: بشروا ولا تنفروا (الصحیح للبخاری ۱:۲۷، الصحیح مسلم کتاب الجہاد:۶) کہ عوام کو خوشخبری سناؤ اور سختی کر کے ان کو دین سے متنفر نہ کرو مگر ہر طرح کے لوگ ہوتے ہیں بعض کو اس بات کا خیال ہی نہیں ہوتا ان سے بجائے نفع کے اور ضرر ہو جاتا ہے۔

ناصح کو نصیحت

خرابی یہ ہے کہ بعض نصیحت کرنے والوں ہی کو نصیحت کرنے کا سلیقہ نہیں ہوتا پھر عوام پر کیا اثر ہوا، دیکھئے لطف ایسا ہوتا ہے کہ کاندھلہ کے ایک مولانا مظفر حسین صاحب تھے وہ گڑھی کے ایک رئیس کے پاس تشریف لے گئے انہیں دیکھا تو وہ نماز نہیں پڑھتے تھے۔ مولانا نے فرمایا کہ خان صاحب! آپ نماز نہیں پڑھتے، انہوں نے عرض کیا کہ میں آپ سے سچی بات کہے دیتا ہوں مجھ کو داڑھی چڑھانے کا شوق ہے اور وضو میں کھولنی پڑتی ہے مجھے بار بار کھولتے چڑھاتے وقت معلوم ہوتا ہے اس لئے میں نماز نہیں پڑھتا۔ مولانا نے فرمایا کہ آپ بلا وضو ہی نماز پڑھ لیا کیجئے مگر جماعت کی پڑھئے اور مسجد میں۔

مولانا تو یہ فرما کر تشریف لے گئے اب خان صاحب نے نماز شروع کی مگر خیال ہوا کہ مولانا تو

میری ہمت بڑھانے کے لئے یہ اجازت دے گئے ہیں کہ بلا وضو ہی نماز پڑھ لیا کرو ورنہ با وضو نماز تھوڑا ہی ہوتی ہے میں محنت بھی کروں اور نماز نہ ہو، یہ کیا حماقت ہے وضو کر کے نماز پڑھنی چاہیے یہ خیال کر کے انہوں نے وضو سے پڑھنا شروع کر دیا مولانا تو اسی لئے کہہ گئے تھے کہ وہ سمجھتے تھے کہ نماز ان کو خود ہی کھینچ لے گی اور با قاعدہ نماز پڑھیں گے۔ چنانچہ اس نے کھینچ لیا تو وہ وضو کرتے اور داڑھی چڑھاتے، آخر جب روز پانچ مرتبہ کھولنی اور چڑھانی پڑی تو بہت زچ ہوئے اور یہی فیصلہ کیا کہ داڑھی چڑھانا چھوڑو، بس اچھے خاصے نمازی ہو گئے اور داڑھی چڑھانا بھی چھوٹ گیا۔

تو یہ ہیں حکمائے امت ایسی نرمی کی میں سند بیان کرتا ہوں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس بنی ثقیف آئے اور اسلام لانے میں یہ شرط کی کہ نہ جہاد کریں گے نہ زکوٰۃ دیں گے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اچھا، بعض نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا کہ آپ نے یہ شرط کیسے منظور فرمائی، حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اس وقت یہ لوگ یہ شرط لگاتے ہیں مسلمان ہونے کے بعد تم دیکھنا کہ خود ہی سب کام کریں گے۔ آخر انہوں نے سب کچھ کیا مگر یہ نرمی وہاں ہے کہ جہاں قدرت نہ ہو، اب یہ نہیں کہ بیوی بچوں کی بھی خوشامد کرے وہ اگر نہ مانیں تو ان کے ساتھ سختی سے کام لیا جائے مگر جہاں قدرت نہ ہو وہاں نرمی کرنی چاہیے۔

خلاصہ یہ ہے کہ ان منصرم صاحب کے پاس ایک متشدد مولوی صاحب آگئے وہ جماعت سے نماز نہ پڑھتے تھے تو مولوی صاحب ان کو سخت وسست کہا کرتے اور صبح کی نماز میں وہ ذرا دیر سے اٹھتے تھے، اس پر بھی برا بھلا کہا کرتے، آخر ایک روز تنگ ہو کر منصرم صاحب کہنے لگے کہ مولوی صاحب مجھے تنگ نہ کیا کیجئے، ہر وقت طبیعت یکساں نہیں ہوتی، شاید کسی وقت مجھ کو بھی غصہ آ جائے اور غصہ میں میرے منہ سے بھی کوئی بات نکل جاوے مگر وہ ایسے سر ہوئے کہ مانا ہی نہیں۔ آخر ایک روز جو منصرم صاحب کو جہالت سوار ہوئی تو کہہ دیا کہ جاؤ نہیں پڑھتے۔ بس اس روز سے ایک وقت کی نماز بھی نہیں پڑھی بعض نے ان کو نماز کی نصیحت کی اس پر انہوں نے کہا صاحب! میں تو پکا نمازی تھا، میری نماز تو ایک مولوی صاحب نے چھڑوائی اور پھر یہ قصہ بیان کیا اور عجب یہ کہ اس پر یہ کہتے تھے کہ میری نماز نہ پڑھنے کا گناہ ان مولوی صاحب کو ہوگا۔ تو لوگوں نے ایسے علماء کو دیکھا بس سمجھے کہ شریعت یہی ہے، مار دھاڑ، تشدد واللہ! شریعت کا سراپا دیکھئے تو کہئے۔

زفرق تا بقدم ہر کجا کہ می نگرم ۔۔۔۔ کرشمہ دامن دل می کشد کہ جا اینجاست

(سر سے پیر تک جس جگہ نظر ڈالتا ہوں کہ کرشمہ دامن دل کو کھینچتا ہے کہ یہی جگہ فریفتہ ہونے کی ہے)

واللہ! ہر ادا اس کی دلربا ہے ہاں سادہ اتنی ہے کہ تکلف ذرا نہیں مگر دلفریب اتنی ہے کہ دنیا میں کوئی چیز اس کے برابر نہیں اور حسن سادگی ہی میں ہوتا ہے۔ حافظ شیرازی فرماتے ہیں:

دلفریبان نباتی ہمہ زیور بستند   دلبر ماست کہ باحسن خداداد آمد

(اوروں کے محبوب زیور متعارف سے آراستہ ہیں ہمارے محبوب کو زیور متعارف کی حاجت نہیں اس میں خداداد حسن ہے)

حقیقت میں سادگی شریعت ہی میں ہے۔ شریعت کی سادگی کا حسن اس کا مصداق ہے۔

حسن الحضارة مجلوب تبطهة   وفي البداوة حسن غير مجلوب

(یعنی شہروں میں تو بناؤ سنگار کا حسن ہے اور دیہات میں سادگی کا حسن ہے)

تو شریعت کے حسن کو وہ شخص معلوم کر سکتا ہے جو اس کی پوری تعلیم کو دیکھے تو کیسی عجیب تعلیم ہے کہ ایک کو تنہا چھوڑ کر دو آدمی بات نہ کریں۔

آمدورفت کے آداب

اسی طرح استیذان (آنے کی اجازت چاہنا) کا مسئلہ ہے کہ اس کے اندر بھی بڑی مصلحتیں ہیں۔ تفصیل اس مسئلہ کی یہ ہے کہ دو مواقع ہوتے ہیں ایک تو وہ موقع کہ قرائن سے معلوم ہو کہ وہاں آنے کی عام اجازت ہے ایسی جگہ تو بلا اجازت جانے میں مضائقہ نہیں اور ایک وہ موقع کہ کوئی آرام کے لئے بیٹھا وہاں کسی کو آنے کی اجازت نہ ہو یا تو کسی کو بٹھلا دیا ہو یا کواڑ بند ہوں یا پردے پڑے ہوں، اس وقت یہ بے تمیزی ہے کہ اندر گھس گئے، اول اطلاع کرنا اور اجازت لینا چاہیے۔

غیر قوموں نے اس کو اسلام ہی سے لیا ہے اور مسلمانوں کو اس سے ایسی اجنبیت ہوئی کہ اس کو دوسری قوموں کا طریقہ سمجھتے ہیں۔ افسوس ہے کہ جو لوگ انگریزوں کی تقلید کر رہے ہیں ایسی بات کو نہیں دیکھتے جو مفید اور کام کی ہے بلکہ فضول اور مضر باتوں کی تقلید کرتے ہیں اور بالفرض یہ انگریزوں ہی کا طریقہ ہوتا تو جہاں اور فضول باتوں کی تقلید کرتے ہو اس مفید بات میں بھی سہی مگر یہ تو شریعت ہی نے سکھایا ہے کھلا حکم ہے قرآن کے اندر اور اس استیذان میں ایسی آزادی دی ہے کہ:

ان قيل لكم ارجعوا فارجعوا۔

(یعنی اگر تم سے کہہ دیا جائے کہ اس وقت واپس ہو جاؤ تو تم واپس چلے جاؤ)

اور حدیث میں ایک قانون مقرر کیا گیا ہے کہ ارجعوا بھی نہ کہنا پڑے وہ قانون یہ ہے کہ تین دفعہ پکارو اگر کچھ جواب نہ ملے تو واپس ہو جاؤ اور استیذان کا طریقہ یہ ہے کہ اگر یہ احتمال ہو کہ سوتے ہوں گے تو اس طرح اجازت لو کہ اگر جاگتا ہو تو سن لے اور اگر سوتا ہو تو آنکھ نہ کھل جائے۔

اور دلیل اس کی مقداد رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی حدیث ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے مسافر مہمانوں کو صحابہ اہل مدینہ پر تقسیم کر دیا تھا اور تین آدمی خود رکھ لیے تھے ان میں حضرت مقداد رضی اللہ تعالیٰ عنہ بھی تھے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو بکریاں بتلا دی تھیں کہ ان کا دودھ نکال کر پی لیا کرو تو یہ معمول ہو گیا تھا کہ بکریوں کا دودھ نکال کر خود پی لیا اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا حصہ رکھ دیا۔ حضرت مقداد رضی اللہ تعالیٰ عنہ کہتے ہیں کہ ایک روز حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو تشریف لانے میں دیر ہوئی، مجھے شیطان نے یہ وسوسہ ڈالا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی آج کہیں دعوت ہو گئی ہو گی اب آپ کو کیا حاجت رہی ہو گی لاؤ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے حصے کا بھی پی لوں۔ یہ خیال کر کے اس کو بھی پی لیا جب پی لیا تو شیطان نے یہ وسوسہ ڈالا کہ اگر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے کچھ نہ کھایا اور کہیں دعوت نہ ہوئی ہو تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم بھوکے ہی رہیں گے اور اگر اس حالت میں بد دعا دے دی تو کیا ہو گا، اس خیال سے یہ بہت پریشان ہوئے۔

آخر حضور صلی اللہ علیہ وسلم بہت دیر میں تشریف لائے تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ عادت تھی کہ جب تشریف لاتے تو نہ تو یہ کرتے کہ بہت زور سے سلام کریں بلکہ ایسا کہ اگر جاگتے ہوں تو سن لیں اور اگر سوتے ہوں تو نیند میں خلل نہ پڑے چنانچہ حسب عادت حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے آہستہ سے سلام کیا اور پھر نماز پڑھی اور پھر آہستہ سے برتن کھولے اور پھر مصلے پر تشریف لے گئے اور دعا کے لئے ہاتھ اٹھائے اب ان کا دم ہوا ہوا کہ بس اب بد دعا کریں گے مگر بھلا حضور صلی اللہ علیہ وسلم بد دعا کیوں فرماتے آپ نے یہ دعا فرمائی کہ:

اللھم اطعم من اطعمنی (الصحیح مسلم: ۶۲۶، المسند الامام احمد ۶: ۲، ۳، ۴)

(اے اللہ! جو مجھے کھانا کھلائے آپ اس کو کھانا کھلایئے)

دیکھئے یہ ہے توکل کہ نہ کوئی شخص ہے نہ کوئی سامان ہے مگر دعا فرما رہے ہیں اور پھر اسباب سے بعد بھی نہیں اختیار کیا۔ یہ دعا کی کہ اے اللہ! جو مجھے کھانا کھلائے آپ اسکو کھانا کھلایئے جسکا حاصل یہ ہوا کہ کسی

ایسے شخص کو بھیج دیجئے کہ جو مجھ کو کھانا کھلائے اس سے بتلا دیا کہ متوکل کو بھی اسباب ہی سے ملتا ہے اللہ اکبر! آخر نبی تھے یہ بات آپ نہ بتلاتے تو اور کون بتلاتا۔ سو توکل میں بھی اسباب کو بالکل ترک نہیں کیا جاتا۔

امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ نے لکھا ہے کہ متوکل کو نہ دروازہ بند کرنا چاہیے اور نہ دروازہ پر نظر رکھنی جائز ہے۔ غرضیکہ حضرت مقداد رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے جب یہ دعا سنی تو بددعا سے تو بے فکری ہوئی۔ اب یہ تمنا ہوئی کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ دعا بھی لوں چونکہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں رہتے تھے، توکل ان میں بھی غالب ہوا اور بکریوں کا دودھ دوبارہ دوہنے بیٹھ گیا وہاں دیکھا تو دودھ بھرا ہوا تھا، غرض نکال کر پیش کیا اور پلایا۔

سو مقصود میرا یہ ہے کہ حدیث میں ایک جزو یہ ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم سلام کرتے تھے آہستہ کہ سوتے ہوں تو نہ جاگیں۔ اس سے معلوم ہوا کہ جہاں سونے کا احتمال ہو وہاں ایسا کھڑکا خواہ ہاتھ سے خواہ زبان سے نہ کرو کہ وہ پریشان ہوں۔ تو اب میں کہتا ہوں کہ اس کی فرع ایک یہ بھی ہے کہ اگر استیذان میں سلام کرے تو ایسی طرح کرنا چاہیے کہ دوسرے شخص کو تکلیف نہ ہو۔

آداب ملاقات

تو آپ نے دیکھا اسلام کی کیا تعلیم ہے۔ اس مقام کو شاہ عبدالقادر صاحب نے خوب لکھا ہے "هُوَ اَزْكٰى لَكُمْ" (یعنی بات تمہارے لئے بہتر ہے) کی تفسیر میں لکھتے ہیں کہ اس سے ملاقات صاف رہتی ہے، کدورت دل میں نہیں آتی ورنہ اگر جا کر سوتوں کو جگا دیا اور استیذان میں اس کو تکلیف ہوئی یا تقاضا کر کے جا گھسے تو دل مکدر ہو جاتا ہے اور ملاقات میں صفائی نہیں باقی رہتی۔

ہمارے حضرت کی خدمت میں ایک شخص عین دوپہر کو آئے یہ بھی لوگوں میں اکثر مرض ہے کہ یا تو دوپہر کو آدیں گے یا بعد عشاء کے کہ یہ تنہائی کا وقت ہے، تنہائی کو تو دیکھتے ہیں اور یہ نہیں دیکھتے کہ اس سے کہیں دوسرے کو تکلیف نہ ہو، اسکی راحت میں خلل نہ ہو، سب سے بہتر یہ ہے کہ پہلے مزاج دیکھ لے بلکہ دریافت کر لیں کہ آپ کو کس وقت ملنے میں سہولت ہے مگر افسوس ہے کہ ہم میں تکلف بھی بھر گیا ہے ہماری کسی بات میں سادگی نہیں ہے بس اپنی فرصت کا وقت دیکھ کر آدیں گے اور وہاں جا کر گھنٹے لگا دیں گے اور کچھ کہنا بھی نہیں ہوتا بس یوں ہی ادھر ادھر کی باتیں کرنے کو جا بیٹھتے ہیں۔ اب انگریزوں کے ہاں لوگ جاتے ہیں تو وہ پوچھتے ہیں کہ کیا کہنا ہے اور

ہمارے ہاں اگر یہ بات پوچھے تو بہت برا مانتے ہیں کہ ہم سے پوچھتے ہیں کہ کیا کہنا ہے کہنا کیا ہوتا بیٹھنے کے لئے آئے ہیں اور اگر کہا جاتا جایئے آرام کیجئے میں بھی سوتا ہوں تو کہتے ہیں تکلیف کی کیا بات ہے ہم بیٹھے ہیں، آپ آرام کیجئے حالانکہ ایسی حالت میں راحت نہیں ہوتی کیونکہ بعض لوگوں سے لحاظ ہوتا ہے تو ان کے سامنے آرام نہیں کر سکتے تو ایسے لوگوں کو دیر تک بیٹھنے سے گرانی اور تکلیف ہوتی ہے تو مجلس کو جہاں تک ہو مختصر کرنا چاہیے تا کہ تکلیف نہ ہو۔

یہی راز ہے کہ عیادت کے متعلق ارشاد ہے "فلیخفف الجلوس" (چاہیے کہ بیٹھنے میں تخفیف کریں کیونکہ دیر تک بیٹھنے سے مریض کو تکلیف ہوگی سبحان اللہ! کتنی دقیق رعایت ہے اور بعض لوگ تو ایسے بے حس ہوتے ہیں کہ وہ کسی طرح اٹھتے ہی نہیں)۔

میں سفر میں عشاء کے بعد آرام کرنے کے لئے لیٹا، چند لوگ آن بیٹھے اور باتیں کرنا شروع کیں۔ جب بہت دیر ہوگئی تو میں نے کہا کہ آرام کیجئے مگر پھر بھی نہیں مانے، آخر مجھے بے مروتی کرنا پڑی، میں نے کہا کہ مجھے اس سے تکلیف ہوتی ہے تو کہنے لگے کہ تکلیف کی کیا بات ہے میں نے کہا کہ یہ وقت مباحثہ کا نہیں ہے کہ تکلیف کی کیا بات ہے۔ غرض جیسے کہ عموماً عادت ہے ایسے ہی ایک صاحب عین دوپہر کے وقت حضرت حاجی صاحب کے پاس آئے حضرت کو سخت تکلیف ہوئی مگر لحاظ کی وجہ سے کچھ نہیں فرمایا، آنکھوں میں نیند تھی، بیٹھے ہوئے جھوم رہے تھے مگر کچھ نہ فرماتے تھے، اگلے دن پھر وہی صاحب تشریف لائے، حضرت نے تو اس روز بھی کچھ نہ کہا مگر حضرت حافظ ضامن صاحب تھے صاف انہوں نے خبر لی کہ تمہیں شرم نہیں آتی خود تو رات بھر جورو کی بغل میں پڑے سوتے رہتے ہو اور اللہ والے جو رات کو جاگتے ہیں اور دوپہر کو ذرا ان کے آرام کا وقت ہوتا ہے اس وقت تم ان کو پریشان کرنے کو آ بیٹھتے ہو خبردار! جب اب کبھی اس وقت آئے پھر اگر اس وقت دیکھوں گا تو ٹانگیں ہی توڑ دوں گا۔

اب لوگ کہتے ہیں کہ بعضے بزرگ بہت سخت مزاج ہیں تو وہ خود سخت مزاج نہیں ہوتے مگر ان کو سخت مزاج کر دیا جاتا ہے تو یہ ہماری معاشرت ہے اور ساری خرابی یہ ہے کہ کسی کو اس بات کا خیال نہیں ہوتا کہ کسی کو تکلیف ہوگی۔ سو شریعت کی یہ تعلیم ہے کہ تکلیف کی ہر بات میں رعایت ہونی چاہیے، کوئی بات ایسی نہ کرنی چاہیے جس سے دوسرے کو تکلیف ہو مگر ہم کو خبر نہیں۔ تو میں اس پر بیان کر رہا تھا کہ "ھُوَ اَزْکٰی لَکُمْ" جو اس حکم کی حکمت بیان کرنے کے لئے آیا ہے اس کی تفسیر یہ ہے کہ ملاقات

صاف رہے گی۔ اسی طرح اور احکام کو بھی اگر عمل میں لاویں تو کدورت ہو ہی نہیں سکتی تو شریعت نے ہر حکم کو ایسا رکھا ہے کہ اس پر عمل کرنے سے باہم کدورت نہیں ہوسکتی اور ہر ایک کو دوسرے سے راحت پہنچے گی جس کی وجہ سے آپس میں محبت ہوگی اور اتفاق پیدا ہوگا۔ تو غرض یہ ہے کہ اتفاق کامل کی تعلیم اسلام نے دی ہے اگر اس کے احکام پر سب لوگ عمل کریں تو ضرور اتفاق ہوگا اور اتفاق ہی جڑ ہے تمدن کی تو یہ تعلیم بھی ایسی خوبی کی حامل ہے کہ اس پر عمل کرنے سے دنیا وآخرت دونوں میں کامیابی ہوگی۔ اصل مقصود تو رضائے حق تعالیٰ ہے اور جنت بھی حاصل ہوگی اور تمدن کے مصالح بھی مرتب ہوں گے۔

کفر وعدم کفر کا جواز

اب میں اس کی مختصر شرح کرتا ہوں مگر اول یہ سمجھ لینا چاہیے کہ اس کے بیان کرنے کی ضرورت کیا ہے تو وجہ یہ ہے کہ وہ مضمون بیان کرنا چاہیے جس کی ضرورت ہو اور جس میں لوگ کوتاہی کرتے ہوں۔ تو یہ مضمون بھی ان ہی میں سے ہے کہ اس میں لوگ بہت کوتاہی کرتے ہیں، اس کا لوگ اتباع نہیں کرتے یعنی باہم اس کا خیال نہیں رکھتے کہ ہم سے کسی کو تکلیف نہ ہو ایسے تو بہت سے لوگ ہیں کہ جان کر ظلم نہیں کرتے لیکن ان کی بہت سی حرکات ایسی ہیں کہ ان سے تکلیف ہوتی ہے۔ پس یہ خیال نہیں کہ ہماری کسی بات سے تکلیف نہ پہنچے اور زیادہ تر وجہ اس کی یہ ہے کہ عوام کو بلکہ بہت سے پڑھے لکھے لوگوں کو اس کی خبر نہیں کہ دین کی بات ہے حالانکہ اسلام کامل کا مدار اسی پر ہے کیونکہ اسلوب عبارت اس بات کو بتا رہا ہے کہ اگر کسی شخص میں یہ نہ ہو تو وہ مسلم ہی نہیں تو اگر دوسری احادیث نہ ہوتیں تو تنہا اس حدیث کے مقتضا پر تو یہ اثر ہوتا کہ جس شخص کو اس کا خیال نہ ہو کہ ہم سے کسی کو تکلیف نہ پہنچے وہ اسلام سے خارج مانا جاتا جیسے کہ اعتزال والوں نے مرتکب کبائر کو ایمان سے خارج کیا ہے مگر کفر میں بھی داخل نہیں کیا بلکہ کافر اور مومن کے درمیان میں ایک مرتبہ مان کر اس میں داخل کیا ہے اور خوارج نے تو کفر میں داخل کیا ہے۔ اہل سنت نے دوسری احادیث سے یہ سمجھا کہ اسلام سے خارج نہیں ہوتا تو ایسی احادیث سے اہل بدعت یعنی خوارج و معتزلہ تمسک کرسکتے ہیں مگر اہل سنت کہتے ہیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم ہی کا ارشاد ہے:

لا تکفرہ بذنب ولا تخرجه عن الاسلام (مجمع الزوائد للهيثمي ۱ : ۱۰٦)

(یعنی مسلمان کو کسی گناہ کی وجہ سے نہ تو کافر کہو اور نہ اس کو اسلام سے خارج کہو)

بہت دنوں تک میری سمجھ میں نہیں آیا تھا کہ دو جملے کیوں بیان فرمائے۔صرف پہلا ہی جملہ کافی تھا دوسرے جملہ کی کیا ضرورت تھی مگر بہت دنوں کے بعد سمجھ میں آیا کہ ایک جملہ میں تو رد ہے خوارج (ایک فرقہ ہے) کا اور ایک میں معتزلہ (ایک فرقہ ہے) کا اول جملہ خوارج کا تو رد ہو گیا مگر معتزلہ کا رد نہ ہوتا کیونکہ وہ گناہ کی وجہ سے کفر میں نہیں داخل کرتے اس لئے دوسرا جملہ بھی بیان فرمایا کہ معتزلہ پر بھی رد ہو گیا اور لا تکفرہ بذنب (مسلمانوں کو کسی گناہ کی وجہ سے کافر نہ کہو) پہلے اس لئے فرمایا کہ دوسرے جملہ میں ترقی ہو کیونکہ اول لاتکفرہ بذنب سے تو یہ فرمایا کہ کافر نہ کہو تو اب ممکن ہے کہ کوئی کہے کہ ہم تو کافر نہیں کہتے بلکہ اسلام سے صرف خارج کرتے ہیں تو اس کے رد کے لئے فرماتے ہیں کہ اسلام سے خارج بھی نہ کہو۔

دیکھئے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کیا فرما رہے ہیں اب بہت سے لوگوں کی یہ حالت ہے کہ ذرا سی بات پر کافر کہہ دیتے ہیں، یہ ہرگز جائز نہیں کیونکہ علاوہ اور دلائل منع کے اس سے تکلیف بھی تو ہوتی ہے اگر کوئی کہے کہ ہم تو زبان سے نہیں کہتے بلکہ لکھ کر کہتے ہیں تو یہ بھی لسان (زبان) ہی سے ہے کیونکہ نقوش کی دلالت الفاظ پر اصطلاح سے ہوئی ہے اور اصطلاح زبان سے مقرر ہوئی تو مترجم اس کا بھی زبان ہی ہے تو لسانہ میں داخل ہے اور اسی کو فقہاء کہتے ہیں الکتابت کالنطق کہ لکھنا زبان سے کہنے کے مثل ہے اور اگر یہ دقیقہ کسی کی سمجھ میں نہ آوے تو چلئے جانے دیجئے آخر "یدہ" میں تو داخل ہے اور لاتکفروہ (اس کو کافر نہ کہو) کے بعد بذنب (کسی گناہ کی وجہ سے) اس لیے فرمایا کہ اگر کوئی بات صریح کفر کی ہو اور اس میں احتمال دوسرا نہ ہو تو اس وقت کافر کہنے کی اجازت ہے لیکن اگر اس میں دوسرا احتمال بھی ہو جس کے اعتبار سے وہ بات کفر نہ ہو تو اس صورت میں کافر نہ کہے۔

چنانچہ فقہاء کہتے ہیں کہ اگر ننانوے وجہ کفر کی ہوں اور ایک وجہ عدم کفر کی ہو تو بھی کافر نہ کہو، آج کل بعض لوگ اس کے معنی یہ سمجھتے ہیں کہ اگر ننانوے عمل کفر کے ہوں اور ایک عمل عدم کفر کا الخ تو یہ مطلب نہیں اگر یہ مطلب ہوتا تو دنیا میں ایک بھی کافر نہ رہتا کیونکہ ہر شخص میں کوئی بات تو اچھی ہوتی ہی ہے بلکہ مطلب یہ ہے کہ ایک قوم میں مثلاً ننانوے توجیہ کفر کی اور ایک توجیہ عدم کفر کی ہو۔

مثلاً امام صاحب کے پاس ایک شخص آیا کہ ایک شخص کہتا ہے کہ کوئی کافر جہنم میں نہ جاوے گا تو وہ اس کے کہنے سے کافر ہوا یا نہیں؟ امام صاحب نے شاگردوں سے پوچھا کہ اس کلام سے کوئی ایسے معنی ہو سکتے ہیں جس کی بناء پر یہ شخص اسلام سے خارج نہ ہو، شاگردوں نے کہا اس میں

تو کوئی تاویل نہیں ہوسکتی یہ تو نص قطعی کا صریح انکار ہے۔ آپ نے فرمایا کہ اس کے یہ معنی ہوسکتے ہیں کہ کوئی کافر دوزخ میں جاتے وقت کافر نہ رہے گا کیونکہ اس وقت تو سب ایمان لے آئیں گے گو اس وقت کا ایمان مقبول نہ ہو۔ یہاں سے امام صاحب کی ذہانت کا خیال کیجئے اور عجب نہیں کہ امام صاحب نے یہ وہاں سے سمجھا ہو کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جنت میں کوئی بڑھیا نہ جاوے گی۔ جیسا کہ کافر منکر اور اس وقت کوئی منکر نہ ہوگا بلکہ سب مومن ہوں گے گو اس وقت کا ایمان مقبول نہ ہو۔ یہ ہے حاصل اس تاویل کا تو امام صاحب نے فرمایا کہ اس قول کا یہ مطلب ہوسکتا ہے پھر اس میں کفر کی کونسی بات ہے تو حاصل یہ ہوا کہ جس قول میں تاویل ہوسکے اور اس کی بناء پر مومن ہوسکے تو ایسی بات ہے اس کو کافر نہ کہہ دینا چاہیے اگر ننانوے مطلب کی بناء پر کفر ہو اور ایک مطلب کی بناء پر کفر نہ ہو تو یوں سمجھو کہ شاید وہی مطلب ہو۔

دیندار کی تعریف

تو خلاصہ یہ ہے کہ ایسی صورت میں کہ جہاں کفر کی بات ہو اور کوئی تاویل چل ہی نہ سکے تو کافر کہیں گے باقی گناہ اور غلطی سے کافر نہ کہا جاوے گا تو چونکہ یہ حدیث موجود ہے کہ مسلمان کو کسی گناہ کی وجہ سے کافر اور غیر مسلم نہ کہو اس لئے ہم اس شخص کو جس کو یہ خیال نہ ہو کہ ہم سے کسی کو تکلیف نہ پہنچے کافر اور غیر مسلم نہ کہیں گے بلکہ اس حدیث کے (کہ مسلم وہ ہے کہ نہ اس کی زبان سے کسی کو تکلیف پہنچے نہ اس کے ہاتھ سے) دوسرے معنی قرار دیں گے کہ مسلم سے مراد مسلم کامل اور یہ ایک محاورہ ہے مثلاً کہتے ہیں کہ مرد وہ ہے کہ غصہ کو ضبط کرے یعنی مرد کامل تو اسی طرح مطلب یہ ہے کہ کامل مسلمان وہ ہے کہ جس کی زبان یا ہاتھ سے کسی کو تکلیف نہ پہنچے۔

اب سمجھ میں آ گیا ہوگا کہ اس شخص کو ناقص الایمان بتلا رہے ہیں جو اس کا خیال نہ رکھے تو یہ بھی دین کا ایک جزو ہوا۔ پس یہ زعم غلط ٹھہرا کہ اس کو دین سے کچھ علاقہ نہیں اور یہ جب دین ہے تو پھر جو اس کی رعایت نہ کرے وہ دیندار کہاں ہے جبکہ دین کا ایک جزو ہی اس سے فوت ہو گیا جیسے حسین وہ ہے جس کے تمام اعضاء حسین ہوں اور دین کا ایک جزو ہے۔ حسن معاشرت بھی تو اگر یہ ناقص ہے تو وہ دیندار کامل نہیں کیونکہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم اس کو اسلام کامل کا مدار فرما رہے ہیں۔ اگر کوئی یہ کہے کہ اس سے تو معلوم ہوا کہ ایمان ناقص بھی ہوتا ہے حالانکہ امام صاحب کہتے ہیں کہ ایمان زائد اور ناقص نہیں ہوتا۔ تو جواب یہ ہے کہ امام صاحب کا یہ مطلب نہیں کہ ایمان میں درجات کا تفاوت نہیں

بلکہ بات یہ ہے کہ کمی اور زیادتی کے دو معنی ہیں ایک تو ہے کثرت وقلت اجزاء جیسے سیر بھر گیہوں زیادہ ہے اور آدھ سیر کم اور ایک معنی ہیں ضعف وقوت جیسے فلاں کم عقل ہے اور فلاں بڑا عقل مند ہے۔ یعنی ضعیف العقل اور قوی العقل تو امام صاحب نے جو زیادت اور نقصان کی نفی کی ہے تو وہ بمعنی کثرت اجزاء وقلت اجزاء ہے نہ کہ بمعنی قوت وضعف کیونکہ گفتگو اس میں ہے کہ اسلام نام کس کا ہے تو امام صاحب فرماتے ہیں کہ تصدیق اور اطاعت کا نام ہے اور اعمال اس کا مکمل (کامل کرنے والا ہے) اور امام صاحب کے پاس دلیل یہ ہے کہ ایک جزو کے ارتفاع سے کل مرتفع ہو جاتا ہے تو اگر اعمال جزو ایمان ہوں تو چاہیے کہ اگر کوئی نماز نہ پڑھے تو کافر ہو جائے حالانکہ کافر نہیں ہوتا تو معلوم ہوا کہ یہ جزو ایمان نہیں ہے بلکہ نماز اس کی ضروریات میں سے ہے تو اس میں کوئی امام صاحب کا مخالف نہیں اور جنہوں نے کہا ہے کہ ایمان بڑھتا ہے ان کا مطلب یہ ہے کہ قوی ہوتا ہے تو نزاع لفظی ہے۔ اب اگر کوئی کہے کہ جب معنوں میں متفق ہیں تو پھر عنوان کے بدلنے سے اور پھر اس میں اختلاف کرنے سے کیا فائدہ ہوا۔ تو بات یہ ہے کہ ہر وقت ضرورت دین کی جدا ہوتی ہے۔ مثلاً ایک عالم کے وقت میں مرجیہ (ایک فرقہ ہے) کے اثر سے لوگوں نے اعمال کو چھوڑ دیا تو اس وقت یہ عنوان اختیار کیا کہ "یزید و ینقص" (ایمان میں کمی اور زیادتی ہوتی ہے) تو اس سے لوگوں کی نظروں میں اعمال کی وقعت ہوئی اور ایک وہ وقت تھا کہ خوارج کے غلبہ سے تشدد بڑھ گیا تھا کہ ذرا سے عمل چھوڑنے سے کہہ دیا کہ کافر ہو گیا تو امام صاحب نے لایزید ولاینقص (ایمان میں کمی اور زیادتی نہیں ہوتی) فرمایا تاکہ تشدد نہ ہو تو دو ضرورتیں ہیں۔ ایک تو یہ کہ اعمال کی بے وقعتی نہ ہو دوسرے یہ کہ تشدد نہ ہو کہ ذرا سی بات میں کافر کہہ دیا جائے۔ خوب سمجھ لینا چاہیے یہ بات منقول نہیں مگر مصلحین کے طرز کو دیکھنے سے یہ خیال ضرور ہوتا ہے کہ اختلاف عنوان سے یہ فائدہ مقصود ہیں۔

غرض اس حدیث سے یہ بات معلوم ہو گئی کہ جس کے اندر اس بات کا خیال نہ ہو کہ اس سے دوسرے کو تکلیف نہ پہنچے وہ کامل دیندار نہیں اور اسی سے ان لوگوں کی بھی غلطی معلوم ہو گئی جو کہ محض نماز وغیرہ پڑھ کر اپنے کو دیندار سمجھنے لگتے ہیں حالانکہ دین کے دو جزو ہیں۔ حقوق اللہ تعالیٰ (اللہ تعالیٰ کے حقوق) اور حقوق العباد (بندوں کے حقوق) تو دیندار وہ ہو سکتا ہے جو دونوں کو ادا کرتا ہو۔ صرف اول کے ادا کرنے سے دیندار کیسے ہو سکتا ہے اور مسلمان کے حقوق دو قسم کے ہیں۔ ایک کرنے کے جیسے کہ عیادت جب کوئی مسلمان مریض ہو تو اس کی مزاج پرسی اور اس کے

دیکھنے کو جائے۔ دوسرے حقوق ہیں تروک یعنی چھوڑنے کے کہ اس کی آبرو سے تعرض نہ کرے، ذلیل نہ کرے پس انہی حقوق تروک میں سے یہ بھی ہے کہ

من سلم المسلمون من لسانہ ویدہ (انظر تخریج الحدیث الرقم: ۴۳)

(کامل مسلمان وہ شخص ہے جس کی زبان اور ہاتھ سے لوگ سالم رہیں)

تین حق

اب دوسری بات سمجھنے کی یہ ہے کہ من سلم المسلمون (جس سے مسلمان سالم رہیں) کا یہ مطلب نہیں کہ غیر مسلم کی رعایت ضروری نہیں کیونکہ حدیث میں یہ بھی ہے کہ

المومن من امن الناس بوائقہ.

(کہ مومن وہ ہے جس کے خطرات سے تمام آدمی امن میں رہیں) تو تمام لوگوں کی رعایت ضروری ہوئی خواہ وہ مسلم ہوں یا کافر اور ان سب ہی کے حقوق بھی ہوئے۔ البتہ حربی اس حکم میں داخل نہیں تو یہاں صرف اس لئے مسلمون فرمایا کہ یہ موقع اسی کا تھا کیونکہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے کوئی کتاب تو تصنیف فرمائی نہیں جس کے الفاظ کا عام ہونا ضروری ہو بلکہ جس وقت جس امر کی ضرورت دیکھی زبان مبارک سے بیان فرما دیا۔

اور مسلمون جو جمع کے صیغہ سے فرمایا تو جمع سے کبھی تو مجموعہ مراد ہوتا ہے اور کبھی ہر ہر واحد تو ظاہر تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہاں ہر ہر واحد مراد لیا جاوے کہ ہر مسلمان اس کی ایذاء سے محفوظ رہے اور اگر مجموعہ مراد ہوگا تو اس پر یہ شبہ ہوگا کہ مجموعہ مسلمین کو تکلیف نہ دی جائے۔ اگر بعض کو تکلیف دی جائے تو کوئی حرج نہیں لیکن غور کرنے سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ ان احکام میں سے ہے کہ جہاں مجموعہ اور ہر ہر واحد کے حکم میں فرق نہیں ہوتا تو بصورت مجموعہ مراد ہونے کے یہی معنی ہوں گے کہ مجموعہ مسلمانوں کا ہر ہر واحد تکلیف سے بچا رہے۔ اب وہ شبہ جاتا رہا کہ اگر بعض کو تکلیف پہنچ جائے تو کچھ حرج نہیں کیونکہ جب ایک مسلمان نہ بچا تو مجموعہ کہاں بچا کیونکہ ایک جزو نکل جانے سے مجموعہ نہیں رہا۔ تو مطلب یہ ہوا کہ کسی کو بھی تکلیف نہ پہنچے۔

آگے فرماتے ہیں من لسانہ ویدہ (اس کی زبان اور اس کے ہاتھ سے) اس میں دو قسم کے حقوق کی طرف اشارہ ہے۔ گو یہ حقوق تروک (چھوڑانے کے) ہیں۔ تین قسم کے مالی جانی

عرضی جس کو اس حدیث میں صاف فرمایا:

ان دماء کم واموالکم واعراضکم علیکم حرام کحرمة یومکم هذا. (الصحیح للبخاری فی کتاب الحج باب الخطبة ایام منی رقم: ۱۷۴۲، ۳:۳۷۵)

(تحقیق تمہارے خون اور تمہارے مال اور تمہاری آبروئیں تم پر حرام ہیں مثل تمہارے اس دن کی حرمت کے)

یعنی نہ آپس میں ایک دوسرے کو قتل کرے، نہ ناحق مال لے، نہ آبروریزی کرے، پس یہ تین قسم کے حق ہیں مگر غور کرنے سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ مال اور جان کے حقوق تو اکثر ہاتھ سے تلف ہوتے ہیں اور عرضی اکثر زبان سے، مال کا حق مثلاً کسی کا مال لوٹ لیا یا کسی کو لکھ دیا لوٹنے کے لئے تو اس کا آلہ بھی یہی ہاتھ ہوگا۔ اب رہا جان کا حق یہ بھی ہاتھ ہی سے ہوتا ہے اور اگر کسی کو زبان سے کسی کے قتل کرنے کو کہا تو یہ بھی پورا ہاتھ ہی سے ہوگا۔ اب رہی آبرو وہ کبھی ہاتھ سے تلف کی جاتی ہے اور اکثر زبان سے سو یہ حقوق گو تین قسم کے ہیں مگر ہیئت اضافہ کے اعتبار سے انہیں دو صورتوں میں داخل ہے **من لسانه ویده** (اس کی زبان اور اس کے ہاتھ سے) پس اس میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے تینوں حقوق کو جمع کر دیا، اجمالاً پس حاصل اس حدیث کا یہ ہوا کہ نہ جان کو تکلیف دے نہ مال کو نہ آبرو کو، اب ہر شخص کو دیکھ لینا چاہیے کہ کہاں تک اس پر عمل کرتا ہے اور کتنے حقوق ترک ہوتے ہیں۔

فقدان تفکر

بعضے حقوق تو خیر کھلے ہوئے ہوتے ہیں لیکن بعضے ایسے خفی ہوتے ہیں کہ ان کا پتہ نہیں چلتا، بہت لوگ ان کو حقوق ہی میں سے نہیں سمجھتے تو ضرورت اس کی ہے کہ احکام کو دیکھے اور پھر اپنے اعمال کو دیکھے اس وقت بہت سے لوگ علم پڑھتے ہیں مگر ان کو احکام کی خبر نہیں ہوتی، پڑھتے سب ہیں مگر وقت پر یاد کچھ نہیں رکھتے۔

اس پر مجھے ایک حکایت یاد آئی کہ سہارنپور میں ایک مولوی صاحب نے اپنے بچہ کے لیے پانچ روپے کی کامدار ٹوپی خریدی اور کہا کہ قیمت پھر دوں گا۔ دکاندار نے کہا کہ مولوی صاحب یہ جائز بھی ہے انہوں نے کہا کہ کیوں ناجائز ہونے کی کون سی بات ہے۔ دکاندار نے کہا کہ اس میں چاندی کا جو کام سچا ہو رہا ہے اس میں ادھار کب جائز ہے تو چونکہ یہ چاندی کی بیع چاندی سے تھی اس لیے اس میں یہ

ضروری تھا کہ اگر دو روپے بھر چاندی ہے تو کم از کم اتنے دام تو ضروری اس وقت دینا چاہئیں۔ مولوی صاحب نے کہا کہ اچھا ابھی اپنی ٹوپی اپنے پاس رہنے دو، جب میں روپیہ لاؤں گا اس وقت خرید لوں گا۔ دکاندار نے کہا کہ مولوی صاحب کیا کوئی ایسی صورت نہیں ہو سکتی کہ ٹوپی اسی وقت خرید لیں اور روپیہ پھر دے جائیں تا کہ ابھی لے جانے سے بچہ کا دل خوش ہو جائے۔ مولوی صاحب نے کہا کہ میری سمجھ میں تو کوئی ایسی صورت نہیں آتی۔ اس نے کہا کہ آپ مجھ سے پانچ روپے قرض لے لیجئے اور اس سے ٹوپی کی قیمت ادا کر دیجئے۔ پھر جب دل چاہے وہ قرض ادا کر دیجئے، یہ سن کر مولوی صاحب کو بڑا افسوس ہوا کہ ہم مدرس ہیں اور ہمیں ان ضروری باتوں کی خبر نہیں جن کا رات دن کام پڑتا ہے۔

سو بڑی کمی اس کی ہے کہ عمل کے لئے نہیں پڑھتے بلکہ بعض تو محض اس لئے پڑھتے ہیں کہ نام ہو گا کیونکہ بعض جگہ مولویت کی بڑی قدر ہے حتیٰ کہ دعوت کھا کر بھی اجرت لی جاتی ہے تو بعض تو محض اپنی قدر بڑھانے کے لئے پڑھتے ہیں اور بعض کی نیت استعداد کی ہوتی ہے مگر اس لیے کہ طلبہ کی جماعت میں ہماری قدر ہو جاوے۔ ان کو زیادہ فکر اس کا ہوتا ہے کہ حواشی جمع کر لیے، حمد اللہ بھی، قاضی بھی، اور سبق کو زائد باتوں سے اس قدر بھر دیا کہ طالب علم متحمل نہ ہو سکیں۔ اسی طرح ہم حدیث پڑھتے ہیں مگر یہ نہیں دیکھتے کہ اس سے کیا حکم نکلا تو ہم اگر غور کریں تو معلوم ہو کہ بعض باتیں جو بظاہر اس میں داخل نہیں ہیں واقع میں وہ بھی اس میں داخل ہیں۔

بات یہ ہے کہ دین کی بعض چیزیں تو ظاہر ہیں جیسے مار دھاڑ سے بچنا اور بعض ظاہر نہیں جیسے رات کو آہستہ سے سلام کرنا اور اس کو لوگ طاعت نہیں سمجھتے حالانکہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم رات کو آہستہ سے اٹھتے تھے اور آہستہ ہی سے سلام کرتے تھے۔ پس ایسی چیزوں کا مدلول حدیث ہونا خفی ہے مگر ہے مدلول صریح۔

چنانچہ حدیث میں ہے کہ حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا فرماتی ہیں کہ ایک مرتبہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم رات کو بستر پر سے اٹھے اور آہستہ سے جوتیاں پہنیں اور آہستہ ہی سے دروازہ کھولا اور آہستہ ہی بند کیا۔ وہاں یہ الفاظ ہیں:

وفتح الباب رویدا واغلق الباب رویدا "وخرج رویدا".

(یعنی آپ نے آہستہ سے دروازہ کھولا اور آہستہ سے دروازہ بند کیا اور آہستہ سے باہر نکلے)

حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کو شبہ ہوا کہ شاید حضور کسی اور بی بی کے ہاں جاتے ہیں اور وجہ یہ تھی کہ حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا حضور صلی اللہ علیہ وسلم پر عاشق تھیں اور عشق میں یہ حالت ہوا کرتی ہے۔

با سایہ ترا نمی پسندم عشق است و ہزار بدگمانی

(یعنی عشق میں ہزاروں بدگمانیاں ہیں اس لئے ہم آپ کے سایہ کے ساتھ رہنا بھی پسند نہیں کرتے ہیں)

بس اس شبہ کی وجہ سے آپ بھی پیچھے پیچھے ہولیں۔ یہاں تک کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم بقیع میں پہنچے اور وہاں پہنچ کر اموات کے لئے دعا فرمائی۔ جب دعا کر چکے تو وہاں سے واپس ہوئے، حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا جلدی جلدی چلیں اور پہلے آ کر بستر پر لیٹ رہیں۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ مالک یا عائشة حشیا رابیة (یعنی اے عائشہ کیا بات ہے کہ تمہارا سانس پھولا ہوا ہے) حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا نے عرض کیا کہ کچھ نہیں۔ فرمایا کہ یا تو بتلا دو ورنہ مجھ کو خدا تعالیٰ خبر دے دیں گے۔ تب حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا نے سارا واقعہ بیان کیا۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ میرے پاس جبرئیل آئے تھے کہ بقیع میں جا کر مومنین کے لئے دعا استغفار کرو۔ اس لئے میں وہاں گیا تھا تو حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو کیسا بے تکلفی کا علاقہ اور پھر وہ آپ پر عاشق چنانچہ کہتی ہیں۔

لواحی زلیخا لو راین جبینہ　　　لاثرن بالقطع القلوب علی الید

(یعنی اگر زلیخا کو ملامت کرنے والی عورتیں آپ کی جبین مبارک کو دیکھ لیتیں تو بجائے ہاتھوں کے قطع کرنے کے قلوب کو قطع کر لیتیں)

سو حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا اس قدر عاشق زار تھیں تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے کسی فعل سے بھی ان کو اذیت نہ ہوتی مگر اس پر بھی حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ رعایت کی کہ رات کو جب اٹھے تو سارے کام آہستہ کیے تا کہ ان کی نیند میں خلل نہ آ دے۔ سو حضور صلی اللہ علیہ وسلم تو جہاں ناگواری کا احتمال بھی نہ ہوتا وہاں بھی ایسے امور کی رعایت فرماتے تھے اور ہماری یہ حالت ہے کہ رات کو اٹھے تو دھڑ دھڑ کرنا شروع کر دیا۔ خصوصاً اگر انگریزی جوتے ہوں یا رات کو ڈھیلے لیتے ہیں تو بھڑا بھڑا توڑتے ہیں حالانکہ اس سے لوگوں کو سخت تکلیف ہوتی ہے مگر کچھ پروا نہیں تو یہ امور ظاہراً ناجائز نہیں اس لیے ان سے بچنے کو دین نہیں سمجھتے مگر واقع میں ناجائز ہیں۔

ذکر جہر کی شرط

ایک قسم اور ہے سب سے بڑھ کر کہ ظاہر میں حسنات ہیں اور پھر ان سے لوگوں کو ایذاء ہوتی ہے تو

وہ بھی نہ کرنا چاہیے مثلاً بعض لوگ نماز تہجد پڑھ کر ذکر جہر کرتے ہیں۔ فقہاء نے لکھا ہے کہ اس کے جواز کی شرط یہ ہے کہ کسی سوتے ہوئے کو یا نمازی کو تکلیف نہ ہو تو جہاں اور لوگ سو رہے ہوں وہاں ذکر جہر سے نہ کرنا چاہیے، گو کوئی لحاظ سے نہ کہے مگر واقع میں ان کو تکلیف ہوتی ہے اور نا گوار ہوتا ہے۔

کانپور میں ایک صاحب رات کو دو منزلہ مکان میں اونچی جگہ بیٹھ کر ذکر جہر کرتے تھے اور اس میں مشاعرہ بھی کرتے تھے کہ

بامقیماں کوئے دل داریم رخ بدنیا ودیں نمے آریم

(ہم محبوب کے کوچہ کے مقیم ہیں، رخ دنیا اور خشک دین کی طرف نہیں کرتے ہیں)

کبھی شعر پڑھتے، کبھی رونے لگتے، میں نے دو تین دن تک تو ادب کیا، آخر ایک روز کہلا بھیجا کہ آپ کے اس قدر جہر کرنے سے سونے والوں کو تکلیف ہوتی ہے تو حضرت بعض اوقات ایسا ہوتا ہے۔ گزشتہ سال رمضان میں ایک نئے نمازی صاحب بعد عشاء ہی کے محلہ کی ایک مسجد میں بیٹھ کر ذکر شروع کر دیتے اور اس قدر جہر سے کرتے کہ محلہ والوں کو نیند نہ آتی۔ آخر ان سے بھی کہا گیا تو اگر کسی کی عبادت سے تکلیف ہوتی ہو تو ایسی عبادت عبادت نہیں۔

خدمت و تعظیم کے آداب

اور لیجئے کہ خدمت اور تعظیم کیسے آرام کی چیز ہے مگر بعضے وقت خدمت سے بھی تکلیف ہوتی ہے۔ مثلاً ایک شخص نے آکر پیر دبانے شروع کیے اور ان سے بے تکلفی ہے نہیں تو اس خدمت سے کلفت نہ ہوگی تو اور کیا ہوگا۔ اب لوگ اس بات کو تو دیکھتے نہیں کہ ہم سے دل بھی کھلا ہوا ہے یا نہیں اور خدمت شروع کر دیتے ہیں حالانکہ ہر ایک سے اتنی خصوصیت نہیں ہوتی تو ایسی صورت میں خدمت کرنے سے ظاہر ہے کہ اور الٹی تکلیف ہوگی۔ میں تو کہا کرتا ہوں کہ اگر کسی کی خدمت کرنی ہو تو اول اس سے خصوصیت اور بے تکلفی پیدا کرو تو یہاں تک لوگوں کی نظر ہی نہیں جاتی۔

ایک اور تعظیم کی صورت لیجئے جنہیں سمجھا کہ یہ بزرگ ہیں، بس گئے اور ان کے پیچھے بیٹھ گئے اور بعضے تو یہ غضب کرتے ہیں کہ پیچھے کھڑے ہو کر نیت باندھ لیتے ہیں اور نماز پڑھنے لگتے ہیں اور بعضے لوگ نماز تو نہیں پڑھتے مگر پس پشت بیٹھ گئے اور کھنکارا کہ توجہ دیں گے۔ میں نے تو کانپور میں اس کا علاج مقرر کیا تھا کہ ایسے میں اس کی پشت کی طرف جا بیٹھتے تاکہ انہیں بھی تو علم ہو کہ اس سے کتنی تکلیف ہوتی ہے اور بعضے لوگ یہ کرتے ہیں کہ پشت کی طرف تو نہیں بیٹھتے مگر

مشغولی اوراد یا تلاوت کی حالت میں برابر اس طرح جا کر بیٹھ جاتے ہیں کہ معلوم ہوتا ہے کہ فراغ کے منتظر ہیں جس سے بے حد گرانی اور پریشانی ہوتی ہے۔غرض جس تعظیم سے گرانی ہوایسی تعظیم بھی نہ کرنی چاہئے۔اس راز کو حضرات صحابہؓ نے خوب سمجھا۔فرماتے ہیں کہ

ما کنا نقوم لرسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم لما کنا نعرف منکراً۔

(یعنی ہم حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی تعظیم کیلئے نہیں کھڑے ہوتے تھے کیونکہ ہمیں معلوم ہو گیا تھا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو اس سے گرانی ہوتی ہے)

مگر آج کل لوگوں کو اس کا بالکل خیال نہیں۔ میں نے دیکھا کہ میرے استاد مولانا فتح محمد صاحب ہاتھ میں جوتے اٹھا کر جامع مسجد سے گرمیوں کے موسم میں باہر آنے لگے تو ایک صاحب نے لپک کر چاہا کہ مولانا کے جوتے میں لے لوں۔انہوں نے تو اپنے نزدیک ادب کیا کہ مولانا کے ہاتھ سے جوتے لے گئے مگر یہ بھی کوئی خدمت ہے کہ چار قدم جوتے پہنچا دیئے،کیا جوتوں کا کوئی بڑا بوجھ تھا اور دو چار میل لے کر جانا تھا کہ مولانا تھک جاتے تو اگر خدمت کرو تو کوئی معتد بہ خدمت کرو تا کہ کچھ راحت پہنچے۔آخر مولانا نے نہیں دیا مگر انہوں نے نہ مانا اور ایک ہاتھ سے تو مولانا کی کلائی پکڑی اور دوسرے ہاتھ سے جھٹکا مار کر جوتا چھین لیا۔یہ بے تمیزی ہے ہم لوگوں میں،اپنے نزدیک تو بڑی خدمت کی کہ لڑ کر جوتا چھین لیا تو ساری خرابی ناعاقبت اندیشی اور تکلف کی ہے۔

غرض ہر طرح سے تکلیف ہی دیتے ہیں تو ان لوگوں کی یہاں تک نظر ہی نہیں جاتی مگر حدیث میں صحابہ کا صاف قول ہے "ما کنا نقوم الخ" کہ ہم حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی گرانی کی وجہ سے آپ کی تعظیم کے لئے کھڑے بھی نہ ہوتے تھے اور اسی قبیل سے ہیں مہمانداری کے قصے کہ اس میں اس قدر تکلف کرتے ہیں کہ بجائے آرام کے اور تکلیف ہو جاتی ہے۔ مجھے بہت دفعہ یہ پیش آیا کہ کھانے کے اندر زیادہ تکلف ہونے کی وجہ سے کھانا نہیں کھایا گیا۔آخر نتیجہ یہ ہوا کہ بعض دفعہ خفیہ طور پر کچوریاں منگا کر کھائیں تو یہ خرافات ہوتی ہیں اور یہی وجہ ہے مسلمانوں میں بے لطفی کی کیونکہ بڑا ذریعہ لطف کا راحت ہے اور جب ہر وقت کدورت ہوتی ہے تو پھر لطف کہاں،اس لیے میں نے اس مضمون کو اختیار کیا۔

اب شاید کسی کو شبہ ہو کہ پھر تو چاہیے کہ کسی کو بھی کچھ نہ کہے۔اگر کوئی بچہ بے تمیزی کرے تو اس کو بھی سزا نہ دی جاوے کیونکہ اس سے اس کو تکلیف ہوگی۔تو سمجھو کہ شریعت یہ نہیں کہتی کہ ادب دینے کے لئے بھی کسی کو نہ مارا جائے اور جو اس حدیث سے یہ شبہ ہوا تو اس کا جواب بھی اسی میں

ہے کہ تمہارا ہاتھ سبب نہ بنے تکلیف کا اور ادب دینے کے موقع پر اس شخص کا فعل سبب بنا ہے تکلیف کا ادب دینے والے کا ہاتھ سبب نہیں بنا بلکہ اس نے تو اس کو تکلیف سے بچایا ہے کہ بد اخلاقی کے ذریعے سے جو تکالیف ہوتیں وہ ان سے بچا رہے گا تو وہ ادب دینے والا موذی نہیں ہے بلکہ اس کا فعل تو "اماطة الاذیٰ" (تکلیف دینے والی چیز کو دور کرنا) ہے۔

دیکھئے اگر کسی بچہ کے پیر میں کانٹا چبھ جاوے تو کیا اس کو ویسا ہی رہنے دیا جاوے گا تو جب اس کے پیر میں کانٹا چبھنا گوارا نہیں ہے تو اس کا دوزخ میں جلنا کیسے گوارا ہوگا تو بدتمیزی پر اس لئے ادب دیا جاتا ہے تاکہ یہ اس ایذاء سے بچا رہے۔ پس یہ شبہ بھی رفع ہو گیا کہ یہ اس کو تکلیف دینا ہے، اب میں بیان کو ختم کرتا ہوں۔

خلاصہ وعظ

خلاصہ یہ ہے اس حدیث کا کہ ہم کو حقوق العباد کی بھی رعایت کرنی چاہیے اور یہ جو فہرست حقوق العباد کی میں نے بیان کی ہے یہ نمونہ کے طور پر ہے۔ ایک بات اور یاد آئی کہ اکثر لوگ مسجد کے اندر جا کر پچھلی دیوار سے مل کر نیت باندھتے ہیں اب اگر کوئی وہاں سے نکلنا چاہے سو اگر نمازی کے آگے سے نکلے تو گنہگار ہو اور گناہ سے بچے تو نکل نہیں سکتا۔ اب اس کو تکلیف ہوئی تو یہ بھی نہ ہونا چاہیے۔ اسی طرح ہر عمل میں اس کا لحاظ رہنا چاہیے یہ یہاں ایک قاعدہ کلیہ ہے کہ کسی کو تکلیف نہ ہو۔ باقی اس کی مثالیں اتنی کثرت سے ہیں کہ مدت تک سوچنی پڑیں گی اور اس کے لیے ایک سہل قاعدہ بتلاتا ہوں کہ جو برتاؤ کسی کے لیے کرو سوچ لو کہ اگر ہمارے ساتھ یہ برتاؤ کرے تو کیا اثر ہوگا۔ مثلاً جیسے کسی کی پشت کی طرف بیٹھے تو سوچ لے کہ اگر میرے پس پشت کوئی بیٹھے تو ناگوار ہوگا یا نہیں تو ایسے قول و فعل کو چھوڑ دو جس کا اثر تکلیف ہو۔ اگر اس معیار کو پیش نظر کرلیں تو ہماری بہت اصلاح ہو جائے گی اور اس وقت ایمان کامل نصیب ہوگا۔

غرض جیسے نماز روزہ ضروری ہے ایسے ہی معاشرت کا درست کرنا بھی ضروری ہے۔ جب اس پر عمل ہوگا اس وقت دنیا کی راحت بھی نصیب ہوگی اور یہ حالت ہوگی کہ

بہشت آں جا کہ آزارے نباشد — کسے را باکسے کارے نباشد

(جہاں کوئی آزار تکلیف نہ ہو اور کسی کو کسی سے کچھ سروکار نہ ہو وہ جگہ بہشت ہے)

اب دعا کیجئے کہ حق تعالیٰ عمل کی توفیق عطا فرماویں۔

وصلی اللہ تعالیٰ علیٰ خیر خلقه محمد و آله واصحابه اجمعین.

اصلاح الیتامی

یتامی کے حقوق کے متعلق یہ وعظ ۴ شعبان المعظم ۱۳۳۷ھ یوم دوشنبہ بعد مغرب یتیم خانہ اسلامیہ کانپور میں ہوا جو ۳ گھنٹے میں ختم ہوا۔ تین ہزار کا مجمع تھا۔ اسے احمد عبدالحکیم صاحب نے قلمبند کیا۔

خطبہ ماثورہ

الحمدلله نحمده ونستعينه ونستغفره ونؤمن به ونتوكل عليه ونعوذ بالله من شرور انفسنا ومن سيئات اعمالنا من يهده الله فلا مضل له ومن يضلله فلا هادى له ونشهدان لا اله الا الله وحده لا شريک له ونشهدان سيدنا ومولانا محمداً عبده ورسوله صلى الله تعالىٰ عليه وعلىٰ وآله واصحابه وبارک وسلم.

اما بعد فاعوذ بالله من الشيطان الرجيم، بسم الله الرحمٰن الرحيم، وَيَسْئَلُوْنَکَ عَنِ الْيَتٰمٰى ط قُلْ اِصْلَاحٌ لَّهُمْ خَيْرٌ ط وَاِنْ تُخَالِطُوْ هُمْ فَاِخْوَانُكُمْ ط وَ اللّٰهُ يَعْلَمُ الْمُفْسِدَ مِنَ الْمُصْلِحِ ط وَلَوْشَآءَ اللّٰهُ لَاَ عْنَتَكُمْ ط اِنَّ اللّٰهَ عَزِيْزٌ حَكِيْمٌ

تمہید:۔ جس مضمون کو میں بیان کرنا چاہتا ہوں اور جس کے لئے میں نے اس آیت کی تلاوت کی ہے اس کی تعیین آیت کی عبارت والفاظ سے کسی قدر اجمالاً سب کے ذہنوں میں ہو گئی ہوگی۔ اس واسطے کہ قرآن مجید کے الفاظ کچھ ایسے مانوس ہیں کہ کم وبیش سب مسلمان کیا عوام اس سے کہ وہ عربی پڑھے ہوں یا نہ پڑھے ہوں سمجھ میں آ جاتے ہیں۔ نیز وہ شرعی الفاظ ہوتے ہیں اس لیے وہ یوں بھی مسلمانوں کے محاورات میں مستعمل ہیں۔ اس لیے اکثر مقاموں کو سن کر مسلمان کچھ نہ کچھ سمجھ لیتا ہے اور اجمالاً مضمون متعین کر لیتا ہے۔

مثلاً اس مقام پر لفظ یتامیٰ ہے۔ کوئی مسلمان ایسا نہیں جس نے اسے اس کے معنی میں استعمال نہ کیا ہو یا بارہا استعمال ہوتے نہ سنا ہو اور بوجہ مکرر استعمال کرنے کے بار بار سننے کے ہر مسلمان سمجھتا ہے کہ یتامیٰ کے متعلق ان آیتوں میں مضمون ہے۔ اس لیے اس کے متعلق زیادہ کہنے کی ضرورت نہیں۔ البتہ تعیین کے بعد بطور دفع دخل مقدر کے اتنا کہنا ضروری ہے کہ شاید موقع کے لحاظ سے (کہ یتیم خانہ میں بیان ہو رہا ہے) کسی کو شبہ ہوا ہو کہ غالباً مہتمم کی جانب سے اس مضمون کی فرمائش کی گئی ہو اور اس وسوسہ کا ہونا کوئی بعید از قیاس بھی نہیں کیونکہ عام عادت اب

یہی ہورہی ہے کہ اکثر بیان کرنے والے سے فرمائش کی جاتی ہے اس لیے یہ وسوسہ اگرچہ بے جا نہیں مگر پھر بھی اتنا ضرور ہے کہ سب کو ایک ہی لکڑی سے کیوں ہانکا جاوے۔ یہ کیا ضرور ہے کہ سب کی طرف سے سب ہی سے فرمائش کی جاتی ہو اور پھر فرمائش بھی کی جاتی ہے تو سب اس کی پابندی بھی کرتے ہوں۔ اس لیے یہ قیاس سب کے متعلق صحیح نہیں ہوسکتا۔

نیز مسئلہ شرعیہ ہے کہ قیاس انشائیات میں مفید ہوتا ہے۔ اخباریات میں مفید ظن۔ تو کیا معنی؟ کسی درجہ میں بھی اس کا اثر نہیں ہوتا بلکہ اور غلط نتائج پیدا کرتا ہے۔ انشائیات میں جو حکم ایک جزئی کے متعلق ہوتا ہے دوسری جزئی کو دیکھ کر تشابہ وتشارک کی وجہ سے اس حکم کو اس کی طرف بھی متعدی کردیتے ہیں اور یہاں قیاس کی ضرورت بھی ہے کیونکہ کوئی جزئی حکم شرعی سے خالی نہیں ورنہ انسان کا وسدی (مہمل) ہونا لازم آئے گا۔

اَیَحۡسَبُ الۡاِنۡسَانُ اَنۡ یُّتۡرَکَ سُدًی

(کیا انسان یہ گمان کرتا ہے کہ وہ مہمل چھوڑ دیا جاوے گا)

مہمل کے یہ معنی کہ اس کو بعض جزئیات میں احکام ہوں اور بعض میں مہمل چھوڑ دیا جاوے، اس آیت نے اپنے اطلاق کی وجہ سے دونوں درجوں کی نفی کردی، البتہ اول درجہ میں اہمال کامل ہے، دوسرے میں اہمال ناقص، مگر اہمال تو دونوں میں مشترک ہے اور آیت مطلق اہمال کی نفی کرتی ہے۔ پس دونوں کی نفی ہوگئی۔

تشبہ بالنصاریٰ

اس موقع پر ایک کام کا مضمون ذہن میں آیا۔ وہ یہ کہ بعض لوگ حدیث "من تشبہ بقوم فھو منھم" (انظر تخریج الحدیث الرقم:۵) (جو کسی قوم سے مشابہت اختیار کرے وہ انہی میں سے ہے) تسلیم کرکے اس کے معنی میں تصرف کرتے ہیں۔ چنانچہ بعض سے گفتگو ہوئی تو وہ کہتے ہیں کہ اگر ہم کوٹ پتلون اور بوٹ پر انگریزی ٹوپی پہنیں تب تشبہ بالنصاریٰ ہو۔ ہم ٹوپی تو ترکی کی پہنتے ہیں اور وہ اسلامی سلطنت کی وضع ہے۔ لہٰذا ہم میں اور نصاریٰ میں فرق ہوگیا۔ سو اس تقریر سے اس کا جواب بھی ظاہر ہے۔ یعنی تشبہ بھی ایسا ہی ہے کہ اس کے بھی دو درجے ہیں۔ ایک تشبہ ناقص، ایک تشبہ کامل اور وعید مطلق تشبہ پر ہے لہٰذا دونوں کو شامل ہے، خواہ ناقص ہو یا کامل۔ اگر ٹوپی بھی نصاریٰ کی سی ہوتی تو

شبہ کامل تھا۔ٹوپی نہیں ہے تو تشبہ ناقص ہے اور ناقص قسم ہے، مطلق تشبہ کی اور مقسم کا اپنی قسم پر صادق آنا ضروری ہے اس لیے اگر تشبہ ناقص بھی ہوگا اس پر بھی من تشبہ بقوم صادق آئے گا اور جب مقدم صادق آئے گا تو تالی اور جز فھو منھم بھی ضرور صادق آئے گی۔ البتہ جس طرح تشبہ میں دو درجے ہیں تام وناقص، اسی طرح اس کی وعید میں بھی دو درجے ہو جائیں گے۔ یعنی تام وناقص لیکن نفس وعید دونوں پر ہے۔ ایک پر وعید تام اور ایک پر وعید غیر تام۔ ان دونوں میں ایسا فرق ہے جیسے ایک چھوٹی سی آگ کی چنگاری اور ایک بڑا سا انگارہ کہ آگ دونوں ہیں۔ فرق اتنا ہے کہ ایک چھوٹا سا قطعہ ہے آگ کا اور ایک بڑا تو کیا جو شخص تشبہ ناقص یا غیر تام کو گوارہ کرتا ہے وہ اس کی اجازت دے گا کہ اسکے چھپر میں ایک چھوٹی سی چنگاری رکھ دی جائے اور اسے ناگوار و مضر نہ سمجھے گا۔ اگر مضر نہ سمجھے گا تو ہم اسے چھوڑ دیں گے اور پھر اسے خطاب نہ کریں گے مگر ہر شخص جانتا ہے کہ کوئی بھی اسے گوارا نہ کرے گا کیونکہ یہ ناقص ہی تام بن جاتی ہے۔ چھوٹی سی چنگاری بڑھ کر انگارہ بن جاتی ہے۔ اور اگر بالفرض چھوٹی بڑی نہ بھی بنے اور سارے چھپر کو تباہ نہ کرے تو کم از کم بالشت دو بالشت تو جلا ہی دے گی۔ اگر مضر باضرار کامل نہیں تو مضر باضرار ناقص تو ضرور ہے۔

تو صاحبو! کیا دین ایسی چیز ہے کہ اس کے تھوڑے حصہ کا کم ہونا گوارا کیا جا سکتا ہے، اپنے چھپر کی قدر دوشالہ کی قدر بلکہ کمبل اور ٹاٹ تک کی قدر ہے کہ اس میں سے بالشت دو بالشت بھی کم اور تباہ ہونا گوارا نہیں۔ اگر قدر نہیں ہے تو دین کی قدر نہیں ہے۔ بڑا افسوس ہے دین بزبان حال کہتا ہے۔

قلق از سوزش پروا نہ داری ولے از سوز ما پروا نہ داری

(کہ ادنیٰ ادنیٰ ضرر تک ناگوار اور ہمارے جلنے اور نقصان پہنچنے کو کچھ بھی ناگوار نہیں سمجھتے)

غرض تشبہ ناقص بھی نفس خدمت میں ویسا ہی مذموم جیسا کہ تشبہ کامل۔ صرف درجات کا فرق ہے ویسے عموماً معاصی میں ایک صغیرہ ہوتا ہے اور ایک کبیرہ اور یہ فرق اس لیے نہیں کہ صغیرہ کے کرنے کی جرأت ہو بلکہ شریعت مقدسہ ہر چیز کی حقیقت اور واقعی فرق کو ظاہر کرتی ہے جس کا اثر صرف علم میں ہوتا ہے اور نفس وجوب عمل میں سب یکساں ہوتے ہیں۔ جیسا کہ طب کی کتابوں میں اطباء سمیات سے بحث کرتے ہیں کہ کون اول درجہ ہے اور کون دوم درجہ اور ان کا یہ مقصود نہیں ہوتا کہ جو درجہ دوم میں ہے اس کی اجازت ہے بلکہ وہ ایک علمی تحقیق ہے۔ باقی اگرچہ عمل یعنی وجوب احتراز میں اول اور دوم دونوں برابر ہیں۔ اسی طرح جو اہل عقل ہیں وہ صغیرہ کبیرہ سے

احتراز کرتے ہیں اور اس قسم کے فضول اور مہمل شے نہیں کرتے کہ تشبہ ناقص ہے، تشبہ تام نہیں۔ بہرحال مہمل چھوڑنا دو درجے کا ہے اور اس آیت سے دونوں کے اہمال کی نفی ہوگئی۔

آزادی کا ہیضہ

آج کل آزادی کا اس قدر ہیضہ پھیلا ہوا ہے کہ ایک گروہ یہ چاہتا ہے کہ انسان کو کسی حکم کا پابند نہ رکھا جاوے جن کا مذاق زیادہ فاسد ہے۔ انہوں نے اس کا نام آزادی مطلق رکھا ہے اور یہاں تک اس کا ہیضہ ہوا ہے کہ اب وہ شرعیات سے گزر کر حسیات میں، روحانیات سے گزر کر مادیات میں اور دین سے گزر کر دنیا تک میں مطلق العنانی چاہتے ہیں۔ ان کے نزدیک قانون سلطنت، قانون شریعت، قانون فطرت سب فضول ہیں۔ وہ بطور خود سلطنت کا بھی انتظام اپنے ہاتھ میں لینا چاہتے ہیں اور گویا بالکل جانوروں کی طرح زندگی بسر کرنا چاہتے ہیں کہ نہ کوئی بادشاہ ہو نہ رعیت، نہ حاکم نہ محکوم اور اس کو یہاں تک ترقی دی ہے کہ ان کے خیال میں اب نکاح بھی فضول ہے، بس عورتیں اس طرح رہیں جیسے گھوڑیاں بیل وغیرہ کہ تھوڑے روز ایک مالک کی سواری میں اور تھوڑی روز دوسرے مالک کی سواری میں ہیں جب چاہا بیچ ڈالا اور جب چاہا خرید لیا۔

اللہ اکبر! کس قدر بے حیائی ہے حیا سے قطع نظر کر کے ایسی آزادی تو فطرت سلیم کے بھی سراسر خلاف ہے۔ الغرض اس قسم کی آزادی تو اعلیٰ درجہ کا اہمال ہے۔ اس کا ادنیٰ درجہ یہ ہے کہ ایسی آزادی مطلق نہ ہو بلکہ بعض امور میں شریعت کا مخاطب ہو اور بعض میں اس کی رائے پر چھوڑ دیا جائے۔ بعض آزاد خیالوں کی تحریر میری نظر سے بھی گزری کہ علماء نے اس قدر تنگی کر دی کہ ہر چیز کو حتیٰ کہ ناخن، بال، داڑھی، مونچھ کو شریعت کے اندر ٹھونس دیا، شریعت تو صرف عقائد اور عبادات تک ہے۔

سبحان اللہ! کیسے خیر خواہ بنے ہیں۔ اے صاحب میں کہتا ہوں کہ جب قرآن وحدیث میں ہر چیز سے صریح بحث ہے۔ کسی کے کرنے کی تاکید ہے اور کسی پر وعید، کسی کے ترک پر وعید ہے، یہ وعدہ وعید بتا رہا ہے کہ یہ قانون ہے اور یہ اس کی تصریح بھی ہے کہ ایسا کرنے والا مجرم اور گنہگار ہوگا اور ایسا نہ کرنے والا مستوجب سزا ہوگا تو پھر کوئی وجہ نہیں کہ اسے شریعت سے خارج سمجھا جاوے گا۔ اس میں مولویوں کا کیا دخل۔ بہرحال مکلفین کا ہر فعل کھانا پینا، اٹھنا بیٹھنا، سونا، غرض ادنیٰ سے ادنیٰ اور اعلیٰ سے اعلیٰ کوئی فعل بھی ہو اس کے متعلق شریعت کا ایک حکم ضرور ہے خواہ وہ جواز ہی کا ہو۔ غرض کوئی فعل ممنوع ہوگا اور کسی کی اجازت ہوگی جس کی تفصیل علماء کے تتبع سے معلوم ہو سکتی ہے۔ جب کسی جزئی

کے حکم کی ضرورت ہو علماء سے دریافت کر لیجئے۔ غرض کوئی فعل ایسا نہیں جس کے متعلق "یجوز یالایجوز" (جائز ہے یا ناجائز) نہ ہو تو اس اعتبار سے یہ قانون تنگ کہاں ہوا بلکہ بڑا وسیع ہوا اور اگر تنگ بایں معنی کہا جاتا ہے کہ اس میں تشدد بہت ہے۔ سو یہ بھی غلط ہے جیسا اپنے محل میں ثابت ہے اور یہ قانون تو ایسی ذات کا بنایا ہوا ہے جو ہماری جان و مال سب کا مالک ہے اور جس کا حق نفوس و اموال و اغراض میں یکساں ہے۔ اس کے مقابلے میں قانون طب جو انسانوں کا بنایا ہوا ہے اور پھر ایسے انسانوں کا جو ہمارے مالک نہیں کوئی چیز نہیں مگر پھر بھی بیمار کے ہر فعل کے ساتھ اس کا تعلق ہے جو طبیب ہے وہ بیمار سے یہ کہے گا کہ اس چیز کا حکم طب میں نہیں ہے۔ مثلاً کوئی پوچھے کہ گوشت کھاؤں، وہ کہے گا ہاں کھاؤ مگر بکری کا کھانا گائے کا نہ کھانا، وہ پوچھے مثلاً بینگن یا مسور کی دال کھاؤں، وہ کہے گا ہر گز نہیں، کوئی پوچھے چلا پھرا کروں، ہاں چلا پھرا کرو مگر دھوپ میں نہ چلنا یا مثلاً آہستہ آہستہ چلنا، مسہل کی حالت میں پوچھے کہ مسہل لے کر سو رہوں، منع کرے گا مت سونا اس سے دست نہیں آئیں گے۔ غرض بیمار کا کوئی فعل ایسا نہیں جس کا حکم طب میں نہ ہو۔ چنانچہ اگر شک ہو تو کسی طبیب سے سوچ سوچ کر پوچھ لو، دیکھو سب کا جواب دے گا۔ ایسے افعال کے متعلق تو پوچھنا نہیں جو مریض سے صادر ہی نہیں ہو سکتے۔ سوچ سوچ کر پوچھنے کا یہ مطلب نہیں کہ تم گھڑ گھڑ کے پوچھنے لگو کہ صاحب اڑنا کیسا ہے، غرض وہ افعال جن کا صدور مریض سے ممکن ہے۔ واللہ طبیب ان کے متعلق ہیں کبھی نہ کہے گا کہ طب میں اس کا حکم نہیں ہے حکم سب کا ہے کسی کے متعلق ینفع کسی کے متعلق یضر کسی کے متعلق "لاینفع و لایضر" طب جو انسانوں کا بنایا ہوا قانون ہے جب ایسا جامع ہے تو شریعت جو خدا کا بنایا ہوا قانون ہے اس میں ایسا احاطہ ہے تو کیا تعجب کی بات ہے۔

شریعت کی آسانی

افسوس! کہ شریعت کی بلکہ خدا کی قدر نہیں "مَا قَدَرُوا اللّٰہَ حَقَّ قَدْرِہٖ" (اللہ کی عظمت ایسے نہ کی جیسا عظمت کا حق ہے) کہ ایسے جامع قانون کو لوگ تنگ کہتے ہیں۔ تنگی تو یہ ہے کہ مثلاً تعزیرات ہند میں بعض جرموں کے متعلق دفع پتہ نہ لگے تو وہاں کس قدر تنگی ہے، قانون میں عام جرائم کو حاوی نہیں ہے۔ درحقیقت تمام جزئیات کے احکام کا ہونا تنگی نہیں بلکہ وسعت ہے، تنگ اس معنی کر ہے کہ اس سے آپ کو تنگی ہوتی ہے ورنہ فی نفسہ تو وسعت ہے اور یہ خدا کی بڑی رحمت ہے۔ ارے صاحب! اگر فکر کیجئے تو تب سمجھ میں آئے کہ یہ کیسی رحمت ہے۔

دیکھئے بچہ ہے کہ اگر اسے اس کی رائے پر چھوڑ دیجئے تو کیا یہ آپ کی شفقت سمجھی جاوے گی، اسے پابند بنانا، اس کو اپنی رائے اور مرضی پر چلانا یہ البتہ شفقت ہے، بچہ آپ سے آکر پوچھتا ہے ابا مٹھائی کھالوں، آپ اسے جواب دیں کہ پوچھتا کیوں ہے تجھے اختیار ہے ہم کیا جانیں تو کیا یہ جواب اور آزادی شفقت ہے یا یہ کہنا شفقت ہے کہ ہاں مٹھائی کھاؤ مگر دیکھو بتاشے کے سوا اور کچھ ثقیل مٹھائی نہ کھانا اور وہ بھی چھٹا نک بھر سے زیادہ نہ کھانا۔ دیکھئے اس میں آپ نے اسے کس قدر پابند کر دیا مگر یہ تنگی اور پابندی انتہا درجہ کی شفقت ہے کیونکہ اس کی مصلحت کے لئے ہے غرض جو شفیق باپ ہوگا وہ بیٹے کے ہر استفسار کا قانونی جواب دے گا اور اس کو آزاد نہ کرے گا بلکہ ایک خاص دستور العمل کا اسے پابند کرے گا اور اگر شفقت نہیں ہے تو اسے آزاد چھوڑ دے گا کہ جو چاہے کرے۔ آپ خود اپنے محاورہ میں آزاد چھوڑ دینے والے کو بے پروا باپ کہتے ہیں اور در حقیقت ایسا شخص باپ نہیں بلکہ بیٹے کے حق میں باپ ہے۔ اس پر لوگ بھی ملامت کرتے ہیں جب یہ سمجھ گئے تو پھر خدا سے یہ چاہتے ہو کہ وہ مطلق العنان چھوڑ دے۔

باپ دوپہر کو بچہ کو باہر نکلنے سے روکتا ہے اور سونے کی تاکید کرتا ہے گو بچہ اسے تنگی اور قید سمجھتا ہے مگر فی نفسہ یہ باپ کی انتہائی شفقت ہے کہ وہ اس کی صحت کی حفاظت کرتا ہے اور آپ بھی یہ کہتے ہیں کہ کیسا شفیق باپ ہے کہ اپنے بیٹے کی کیسی نگرانی کرتا ہے۔ آہ افسوس! یہ قیود باپ کرے تو نگرانی سمجھی جاتی ہے اور خدا کرے تو سختی اور تنگی سمجھی جاتی ہے۔ خوب سمجھ لیجئے کہ مہمل اور آزاد ہونے سے راحت کبھی نہیں مل سکتی۔ راحت اسی مریض کو مل سکتی ہے جس کی ایک ایک جزئی سے طبیب تعرض کرے۔ اگر شریعت سے قطع نظر کر لی جاتی تو اس قدر ٹھوکریں لگتیں کہ کہیں پناہ نہ ملتی۔ واقعات نے شریعت کی ضرورت کو ثابت کر دیا ہے۔ ملاحدہ کو دیکھئے کہ اب وہ بھی شریعت کے قائل ہو رہے ہیں جو کہیں تعدد ازواج پر اعتراض کرتے تھے، کہیں طلاق کے مسائل پر، کہیں شراب کی ممانعت پر اور اپنی نارسا عقل سے طرح طرح کے شبہے کرتے تھے لیکن ایک زمانہ دراز کے تجربہ کے بعد انہیں بھی اپنے اعتراضوں کا غلط ہونا اور اپنی عقل کو تا کافی سمجھتے ہیں اور اسے اس طرح سے خطاب کرتے ہیں۔

آزمودم عقل دور اندیش را ۔۔۔ بعد ازیں دیوانہ سازم خویش را

(یعنی ہم نے عقل کو آزمالیا اور اس کی غلطیاں سمجھ لیں۔ اب تو دیوانہ بنیں گے) حضرت ادنیٰ سی بات ہے کہ اگر عقل پر مدار ہوتا ہم ایسی مصیبت میں پڑتے کہ سب بھول جاتے۔

عقل اور شریعت

میں اس کا ایک نمونہ پیش کرتا ہوں اور ابھی مشاہدہ کرائے دیتا ہوں مگر مخاطب وہ ہے جو خدا اور اسلام کا قائل ہے یا کسی دین سماوی کا قائل ہے۔ایک مقدمہ میں تو یہ سوچئے کہ دنیا و آخرت میں کیا نسبت ہے۔ان دونوں میں ایک فانی ہے اور ایک باقی اور بقا بھی کیسا کہ الی مالا نہایۃ لہ۔حاصل یہ ہوا کہ دنیا محدود اور آخرت غیر محدود، ایک مقدمہ تو یہ ہوا۔دوسرا مقدمہ یہ ہے کہ دنیا کے مقاصد کے لئے کتنی کوشش کی جاتی ہے اور آخرت کے لئے کتنی، یہ تو واقعات تھے۔اب تیسرا مقدمہ جس کا عقل حکم کرتی ہے یہ ہے کہ جو نسبت مقاصد میں ہونی چاہیے۔مثلاً روپیہ اور پیسہ میں کیا نسبت ہے۔پیسہ روپیہ کا ایک بٹہ چونسٹھ ہے (یہ حساب حضرت کے زمانہ کا ہے) تو جتنی کوشش ایک پیسہ کے حصول کے لئے کی جاتی ہے عقل کا حکم یہ ہے کہ روپیہ کے لئے اس سے چونسٹھ حصہ زائد کرنی چاہیے۔اگر ایک پیسہ کے لئے ایک چھٹانک کوشش ہے تو دو کے لیے دو چھٹانک کوشش اور تین کے لیے تین چھٹانک یہاں تک کہ روپیہ کے لیے چونسٹھ چھٹانک کوشش کرنی چاہیے۔

اب ان سب مقدمات کا مقتضا عقل کا یہ فتویٰ ہے (آپ اس فتویٰ کے موافق غور کیجئے) کہ دنیا سے آخرت کو کیا نسبت ہے۔ایک محدود ایک غیر محدود، تو یہی فرق ان کی تحصیل کی کوششوں میں بھی ہونا چاہیے۔یعنی دنیا کے لئے محدود کوشش ہونی چاہیے اور آخرت کے لیے غیر محدود اور ظاہر ہے کہ انسان کی عمر محدود ہے اس لیے وہ غیر محدود کوشش پر کبھی قادر نہیں ہوگا۔تب عقل گھبرا کر اس پر صلح ٹھہرا دے گی کہ خیر عمر کا جتنا وقت ہے وہ تو سب کا سب کوشش میں صرف کر دینا چاہیے۔چلنا، پھرنا، کھانا، پینا، سونا سب چھوڑ دینا چاہیے۔یہ ہے عقل کا فتویٰ اور شریعت کا فتویٰ مشہور ہے کہ نہیں، تھوڑے اعمال فرضی ٹھہرا دیئے باقی آزاد رکھا۔سو صاحب! ہم تو شریعت کے متبع ہیں، آپ عقل کا اتباع کیجئے، دیکھئے پھر کیا مصیبت ہوتی ہے ہم تو جہاں تک شریعت نے آزادی دی سب کچھ کرتے ہیں اور عقل کے فتویٰ پر عمل نہ کرنے کی بدولت بڑے چین میں ہیں۔

آزمودم عقل دور اندیش را　　　بعد ازیں دیوانہ سازم خویش را

(میں نے عقل دور اندیش کو بہت آزمایا اور آخر کار اپنے آپ کو دیوانہ بنالیا)

وَلَوِ اتَّبَعَ الْحَقُّ اَهْوَآءَ هُمْ لَفَسَدَتِ السَّمٰوٰتُ وَالْاَرْضُ وَمَنْ فِيْهِنَّ

(اگر لوگوں کی خواہشوں کا اتباع کیا جاتا تو تمام عالم میں فساد برپا ہو جاتا)

عقل یہ بھی کہتی ہے کہ نکاح کوئی حقیقت واقعی نہیں ایک موجود اعتباری ہے۔ اسی طرح ملک بھی ایک ذرا سے الفاظ سے بدل جاتی ہے، عقل کے نزدیک ایسی چیز کا وجود نہیں تو بس اب نہ کوئی کسی کی بیوی ہے نہ کوئی چیز کسی کی ملک۔ آپ میرے کپڑے چھین لیجئے اور میں اور کسی کے چھین لوں، عقل ان فسادات کو جائز رکھتی ہے مگر شریعت کہتی ہے گو عقل اسے جائز رکھے مگر ہم اس اعتبار و جود کا بھی اعتبار ہی کرتے ہیں اور ان افعال کو ناجائز کہتے ہیں۔

اسی طرح سینکڑوں مثالیں ہیں جن سے آپ سمجھ لیں گے کہ عقل کچھ زیادہ خیر خواہ نہیں بلکہ شریعت زیادہ خیر خواہ ہے کہ ہر چیز کا قانون مقرر کر دیا ہے۔ بہر حال یہ ثابت ہو گیا کہ انسان مہمل نہیں اور اس کو ہر ہر جزئی میں کچھ نہ کچھ خطاب ہے۔ آگے جزئیات کی دو قسمیں ہیں۔ بعض وہ ہیں جن کا حکم منصوص ہے اور بعض وہ ہیں کہ سکوت عنہ ہیں۔ آگے حکم معلوم کرنے کے لئے قیاس کی ضرورت ہوتی ہے ورنہ فی نفسہ قیاس ضروری نہ تھا، صرف ضرورت کی وجہ سے اس کی اجازت ہوئی اور احکام انشائیات میں قیاس کی اجازت ہوئی، واقعات اخبار میں چونکہ کوئی ضرورت نہ تھی اس لیے ان میں قیاس کی اجازت نہیں ہوئی۔

مثلاً ایک شخص نے چوری کی تو یہ واقعہ ہے یہاں کون سی ضرورت ہے، قیاس کی کسی دوسرے یقینی چور کے پاؤں، آنکھ، ناک، سر، قد اور صورت دیکھ کر یہ اندازہ کیا جاوے کہ جتنے اس کے مشابہ ہوں گے سب چور ہوں گے۔ لہٰذا شہر بھر میں جتنے اسی حلیے کے ہوں سب کو پکڑ لو کہ یہ چوری بھی ان لوگوں نے ہی کی ہے۔ سو ظاہر ہے کہ یہ بالکل بیہودہ بات ہے۔ غرض اخباریات میں قیاس نہ عقلاً صحیح ہے نہ نقلاً ماذون فیہ ہے۔

جب یہ سمجھ میں آ گیا تو اب میں کہتا ہوں کہ ایک انسان کی کسی حالت پر دوسرے انسان کی حالت کو قیاس کرنا بھی غلط ہوگا اور ایک انسان کا دوسرے انسان پر قیاس کرنا تو کیا صحیح ہوتا، خود ایک انسان کی ایک حالت کا دوسری حالت پر قیاس صحیح نہیں ہوتا۔ مثلاً ایک شخص نے ایک مرتبہ چوری کی تو یہ کیا ضرور ہے کہ جب کہیں چوری ہوئی ہو اسی نے کی ہو۔ اس واسطے ارشاد ہے:

اِنَّ بَعْضَ الظَّنِّ اِثْمٌ ، فاجتنبو امن الظن، ان الظن لا یغنی من الحق شیئاً.

یہ اخباریات کے متعلق ہے اور انشائیات کے متعلق قیاس کرنے کا امر ہے چنانچہ ارشاد ہے:

فاعتبروا یاولی الابصار.

جب یہ سمجھ میں آ گیا تو کسی شخص کو ایسے موقع پر فرمائش کرتا ہوا دیکھ کر دوسرے شخص کی نسبت یہ گمان کرنا کہ اس نے بھی فرمائش کی ہے محض فاسد ہے۔

فرمائش اور اطلاع کا فرق

چنانچہ میں واقعی کہتا ہوں کہ مجھ سے بالکل فرمائش نہیں کی گئی۔ گو کسی کو شبہ ہو کہ یتیم خانہ میں بیان ہے تو ضرور فرمائش ہوئی ہوگی کہ یتامیٰ کے حقوق بیان کیے جائیں لیکن مجھ سے فرمائش نہیں ہوئی اور اگر ہوتی بھی تو میں قبول نہ کرتا۔ وجہ یہ ہے کہ وہ مشورہ ایسے شخص کا ہوتا کہ جس کی نظر صرف محدود تمام مصالح پر ہوتی تو وہ فرمائش ایسی ہوتی کہ ایک مریض فرمائش کرے کہ حکیم جی دوا دو تولہ سے زائد نہ ہو جو طبیب ہے وہ یہ جواب دے گا کہ بھائی پھر خود ہی نسخہ تجویز کرلو۔ اسی واسطے میں نے یہ معمول مقرر کرلیا ہے کہ وعظ میں کسی کی فرمائش پر عمل نہیں کرتا۔ گو اب بھی بعض ناواقف فرمائش کر دیتے ہیں لیکن میں کسی کا دل نہیں توڑتا، ہاں عذر کر کے ٹال دیتا ہوں۔ اگر کوئی یہ شبہ کرنے لگے کہ غیب کی خبر تو خدا کو ہے، بدوں اطلاع کے حالات کا علم کیوں کر ہوسکتا ہے اور وعظ میں وہاں کے حالات کا علم ضروری ہے۔ میں کہتا ہوں کہ اول تو خدا کو خبر ہونی چاہیے سو ان کو خبر ہے، وہ خود ہی دل میں ڈال دیں گے جس کی ضرورت ہے، ہم تو مشین ہیں جس کا کل انہی کے ہاتھ میں ہے۔

رشتہ در گردنم افگندہ دوست　　　　مے برد ہر جا کہ خاطر خواہ اوست

(ہم تو انہیں کے قبضہ میں ہیں، وہ جدھر چاہیں لے جائیں)

عشق من پیدا و معشوقم نہاں　　　　یار بیروں فتنہ او در جہاں

(غرض فاعل تو وہ ہیں، ہمیں خبر نہیں تو نہ سہی انہیں تو خبر ہے، اگر انجن کو خبر نہیں تو کچھ مضائقہ نہیں، گارڈ کو اور ڈرائیور کو تو خبر ہے)

می تراود خود بخود از لب سخن　　　　آنچہ خواہی اے ضیاء الدین بکن

(یہ تو مولانا کی طرف سے ضیاء الدین کو خطاب ہے، یہی خدا کو سب کی جانب سے ہوسکتا ہے)

چوں زمام عقل من در دست تست　　　　ہر کجا خواہی بکش جان مست تست

(بہر حال وہ خبر خدا کے قبضہ میں ہے، وہ خود بخود قلب میں ڈال دیتے ہیں اگر نیت میں ذرا خلوص ہو تو ادھر سے اعانت ہوتی ہے)

دوسرے اطلاع اور چیز ہے اور فرمائش اور چیز، اطلاع کر دینے کا مضائقہ نہیں کہ یہاں کے یہ حالات ہیں، آگے رائے مصلح کی جس طرح مریض طبیب کو حالات سے تو اطلاع دے دیتا ہے

مگر فرمائش نہیں کرتا چونکہ یہ مقدمات پیش نظر ہیں اس لیے میں کسی کی فرمائش کو قطعاً قبول نہیں کرتا۔

ایک مرتبہ مجھ کو نواب ڈھاکہ نے بلایا۔ میں نے لکھا کہ اس شرط سے آ سکتا ہوں کہ مجھ سے کسی خاص بیان کی فرمائش نہ ہو جو چاہوں گا اور جب چاہوں گا بیان کروں گا۔ چنانچہ انہوں نے اس شرط کو قبول کر لیا، تھے بڑے سلیم الطبع انہوں نے ایک دن بھی فرمائش نہیں کی جو میرے جی میں آیا وہ میں نے بیان کیا، بعد میں معلوم ہوا جو میں نے بیان کیا ضرورت بھی انہی مضامین کی تھی اور وہ چاہتے بھی وہی تھے۔

بہر حال خدا مضامین پیدا کرنے والا ہے یہاں بھی نہ کسی نے فرمائش کی نہ میں منظور کرتا۔ اس واسطے کہ مریض اور طبیب کا سا قصہ ہے۔ طبیب کبھی مریض کے مشورہ پر عمل نہیں کرتا لیکن اتفاق سے ضرورت ہی کسی ایسے مضمون کے بیان کرنے کی واقع ہو جاوے جس کے متعلق فرمائش کا شبہ ہو سکتا ہو تو کیا اس شبہ کو مانع بیان قرار دیا جائے گا۔ سو اگر اتفاق سے یتیم خانہ میں بیان ہوا اور ضرورت بھی خاص ہی مضمون کی ہو تو یتیم خانہ بوجہ مناسبت کے مرجح ہو گا نہ کہ مانع، غرض اس مضمون کی ضرورت سب دواعی سے قطع نظر کر کے ذہن میں بھی نہیں آئی کیونکہ میں سمجھتا تھا کہ اس کے بیان کرنے کی ضرورت ہی کیا ہے کیونکہ یتامیٰ کی طرف ان کی بے کسی اور بے زبانی کی وجہ سے فطرۃً ہوتا ہے اس لیے میں اس بیان کی بھی ضرورت نہیں سمجھتا بلکہ اس سے بڑھ کر معاف کریں ہمدردان قوم، ان کے حالات اور واقعات معلوم ہونے کے بعد تو میں ذرا ایسے مضامین بیان کرتے ہوئے اس لیے بھی جھجکتا ہوں کہ کہیں بد دیانتی ہی پھیل رہی ہے لیکن اس یتیم خانہ کو جو میں نے دیکھا گو اجمالی ہی دیکھا تو دل نے گواہی دی کہ حالت اچھی ہے اور اگر کوئی مخفی کوتاہی کا میں بھی مدعی نہ ہو جاؤں جو آج کل بکثرت ایسے یتیم خانوں اور انجمنوں کے کارکن ہوں تو مجھے علم نہیں اور اس طور پر اگر اس میں بھی اس کوتاہی کی اعانت ہو جائے تو مواخذہ بھی نہیں۔

چنانچہ سب سے اول یہاں مجھے جو چیز سب سے زیادہ پسند آئی وہ سادگی تھی۔ میں نے اس کو نہایت سادہ اور ضرورت کی حد پر پایا اور جگہ کے یتیم خانے بھی میں نے دیکھے، وہاں یتیموں کی فوج کی طرح ایک وردی ہے۔ ایک دم سے سب کے سب آواز ملا کر السلام علیکم کی صدا بلند کرتے ہیں جس طرح قحط کے زمانہ میں اذانوں کا شور ہوتا ہے۔ یہ کیا ضرور ہے کہ گلے ملا کر کہیں السلام علیکم، یہاں آ کر دیکھا تو بچوں کا لباس بھی سادہ تھا، جیسا اپنے گھروں میں ہوتا ہے اور جگہ کو فوج کا سا لباس ہے جو ظاہراً با وقعت ہے مگر دونوں میں بڑا فرق ہے، فوج کا لباس اجنبی لوگوں کی طرح سے ہوتا ہے اور گھر کا لباس اپنے عزیزوں کی طرح سے۔ تو معلوم ہوا اور جگہ لباس کے ساتھ غیروں کا سا برتاؤ ہوتا ہے اور

یہاں اپنے بچوں کا سا، میری یہی رائے ہے اب چاہے کوئی یہی کہے کہ ملا ہیں بدذوق ہیں، کہا کرو۔

معشوق من انست کہ بہ نزدیک تو زشت است

(میرے نزدیک پسندیدہ یہی ہے خواہ تیری نظر میں برا ہو) بہرحال میرا خیال خواہ صحیح ہو خواہ غلط، دل کا شگفتہ اور مطمئن ہونا اس بیان کے لئے محرک ہوا۔ اب غیب کی مجھے کیا خبر اور مخفی کوتاہی کی اعانت سے بددیانتی کی اعانت نہ ہوگی اور اس واقعہ سے بھی تحریک ہوئی کہ برخلاف گمان سابق کے یتامیٰ کی طرف جیسی توجہ ہونی چاہیے ویسی ثابت نہیں ہوئی۔ پھر مشن والوں کے یتیم خانوں کی تعداد معلوم کر کے بھی غیرت اور حرکت ہوئی۔ غرض ذہن میں اس بیان کے لیے یہ مرجحات پیدا ہوئے۔ بہرحال بیان سے قبل یہ شبہ رفع کر دینا ضروری تھا کہ مجھ سے اس بیان کی کسی نے فرمائش نہیں کی کیونکہ فرمائشی بیان مؤثر نہیں ہوتا اس لیے کہ اپنے دل سے نہ ہونے کی وجہ سے اس میں خلوص کی قوت نہیں ہوتی اور جو بیان بغیر فرمائش کے ہوتا ہے وہ منجانب اللہ ذہن میں آتا ہے۔

در پس آئینہ طوطی صفتم داشتہ اند آنچہ استاد ازل گفت ہماں می گویم

(آئینہ کے پیچھے مجھے طوطی کی طرح رکھا ہے جو کچھ استاد ازل نے کہا تھا وہی میں کہہ رہا ہوں)

بے فرمائش تو غیب کی زبان ہے اور متعارف فرمائش کے وقت غیب کی زبان ہوتی ہے۔ اس وجہ سے میں فرمائش کو یا اس کی تعمیل کو پسند نہیں کرتا کیونکہ فرمائشی بیان اکثر غرض پر مبنی ہوتا ہے خواہ وہ غرض بھی ظاہراً نیک نیتی ہی سے ہو مگر پھر بھی فرمائش پر بیان کرنا دوسرے کی رائے کا اتباع ہے خود اس فرمائشی بیان میں قوت نہیں ہوتی۔ نیز سننے والوں کو یہ شبہ ہوتا ہے کہ یہ اپنی تحقیق سے نہیں کہتے بلکہ کہلوایا ہوا کہتے ہیں اس لیے اس کے کہنے کا وہی اثر ہوگا جو سیکرٹری یا صاحب فرمائش کے کہنے کا ہوتا ہے۔ جب دونوں کے کہنے کا اثر یکساں ہوا تو پھر اس کے بیان کی کیا ضرورت ٹھہری۔

میں یہ اس لیے بیان کیے دیتا ہوں کہ اہل علم کو بھی اور عوام کو بھی سبق ہو اور یہ فرمائش سے اور وہ فرمائشی بیان سے احتراز کریں کہ اس میں نہ اہل علم کے بیان کی وقعت اور قوت ہوتی ہے اور نہ عوام کو نفع ہوتا ہے۔ بہرحال ضرورت کی اطلاع کا تو مضائقہ نہیں مگر فرمائش نہ کرو جس طرح مریض طبیب سے اپنی حالت کی اطلاع کر کے پھر اپنے کو سپرد کر دیتا ہے اسی طرح تم بھی کرو۔

سپردم بتو مایہ خویش را تو دانی حساب کم بیش را

(میں نے خود کو آپ کے سپرد کر دیا کم وبیش کے حساب سے آپ خود آگاہ ہیں)

افراط وتفریط کا اثر

حالت کی اطلاع اکثر جگہ تو مناسب اور بعض اوقات واجب ہے مگر اس میں بھی کہیں افراط ہے کہیں تفریط ہے۔ مثلاً پیرو مرید کے تعلق ہیں اس بات میں تفریط ہے کہ مرید صاحب ضروری حالات سے اطلاع بھی نہیں کرتے، سمجھتے ہیں کہ پیر صاحب کشف ہیں ان کی یہ حالت ہے۔

چہ حاجت ست بہ پیش تو حال دل گفتن　　　که حال خستہ دلاں را تو خوب می دانی

(تیرے روبرو دل کا حال کہنے کی کیا حاجت ہے کہ تو کمزوردلوں کے حال کو خوب جانتا ہے)

یادرکھو کہ اس کے خطاب کا اگر کوئی مستحق ہوسکتا ہے تو وہ ذات ہے حق جل وعلیٰ شانہ کی لیکن باوجود اسکے وہاں پر بھی یہ حکم ہے کہ ادعونی اگر چہ یہ دعا اظہار کے لئے نہیں کیونکہ وہ تو عالم الغیب ہیں محض اپنے افتقار کے لئے ہے کیونکہ اگر چہ وہ جانتے ہیں مگر یہ بھی تو اپنا عجز اور محتاجی ظاہر کرے۔

اسی واسطے حدیث میں ہے "الدعاء مخ العبادة" (سنن الترمذی:۳۳۷۱، اتحاف السادة ۲:۲۸۴،۵:۲۹)

(یعنی دعا مغز عبادت ہے چنانچہ عبادت کے معنی لغت میں غایۃ التذلل کے ہیں۔ چنانچہ کہتے ہیں ثوب معبدای ثوب مذلل پس عبادت غایۃ تذلل کا بھی مغز ہے تو بروئے حدیث وہ انتہا درجہ کا تذلل ہوا اور واقعی دعا ایسی ہی چیز ہے کہ اس سے بڑے بڑے متکبروں کا تکبر مٹ جاتا ہے اور ان کا عجز افتقار ظاہر ہوتا ہے کیونکہ جب یہ خدا کے آگے ہاتھ پھیلاتا ہے تو معلوم ہوجاتا ہے کہ یہ بھی محتاج ہے۔

ایک مرتبہ اکبر شاہ بہ سبیل شکار کہیں جنگل میں گئے وہاں اتفاق سے راستہ بھول گئے، پیاس بہت شدت کی لگی، ایک دیہاتی کے گھر گئے اس نے انہیں دودھ پلایا، خاطر کی۔ جب یہ وہاں سے چلنے لگے اس وقت اپنا بادشاہ ہونا ظاہر کیا اور اس سے کہا کہ تم ہمارے دربار میں آنا یہاں آ کر اس گنوار کا حلیہ بتا کے حکم دیدیا کہ جب یہ آئے اسے ہمارے پاس پہنچا دیا جائے۔ چنانچہ ایک بار کسی حاجت کے پیش آنے کے وقت یہ گیا اور بادشاہ کے پاس پہنچا دیا گیا۔ اس نے بادشاہ کو دیکھا کہ نماز سے فارغ ہوکر دعا مانگ رہے ہیں۔ جب فارغ ہوئے تو اس کی طرف متوجہ ہوئے، پوچھا کس ضرورت سے آئے ہو، اس نے کہا آیا تو تھا مانگنے ہی کے لئے مگر یہاں آ کر دیکھا کہ تم خود ہی مانگ رہے ہو تو پھر تم سے کیا مانگوں، اسی سے نہ مانگوں جس سے تم مانگتے ہو، کیا وہ تمہیں بہت دے گا تو مجھے تھوڑا بھی نہ دے گا، مجھے کیا ضرورت کہ تمہارا احسان لوں۔

کس قدر عقیل تھا، سادگی فطرت پر قائم تھا، مصلحت بینی اور رائے کی آمیزش اس کے خیالات میں نہ ہوئی تھی اس نے دعا کی ہیئت سے اس کی حقیقت سمجھ لی تو دعا سے بندہ کا تذلل اور عجز ظاہر ہوتا ہے اس لیے خدائے تعالیٰ کے عالم الغیب ہوتے ہوئے بھی اس سے مانگا جاتا ہے۔

اب غور کرو کہ درحقیقت جس کی شان میں

کہ حال خستہ دلاں را تو خوب می دانی

(خستہ دلوں کے حال سے آپ خوب واقف ہیں)

کہا جا سکتا ہے وہاں بھی اپنا حال کہا جاتا ہے تو پھر پیر کی کیا حقیقت کہ وہاں حاجت عرض نہ ہو پھر پیر میں کشف بھی تو ضروری نہیں اور اگر ہو بھی تو دائم نہیں اور اگر دائم بھی ہو تو بغیر تمہاری توجہ کے آخر وہ کیوں التفات کریں اور حال نہ لکھنے سے ضرور استغناء کا شبہ ہوتا ہے۔ ایک محتاج دروازہ پر آئے گو اس کی ظاہری حالت اس کی احتیاج کو ظاہر کر رہی ہے تاوقتیکہ وہ زبان سے کہے اس کی حاجت روائی نہیں ہوتی، الغرض کہنا ضروری ہے۔ یہ تو اطلاع میں تفریط تھی اور کہیں افراط ہوتا ہے کہ اطلاع کے بعد فرمائش بھی کر دیتے ہیں۔ ایک صاحب کا خط آیا کہ حبس دم کا عمل بتا دو اور اس کی اجازت دے دو۔ میں نے لکھا کہ میری اجازت کی کیا ضرورت ہے جب آپ نے خود ہی تجویز کر لیا تو آپ خود ہی شیخ ہیں۔ حکیم صاحب کے پاس آئے خمیرہ بنفشہ تجویز کر دیجئے، جب خمیرہ بنفشہ خود ہی تجویز کر لیا تو حکیم صاحب کے پاس جھک مارنے کو کیوں آتے ہیں۔ انجمنوں میں عموماً یہی افراط اطلاع کی رسم ہو رہی ہے کہ علماء پر مضامین کی فرمائش ہوتی ہے جس سے زیادہ مقصود اپنی انجمن کی اظہار شان ہے کہ اس میں ایسے ایسے مضامین پر بحث ہوئی ہے اور اسی اظہار شان کے لئے ایسا ہوتا ہے کہ اگر ضرورت دو کی ہوتی ہے تو دس بیس کو بلاتے ہیں اس سے بھی محض شان و شوکت مقصود ہوتی ہے تبلیغ مقصود نہیں۔ خوب سمجھ لیجئے کہ دین میں بڑی چیز خلوص ہے نہ کہ افتخار اور اظہار یہی وجہ ہے کہ ہمارے اکثر کارناموں میں برکت نہیں۔ سلف کا طرز یہ تھا کہ ایک مرتبہ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو بیت المقدس کے نصاریٰ کے سامنے پیش کرنے کے لئے لے گئے، آپ پھٹے ہوئے کپڑے پہنے ہوئے تھے، عرض کیا گیا کہ لباس بدل لیجئے تا کہ کفار کی نظر میں عزت ہو، فرمایا: "نحن قوم اعزنا اللہ بالاسلام" ہم وہ قوم ہیں کہ خدا نے ہمیں اسلام سے عزت دی، لباس سے نہیں۔

جب بیت المقدس کے قریب پہنچے تو پھر سب نے اصرار کیا کہ جوڑا اور سواری بدل لیجئے۔

آپ نے مسلمانوں کا دل توڑنا گوارانہ کیا اور منظور فرمالیا، ایک مانگے کا گھوڑا اور مانگے کا جوڑا لایا گیا، یہ امیرالمؤمنین ہیں، یہ مسلمانوں کے بادشاہ ہیں جن کے پاس ایک اچھا جوڑا بھی نہ نکلا۔ اللہ اکبر! کیا سادگی تھی خیر گھوڑے پر سوار ہو کر دو قدم چلے ہوں گے کہ گھوڑا اُشتر اور ناز سے مچل مچل کر چلنے لگا، آپ اسے روک کے فوراً اتر پڑے اور فرمایا: ''تمہارا بھائی عمر ہلاک ہو گیا ہوتا کیونکہ گھوڑے پر بیٹھ کر وہ دل ہی نہیں رہا'' چنانچہ پھر اپنی پہلی ہی سادہ حالت میں پیش کیے گئے۔ نصاریٰ نے جب آپ کو دیکھا فوراً دروازہ کھول دیا۔

اللہ اکبر! یہ تھی خلوص اور سادگی کی برکت، مسلمانوں کو اس حالت سے جھیپ نہ ہونی چاہیے اور انہیں یہ سمجھنا چاہیے کہ وہ اپنی سادہ حالت میں اس کا نمونہ ہیں۔

مبیں حقیر گدایان عشق راکیں قوم ۔۔۔ کہ شہان بے کمر وخسرواں بے کلہ اند

اوران کی یہ حالت ہے

گدائے میکدہ ام لیک وقت مستی بیں ۔۔۔ کہ ناز برفلک و حکم برستارہ کنم

(میں شراب محبت الٰہی کے میکدہ کا ایک فقیر ہوں لیکن مستی کے وقت دیکھو کہ میں آسمان پر ناز اور ستارہ پر حکم کرتا ہوں)

بہرحال مسلمان کی شکستگی کسی حالت میں بھی مضر نہیں یہ شکستگی انار کی سی شکستگی ہے اور شکستہ انار اس وقت شرمندہ ہوتا ہے جبکہ اس کے اندر دانے خراب ہوں ورنہ مسلمان کی شکستگی میں تو یہ شان ہے۔

جملہ دانا یاں ہمیں گفتہ ہمیں ۔۔۔ ہستہ دانا رحمۃ للعالمین

(جملہ عقلمندوں نے یہاں کہا ہے کہ سب سے بڑے دانا حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم ہیں)

گر انارے می خری خنداں بخر ۔۔۔ تادہد خندہ اش زدانہ اوخبر

(اگر انار خرید تو کھلا خریدتا کہ کھلے انار کا دانہ دانہ اس کی شیرینی کی خبر دے)

اور اگر اندر عجیب ہے تو اس کی شکستگی کا یہ رنگ ہوگا

نامبارک خندہ آں لالہ بود ۔۔۔ کہ زخندہ اوسواد دل نمود

یعنی نامبارک خندہ لالہ کا تھا کہ جب تک منہ بند لال لال اور خوشنما تھا، جب منہ کھلا تو اندر سے کالے کالے ریشے نکل آئے یہی طرح ایسا شخص اپنی شکستگی کو چھپائے گا اور بنے گا جس میں حقیقت نہیں ہے۔

زعشق ناتمام ماجمال یار مستغنی ست　　باب ورنگ وخال وخط چہ حاجت روئے زیبارا

(جمال محبوب ہمارے عشق ناتمام سے مستغنی ہے جس طرح زیبا صورت کو رنگ و روپ، خط وخال کی احتیاج نہیں ہے)

صحابہ کے طرز کو دیکھئے مدینہ کی سادی مسجد میں ٹوٹے ہوئے بوریوں پر بیٹھے ہیں اور حوصلہ اس قدر بلند ہے کہ سلطنت روم وفارس کی (جو دنیا کی عظیم الشان سلطنتیں تھیں) قسمت کے فیصلہ کا مشورہ کر رہے ہیں اور سب خوفزدہ تک رہے ہیں کہ دیکھئے یہ بوریہ نشین ہماری قسمت کا کیا فیصلہ کرتے ہیں۔ سارا جہان متزلزل ہے کہ یہ پھٹے کپڑے پہننے والے کیا کریں گے، حضرت یہ نمونہ تھا کام کرنے والوں کا، یہ فیشن یہ وضع اور یہ شان وشوکت ان حضرات میں کہاں تھے۔

عاقبت ساز د ترا ازدیں بری　　ایں تن آرائی وایں تن پروری

(انجام کار تمہاری اس تن آرائی اور تن پروری کا یہ ہوگا کہ تم کو دین سے چھڑا دے گا)

قدرتی حسن

اگر واقعی کوئی کام کرنا ہے تو کسی چیز میں شان وشوکت کا خیال مت کرو، رمضان میں بعض لوگ مسجد کو تماشا گاہ بنا دیتے ہیں جس کی کراہت حدیث شریف میں ہے:

لتزخرفن المساجد کما زخرفت الیھود والنصاریٰ۔ (موارد الظمآن للھیثمی:۳۰۵)

''مساجد (کی زیب وزینت اور نقش ونگار) پر فخر کریں جیسے یہود ونصاریٰ اپنی عبادت گاہوں پر فخر کرتے ہیں۔''

مگر سنوارنا اور بات ہے اور استحکام اور بات ہے سو فقہاء نے لکھا ہے کہ استحکام جتنا چاہو کرلو حقیقت میں فقہاء اور صوفیاء ہی حکمائے امت ہیں۔ صوفیاء فرماتے ہیں کہ ذاکر کا حجرہ اتنا تنگ ہو کہ پاؤں نہ پھیلا سکے اور اس میں کسی قسم کا سامان آرائش وغیرہ نہ ہوتا کہ عبادت کے وقت قلب کو مشغولی نہ ہو دیکھئے! صوفیاء کرام حجرہ میں ضروری سامان کی بھی اجازت نہیں دیتے تو ان کے نزدیک غیر ضروری سامان سے مسجد کو سنوارنا کب درست ہوگا مگر اس وقت عام طور پر مسجد کو آراستہ کیا جاتا ہے مجالس اسلامیہ کو آرائش وزیبائش سے بالکل تھیٹر بنا دیا جاتا ہے اور یہ کہا جاتا ہے کہ غیر قوموں کے مقابلہ میں ہم کو ان سے پیچھے نہیں رہنا چاہیے۔

اے حضرات! غیر قومیں کہ جن کے سامنے آپ یہ ظاہر کررہے ہیں آپ ان کا مقابلہ اس میں نہیں کرسکتے ان کے برابر دولت آپ کے پاس کہاں ہے اگر وہ بھی ضد باندھ لیں تو یقیناً آپ ان کے مقابلہ میں شرمندہ ہوں گے اس لیے آپ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ رضوان اللہ علیہم اجمعین کی پیروی کیجیے اور کفار کا یہ نفسانی مقابلہ چھوڑیے بس ایک سچے مسلمان کی شان یہ ہونی چاہیے۔

دلبر ماست کہ با حسن خداداد آمد دلفریبان بناتی ہمہ زیور بستند

یہود اپنی زینتیں دکھلائیں نصاریٰ اپنی زینتیں دکھلائیں، ہنود اپنی زینتیں دکھلائیں اور ایک مسلمان پھٹا ہوا کرتا پہن کر نکلے گا تو خدا کی قسم سب کی رونقوں کو مات کردے گا۔ ارے صاحب خدا نے وہ حسن آپ کو دیا ہے کہ آپ کو زینت کی حاجت نہیں، ارے حسین! تجھے خدا نے وہ حسن دیا کہ تیرے حسن کے آگے آفتاب و ماہتاب شرماتے ہیں، ارے تو پوڈر مل کر کاہے کو اپنے قدرتی حسن کو پوشیدہ کرتا ہے تجھے اپنے حسن کی خبر نہیں۔ یہ عارضی حسن تیرے اصلی حسن کو پوشیدہ کیے دیتا ہے۔ متنبی کہتا ہے۔

حسن الحضارة مجلوب بنظرية وفي البداوة حسن غير مجلوب

(یعنی شہری عورتوں کا حسن تو بناؤ سنگار سے ہے اور دیہاتی عورتوں کا حسن خداداد ہے)

واقعی ایک دیہاتی عورت اگر حسین ہو تو بوجہ اس کے کہ اس کے قویٰ بھی اچھے ہوتے ہیں اور محنت کی عادت کی وجہ سے صحت عمدہ اور جسم توانا ہوتا ہے۔ ایک شہری کی حسین عورت سے جو بیسیوں تکلفات سے اپنے حسن کو بڑھا لیتی ہے بہت اچھی معلوم ہوتی ہے۔

ارے صاحب! مجلس اسلامی کے لیے یہ حسن اور یہ شرف کیا کم ہے کہ وہ اسلام کی طرف حقیقی نسبت سے منسوب ہے (تم نے اسلامی مجلس منعقد کی، اس کو شہنشاہ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کا دربار ٹھہرادیا اور اس کو اتنا بھی آراستہ نہ کرسکے جتنا دلی دربار یا یورپ کے بڑے بڑے تھیٹر تو تم نے گویا ایک نقل کی اور کوے کی طرح ہنس کے مقابلہ میں شرمندہ اور ذلیل ہوئے) ارے صاحب! مجلس اسلامی ایسی ہو کہ دور سے دیکھ کر خبر ہو جاوے کہ یہ مجلس اسلامی ہے، یہ کسی ناچ رنگ کی محفل یا تھیٹر یا سرکس کا سٹیج نہیں ہے، باہر سے مجلس اسلامی بالکل سادہ ہو، اندر پہنچو تو صحابہ کا رنگ جھلکتا ہو، یہ نہ ہو کہ بازاری عورتوں کی طرح گلے میں پھولوں کے ہار پڑے ہوں، لباس نہایت پر تکلف اور ایک ایک چیز اور ہر ہر ادا سے روسا کا سا تکبر نمایاں ہو اور حقیقت کا پتہ نہیں اور مشاہدہ شاہد ہے کہ زیب و زینت وہ شخص کرتا ہے جس کے پاس مال ہے، کمال نہیں ہے، ورنہ یہ

بجائے مال کے اپنے کمال کا اظہار کرتا اور اب کمال نہ ہونے سے مال کا اظہار کر رہا ہے۔

مولانا رومیؒ نے ایک مقام پر ارشاد فرمایا ہے کہ گنجا آدمی اپنے سر کا عیب چھپانے کے لئے خوبصورت ٹوپی کا اہتمام کرتا ہے اور جس کا سر اور بال درست ہوں وہ تو یہ چاہے گا کہ ٹوپی ہی نہ ہو تو بہتر ہے لوگوں کو معلوم ہو کہ کیسی خوبصورت مانگ اور کتنے اچھے بال ہیں۔ حضرت! میں بقسم کہتا ہوں کہ اگر قلب میں حقیقت ہے تو ظاہری آرائش سے نفرت ہوگی اور اگر حقیقت سے کورے ہیں تو ظاہری شان وشوکت سے اس کی لیپ پوت کریں گے، مجالس اسلامیہ میں کیسا بناؤ، اسلام کی طرح مجالس اسلامی میں بھی سادگی ہونی چاہیے۔ غرض انجمنوں میں بہت سے واعظین کا جمع کرنا یہ سب اسی افتخار ونمود واظہار کے لئے ہوتا ہے۔

اس میں ایک غرض اور بھی ہوتی ہے وہ یہ کہ کوئی کسی واعظ کو پسند کرتا ہے، کوئی کسی کو، سب کو جمع کرلو تا کہ ہر مذاق کے لوگ جمع ہوں اور جلسہ میں خوب رونق ہو، میں کہتا ہوں اگر آپ صحیح غرض کے لیے جلسہ کر رہے ہیں تو آپ کو لوگوں کے اس مذاق کی رعایت کی کیا ضرورت ہے، کوئی روپیہ تقسیم کر رہا ہے تو سائل خود بخود جمع ہوں گے اس اشتہار کی کیا ضرورت ہے کہ جو سائل روپیہ لینے آئے گا اسے مٹھائی بھی ملے گی۔ معلوم ہوتا ہے کہ روپے جعلی ہیں اگر سودا کھرا ہے تو بغیر قافیہ اور سجع ملائے بک جائے گا ورنہ مقفّی اور مسجع عبارت بولنا پڑے گا۔ حضرت اپنا متاع خالص رکھئے، دیکھئے خود بخود خریدار آئیں گے۔ اسی طرح حق ایسی چیز نہیں کہ اس کی طرف کشش نہ ہو، اہل حق اور ملمع سازوں کے کلام میں بھی فرق ہے کہ ملمع سازوں کی آمد بڑی رنگین ہوتی ہے اور اس میں بڑا زور وشور ہوتا ہے مگر حاصل سوائے قافیہ بندی کے کچھ نہیں ہوتا اور اہل حق کے کلام میں ابتداءً تو بہت دھیمی ہوتی ہے مگر انتہا میں اس کے زیور اور قوت کا خاص اثر ہوتا ہے۔ ابتداءً اس کی ہلکی بارش کی طرح آہستہ آہستہ ہوتی ہے جو کہ قلب میں آہستہ آہستہ ایسی بارش کی طرح جذب ہوتی جاتی ہے مگر اس کا انتہائی اثر گلزار اور گلناز ہوتا ہے۔ بقول مولانا

در بہاراں کے شود سرسبز سنگ   خاک شو تا گل بروید رنگ رنگ

(موسم بہار میں پتھر کب سرسبز ہوتے ہیں، خاک ہو جاؤ تو رنگ رنگ کے پھول اُگیں گے)

اور ملمع ساز اپنا رنگ جمانے کے لئے ابتداء میں خوب مثنوی کے اشعار پڑھتے ہیں اور کہیں کہیں اب تو ڈھولک، ستار اور ہارمونیم سے بھی مجلس وعظ کو گرم کیا جاتا ہے۔ مضامین کے الفاظ بھی دلگداز ہوتے ہیں کہ اس وقت تو ذرا سا جوش پیدا ہو جاتا ہے پھر جہاں مجلس برخاست ہوئی اثر بھی

تشریف لے گیا اور جو ذرا سا باقی رہ گیا وہ دو چار روز کا مہمان ہوتا ہے اور اہل حق کے کلام کا اثر پائیدار ہوتا ہے مگر کلام ان کا رنگین نہیں ہوتا۔ پس ان دونوں میں ایسا فرق ہے جیسا ایک چمکدار گلٹ کے چمچہ اور زنگ آلود روپیہ میں ہے، روپیہ کا زنگ اگر نہ بھی چھڑاؤ وہ تب بھی سولہ ہی آنے کو چلتا ہے اور گلٹ کے چمچہ پر اگر گلٹ بھی چڑھا رہے پھر بھی اس سے کوئی نہیں پوچھتا اور اگر وہ بھی اتر جاوے تو پھر تو وہ کچھ بھی نہیں، غرض روپے کو سفیدی اور چمک کی حاجت نہیں اور جو گلٹ کا چمچہ اپنے سفید ہونے کا دعویٰ کر رہا ہے اور بظاہر روپے سے بھی زیادہ چمکدار ہے اس کی سفیدی اور چمک تھوڑے دنوں کی ہے کہ اس کے بعد وہ دو کوڑی کا بھی نہ رہے گا۔

نقد صوفی نہ ہمہ صافی بیغش باشد　　　اے بسا خرقہ کے مستوجب آتش باشد

(صوفی کی موجودہ حالت اگر بالکل درست نہ ہو تو وہ صوفی نہیں، اگرچہ خرقہ پہن لے، بہت سے خرقہ پوش آگ میں جلانے کے قابل ہیں)

جب کسوٹی آئے گی تو روپیہ تو سامنے کھڑا ہوگا اور گلٹ کا چمچہ منہ چھپاتا پھرے گا۔

نباشد اہل باطن درپئے آرائش ظاہر　　　بہ نقاش احتیاجے نیست دیوار گلستاں را

(اہل باطن ظاہری زیب و زینت کے درپے نہیں ہوتے، نقاش کو باغ کی دیوار کی ہرگز ضرورت نہیں)

سادہ زندگی

یہی وجہ ہے کہ جناب رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم کی نہایت سادہ زندگی تھی۔ آپ میں تکلف اور ظاہری وضع میں کوئی شان وشوکت نہ تھی کیونکہ آپؐ سچے تھے۔ باوجودیکہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم اعلیٰ درجہ کے باوقار اور انتہا درجہ کے متین تھے مگر ساتھ ہی اس کے نہایت بے تکلف تھے۔ حتیٰ کہ ایک مرتبہ حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے جو نو برس کی عمر میں بیاہ کر آ گئی تھیں ان کی دل جوئی کے لئے فرمایا: کہ آؤ مسابقت کریں (یعنی دوڑیں) دیکھیں آگے کون نکل جاتا ہے۔ آپ کا سن شریف بھی زیادہ تھا اور جسم مبارک بھی بہ نسبت ان کے بھاری تھا۔ حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا ایک تو کمسن لڑکی دوسرے چھریرا بدن، وہ آپؐ سے آگے نکل گئیں۔ ایک مرتبہ پھر کئی سال بعد آپؐ نے فرمایا کہ آؤ مسابقت کریں، اس مرتبہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا پیچھے رہ گئیں کیونکہ عورتوں کا بدن مردوں کے

مقابلہ میں بہت جلد لنگ جاتا ہے اور اس سے جسم میں سستی پیدا ہو جاتی ہے (آج کل لوگ دونوں میں مساوات چاہتے ہیں، انہیں چاہیے پہلے اللہ تعالیٰ سے درخواست کریں کہ اس تفاوت کو موقوف کریں) غرض حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا میں بچپن کی سی چستی نہ رہی تھی اور آپؐ اس وقت بھی ویسے ہی تھے جیسے پہلے مسابقت میں تھے۔ اس لیے اس مرتبہ آپ آگے نکل گئے اور حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کی شرمندگی کو رفع کرنے کے لئے فرمایا تلک بتلک یہ آگے نکلنا اس وقت کے تمہارے آگے نکلنے کے بدلے میں ہے۔ یعنی ہم تم دونوں برابر ہو گئے۔ آج کل کے وقار میں اور کبر میں کچھ بھی فرق نہیں رہا۔ چنانچہ آج کل مدعیان وقار کبھی ایسا نہ کریں گے حالانکہ یہ وقار کے منافی نہیں البتہ کبر کے مناقض ضرور ہے کہ شان کے خلاف معلوم ہوتا ہے۔

ایک مولوی صاحب سے میں نے یہی واقعہ بیان کیا ہے، وقار کا بہت لحاظ رکھتے تھے اور میری نسبت ان کا شبہ تھا۔ کہتے تھے کہ یہ خفیف الحرکات ہیں جو اپنے گھر کے اسرار مجمع میں بیان کر دیتے ہیں۔ میں نے کہا بتائیے آپ کا وقار بڑا ہے یا حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا، کہا حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا، میں نے پوچھا آپ بھی کبھی اپنی بیوی کے ساتھ دوڑے ہیں؟ کہنے لگے نہیں، میں نے کہا تو پھر یہ وقار نہیں تکبر ہے، اگر آپ گھر کے اسرار بیان کریں تو ''بیش بریں نیست'' (اس سے بڑھ کر نہیں ہے) کہ کوئی آپ کا معتقد نہ رہے گا نہ رہے، ایسے شخص کو سن لینا چاہیے۔

ہاں وہ نہیں وفا پرست جاؤ وہ بے وفا سہی جسکو ہو جان و مال عزیز اسکی گلی میں جائیں کیوں

تم کسی کو بتلاتے ہی کیوں ہو صاف کہہ دو۔

ہر کہ خواہد گو بیاید ہر کہ خواہد گو برو دار و گیر و حاجب و درباں دریں درگاہ نیست

(جس کا جی چاہے آئے جس کا جی چاہے چلا جائے، اس دربار میں محاسب دربان اور داروغہ کی ضرورت نہیں ہے)

تو آپ کی سادہ زندگی اس لیے تھی کہ آپ سچے تھے اور جتنا کوئی سچا ہوگا اس قدر اس میں سادگی ہوگی، نہ چلنے میں بناوٹ نہ اٹھنے میں، نہ بیٹھنے میں بناوٹ بلکہ اسے بنتے ہوئے بھی شرم آتی ہے کہ ہمارے آقا کے اور اسلام کے طرز کے یہ بالکل خلاف ہے۔ آج کل بناوٹ کی اس قدر شدت ہے کہ وعظ تک میں بناوٹ، زبردستی مضمون نہیں آتا تو اسے بنا لیتے ہیں۔ مقصود تو ہے شعر پڑھنا اس کے لے ادھر ادھر سے مضمون کو گھیر گھار بس جھٹ سے شعر پڑھ دیا۔ بھلا زبردستی شعر

کے لئے اس تکلیف کی کیا ضرورت ہے۔ یہ سب چھچھوراپن ہے کہ ایک آدھا شعر یاد ہے تو اسے ظاہر کیسے کریں خواہ بے موقع ہی پڑھ دیں۔

جیسے ایک حکایت ہے کہ ایک شخص تھے، کچھ پڑھے لکھے تو تھے نہیں، اپنی جہالت چھپانے کے لئے سنے ہوئے الفاظ بہت بولا کرتے تھے۔ ایک مرتبہ انہوں نے ایک شخص کو کسی کے بیٹے کی تعزیت میں نعم البدل کا لفظ بولتے سنا، جھٹ اسے یاد کرلیا اور اپنے دل میں کہنے لگے کہ خدا کرے اور کوئی مرے تو میں اس لفظ کو بولوں، اتفاق سے محلّہ میں کسی کے باپ مرگئے، اب کیا تھا، آپ تو اس موقع کے منتظر ہی تھے، جھٹ پہنچے اور تعزیت ادا کرنے لگے کہ آپ کے والد کے انتقال کا بہت صدمہ ہوا، خدا آپ کو صبر دے اور اس کا نعم البدل عطا فرماوے، وہ جھلا اٹھا کہ چل دور ہو یہاں سے تو تو میری ماں کو خصم کراتا ہوا آیا۔

اسی طرح ایک اور صاحب تھے جو سماعی الفاظ کے بڑے شوقین تھے، انہوں نے رخصت ہوتے وقت کسی کو یہ کہتے سن لیا کہ مرخص ہوتا ہوں بس اسے یاد کرلیا اور ٹھان لی کہ چلتے وقت میں بھی یہی الفاظ استعمال کیا کروں گا۔ چنانچہ صبر نہ ہوا اور قصداً ایک امیر کی مجلس میں محض یہی لفظ استعمال کرنے کے لئے تھوڑی دیر بیٹھ کر اٹھے، اب اصل لفظ یاد نہ رہا، بجائے اس کے کہنے لگے میں بھی مخنث ہوتا ہوں، وہ امیر کہنے لگے بسم اللہ! آپ کی چیز ہے آپ کو اختیار ہے، رکھئے یا نہ رکھئے، اس جواب پر بہت حیران ہوئے، باہر آکر لوگوں سے پوچھا تو اپنی غلطی معلوم ہوئی۔

یہی حال ان شعر ٹھونسنے والے واعظین کا ہے۔ حضرت! کیا اسلام کا یہی طریقہ ہے۔ کیا تبلیغ اسی بناوٹ کے طرز سے ہوتی ہے، موقع پر کوئی شعر یاد آ گیا، پڑھ دیا، نہیں آیا جانے دو، یاد آ گیا تو ایک وعظ میں دو سو شعر ہیں، نہیں یاد آیا تو ایک بھی نہیں ہے۔ غرض تصنع کا بڑا زور ہے جس میں سے کئی کئی واعظین کا جمع کرنا بھی ہے۔ پھر واعظین بھی کیسے کہ علم سے بالکل بے بہرہ، دو چار مضمون اردو کے رسالوں سے یاد کرلیے اور بس مولانا بن گئے۔ یہ مولانا بمعنی سیدنا نہیں بلکہ غلامنا، کیونکہ مولا کے معنی سید کے بھی ہیں اور غلام کے بھی ہیں۔ سید تو جب ہوئے کہ جب اہل علم ہوتے اور اب تو نرے غلام ہیں کہ جس کی مرضی دیکھی ویسا ہی اسے سنا دیا۔ حضرت نرے وعظ کہنے سے آدمی اہل علم نہیں ہو جاتا۔

نہ ہر کہ آئینہ دار سکندری داند　　نہ ہر کہ سر بتراشد قلندری داند

(ہر وہ شخص جو آئینہ رکھتا ہے سکندری نہیں جانتا، اسی طرح ہر وہ شخص جو اپنا سر منڈاتا ہے

قلندری نہیں جانتا) بلکہ ان دونوں کے لیے یہ شرط ہے کہ

صوفی نشود صافی تا درنکشد جامی — بسیار سفر باید تا پختہ شود خامی

(صوفی جب تک بہت سے مجاہدے نہ کرے خام ہی رہتا ہے، پختگی مجاہدات کے بعد حاصل ہوتی ہے)

ہزاروں دھوئیں اڑ کر دماغ میں پہنچیں تب کہیں طالب علم بنتا ہے۔

پر تکلف زندگی

آج کل جس طرح ہر کام کی مشینیں ایجاد ہوگئی ہیں اور ان سے ہر کام سہل اور ارزاں ہوگیا ہے اسی طرح مولویت کی بھی مشین بن گئی ہے۔ پہلے دو پیسہ میں شاہ صاحب تو بن جاتے تھے کہ ایک پیسہ کے گیرو میں کپڑے رنگ لیے، ایک پیسہ کی مٹی کے دانوں کی تسبیح خرید لی، بس شاہ صاحب بن گئے لیکن مولوی بننا مشکل تھا مگر اب تو کتب خانے جا بجا ناول و اخبار بینی کے لیے قائم ہیں۔ قوم کا روپیہ مفت برباد ہو رہا ہے جس کا جی چاہا آیا اور اخبار اور دو چار ناول دیکھے، اس کے کچھ الفاظ اور تقریریں یاد کر لیں اور مولانا صاحب بن گئے۔ اخبار اور ناول مولویت کی مشین ہیں۔ ان سے بلا کسی مشقت اور صرف کے مولوی تیار ہو جاتے ہیں اور ایسے ہی مولوی اکثر مجالس الاسلامیہ کی رونق کے لیے جمع کیے جاتے ہیں اور وہ اپنی جہالت اور لالچ کی وجہ سے آپ کی بدعات کی تائید کر جاتے ہیں۔ اب اگر کوئی محقق منع کرتا ہے تو اس کی سادگی کی وجہ سے اس کا کہنا نہیں سنتے، سنو یا نہ سنو اس کا تو مذہب یہ ہے۔

کس بشنود یا نشود من گفتگوئے می کنم

(کوئی سنے یا نہ سنے میں گفتگو کرتا ہوں) اور اس کا عمل اس پر ہے۔

حافظ وظیفہ تو دعا گفتن است وبس — دربند آں مباش کہ نشنید یا شنید

(حافظ تیرے ذمہ دعا کرنا ہے اور بس اس کے درپے ہو کہ قبول ہوئی یا نہیں)

کیمیا گر کا کبھی دل برا نہیں ہوتا، اگر کوئی اس کی کیمیا سازی سے انکار کر دے اور ملمع ساز کا دل برا ہوتا ہے کیونکہ اس کی روزی میں خلل پڑتا ہے۔ اتنے تکلفات کی کیا ضرورت ہے کہ بہت سے واعظوں کو جمع کیا جاوے اور اس میں اہل، نااہل کا امتیاز بھی نہ رکھا جاوے۔ خصوص جبکہ خاص معراج یا میلاد کے جلسے کیے جائیں اور اس میں علماء سے فرمائش کی جاوے کہ وہ عوام کے مجوزہ مضامین کی

پابندی کریں۔ اللہ اکبر! علماء کو مشورہ دیں عوام الناس، ایک مریض کے ابا جان طبیب سے فرمائش کر رہے ہیں کہ خمیرہ گاؤ زبان کا نسخہ تجویز فرما دیجئے تو ابا جان آپ خود ہی علاج کیوں نہ کر لیتے، علماء کی کیا ضرورت، معراج اور میلاد کا بیان تو بہت کتابوں میں موجود ہے، آپ خود ہی کتاب ہاتھ میں لے کر کھڑے ہو کر پڑھ دیجئے بلکہ یہ تو اور اچھا ہوگا کیونکہ اتنی روایتیں زبانی تو کسی کو یاد نہیں۔

بہر حال علماء سے فرمائش کرنا بہت ہی بے ادبی کی بات ہے، انہیں تو آزاد چھوڑ دو اور یہ کہہ دو کہ جو مرض ہو اس کے متعلق بیان کیجئے۔ مگر ایسا اس لیے نہیں کرتے کہ ایک تو رنگ مجلس کے خلاف ہوتا ہے، دوسرے یہ بھی غرض ہوتی ہے کہ ہمارے امراض بیان نہ کریں کیونکہ ایسے جلسوں میں مختلف مذاق کے لوگ جمع ہوتے ہیں، ممکن ہے کسی کے خلاف گزرے اور ناگوار ہو۔ مثلاً اگر میں یہ کہوں کہ سود لینا حرام ہے، رشوت لینا حرام ہے، ترک نماز پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کافر تک فرمایا ہے تو کہیں سود خوار خفا ہو جائیں گے اور کہیں رشوت خوار ناراض ہو جائیں گے اور کہیں بے نمازی بگڑ جائیں گے اور اس سے مجلس میں سناٹا ہو جائے گا اور اکثر ایسے عام جلسوں میں علماء تو ہوتے نہیں، اکثر فیس والے جمع ہوتے ہیں ان سے جو فرمائش کردے وہ چار و ناچار اسے پورا کرتے ہیں۔

حالت ان لوگوں کی یہ ہے کہ سیکنڈ کلاس میں تو سفر کر کے آتے ہیں، تاروں میں بات چیت کرتے ہیں، خس کی ٹٹیوں میں قیام کرتے ہیں، ہم نے خود دیکھا ہے کہ اٹاوہ کے جلسے میں ایسے ہی ایک صاحب مع اپنی فوج کے تشریف لائے تھے۔ صرف چونسٹھ روپیہ ان کے ریل کے کرایہ میں صرف ہوئے تھے، رات کو ایک کمرہ میں لیٹے، خس کی ٹٹیاں لگی ہوئی تھیں، میں برآمدے میں لیٹا برسات کی گرمی برآمدہ میں ہو تو ہوا آتی تھی مگر کمرہ میں رات کو اور بھی حبس تھا، وہ بڑے آدمی تھے اس لیے انہوں نے ہم عوام کے ساتھ برآمدے میں لیٹنا اپنی شان کے خلاف سمجھا مگر وہاں مارے گرمی کے نیند نہ آئی۔ اب آپ نے داعی سے فرمائش کہ دو آدمی مقرر کرو جو رات بھر پنکھا کھینچیں چنانچہ آدمی مقرر کیے گئے، اب جو سوئے تو صبح کو 8 بجے بستر استراحت سے اٹھے، صبح کی نماز بھی غائب کر دی، منہ ہاتھ دھو کر عباء وقباء سے آراستہ ہو کر مولانا بن کے پھر سب میں آ بیٹھے...... یہ ہیں صاحب مولانا!

خطاب تو بڑے بڑے لمبے چوڑے مل جاتے ہیں کوئی شمس العلماء ہے، کوئی بدر العلماء ہے، میں کہتا ہوں کہ شمس العلماء تو ہیں مگر شمس مخسوف یعنی آفتاب تو ہیں مگر گہنائے ہوئے آفتاب ہیں جن میں نور بالکل نہیں، اگر یہی مقتدائے قوم ہوں گے تو انجام یہ ہوگا۔

اذا کان الغراب دلیل قوم سیهدیهم طریق الها لکینا
گر همیں مکتب وهمیں ملا کار طفلاں خراب خواهد شد

(جب کوا قوم کا لیڈر ہو وہ انہیں ہلاکت کی طرف لے جائے گا، اگر ایسے اساتذہ اور ایسے مکاتب ہوں تو بچوں کا انجام خراب ہو گیا)

بہرحال آج کل کے علماء کے یہ حالات ہیں۔ میں زیادہ کہتے ہوئے شرماتا ہوں کیونکہ اول تو میں خود اسی گروہ میں شریک سمجھا جاتا ہوں۔ دوسرے شبہ ہوتا ہے کہ شاید وہ مثل ہو کہ سلہاری کو دیکھ کر سلہاری کلسے، سوت سوت پر رشک کرتی ہے مگر خیر آپ انہیں مخلص اور مجھے خود غرض سمجھئے۔ اظہار حق کی ضرورت تھی وہ پوری ہو گئی۔ خواہ مجھے کچھ بھی سمجھئے بہرحال علماء سے فرمائش کرنا بھی بے تمیزی ہے اور ان کو فرمائش کے تابع ہونا بھی نامناسب ہے۔ اگر کوئی اسلامی مجلس کیجئے تو علماء کو بلائیے فیس لینے والوں کو نہ بلائیے۔

مگر اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ ہم کیوں کر پہچانیں؟ اس کی سہل ترکیب یہ ہے کہ مقامی علماء سے انتخاب کرائیے، "ولی را ولی می شناسد" (ولی ولی کو پہچانتا ہے)۔ اسی طرح عالم کو عالم ہی خوب پہچانتا ہے۔ اب اگر علماء ہی انتخاب میں گڑبڑ کریں تو وہ ذمہ دار ہوں گے۔ اگر وہ بددیانتی کریں گے تو خدا کے یہاں انہی کی گردن نپے گی مگر افسوس ایسا نہیں کیا جاتا، خود عوام ہی جو سمجھ میں آتا ہے وہی کرتے ہیں۔

بہرحال اس پر گفتگو شروع ہوئی تھی کہ فرمائشی بیان مناسب نہیں ہے اور یہی وجہ ہے کہ میں فرمائش کو قبول نہیں کرتا۔ گو یہ گفتگو طویل ہو گئی تاہم اس میں بہت سے مفید مضامین آ گئے۔

معاملات یتامیٰ

جو مضمون میں بلا فرمائش بیان کرنا چاہتا ہوں اس کی اجمالی تعیین تو سب کے ذہنوں میں الفاظ قرآن ہی سے ہو گئی ہے جیسا بالکل شروع میں مذکور ہوا ہے۔ اب ضرورت کسی قدر تفصیل کی ہے سو عرض کرتا ہوں، ارشاد ہے:

وَيَسْئَلُوْنَکَ عَنِ الْيَتٰمٰى (آپ سے یتامیٰ کے بارے میں پوچھتے ہیں) اس کا شان نزول یہ ہے کہ جب یہ آیتیں نازل ہوئیں۔

اِنَّ الَّذِيْنَ يَاْكُلُوْنَ اَمْوَالَ الْيَتٰمٰى ظُلْمًا اِنَّمَا يَاْكُلُوْنَ فِىْ بُطُوْنِهِمْ نَارًا

(یعنی جو لوگ یتامیٰ کا مال ظلم سے کھاتے ہیں وہ جز ایں نیست کہ اپنے پیٹوں میں آگ بھرتے ہیں)

تو وہ صحابہ رضی اللہ تعالیٰ عنہم جن کے قبضہ میں یتامیٰ کے اموال تھے، ڈر گئے حالانکہ اس وقت یہ حالت نہ تھی جو آج کل ہے کہ اب تو قابض اموال بھی ہیں اور قابض ارواح بھی ہیں جو امین ہیں ان کی یہ حالت ہے کہ کوئی مرا، اس کے ورثاء نابالغ ہیں، ان کے مال میں سے تیجہ، چالیسواں، چھ ماہی، برسی کر رہے ہیں اور یتیم خانوں اور مدرسوں، انجمنوں میں بھیج رہے ہیں اور ان کے مہتمم بھی کہیں بلا تحقیق اور کہیں باوجود تحقیق ہونے کے دھڑلے سے لے جاتے ہیں جو آیا رکھ لیا، کم از کم اتنی تو تحقیق کر لیجئے کہ یہ عطیہ ترکہ میں سے ہے یا حصہ میں سے، اگر ترکہ میں سے ہے تو اس کے سب ورثاء بالغ ہیں یا نابالغ بھی ہیں پھر اگر سب بالغ ہیں تو دینے کے وقت سب حاضر بھی ہیں یا کچھ غائب ہیں، اگر سب حاضر ہیں تو سب کی رضا سے دیا گیا ہے یا بلا رضا کے، اگر رضا سے دیا گیا ہے تو رضا سکوتی ہے یا نطقی، پھر اگر رضا نطقی ہے تو بطیب خاطر دیا ہے یا محض شرما شرمی بغیر ان امور کے حل کیے حلال نہیں ہوتا، یہ کیا بدتمیزی ہے کہ جو ملے رکھ لو یہ خبر نہیں کہ اس میں یتیموں کا بھی حق ہے حالانکہ خود میراث ہی کا معاملہ بڑا نازک ہے، ایک بزرگ کسی بیمار کی عیادت کو گئے، اتفاق سے وہ ان کے سامنے مر گیا، اس کے مرتے ہی انہوں نے چراغ گل کر دیا، وہاں جو اور تیماردار تھے انہوں نے پوچھا تو فرمایا کہ جب تک یہ زندہ تھا تو تیل اس کا تھا، اب یہ مر گیا تو یہ تیل ورثاء کا ہو گیا اور اب یہ تیل ترکہ میں لگے گا، میں نے اپنے پاس سے دو پیسہ کا تیل منگا لیا ہے۔

شریعت میں ادنیٰ چیزوں کا حساب ہے اگر اور متروکہ دو پیسہ کم ایک ہزار کا ہے تو دو پیسہ کا تیل اس میں شامل کر کے ایک ہزار کی تقسیم ہو گی چونکہ شریعت میں ادنیٰ چیزوں کا حساب ہے اسی لیے ادنیٰ چیزوں پر مواخذہ بھی اتنا ہی ہے جتنا بڑی بڑی چیزوں پر ہے۔

درمختار میں ہے کہ اگر کوئی کسی کا ایک دانگ دبا لے جو بقدر تین پیسہ کے ہوتا ہے تو اس کے بدلے اس کی سات سو نمازیں دے دی جاویں گی، آپ اسے سہل سمجھتے ہیں، بڑا سخت قصہ ہے اب تو بڑا اندھیر ہے، مشترک ترکہ میں سے تیجہ، چالیسواں سب کرتے ہیں، اگر کوئی کہے تو کہتے ہیں کیا ہم اپنے لیے کرتے ہیں، انہی کی عزت کے واسطے کرتے ہیں، اگر آپ بڑے ہمدرد بنے ہیں تو اپنی گرہ سے کیجئے، کیا ٹھکانہ ہے بدتمیزی پھیلی ہوئی ہے۔

مجھے اپنے یہاں کی ایک حکایت یاد آئی، میرے ایک ماموں زاد بھائی کی لڑکی ایک نابالغ

لڑکا اور شوہر اور ماں باپ چھوڑ کر مرگئی، اس کے باپ نے ایک حمائل مدرسہ میں میری معرفت دینا چاہی جس میں اس نابالغ کا بھی حق تھا اس کی ماں نے کہا وہاں نہ بھیجو وہاں تو کر چیلیں نکلیں گی، اس کے باپ نے کہا تب تو وہیں بھیجنا اچھا ہے کہ مسئلہ کی بھی تحقیق ہو جاوے گی چنانچہ میرے پاس بھیجی گئی، میں نے سب سے واقعہ دریافت کیا اور کہا کہ بچے کی تو اجازت معتبر نہیں اس لیے اس کی قیمت لگاؤ اور جتنا نابالغ کا حق ہے اتنے کا اپنے پاس سے کپڑا خرید کر الگ سے اسے پہنا دو تو اس کا حصہ تمہاری ملک میں ہو جاوے گا پھر تم مدرسہ میں دے سکتے ہو، یہ جواب پہنچا تو وہ کہنے لگے کہ میں نے تو پہلے ہی کہا تھا خیر صاحب! اس کی قیمت کا اندازہ کر کے دس آنے کے پیسے لڑکے کے حصے کے میرے پاس بھیجے کہ تم ہی اس کا کپڑا منگا دو کہیں ہمارا اعتبار نہ آوے، میں نے کہا کہ اگر پیسے نہ بھیجتے تو اعتبار نہ آتا، اب اعتبار ہے تم ہی منگا کر سب کو دو۔

تو یہ ہیں احتیاطیں جن کے بغیر حلال و حرام میں فرق نہیں ہو سکتا۔ اگر کوئی کہے کہ بس فاتحہ روک دیں، مرگیا مردود نہ فاتحہ نہ دُرود، میں کہتا ہوں کرو فاتحہ دُرود مگر جو طریقہ ہے اس کے موافق کرو۔ طریقہ یہ ہے کہ میت کے مال میں سے سب سے پہلے تجہیز و تکفین کرو مگر ضرورت کے موافق یعنی اسراف اس میں بھی مت کرو، اس کے بعد اگر وہ مقروض ہو تو اس کا قرض ادا کرو، اس کے بعد اگر اس نے کوئی وصیت کی ہو تو ثلث مال کے اندر اندر اسے پورا کرو، اس کے بعد جو بچے ورثاء میں بانٹ لو۔ اب جو چیزیں مساکین کو دینا ہوں اور وہ اپنے حصہ کے بقدر اپنے حصہ میں لگاؤ تا کہ کسی نابالغ کا حق یا کسی بالغ کا حق بغیر طیب خاطر تمہارے ہاتھ سے صرف نہ ہو مگر اس کی امید نہیں کہ آپ ایسا کریں، اس وقت تو آپ بھی نابالغ بن جائیں گے اور کہیں گے کہ مولانا نے ہمیں اس شعر میں نابالغ کہا ہے۔

خلق اطفال اند جز مرد خدا نیست بالغ جز رہیدہ از ہوا

(سوائے اہل اللہ کے تمام مخلوق نابالغ ہے جو خواہش نفسانی میں مبتلا ہے وہ بالغ نہیں ہوا)

اب تو یہ بھی نابالغ بن جائیں گے کہ خرچ نہ کرنا پڑے۔ جس طرح ایک شخص قصر نماز پڑھا کرتا تھا، پوچھا یہ کیا، کہنے لگا حدیث میں ہے "کن فی الدنیا کانک غریب" (دنیا میں مسافر کی طرح رہو) بس میں مسافر کی طرح رہتا ہوں، اس لیے نماز میں قصر کرتا ہوں، کم بخت! صرف نماز ہی میں مسافر بن گئے۔ تو ایسے ہی مال کی حفاظت کے لئے یہ بھی نابالغ بن جائیں گے تو دینے کا یہ طریقہ ہے کہ اپنے حصہ میں لگا کر پھر دو، مگر اب تو دیتے ہوئے دم نکلے گا، اسی طرح اپنے حصہ میں

سے خیرات کرو، مدرسہ میں دو جو چاہو کرو مگر حد سنت سے تجاوز مت کرو، بدعت کے طریقوں پر مت چلو، غرض جیسی آج کل بے تمیزی پھیلی ہوئی ہے اس وقت جب یہ آیتیں نازل ہوئی ہیں ان کا صحابہؓ میں احتمال بھی نہ تھا۔ ہاں اتنا ضرور تھا کہ وہ صحابہؓ جن کے پاس یتامیٰ تھے، کھانے پینے کو یتامیٰ کے ملا لیتے تھے، نسبت کا لحاظ رکھتے تھے کہ اگر ان کے دو پیسے صرف کیے تو اپنے چار خرچ کیے۔ ان کا ایک چھٹانک مثلاً غلہ لیا تو اپنا پاؤ بھر شریک کیا مگر یہ ضرور ہے کہ مخالطت تھی اور مخالطت میں ظاہر ہے کہ اپنا ان کے صرف میں آ جاتا ہے اور ان کا اپنے صرف میں تو جس وقت یہ آیتیں نازل ہوئیں۔

"اِنَّ الَّذِیْنَ یَاْکُلُوْنَ اَمْوَالَ الْیَتٰمٰی" (بے شک جو لوگ یتیموں کا مال کھاتے ہیں)

حالانکہ یہ آیتیں اس مخالطت کے متعلق نہ تھیں مگر صحابہؓ ان کو سنتے ہی گھبرا اٹھے اور اس کے بعد ان کے کھانے پینے کا انتظام الگ کر دیا، کتنی زحمت اٹھائی کہ یتیم کا آٹا گوندھا، سالن الگ پکایا، پھر اس کی حفاظت کی مشقت الگ گوارا کی کیونکہ بچہ ہے۔ کسی وقت کم کھایا، کسی وقت زیادہ، زیادہ اپنے پاس سے کھلا دیا مگر کم کھایا تو اب اس کی حفاظت کی مشقت گوارا کرنا پڑی کہ یتیم کا مال ہے ضائع نہ ہو، پھر کبھی گرمی ہے کبھی سردی، گرمی میں بچا ہوا کبھی سڑ گیا تو یتیم کا نقصان ہوا کیونکہ آپ کھا نہیں سکتے تو اب بہت تنگی ہوئی اور زیادہ اپنی مشقت سے نہیں بلکہ زیادہ تر ان کے خیال سے گھبرانے لگے تو عرض کیا یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم! ہم کیا کریں جو یتامیٰ کا نقصان نہ ہو اس کے جواب میں یہ آیت نازل ہوئی:

وَیَسْئَلُوْنَکَ عَنِ الْیَتٰمٰی (آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے یتیموں کے بارے میں پوچھتے ہیں)

جس نے یہ فیصلہ کر دیا کہ کس طرح کھانا جائز ہے یعنی جہاں مقصود کھانا نہ ہو بلکہ مخالطت کے ضمن میں کھایا جاوے اور کس طرح ناجائز ہے جہاں کھانا ہی مقصود ہو اور دوسرے امور کا بہانہ ہو۔

مہتمان کے کرتوت

جیسے آج کل بھی یتیموں کا مال ظلماً کھاتے ہیں جس کی ایک صورت یہ بھی ہے یتیم خانہ کا مہتمم بھی جو دستبردار کرتا ہے وہ ایک درجہ میں یتیموں کا مال ظلماً کھاتا ہے کیونکہ جو رقم اس کے قبضہ میں آئی ہے اس کی دو حالتیں ایک تو وہ اشیاء جو موجودہ یتامیٰ کے لیے آتی ہیں، قواعد شرعیہ سے وہ تو دراصل یتامیٰ کی ہوتی ہیں اور یہ مہتمم یتامیٰ کا امین و وکیل ہے اس لیے جو رقم اس کے قبضہ میں آ گئی

اب اگر اس نے دستبرد کی وہ صریحاً یتامیٰ کے مال میں ظلماً دستبرد کی جیسا بعض جگہ کا حال معلوم کر کے افسوس ہوتا ہے اور ایک جو آنے والے یتامیٰ کے لیے بھیجا ہے اس میں یہ مہتمم دینے والوں کا وکیل ہے اس میں دستبرد کرنا بھی باعتبار اثر اور ضرر یتامیٰ کے ایک گونہ اکل مال یتیم ظلماً ہے۔

اب تو اکثر لوگوں نے یتیموں کا بہانہ بنا رکھا ہے میں نے ایک سیکرٹری صاحب کو دیکھا کہ وہ یتیم بچوں کو اپنے ساتھ لیے لیے پھرتے ہیں اور ان کو نظمیں پڑھوا پڑھوا کر چندہ جمع کرواتے ہیں۔ ایک تو بچوں کی سریلی آواز دوسرے لباس کی آرائش سے وہ اور بھی گڑیا سے معلوم ہوتے ہیں پھر مضمون بھی دلگداز کہ جس نے سنا رونا شروع کر دیا، اے لیجئے تھوڑی دیر میں بہت سا چندہ جمع ہو گیا، یتیموں کا نام ہوا اور مہتمم صاحب کا کام ہوا، اب جب یہ مہتمم صاحب اپنے مرکز پر پہنچے وہاں آمدنی کی جانچ پڑتال ہوئی انہوں نے وہاں بھی مٹھی گرم کر دی اور سب مزے میں رہے۔

اسی طرح بہت سے لوگ مساجد کے لیے چندہ جمع کرتے ہیں اور اپنے تصرف میں لاتے ہیں۔ ایک شخص مسجد کے لیے چندہ مانگ کر لاتا تھا اور ہضم کر جاتا تھا۔ جب ختم ہو جاتا تھا پھر اسی عنوان سے لاتا تھا کہ وہ رقم مسجد میں لگا دی، اب اور ضرورت ہے کسی نے جو اس کے راز سے آگاہ تھا کہا ارے کم بخت! مسجد کے نام سے چندہ لاتا ہے اور خود صرف کر ڈالتا ہے اور پھر کہتا ہے کہ مسجد میں لگا دیا اس نے کہا کہ میں جھوٹ کیا کہتا ہوں، پہلے مسجد میں لگاتا ہوں پھر خرچ کرتا ہوں کیا کرتا تھا کہ مسجد میں روپیہ کو چھوا لیتا تھا اور پھر خرچ کر ڈالتا تھا، اپنے نزدیک گویا سچ بھی بولتا تھا۔ ایک اور شخص بہت ہی کثرت سے پانی ملا کر دودھ بیچتا تھا اور اگر کوئی کہتا تھا تو قسم کھا کر کہتا کہ میں دودھ میں پانی نہیں ملاتا، مسلمان لوگ اس کی قسم پر خاموش ہو جاتے تھے، ایک اس کے محلے والے نے جنہیں اس کا حال معلوم تھا کہا ارے کم بخت! ایک تو پانی ملاتا ہے دوسرے جھوٹی قسم کھاتا ہے، کہنے لگا جھوٹی قسم نہیں کھاتا پہلے برتن میں پانی ڈال لیتا ہوں اس کے بعد اس میں دودھ ڈال لیتا ہوں تو میں تو پانی میں دودھ ملاتا ہوں، دودھ میں پانی نہیں ملاتا۔ تو اس قسم کی احتیاط اور تاویل مہتممان انجمن و یتیم خانہ بھی کر لیا کرتے تھے مگر ایسی ہی احتیاط و تقویٰ کو عارف شیرازی فرماتے ہیں:

ترسم کہ صرفہ نہ برد روز باز خواست نان حلال شیخ ز آب حرام ما

(مجھے اس بات کا ڈر ہے کہ کہیں بروز قیامت ہمارا آب حرام شیخ کے نان حلال سے نہ بڑھ جائے)۔ حضرات! ایسے شریر متقین سے قیامت میں فساق و فجار ہزار درجہ بہتر ہونگے، خوب کہا ہے۔

گنہ آمرز رندان قدح خوار بطاعت گیر پیران ریاکار

(رندان شراب خوار کے گناہ بخشنے والے، ریاکار پیروں سے طاعت پر مواخذہ کرنے والے)

خدا بچائے فریب سے آج کل تو یہ بھی کمائی بنا رکھی ہے، بعض یتیموں نے خود کہا ہے کہ ہم تو بھوکے رہتے ہیں اور ہزاروں روپیہ معلوم نہیں کدھر کو چلا جاتا ہے، خوب سمجھ لیجئے مسئلہ، کہیں آپ اس دھوکہ میں نہ رہیں کہ ہم نے یتیموں کا کہاں کھایا ہے، ہم نے تو چندہ دینے والوں کا کھایا کیونکہ جیسا اوپر بیان ہوا ہے بعض صورتوں میں تو وہ حقیقتاً یتیموں کی ملکیت ہوگی اور بعض صورتوں میں گو نسبت مجازی ہوتی ہے مگر بعض مجازی نسبت بھی مؤثر ہوتی ہے۔

چنانچہ مجھے ایک قصہ یاد آیا کہ ایک بادشاہ نے اپنے وزیر سے کہا کہ کون قوم عقلمند ہے اور کون احمق، وزیر نے دونوں قوموں کا نام لیا جن کا میں اس وقت اعادہ کرنا دل شکنی کے خیال سے مناسب نہیں سمجھتا۔ خیر بادشاہ نے کہا امتحان کراؤ وزیر نے احمق قوم کے ایک فرد کو بلایا اور اس سے بادشاہ نے پوچھا میاں داڑھی بیچتے ہو وہ بہت برہم ہوا کیونکہ آج کل کا زمانہ نہ تھا کہ داڑھی حجام کو مفت دیتے ہیں اور بلکہ ایک آنہ پیسہ بھی دیتے ہیں، وزیر نے سمجھایا کہ خفا کیوں ہوتے ہو روپیہ ملے گا، اس سے تجارت کرنا داڑھی پھر نکل آئے گی، راضی ہوگیا، حجام کو بلا کر داڑھی مونڈ لی گئی اور ایک ہزار روپیہ داڑھی کی قیمت میں ان کے حوالے کر دیا۔ یہ روپیہ لے کر خوشی خوشی گھر پہنچے، وہاں بیوی نے لنڈ منڈ صورت دیکھ کر بہت لتاڑا، اب یہ لاکھ سمجھاتا ہے کہ ہزار روپیہ رکھ لو داڑھی دے دیجئے اور اپنا روپیہ لے لیجئے ہم نہیں بیچتے، انہوں نے کہا لیجئے۔ اس کے بعد ایک عقلمند بلایا گیا، اس سے پوچھا داڑھی بیچتے ہو، پہلے تو وہ بہت بگڑا پھر راضی ہوا، پوچھا کتنے کو؟ کہا دس ہزار روپیہ کو، نائی بلایا گیا، اس نے استرہ نکالا، کہنے لگا کہ ابھی ٹھہرو، اس کے بعد بادشاہ سے کہا کہ حضور یہ کس کی منڈتی ہے، اب یہ میری نہیں منڈتی کیونکہ روپیہ لینے کے بعد وہ آپ کی ہوگئی، اس لیے اب آپ کی منڈتی ہے اگر آپ کو منظور ہے تو بسم اللہ! اب بادشاہ بہت گھبرایا کہ یہ تو میری ہی داڑھی بنا کے منڈواتا ہے حکم دیا کہ اچھا بھئی اسے روپیہ دے دو اور داڑھی بھی مت مونڈو، دیکھئے یہ داڑھی بھی بچالے گیا اور روپیہ بھی لے گیا۔

مقصود یہ ہے کہ محض مجازی نسبت سے اس کی داڑھی میں احترام پیدا ہوگیا، بعض فقط بادشاہ کا نام لگنے سے داڑھی کی حرمت بڑھ گئی، یہاں بھی اسی طرح کہیں حقیقتاً کہیں مجازاً وہ مال یتامیٰ کا ہے اس لیے اب اگر کھاؤ گے تو یتیموں کا ہی کھاؤ گے تو دوسری صورت اموال یتامیٰ کے ظلماً

کھانے کی یہ تھی اور صحابہؓ کے وقت میں ان دونوں صورتوں کا پتہ بھی نہ تھا مگر پھر بھی صحابہؓ ڈر گئے، تھوڑے روز تک الگ انتظام رکھا، اس کے بعد جب نقصان ہونے لگا تو آ کر حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا۔ سبحان اللہ! کیا رحمت ہے حق جل وعلیٰ شانہ کی کہ جواب میں یہ نہیں فرمایا کہ یونہی کرنا پڑے گا۔ واللہ! ہماری اپنی مصیبت پر اتنی نظر نہیں جتنی ان کی ہے۔ واقعی ایک طرف شریعت کے احکام کو اور دوسری طرف واقعات کو دیکھ کر قدر ہوتی ہے، معاملات کی پیچیدہ صورتیں دیکھی جاویں اور ان کے احکام بھی دیکھے جاویں تو بے ساختہ زبان سے یہ نکلے گا۔

زفرق تابقدم ہر کجا کہ می نگرم کرشمہ دامن دل می کہ جا اینجا ست

(سر سے قدم تک جس جگہ دیکھتا ہوں کرشمہ دامن دل کھینچتا ہے کہ یہی جگہ محبوب کی ہے)

اس قدر دلفریب صورت نظر آئے گی کہ وجد کی سی کیفیت پیدا ہو جائے گی۔

طریق اصلاح

چنانچہ اسی مقام پر دیکھئے۔ "وَيَسْئَلُوْنَكَ عَنِ الْيَتٰمٰى" (آپ سے یتامیٰ کے بارے میں سوال کرتے ہیں) "قُلْ اِصْلَاحٌ لَّهُمْ خَيْرٌ" آپ ان کے سوال کے جواب میں کہہ دیجئے حقیقی جواب تو آگے آئے گا۔ پوچھا تو واقعہ جزئیہ، اس کے جواب میں پہلے ایک قاعدہ کلیہ بتاتے ہیں، نو پوچھا ایک بتائیں سو کہ شاید ادب کی وجہ سے بار بار نہ پوچھ سکیں اس لیے ایک قاعدہ کلیہ بتاتے ہیں کہ اسے یاد رکھیں، وہ یہ ہے۔ "اِصْلَاحٌ لَّهُمْ خَيْرٌ" (یعنی ان کے حال کی درستی کرنا) یہ ہے بڑی اچھی بات، آگے جواب ہے۔

وَاِنْ تُخَالِطُوْهُمْ فَاِخْوَانُكُمْ

(اگر تم ملا جلا لو تو وہ تمہارے بھائی ہیں) غیر نہیں ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ کچھ حرج نہیں مگر یہ قاعدہ کلیہ پیش نظر رہے۔ "اصلاح لهم" یہ کھانا ان کی مصلحت کے لئے ہو۔ "اصلاح لکم" نہ ہو یعنی تمہاری مصلحت کے لیے نہ ہو کیونکہ مخالطت میں دو مصلحتیں ہیں، ایک اپنی کہ اپنا کم ملایا ان کا زیادہ ملایا اور ایک ان کی مصلحت ہے کہ یوں بچا ہوا بگڑتا ہے اور اب ملا جلا کر کھا لو، اگلے وقت ان کی کم جنس سے لیں گے یا خود اپنی ہی جنس میں ان کو شریک کر لیں گے تو مخالطت کرو مگر ان کی مصلحت سے اپنی مصلحت سے نہیں۔ تو فرماتے ہیں اس طور پر مخالطت کر لو کہ تمہارے بھائی ہی ہیں۔ واقعی اگر اتنی بھی مخالطت نہ ہوگی تو آپس میں یکجہتی نہ ہوگی اور وہ بھی غیر سمجھ کر الگ تھلگ رہیں گے ان کی شفقت بھی ظاہر نہ ہوگی۔

بس دل میں حساب کتاب رہے کہ خود سمجھ رہے ہیں کہ یہ ان کی چیز ہے اور یہ ہماری ہے۔

اب ایک سوال باقی رہا تھا کہ نیت تو اصلاح کی ہے مگر اس طرح کرنے سے ممکن ہے کہ کچھ ان کا ہمارے ہاں صرف ہو جائے۔ شاید اس کا مواخذہ ہو، اس کا جواب ارشاد ہوتا ہے۔

وَ اللّٰہُ یَعْلَمُ الْمُفْسِدَ مِنَ الْمُصْلِحِ (یعنی خدا جانتا ہے مفسد اور مصلح کو)

مطلب یہ کہ کوڑی کوڑی کا حساب نہیں دیکھتے، صرف نیت دیکھتے ہیں، اگر نیت اصلاح کی ہے اور ان کا کچھ اپنے ذمہ صرف ہو گیا تو وہ معاف ہے، نیت تو کھلانے کی ہے اگر اس پر بھی کچھ کھالیا گیا تو وہ ہمارے یہاں معاف ہے اور اس قسم کے کھانے کی اجازت ہے۔

اللہ اکبر! کس قدر رعایتیں ہیں ایسی تعلیم تو کسی بڑے سے بڑے حکیم کی بھی نہیں ہو سکتی۔

حق یہ ہے کہ ذرا سے غور میں ہر شخص آسانی سے سمجھ سکتا ہے کہ یہ خدا کا کلام ہے، واقعات پیش آنے کے بعد ان احکام کی اچھی طرح قدر ہوتی ہے جیسے ایک اور مقام پر والدین کے حقوق کے ضمن میں فرمایا ہے: "لاتقل لهما اف" (یعنی انہیں ہوں بھی نہ کہو) "ولا تنهر هما" (انہیں مت جھڑکو) "الی قوله تعالٰی قل رب ارحمهما کما ربیانی صغیرا" (یعنی ان کے ساتھ کرم کرو، تواضع سے پیش آؤ ان کے حق میں دعا کرو)

باپ کے حقوق

اس کے آگے ایک غضب کا مضمون ہے ایک مولوی اور فقیہ اگر حقوق بیان کرنے پہ آئے تو والدین کے حقوق بیان کرے گا اور کوتاہی پر وعید کا ذکر کردے گا، باقی کوتاہی میں یہ توفیق کہ اسکے کسی مرتبہ کو قابل عفو قرار دے کر اس کی شرط عفو کو بھی بیان میں لاوے، سو یہاں تک بیان تو کیا، ذہن بھی نہ پہنچے گا، الغرض جہاں تک حقوق کا ذکر ہے یہاں تک ایک بڑے سے بڑے فقیہ کا کام ختم ہو گیا، آگے اس کے ذہن کی رسائی سے باہر ہے مگر قرآن میں بھی وہ یہ ارشاد ہے:

رَبُّکُمْ اَعْلَمُ بِمَا فِیْ نُفُوْسِکُمْ ط اِنْ تَکُوْنُوْا صٰلِحِیْنَ فَاِنَّهٗ کَانَ لِلْاَوَّابِیْنَ غَفُوْرًا (یعنی تمہارے خدا کو خوب معلوم ہے جو کچھ تمہارے دل میں ہے اگر تمہارے اندر صلاحیت ہے تو وہ رجوع ہونے والوں کے لیے غفور بھی ہیں)۔

اب واقعات میں غور کیجئے تو اس کا پتہ چلے گا کہ یہ کتنی دور کی بات فرمائی ہے۔ یہ کبھی تھکا

ماندہ جھنجھلایا ہوا ہوتا ہے اور ادھر والد بزرگوار کی بڑھاپے کی وجہ سے عقل ماری جاتی ہے اور اس سے ایک فضول اور لایعنی بکواس کا سلسلہ شروع ہو جاتا ہے کہ کیوں بیٹا یہ یوں ہے اس نے کہا جی ہاں پھر پوچھا یوں ہے کہا جی ہاں، غرض دو مرتبہ سیدھی طرح بتا دیا۔ تیسری مرتبہ کچھ جوانی کی حدت اور کچھ تھکن کی جھنجھلاہٹ کہ یہ تو دم ہی نہیں لینے دیتے، ذرا ترش لہجہ میں کہہ دیا کہ ابھی تو عرض کر چکا ہوں، آپ بار بار پوچھے جاتے ہیں حالانکہ ان کی حالت خود کسی وقت میں اس سے زیادہ بے عقلی کی باتیں کراتی تھی اور وہی باپ نہایت خندہ پیشانی سے جواب دیتا تھا۔

چنانچہ ایک بنئے کی حکایت ہے کہ ایک مرتبہ اس کے گھر میں کوا آ کر بیٹھا، اس کے چھوٹے بچے نے پوچھا ابا یہ کیا ہے اس نے کہا بیٹا کوا ہے، پھر پوچھا کیا ہے کہا کوا، یہاں تک کہ سو مرتبہ پوچھا اور وہ برابر کہتا رہا کوا ہے، تھا ہوشیار اس کو ایک بہی پر لکھتا گیا، اتفاق سے جب صاحبزادہ جوان ہوا اور ابا جان کے بڑھاپے کا زمانہ آیا اور کوا آ کر بیٹھا صاحبزادے سے پوچھا کہ بیٹا کیا ہے؟ پہلے ہی سوال پر اپنے دل میں کہنے لگے کہ اب یہ ایسے نابالغ ہو گئے کہ انہیں اس کی بھی خبر نہیں مگر خیر زبان سے کہہ دیا کوا ہے، پھر پوچھا تو کہا ابھی تو عرض کر چکا ہوں کہ کوا ہے، تیسری مرتبہ پھر پوچھا تو کہا کیا دماغ میں خبط ہو گیا ہے، بنئے نے کہا خفا نہ ہو اور بہی لے آیا اور دکھایا کہ تم نے تو سو مرتبہ پوچھا تھا مگر اپنے بوڑھے باپ کو پانچ مرتبہ نہ بتا سکے۔

الغرض بڑھاپے میں غریب باپ کی بری گت بنتی ہے اور اگر کہیں اتفاق سے اماں مر جاویں تو پھر باپ کو حکم ہوتا ہے کہ اپنا حقہ پانی سنبھال کر دہلیز کا پہرہ دو یعنی باہر ڈیوڑھی میں رہا کرو کیونکہ گھر میں جوان میاں بیوی رہتے ہیں، غرض بڑھاپے میں جوان بیٹے عجیب گت بناتے ہیں۔

ایک گاؤں کا قصہ یاد آ گیا کہ ایک بوڑھے کے ساتھ اس کے بیٹے برا سلوک کرتے تھے، وہ پورے طور پر اس کی خبر گیری بھی نہ کرتے تھے، اتفاق سے وہاں ایک مولوی صاحب کا گزر ہوا اور انہوں نے نماز کے لیے وعظ کہا، اس نے یہ خیال کیا کہ دنیا تو ہے خراب اب آخرت کیوں برباد ہو، لاؤ نماز ہی شروع کر دیں۔ اتفاق سے اس نے جس روز نماز شروع کی اسی روز بیٹے کی بھینس مر گئی، جاہل گنوار یہ سمجھے کہ نماز کے سبب یہ مر گئی، اب وہ باپ کے پاس آئے کہ بادا نماز نہ پڑھا کرو، اس نے کہا کہ میں اور کیا کروں، جب کھانے پینے کو نہ ملے تو میں اور کیا کام کروں، بیٹوں نے کہا اب تمہاری خبر گیری کریں گے۔ چنانچہ اس نے نماز چھوڑ دی اور خوب گھی، دودھ ملنے لگا،

اب تو یہ کیا ذرا تکلیف پہنچی اور اس نے دھمکی دینی شروع کی کہ لاؤ تو میرے وضو کا کلھڑا میں نماز پڑھوں گا، وہ پھر مارے ڈر کے ان کی خاطر کرنے لگتے۔ تو بعضے تو باپ کو اس نوبت تک پہنچا دیتے ہیں یہ تو صریح گناہ ہے اور بعض نیک دل ہوتے ہیں، دل میں شرارت نہیں ہوتی مگر پھر بھی آدمی ہی تو ہے، بعض حالتوں میں وہ اللہ والے کے سامنے بے ادبی کے کلمات کہہ بیٹھتا ہے تو باپ کی کیا حقیقت غرض منہ سے کوئی بات گستاخی کی نکل گئی اور فوراً خیال آیا کہ ارے مجھ سے کیا کوتاہی ہوئی، میں تو مرہی گیا جتنی خدمت کی تھی سب اکارت ہوگئی۔

بردل سالک ہزاراں غم بود　　　گر زباغ خلالے کم بود

(سالک کے دل میں ہزاروں رنج وغم صادر ہوتے ہیں مگر باطنی حالت میں ذرا کمی نہیں ہوتی)

نرمی کا برتاؤ

سالک کے باغ دل سے ایک تنکا بھی کم ہوجاوے تو بس اس کی موت ہے کہ میری پچاس برس کی خدمت ایک ذراسی کوتاہی میں جاتی رہی حق جل وعلیٰ شانہ اس کا دل تھامتے ہیں اور اس کا قانون بتاتے ہیں۔ رَبُّكُمْ اَعْلَمُ بِمَا فِيْ نُفُوْسِكُمْ (یعنی تمہارے خدا کو خوب معلوم ہے جو کچھ تمہارے دلوں کے اندر ہے) مطلب یہ ہے کہ ایک کوتاہی پر نظر نہیں کرتے وہ تو نیت کو دیکھتے ہیں۔

مابروں را ننگریم وقال را　　　ما دروں را بنگریم وحال را

ناظر قلبیم اگر خاشع بود　　　گرچہ گفت لفظ ناخاضع بود

(ہم ظاہری الفاظ کو نہیں دیکھتے بلکہ ہم باطنی دل کے حال کو دیکھتے ہیں، ہم دل کو دیکھتے کہ اس میں خشوع ہے اگرچہ الفاظ پرشکوہ نہ ہوں)

گو ظاہر میں بے ادبی ہوگئی مگر دل میں تو بے ادبی نہیں۔ "اِنْ تَكُوْنُوْا صٰلِحِيْنَ" اگر تم میں صلاحیت ہے تو " فَاِنَّهٗ كَانَ لِلْاَوَّابِيْنَ غَفُوْرًا" (پس وہ اس کی طرف رجوع کرنے والوں کو بخشنے والا ہے) خدا کے یہاں مغفرت کا بھی قانون ہے تم پریشان مت ہو۔

اللہ اکبر! اتنی دلداری، اس قدر دلجوئی، اتنی شفقت دنیا کا حکم نہیں کرسکتا، تعزیرات میں کہیں ایسی دفعہ نہ ملے گی کہ اگر مجرم کی نیت اچھی ہو تو اسے چھوڑ دو، گو حکام بعض وقت چھوڑ دیتے ہیں مگر قانون نہیں ہے، یہ خدا ہی کا قانون ہے یہ کسی سلطان کا قانون نہیں بلکہ سلطان السلاطین کا قانون ہے۔ یہ ملک دار کا قانون نہیں بلکہ دلدار کا قانون ہے۔

اس میں ایک راز ہے جسے شیوخ خوب سمجھتے ہیں وہ یہ کہ شدت سے اطاعت کی ہمت ٹوٹ جاتی ہے جیسے آج کل کے خشک علماء کیا کرتے ہیں کہ ذرا ذرا سی باتوں پر تکفیر کر بیٹھتے ہیں، میں تو کہتا ہوں کہ ان لوگوں کو سوائے اس کے کوئی کام نہیں، گویا ایک کفر کا ہائیکورٹ بنالیا ہے اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ آدمی بعض وقت بھڑک اٹھتا ہے کہ دین کا کام کرنا بہت مشکل ہے، اتنی دور پہنچ کر بھی آدمی کو یہ حاصل نہیں ہوتا تو لاؤ پھر چھوڑ دو کوئی اور کام کرو، تو یہ خشک علماء اس کی مصلحت سے بالکل ہی ناواقف ہیں۔ البتہ جو علماء محقق ہیں اور صوفی بھی ہیں وہ جانتے ہیں۔

چنانچہ ایک حکایت ہے کہ ایک چور ایک بزرگ کا مرید ہوا، انہوں نے اسے چوری سے توبہ کرائی اور اسے خانقاہ میں رکھا،اب جب پچھلی رات آتی اور خانقاہ والے ذکر شغل کرنے کے لئے اٹھتے یہ بھی اٹھتا اور اس کا نفس اسے چوری کے لیے برانگیختہ کرتا اور یہ اسے روکتا جب کسی طرح نہ رکتا تو یہ کیا کرتا کہ خانقاہ والوں کے جوتے ادھر ادھر کر دیتا، کسی کے جوتے کا ٹھکانہ بدل دیا، کسی کے ساتھ ایک پوانی دوسرے کی لگا دی، غرض اس سے لوگوں کو بہت پریشانی ہوتی، آپس میں انہوں نے کہا بھئی پہرہ دو اور پتہ لگاؤ کہ کون ایسا کرتا ہے۔ چنانچہ کچھ لوگ گھات میں رہے، یہ حضرت اٹھے اور معمول کے موافق وہی حرکت پھر شروع کی، پکڑے گئے اور صبح کو پیر صاحب کی خدمت میں انہیں پیش کیا۔ انہوں نے پوچھا کہ کیوں میاں تم خانقاہ والوں کو پریشان کیا کرتے ہو۔ حالانکہ ایسی حرکتوں سے توبہ کر چکے ہو، کہا سنئے صاحب! میں نے چوری سے توبہ تو کر لی ہے ہیرا پھیری سے نہیں کی، آخیر رات کو نفس ستاتا ہے تو میں اس کی تسلی کے لئے ہیرا پھیری کر لیتا ہوں، اگر آپ اس سے منع کریں گے تو پھر چوری میں مبتلا ہو جاؤں گا، شیخ اس مرض کو سمجھ گئے اور اجازت دیدی کہ تمہیں یہ ہیرا پھیری معاف ہے تو صوفیاء علماء اسے سمجھتے ہیں اور خشک عالم نہیں سمجھتا۔

ایک شخص افیون چھوڑ کر تمبا کو کھانے لگے اگر اس کا تمبا کو بھی چھڑا دو گے تو پھر افیون کھانے لگے گا، بہر حال نرمی کی ضرورت ہے جسے محقق شیخ ہی خوب سمجھ سکتا ہے۔ پس جو حاصل ہے ”اِنْ تَکُوْنُوْا صٰلِحِیْنَ“ کا ایسا ہی حاصل ہے۔ ”وَ اللّٰہُ یَعْلَمُ الْمُفْسِدَ مِنَ الْمُصْلِحِ“ (یعنی خدا جانتا ہے مفسد اور مصلح کو) کا پس حق جل وعلیٰ شانہٗ بھی بے انتہا نرمی کا برتاؤ فرماتے ہیں۔

جامعیت کلام الٰہی

چنانچہ اس مقام میں بھی آگے ارشاد ہے ”وَلَوْشَآءَ اللّٰہُ لَاَ عْنَتَکُمْ“ اور اگر خدا کو منظور

ہوتا تو تمہیں خوب مشقت میں ڈالتے۔ یعنی مخالطت کی اجازت ہی نہ دیتے اور حفاظت اموال کا امر فرماتے، تو ظاہر ہے بے انتہا مشقت ہوتی، اس میں دو دعوے ہیں ایک تو یہ کہ اسے مشقت میں نہیں ڈالا، آگے دونوں کی دلیل علی الترتیب فرماتے ہیں۔ "اِنَّ اللّٰهَ عَزِيْزٌ حَكِيْمٌ" (بے شک اللہ غالب ہے حکمت والا ہے، غالب ہے اس لیے کہ مشقت ڈالنے کی قدرت ہے، حکمت والا ہے دانا ہے اس لیے کہ مشقت میں ڈالنا مناسب نہیں سمجھا)

یہ ان آیات کا ترجمہ ہے اور اس ترجمہ سے مفصل مضمون معلوم ہو گیا ہوگا۔ اس وقت مجھے "قُلْ اِصْلَاحٌ لَّهُمْ خَيْرٌ" کے متعلق بیان کرنا ہے۔ پہلی بات تو یہ ہے کہ یہاں اصلاح جو مبتداء ہے نکرہ ہے اور خیر جو خبر ہے وہ بھی نکرہ ہے مگر خبر میں اصل نکارت ہی ہے اور مبتداء میں اصل تعریف ہے کیونکہ مثلاً رجل جاء نی (ایک آدمی میرے پاس آیا) کہنے سے مخاطب کو کوئی نفع نہیں ہوتا تاوقتیکہ رجل کی تعریف یا تخصیص نہ کر دی جاوے، اس لیے مبتداء کا معرفہ ہونا یا کسی صفت یا ظرف کے ساتھ مقید ہو کر اس میں تخصیص ہونا ضروری ہے۔ یہاں پر اصلاح اگرچہ نکرہ ہے مگر لھم کی قید نے اسے مبتداء بننے کے قابل کر دیا اور یہاں معرفہ بھی فرما سکتے تھے۔ یعنی "اصلاح لھم اصلاحھم" مگر نکرہ ہی لائے۔ اس میں نکتہ یہ ہے کہ اصلاح کی تنوین تقلیل کی ہے کہ اگر تھوڑی بھی اصلاح ہو تب ہی خیر ہے اس سے معلوم ہوا کہ یہ اصلاح کتنا بڑا حق ہے اور اس کے لیے کس قدر اہتمام کی ضرورت ہے۔ آگے فرماتے ہیں خیر یہ "افعل تفضیل" کا صیغہ ہے۔ مبتداء میں تقلیل اور خبر میں تکثیر سبحان اللہ! کیا رعایت ہے یعنی تھوڑی بھی اصلاح بہت بہتر ہے اور اس کا اتنا اجر ہے کہ ہزاروں عبادتوں سے بڑھ کر ہے۔ سبحان اللہ!

یوں تو یتامیٰ پر توجہ کے لیے بہت مضامین ہیں مگر اس چھوٹے سے جملہ کا نظیر نہیں اور کوئی نظیر کہاں سے لائے۔ نہ وہ خدا ہوگا نہ ایسے جملے لا سکے گا اور پھر یہ تو مجھ کو علم کی سمجھ میں آ گیا اور جو واقعی علماء ہوئے ہیں انہوں نے خدا جانے کیا سمجھا ہوگا۔ واقعی قرآن عجیب چیز ہے۔

چیست قرآن اے کلام حق شناس — رونمائے رب ناس آمد بناس

حرف حرفش راست در بر معنے — معنے در معنے در معنے

(اے کلام حق کو پہچاننے والے یہ قرآن کیا ہے، یہ تو لوگوں کیلئے لوگوں کے رب کی رونمائی ہے، اس کا حرف حرف سچ ہے اور معنی سے لبریز ہے، اس کے معنوں کے اندر معنی مضمر ہیں)

اور ایک بزرگ فرماتے ہیں

مخدرات سراپردہ ہائے قرآنی | چہ دلبر ند کہ دل می برند پنہانی

یہ ہیں قرآن کے علوم "اِصْلَاحٌ لَّهُمْ خَيْرٌ" (ان کے لئے بھلائی ہے) کیا عجیب و غریب جملہ ہے اور کتنا بڑا اہتمام ہے کہ اصلاح کو نکرہ لائے جس سے اصلاح کی تعین نہ رہی تو اصلاح کی جونسی قسم خواہ چھوٹی ہو یا بڑی، خواہ جسمانی، خواہ روحانی سب کی خیریت حق تعالیٰ نے بیان فرمادی ہے۔ "اِصْلَاحٌ لَّهُمْ" بالکل عام ہے اس میں نہ قید ہے بدن کی، نہ روح کی بلکہ یہ دونوں کی جامع ہے۔ سبحان اللہ! جیسے وہ خود جمیع صفات کمالیہ کے جامع ہیں ویسا ہی ان کا کلام بھی کیا جامع ہے اس لیے نام نہیں لیا کسی خاص اصلاح کا۔

آداب یتامیٰ

اب اصلاحات کی فہرست سنئے۔ من جملہ ان اصلاحات کے ایک بدن کی ہے کہ انہیں کھلایا جاوے، پلایا جاوے، سردی گرمی سے بچایا جاوے مگر اس کھلانے پلانے کے آداب کا خیال رکھا جاوے۔ "وَيُطْعِمُوْنَ الطَّعَامَ عَلٰى حُبِّهٖ مِسْكِيْنًا وَّيَتِيْمًا وَّاَسِيْرًا" (وہ اس اللہ تعالیٰ کی رضا کے لیے مسکین، یتیم اور قیدی کو کھانا کھلاتے ہیں) میں اسی کھلانے پلانے کا ادب بیان کیا گیا ہے۔ بعض ادب تو علی حبہ میں ہیں اس طرح سے کہ اس کی ضمیر میں کئی احتمال ہیں یا تو اس کا مرجع حق تعالیٰ ہے تو مطلب یہ ہے کہ کیوں کھلاتے ہیں؟ حق تعالیٰ کی محبت کی وجہ سے کھلاتے ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ کھلانے پلانے میں ناموری یا تفاخر مقصود نہیں ہوتا بلکہ محض خدا کی محبت اس کا سبب ہے سو یہ بھی ادب ہے جس کا حاصل اخلاص ہے۔

دوسرا احتمال یہ ہے کہ اس کا مرجع الطعام ہو۔ اس وقت یہ معنی ہوں گے کہ کھانا کھلاتے ہیں باوجود اس کھانے کے محبوب و مرغوب ہونے کے حاصل یہ ہے کہ بچا کھچا گرا پڑا جو بالکل اپنے کام نہ آسکے نہیں کھلاتے بلکہ خود کو بھی مرغوب ہے اور اسکے حاجت مند بھی ہیں وہ کھلاتے ہیں، یہ نہیں کہ کھانا خراب ہو گیا لاؤ یتیم کو دے دیں، مؤذن کو دے دیں۔

جیسے ایک حکایت ہے کہ ایک عورت نے کھیر پکا کر رکھی، کتے نے منہ ڈال دیا تو ایک مٹی کے طباق میں کر کے لڑکے کے حوالے کی یہ مؤذن کو دے آ، لڑکا لے گیا تو وہ اتفاق سے ان سے

پڑھتا بھی تھا، حریص تو تھے جھٹ ایک منہ مار ہی تو دیا اور جس طرف سے کھایا ہوا تھا اسی طرف سے ہاتھ مارا، لڑکے نے کہا کہ ملا جی ادھر سے نہ کھایئے، کہا کیوں، کہا ادھر کتے نے منہ ڈال دیا ہے، یہ سنتے ہی طباق اٹھا کر زمین پر دے مارا، وہ لڑکا رونے لگا، پوچھا روتا کیوں ہے، کہا اماں ماریں گی کہ بھیا کے پاخانہ اٹھانے کا برتن توڑ دیا۔

سبحان اللہ! کیا ظرف ہے اور کیا مظروف ہے، یہ قدر ہے مؤذن کی، واقعی یتیموں، مؤذنوں، طالب علموں اور ملاؤں کو لوگ بہت ہی ذلیل سمجھتے ہیں تو اے حضرات! خوب سن لیجئے۔ اس آیت سے معلوم ہو گیا کہ وہ کھانا دینا چاہیے جسے دینے کو جی میں بھی چاہتا ہو یہ نہیں کہ جو لامحالہ پھینکنا پڑے گا وہ دے دیا، یہ دونوں احتمال تو منقول تھے۔

ایک تیسرا احتمال جو میری سمجھ میں آیا ہے اور کہیں منقول نہیں دیکھا یہ ہے کہ جملہ کی ترتیب یہ ہے سب سے پہلے فعل اور اس کے بعد فاعل پھر مفعول بہ اور اس کے بعد ظرف وغیرہ ہوتا ہے۔ یہاں الطعام کو تو جو مفعول بہ اول ہے، موافق قاعدہ کے مقدم کیا، اس کے بعد علی حبہ لائے پھر "مِسْكِيْنًا وَّ يَتِيْمًا وَّاَسِيْرًا" کو لائے جو معطوف علیہ، سب مل کر مفعول بہ ثانی ہے اور اس وجہ سے اسے علی حبہ پر لفظاً سہی مگر معناً تقدم حاصل ہے اور اب علی حبہ کی ضمیر بہ تاویل کل واحد کے ان کی طرف پھر سکتی ہے اور اب اضمار قبل الذکر کا اشکال بھی نہیں رہا کیونکہ اضمار قبل الذکر وہ ناجائز ہے جو لفظاً اور رتبتہ ہو یہاں اگرچہ لفظاً ہے مگر رتبتہ اضمار قبل الذکر نہیں ہے اب معنی یہ ہوئے کہ ان کو جو کھلاتے ہیں ان کی محبت کر کے کھلاتے ہیں تو تیسرا ادب یہ ہوا کہ انہیں محبت و شفقت سے کھلائے۔ غرض پہلا ادب یہ ہوا کہ خدا کی محبت کی وجہ سے کھلاؤ، ناموری، شہرت اور تفاخر کی نیت سے نہ کھلاؤ۔ دوسرا یہ ہوا کہ عمدہ کھانا کھلاؤ۔ تیسرا ادب یہ ہوا کہ محبت اور شفقت سے کھلاؤ۔ یہ نہیں کہ کھلا پلا کے اور دے کے ان سے شکریہ کے متوقع ہو۔ اے خدمت کرنے والو! مصارف خیر میں رقم دے کر کسی سے متوقع شکریہ کے مت ہو، اگر تم نے توقع شکریہ کی رکھی تو یاد رکھو اس کا حق ادا نہ کیا کیونکہ دینے والے کا ادب تو یہ ہے۔

لَا نُرِيْدُ مِنْكُمْ جَزَآءً وَّلَا شُكُوْرًا. (کہ ہم جو کچھ دیتے ہیں تم سے اس کا اجر اور شکریہ نہیں چاہتے) اور اے مہتممان یتیم خانہ و مدارس و انجمن تم بھی کسی کا شکریہ ادا نہ کرو کیونکہ شکریہ تو اسے ادا کرنا چاہیے جس کے ساتھ احسان کیا جائے۔

"من لم يشكر الناس لم يشكر الله."

(سنن الترمذی: ۱۹۵۵، للطبرانی ۲: ۴۰۸، الدار المنثور ۶: ۳۶۲، مشکوۃ: ۳۰۲۵)
(جو لوگوں کا شکر گزار نہیں وہ اللہ تعالیٰ کا بھی شکر گزار نہیں)

کا مطلب یہی ہے کہ اگر ہو سکے تو احسان کی مکافات کرو، اگر استطاعت نہ ہو مکافات دعا اور تعریف سے کر دو اور یہی شکریہ ہے مگر یہ شکریہ خواہ مکافات کے طور پر ہو یا دعا و تعریف کے طور پر اس شخص کے ذمہ ہے جس کے ساتھ احسان کیا جائے بلکہ تمہارے شکریہ سے تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ تم یہ سمجھتے ہو کہ تمہیں دیا ہے اس سے ایک فہیم شخص کی حوصلہ افزائی کے بدلے اسے بدظنی کا موقع مل سکتا ہے کہ شکریہ ادا کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ خود کھا جائیں گے بلکہ بجائے آپ کے انہیں آپ کا شکریہ ادا کرنا چاہیے کیونکہ ایک کام میں جو انہیں کرنا چاہیے تھا، آپ ان کا ہاتھ بٹا رہے ہیں، مال کا موقع پر صرف کرنا حساب کتاب کو مرتب کرنا جھگڑے اور دشواری کے کام ہیں جنہیں بجائے ان کے آپ نے اپنا ذمہ لیا ہے اس لیے آپ کا ممنون ہونا چاہیے نہ یہ کہ آپ ان کا الٹا شکریہ ادا کریں۔

مدرسہ دیوبند کے ایک جلسہ میں جو موتمر الانصار کی طرف سے میرٹھ میں منعقد ہوا تھا، میں بھی تھا، وعظ میں میں نے کہا اگر چندہ شکریہ کے لیے دیتے ہو تو جیب میں رکھو کیونکہ تمہارے چندہ سے ہمیں کیا فائدہ، وہ تو جس کام کے لئے تم دیتے ہو اس میں صرف کر دیا جائے گا، کچھ ہمیں تھوڑا ہی مل جائے گا جو ہم شکریہ ادا کریں گے بلکہ ہمارے شکریہ ادا کرنے سے ممکن ہے آپ کو شبہ پیدا ہو کہ شاید یہ خود کھا جائیں گے۔

اس شکریہ پر مجھے ایک حکایت یاد آئی۔ ایک شاعر تو غلام امام شہید گزرے ہیں اور ایک شہیدی، شہیدی ان سے پہلے گزرے ہیں اور کلام بھی ان کا اچھا ہے۔ ایک مرتبہ شہید کان پور میں آئے، مشاعرہ ہوا، انہوں نے غزل پڑھی، بہت داد دی گئی، اس کے بعد لوگوں نے شرارت سے ان کے شرمندہ کرنے کے باہم مشورہ کیا کہ ایک تو شہیدی کی غزلیں پڑھے اور دوسرے معمول کے موافق خوب داد دیں اور ان کے اشعار سے زیادہ داد دیں مگر انہوں نے یہ حرکت کی کہ جب کوئی داد دیتا آپ اس کی طرف متوجہ ہو کر کہتے تسلیمات! تسلیمات! لوگوں نے کہا یہ کیا، آپ کس بات کا شکریہ ادا کرتے ہیں، کہنے لگے کہ آخر میری بیوی ہی کی تو غزلیں ہیں دیکھو! شہید اور شہیدی یعنی بقاعدہ اردو یائے تانیث ہے، لوگ ان کے اس لطیفہ سے بہت ہی شرمندہ ہوئے۔

تو جیسے ان کی تسلیمات تسلیمات کی بنا یہ تھی کہ من وجہ یہ اشعار اپنے سمجھتے ہیں۔ اسی طرح یہاں بھی اسی بناء پر یہ شبہ ہو سکتا ہے کہ پرائے مال کو یہ سمجھتا ہے کہ گویا مجھ کو دیئے جانے سے میرا

ہو گیا، جب تو شکریہ ادا کرتا ہے تو صاحب ایسے مہتمم کو تو بدل دینا چاہیے جو چندہ کے مال کو اپنا سمجھے کیونکہ اس کا شکریہ گویا نوٹس ہے کہ میں خود کھاؤں گا۔

اگر آپ یہ کہیں کہ ہمارا کچھ خرچ نہیں ہوتا اور شکریہ سے دینے والے کا حوصلہ بڑھ جاتا ہے تو میں کہوں گا آپ روزہ رکھنے والوں اور نماز پڑھنے والوں کا کیوں نہیں شکریہ ادا کرتے حالانکہ جس طرح وہ عبادت ہے اسی طرح یہ بھی عبادت ہے جس طرح وہاں حوصلہ افزائی کی ضرورت ہے یہاں بھی ہے مگر وہاں تو آپ کہیں گے کہ نماز پڑھی یا روزہ رکھا تو اپنے لئے ہمیں کیا فائدہ یہی جواب میں یہاں کے لیے کہوں گا کہ چندہ دیا اپنے لئے تمہارا کیا بھلا کیا، واللہ! مجھے تو شکریہ سے غیرت آتی ہے، غایت ما فی الباب میری رائے عرف و مصلحت کے خلاف ہے مگر میں یہ کہوں گا کہ ہمارے مضامین تو حقیقت کے موافق ہیں ہم عرف کو نہیں جانتے ہیں۔

گرچہ بدنامی ست نزد عاقلاں مانمے خواہیم ننگ ونام را

(اگر چہ یہ عقلمندوں کے نزدیک بدنامی ہے لیکن ہم ننگ ونام کے سوا کچھ نہیں چاہتے)

جو کچھ ہم کہتے ہیں یہ دیکھ لیجئے کہ منقول بھی ہے یا غیر منقول، اگر منقول ہے تو وہ معقول بھی ہے کیونکہ شریعت کے احکام عقل کے خلاف نہیں ہیں، خلاصہ یہ کہ "لَا نُرِیْدُ مِنْکُمْ جَزَآءً وَّلَا شُکُوْرًا" دینے والوں کو تو شکریہ کی توقع نہ رکھنی چاہیے البتہ لینے والوں کو جب انہیں دیا جاوے شکریہ ادا کرنا چاہیے۔ غرض ایک اصلاح تو یہ ہے کہ انہیں کھانے پینے کو دو اور قدر و منزلت کے ساتھ دو، تقریبات میں جس طرح اپنے عزیزوں کو کھلاتے ہو اسی طرح ان کو بھی کھلانا چاہیے لیکن میری رائے میں کھانے کے لئے انہیں گھر پر نہیں بلانا چاہیے بلکہ انہی کے ٹھکانے پر کھانا بھیج دینا چاہیے کیونکہ آج کل لوگ انہیں ذلیل سمجھتے ہیں اور ان کی جماعت پر طرح طرح کے آوازے کستے ہیں۔

جب میں جامع العلوم میں تھا ایک بزرگ میرے یہاں مہمان تھے، رام نارائن کے بازار کے ایک غریب مسلمان حلوائی نے میری اور میرے مہمان کی اور دو ایک طالب علموں کی دعوت کی تھی تو ہم سب جارہے تھے ایک گلی میں پہنچے تو ایک صاحب نے جنہوں نے مجھے نہیں دیکھا ورنہ ضرور لحاظ کرتے، بس اور ساتھیوں کو دیکھ کر کیا کہتے ہیں کہ خدا خیر کرے نہ معلوم آج کس کے گھر پر چڑھائی ہے، مجھے یہ فقرہ سن کر بہت ناگوار ہوا، جی میں آیا کہ لوٹ جاؤں، پھر خیال ہوا کہ "لَا تَزِرُ وَازِرَۃٌ وِّزْرَ اُخْرٰی" بلانے والے کا اس میں کیا قصور ہے جو اسے سزا دی جائے خیر جب میں

لوٹ کر آیا تو میں نے مدرسہ کے سرپرستوں کو جمع کر کے یہ واقعہ بیان کیا اور یہ مشورہ دیا کہ یہ قانون مقرر کر دو کہ جس کو طلبہ کی دعوت کرنا ہو مدرسہ میں ہی کھانا بھیجے، طلبہ کہیں نہ جائیں گے، بلا سے دعوتیں کم ہوں گی مگر ذلت تو نہ ہوگی چنانچہ یہ قاعدہ جب ہی سے چلا آتا ہے۔ اسی طرح میرا دل نہیں کرتا کہ یتیموں کی ذلت ہو ان کی عزت کی بھی اور راحت کی بھی، سب مستحقین سے زیادہ ضرورت ہے کیونکہ اور مستحقین تو اپنے حقوق کا اظہار کر کے مطالبہ بھی کر سکتے ہیں اور یہ بچے ہیں انہیں نہ اظہار کا سلیقہ نہ مطالبہ کی ہمت، اس لیے یہ اپنا حق بھی وصول نہیں کر سکتے پھر اوروں کے ساتھ تو اگر کوئی بے اعتنائی کرے تو وہ دوسری جگہ چلے جائیں گے اور یہ سوا اس کے رولیں اور کیا چارہ ہے۔

بلرزد ہمی چوں بگرید یتیم　　　　الا تا نگرید کہ عرش عظیم

(دیکھو خبردار ہو کہ یتیم روتا ہے تو عرش عظیم کانپ اٹھتا ہے) اگر کوئی طالب علم کے ساتھ بے اعتنائی کرے تو وہ یہ جانتا ہے کہ کانپور میں نہ رہیں گے، سہارنپور چلے جائیں گے، سہارنپور میں گزر نہ ہوگا، دیوبند چلے جائیں گے غرض بہت سے ٹھکانے ہیں مگر یہ غریب کہاں جائے گا کیونکہ بچہ ہے، ہاں بالغ ہو تو وہ یتیم ہی نہیں۔

جیسے ایک داڑھی مونچھ والے طالب علم میرے پاس آئے تھے کہ میں یتیم ہوں اور ان کے اس مضحکہ میں وہ اہل ضابطہ بھی شریک ہیں جنہوں نے بلوغ کی ابتدائی حد اٹھارہ یا انیس سال رکھی ہے اس حساب سے تو بعض اوقات باپ بن جائے گا اور نابالغ ہی رہے گا تو ایسے ضابطہ کا نابالغ یتیم نہیں یتیم تو وہی ہے جو واقعی نابالغ ہو اور اس کا باپ مر جائے۔ بہر حال یہ زیادہ قابل رعایت ہے اور وہ رعایت صرف یہی نہیں کہ چندہ دے دیا اور سبکدوش ہو گئے، ان کو اپنی تقریبات میں بھی مدعو کرو اور ان کے ٹھکانے پر کھانا بھیجو اور بہت اچھی صورت یہ ہے کہ کھانا بھی بھیجو اور خود بھی وہاں کھلانے کے لئے جاؤ تا کہ ان کا کھلنا بھی دیکھو۔

ایک عورت کا ذکر ہے کہ وہ اپنے بچے کو تو پیدل چلاتی تھی اور سوتیلے بچہ کو گود میں لیے لیے پھرتی تھی، لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ کیسی شفقت اور ہمدردی ہے اس کے مزاج میں، خود اس سے پوچھا تو کہنے لگی کہ اسے اس لیے گود میں رکھتی ہوں کہ اس کا چلنا، پھرنا، کھیلنا، کودنا مجھے ناگوار ہوتا ہے، جب اسے کھیلتا دیکھتی ہوں تو آگ لگ جاتی ہے اور یہ بھی مطلب ہے کہ یہ گود میں چڑھے چڑھے آرام طلب اور کاہل بن جائے اور اس کے پیروں میں قوت نہ پیدا ہونے پائے، بظاہر شفقت تھی اور بباطن عداوت تھی۔

دشمن راچہ دوستانہ گویدت | دام داں گرچہ زدانہ گویدت
زانکہ صیاد آورد بانگ صفیر | تا کہ گیرد مرغ را آں مرغ گیر

(دشمن اگر تم سے دوستانہ کے طور پر کوئی بات کہے تو اس کو جال ہی سمجھو، اگر چہ دانہ کی بات کہے لیکن اس کو مکروہ حیلہ سمجھو، جب شکاری میٹھی آواز نکالتا ہے تا کہ مرغ والے سے مرغ حاصل کرے)

تو یہ بھی محبت کا اقتضا ہے کہ اپنے بچوں کا چلنا پھرنا، کھیلنا کودنا اچھا معلوم ہوتا ہے بلکہ کھیلتے کودتے دیکھ کے بھی پیار آتا ہے اور ان سے محبت بڑھتی ہے تو خود جانے میں یہ منظر بھی دیکھنے میں آئے گا، کوئی کھیلتا ہے کوئی کھاتا ہے، کوئی چھینتا۔

تربیت یتامیٰ

ایک ہے اصلاح فی المال یعنی اس کا بھی انتظام کرنا چاہیے کہ وہ آئندہ اپنی بسر اوقات میں کسی کے دست نگر نہ رہیں اس کے لئے انہیں کچھ صنعتیں سکھا دینی چاہئیں تا کہ وہ یتیم خانہ سے نکل کر بھیک نہ مانگیں اور ایسا نہ ہونا چاہیے کہ تقریریں اور نظمیں سکھلا دیں، یہ طریقہ بہت مضر ہے اس کے لیے یہ قانون مقرر کر دینا چاہیے کہ جو کم از کم جلالین اور مشکوٰۃ شریف پڑھے اسے تقریر سکھلائی جاوے اور اس سے پہلے تقریر سکھانے میں بڑا ضرر ہے۔ یہ کہ اگر علم میں ادھورہ رہ گیا تو لوگوں کی خواہش کے موافق تقریریں کر کے کما کھائے گا جس سے سخت گمراہی پھیلے گی، ہاں تفسیر و حدیث پڑھے تو اگر چہ وہ کامل الاستعداد نہ ہو مگر اسے حق تو ہے تقریر کا اور جو شخص تفسیر حدیث نہیں جانتا اسے تو حق ہی نہیں۔ اگر اس حالت میں انہیں تقریر سکھا دی گئی یا نظمیں یاد کرا دی گئیں تو پھر ان سے محنت نہیں ہوگی بلکہ مولود شریف اور معراج شریف پر نذرانے ٹھہرا ٹھہرا کر کمائیں گے اور کھائیں گے۔ میں نے سنا تھا کہ قصبہ بوڑھانے میں ایک واعظ صاحب آئے تھے جو آٹھ آنے سے لے کر پانچ روپیہ تک کا وعظ کہتے تھے، میں نے کہا کسی نے ان کے دونوں وعظ سنے بھی ہیں کہ کیونکر یہ فرق ہوتا ہے، ایک شخص نے کہا کہ میں نے دونوں وعظ سنے ہیں، ایک بھٹیارے نے ایک مرتبہ آٹھ آنے والا وعظ کرایا تھا تو بہت ہی دھیمی آواز میں اور نہایت مختصر بیان میں ختم کر دیا، نہ شعر پڑھے نہ روئے، اس نے کہا مولوی جی! تھوڑا سا اور کہہ دو تو کہتے ہیں کہ کیا تو آٹھ آنے میں جان لے گا اور جو پانچ روپیہ والا وعظ تھا اس میں خوب چلا چلا کر شعر بھی پڑھے اور روئے بھی، غرض بغیر علم کے تقریر اور نظمیں سکھلانے کا یہ اثر ہوتا ہے۔

زیاں می کند مرد تفسیر دان　　　کہ علم و ہنر می فروشد بنان

(تفسیر جاننے والا مرد اپنا نقصان کرتا ہے کہ اپنا علم وعمل فقط نان کے بدلے بیچ ڈالتا ہے)

لیکن خود اگر جائیے تو محض تماشا ہی دیکھتے جائیے اور مہتمم کے اختیارات میں دخل نہ دیجئے جو کچھ بھیجئے اسے مہتمم کے سپرد کر دیجئے کہ وہ جس طرح مناسب سمجھے تقسیم کرے۔ اگر کوئی کہے کہ یہ تو تماشا دیکھنے کی تعلیم دیتے ہیں، میں کہتا ہوں کہ حدیث میں ہے کہ ایک صحابی نے اپنے دل کے سخت ہونے کی شکایت کی تو جناب رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا یتیموں کے سر پر ہاتھ پھیرا کرو تو دل نرم ہو جائے گا کیونکہ جس قلب میں قساوت ہے وہ خدا سے دور ہے اس کا علاج بتاتے ہیں۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کہ یتیموں کے سر پر ہاتھ پھیرا کرو، مطلب یہ کہ ان کی سرپرستی کرو جس کا حاصل ترحم وہمدردی ہے۔ سبحان اللہ! حضور صلی اللہ علیہ وسلم کیسے شفیق ہیں، کتنی سہل ترکیب بتادی کہ یتیموں کے سر پر ہاتھ پھیرو، دل نرم ہو جائے گا۔

تو یہ تماشا نام کا ہے ورنہ واقعہ میں ہمدردی کی ترکیب ہے، الغرض اس طرح قدر سے کھلانا چاہیے، ہاں اور سنئے! تقریبات کے علاوہ بھی کوئی اچھی چیز پکا کرے تو بھیج دیا کرو اور اگر محض تقریبات ہی پر اکتفا کروئے تو یہ ان کے اعتبار سے تبعیدات ہو جائیں گی اور یہ خیال نہ کرو کہ چیز تھوڑی ہے اگر تمہارے بہت سے بچے ہوں اور چیز تھوڑی ہو تو آخر بانٹو گے۔ اسی طرح ان کا بھی حصہ لگاؤ، اب مہتمم کو اگر تھوڑی چیز تقسیم کرنے میں دقت ہو تو باری مقرر کر دے۔

اسی طرح محض چندہ اور کھانے ہی پر اکتفا نہ کرو بلکہ یہ التزام بھی کر لو کہ جب اپنے بچوں کے کپڑے بنائے تو کم از کم ایک جوڑا ان کے لئے بھی بنا دیا، اگر ایسا ہونے لگے تو یتامیٰ کو کافی امداد پہنچ جائے۔ مثلاً یہاں سے چار پانچ جوڑے روزانہ بننے کا اوسط ہو گا۔ اس حساب سے اگر ایک جوڑا روز کے اوسط سے یتیم خانہ میں بھیج دیا کریں تو تین سو ساٹھ جوڑے سال بھر میں اکٹھے ہو جائیں اور سو یتیموں کے ایک سال کے لیے کفایت کر جائیں اور یہ التزام کسی کی خاطر یا رعایت سے نہ ہونا چاہیے بلکہ آپ کو یتامیٰ سے تعلق ہونا چاہیے اور وہ تعلق ایسا ہو کہ وہ اپنے ماں باپ کو بھول جائیں اور آپ کے وجود اور سرپرستی کو غنیمت سمجھیں۔ یہ تو اصلاح فی الحال کا بیان تھا۔

تفسیر داں نہیں بلکہ تقریر داں کہنا چاہیے۔ ایک اور واعظ صاحب وعظ کہنے بیٹھے تو پہلے آپ نے تلاوت کی "اِنَّآ اَعۡطَیۡنٰکَ الۡکَوۡثَرَ" (اور ہم نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو کوثر عطا کیا) اور ترجمہ

کیا (ہم نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو مثل کوثر کے دی) کاف کا ترجمہ تو آپ کو ہو گیا۔ اب یہ مثل کا ہے کے معنی ہوئے۔ ایک عالم بھی وہاں موجود تھے۔ انہوں نے کہا کہ مولانا یہ مثل کا ہے کا ترجمہ فرمایا؟ آپ کہتے ہیں کہ یہ ترجمہ کاف کا ہے۔ ک الکوثر میں، یہ کاف تشبیہ کا کہلاتا ہے۔ مولوی صاحب نے کہا کہ حضرت! یہ کاف تشبیہ کا نہیں ہے خطاب کا ہے۔ تو آپ فرماتے ہیں کہ اس کی کیا دلیل ہے کہ یہ کاف تشبیہ کا نہیں ہے اور جاہلوں کا مجمع تھا اور ایسے مقام پر تو جاہل ہی غالب آتے ہیں کیونکہ علم سے ان کا جواب نہیں ہوتا، ایسی جہالت کا جواب جہالت ہی سے ہوتا ہے۔

ایک گاؤں کا قصہ ہے کہ ایک شخص وہاں مولوی بن کے رہتا تھا اور جو واقعی اہل علم وہاں جاتے تھے ان کا رنگ نہ جمنے دیتا تھا۔ ایک مرتبہ ایک مولوی صاحب وہاں پہنچ گئے، وہ بہت تھے ذہین، اس جاہل نے عوام کے سامنے ان کا بھی امتحان لیا کہ مولوی صاحب! یہ بتلاؤ ایمان نقطہ دار ہے یا بے نقطہ، مولوی صاحب پہلے تو چپ ہوئے کہ یہ کیا خرافات بکتا ہے اس کے بعد سوچ کر کہنے لگے کہ بے نقطہ ہے، اس نے کہا ہاں یہ تو ٹھیک ہے مگر کیسے؟ مولوی صاحب نے ذہانت سے ایک بات پیدا کر کے کہا لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) جو ایمان کا کلمہ ہے اس میں نقطہ نہیں ہے، کہنے لگا یہ غلط ہے، یہ وجہ نہیں ہے بلکہ یہ وجہ ہے کہ جب کوئی پوچھتا ہے کہ تم مسلمان ہو تو دوسرا کہتا ہے الحمد للہ اور اس میں نقطہ نہیں۔ انہوں نے کہا واہ غلط کہتے ہو، خالی الحمد للہ کون کہتا ہے بلکہ شکر الحمد للہ کہتے ہیں اور اس میں تین نقطے ہیں۔ اس لیے یہ ہو ہی نہیں سکتا، بس وہ مارا گیا اور گاؤں والوں نے اسے نکال کر انہیں رکھ لیا۔ تو صاحب! جاہلوں سے جیتنا بڑا ہی مشکل ہے۔

تو مولوی صاحب اس سوال سے بڑے گھبرائے کہ اب کیوں کر سمجھاؤں کہ یہ کاف تشبیہ کا نہیں، بس ایک بات سمجھ میں آ گئی، کہنے لگے کہ کاف تشبیہ کا گول گول لکھا جاتا ہے اور یہ لمبا لمبا ہے۔ وہ جاہل لاجواب ہو کر کہنے لگا ہاں ٹھیک ہے، اب خیال رکھوں گا۔ ایک اور جاہل سہارنپور میں آیا، مسجد میں آپ نے پکار دیا، بھائیو! آواج (وعظ ہو گا) خیر لوگ جمع ہو گئے، آپ نے منبر پر چڑھ کر وعظ شروع کیا، پہلے تو تین دفعہ یٰسین یٰسین یٰسین پڑھی، پھر یہ ترجمہ کیا کہ اے محمد اے محمد (صلی اللہ علیہ وسلم)! اگر تجھے پیدا نہ کرتا نہ آسمان پیدا کرتا نہ زمین پیدا کرتا۔ یہ کہہ کر کہیں لگا بھائیو دعا مانگو آج تھکے ہارے ہیں، آدھا آج ہوا آدھا کل ہو گا۔ وہاں ایک مولوی صاحب بھی تھے جو نابینا ہو گئے تھے۔ انہوں نے کسی سے کہا ذرا ان واعظ صاحب کو میرے پاس لانا، خیر وہ لائے گئے۔ مولوی

صاحب نے پوچھا مولانا آپ کی تحصیل کہاں تک ہے، کہنے لگا ہماری تحصیل ہاپوڑ ضلع میرٹھ ہے۔ انہوں نے پوچھا صاحب! آپ نے کیا کیا پڑھا ہے! کہنے لگا وفات نامہ ہم نے پڑھا ہے، ہرنی کا معجزہ ہم نے پڑھا ہے، دائی حلیمہ کا قصہ ہم نے پڑھا ہے اور تو کیا جانے اندھے، مولوی صاحب نے معذور سمجھ کر چھوڑ دیا۔ تو ایسے ایسے واعظ ہیں جو کھاتے کماتے پھرتے ہیں۔

آدمیاں گم شدند ملک خدا خر گرفت

(امور سلطنت جاننے والے ماہر گم ہو گئے اور اللہ کے ملک کی سلطنت نا اہلوں کے ہاتھ آ گئی)

آہ! کوئی اصلاح کرنے والا نہیں، لوگ یہ الزام دیتے ہیں کہ علماء اصلاح نہیں کرتے، میں کہتا ہوں ان کی اصلاح تو عوام ہی کے ہاتھ میں ہے۔ اگر یہ ایسے جاہلوں کے وعظ نہ سنیں تو یہ خود وعظ کہنا چھوڑ دیں مگر لوگوں کو خدا جانے کیا ہوا ہے کہ ایسے جاہلوں کے وعظ میں مزہ آتا ہے۔

ہر کسے روزِ می طلبد از ایام   مشکل ایں است کہ ہر روز بتری بینم

اسپ تازی شدہ مجروح بزیر پالاں   طوق زریں ہمہ در گردن خری بینم

اس لیے کہتا ہوں کہ ایسے واعظ انجمن یتیم خانہ اور مدرسہ سے نہ نکلیں اس کی یہی صورت ہے کہ بجائے تقریر کے انہیں صنعتیں سکھانی چاہئیں۔ مثلاً درزی کا کام، بڑھئی کا کام وغیرہ، بس یہ تعلیم صنعت اصلاح بدن فی المال تھی، اب ایک اصلاح اس اصلاح جسمانی سے زیادہ قابل اہتمام ہے۔

اصلاح روح

وہ اصلاح روح کی ہے اور یہ دو چیزوں سے ہوتی ہے ایک علم سے اور ایک عمل سے، پھر ان میں عمل علم سے بھی زیادہ ضروری ہے مگر اس کے برعکس کہیں کہیں علم پر توجہ بھی ہے مگر عمل کی تو بالکل پروا نہیں ہے اور علم کے متعلق میں کہتا ہوں کہ خواہ عالم نہ بنائیں مگر قرآن مجید اور چھوٹے چھوٹے رسائل ضروری مسائل کے اردو میں تو ضرور ہی پڑھا دیں۔ اس کے بعد پھر صنعت سکھا دیں اور جسے دیکھیں کہ ہونہار ہے اور علم کی صلاحیت اور مناسبت بھی رکھتا ہے اسے درزی، لوہار وغیرہ کا کام نہ سکھائیں اسے عالم بھی بنائیں اور قوم سے اس کے تعلیم کے اخراجات کے لیے وظیفہ بھی دلائیں کیونکہ قوم کو علماء کی بہت ضرورت ہے اور اگر علم سے مناسبت نہ دیکھیں تو پھر کوئی پیشہ ضرور سکھا دیں تاکہ یہ بھیک نہ مانگیں اور اپنی محنت سے زندگی بسر کر سکیں۔

علم سے زیادہ ضرورت اخلاق وعادت کی اصلاح کی ہے جو کہ اصلاح روح یا عمل بالدین ہے۔ اس طریق سے کہ ان کے اعمال کی نگرانی کریں، لباس خلاف شرع نہ پہننے دیں، کوئی ناجائز حرکت یا شرارت کریں تو ان پر تنبیہ کریں، نماز کی تاکید کریں اور انہیں اس کا پابند بنائیں، نہ پڑھیں تو سزا دیں۔ مگر افسوس ہے کہ اخلاق کی اصلاح جس قدر زیادہ ضروری ہے اسی قدر اس سے لاپروائی ہے۔ شاگردوں کی مولانا کو فکر نہیں، مریدوں کی پیر کو نہیں، غرض حلال حرام مناسب نامناسب کی ان کو کچھ خبر نہیں۔

میرا جی ایک واقعہ سے بہت خوش ہوا۔ لکھنؤ کے زمانہ قیام میں میرے چند احباب بھی میرے ہمراہ تھے اور احباب وہ تھے جن کے اعمال کی میں نے نگرانی کی تھی جہاں قیام تھا وہاں ایک خطوط رساں ایک بیرنگ کارڈ لایا۔ میں اتفاق سے اس وقت نہ تھا۔ ایک دوست نے بدوں میری اجازت کے بیرنگ خط لینے سے انکار کیا تو خطوط رساں نے کہا کہ پڑھ کر واپس کر دیجئے اور مکتوب الیہ کو مضمون کی اطلاع کر دیجئے۔ میں اس سے بہت ہی خوش ہوا کہ انہوں نے اسے یہ جواب دیا کہ بغیر محصول دیئے اس کا پڑھنا بھی جائز نہیں ہے۔

میں بقسم کہتا ہوں کہ الحمدللہ جس پیمانہ پر میں نے اپنے دوستوں کو پہنچانا چاہا وہ پہنچ گئے، خود مجھ کو یہ واقعہ بکثرت پیش آتا ہے کہ ڈاک میں اکثر خطوط ایسے آجاتے ہیں جن کے ٹکٹوں پر مہر نہیں ہوتی مگر میں سب سے پہلے ایسے ٹکٹوں کو چھڑا کر چاک کر ڈالتا ہوں۔ اس کے بعد خط پڑھتا ہوں، گو میں خلوت میں ہوتا ہوں اور میں اگر اس ٹکٹ کو دوبارہ استعمال کروں تو کسی کو پتہ بھی نہ چل سکے مگر خدا تعالیٰ تو دیکھتا ہے۔

یہاں سے یہ بھی معلوم ہوا کہ گورنمنٹ کے قوانین میں یہ قوت نہیں کہ آدمی چھپ کر بھی ارتکاب جرائم نہ کر سکے۔ یہ صرف خدا ہی کے قانون میں طاقت ہے کہ وہ خلوت وجلوت میں یکساں نافذ ہے۔ بس سوائے خوف خدا کے دنیا کے کسی قانون میں یہ طاقت نہیں کہ وہ آدمی کو جرائم سے باز رکھے جس شخص کے دل میں خوف خدا ہو اگر وہ ہزار پردوں میں ہو مگر کبھی متزلزل نہ ہوگا تو دیکھئے جس چیز میں یہ اثر اور برکت ہے افسوس کہ اسی کا اہتمام نہ ہو، دین تو دین، میں بقسم کہتا ہوں اگر اعمال واخلاق درست ہو جاویں تو دنیا بھی درست ہو جاوے۔ دنیوی پریشانیاں جو ہم کو پیش آرہی ہیں اس کی وجہ بھی یہی ہے کہ ہمارے اعمال ظاہری وباطنی درست نہیں کہ حدیث شریف میں ہے کہ سلاطین کا تشدد بھی خدا تعالیٰ کی نافرمانی سے ہوتا ہے۔ پس اگر سلاطین ہماری مرضی کے خلاف ہیں تو ان کو اپنے موافق بنانے کے لئے اپنے اخلاق شریعت کے موافق کر لو ورنہ

محض ان کی شکایت سے کیا فائدہ۔ حدیث شریف میں ہے کہ ظالم بادشاہوں کو برا نہ کہو کیونکہ ان کا قلب میرے ہاتھ میں ہے۔ جب میرے بندے میری نافرمانی کرتے ہیں تو بادشاہوں کے دلوں کو سخت کر دیتا ہوں تو تم میری فرمانبرداری کرو تا کہ میں ان کے دلوں کو نرم کر دوں۔

ایک مرتبہ جب شروع طاعون کا زمانہ تھا میں بھی یہاں کانپور میں تھا تو بعض دوستوں نے جلسہ کر کے حکام کو توجہ دلانا چاہی۔ اس میں مجھ سے شرکت چاہی، میں نے کہا ٹھہر جاویں، ذرا حافظ علیہ الرحمۃ سے پوچھ لوں۔ پھر میں نے دیوان حافظ دیکھا تو یہ شعر نکلا۔

گدائے گوشہ نشینی تو حافظا مخروش　　　رموز و مصلحت ملک خسرواں دانند

(یعنی تم ایک گدائے گوشہ نشین ہو تمہیں شور وغل نہیں کرنا چاہیے، اپنے ملک کی مصلحتیں بادشاہ ہی جانتے ہیں)

میں نے کہا کہ دیکھو بھائی حافظ صاحب منع کرتے ہیں اور لطیفہ دیکھو حافظا کہا ہے اور میں حافظ بھی ہوں۔ اب میں شرکت کر ہی نہیں سکتا لیکن تمہیں بھی یہی رائے دیتا ہوں کہ جلسہ نہ کرو۔ پس پانچ سو مرتبہ **لا حول ولا قوة الا باللہ العلی العظیم** تسبیح لے کر پڑھو اور خدا سے دعا کرو، چنانچہ کیا گیا۔ اس کے بعد ایک ہفتہ بھی نہ گزرا تھا کہ صاحب کلکٹر نے رپورٹ کی کہ یہاں طاعون وغیرہ کچھ نہیں ہے لہٰذا قرنطیہ اٹھالیا جاوے۔ چنانچہ جب سے اب تک جامع مسجد میں روزانہ بعد نماز عصر لاحول کا ختم ہوتا ہے۔

غرض طریق تو یہ ہے کہ مگر اب تو خدائے تعالیٰ سے ایسی بے تعلقی ہے کہ گویا ان کے ہاتھ میں کوئی کام ہی نہیں سمجھتے۔ بہت سے بدعقیدہ تو یہاں تک بڑھ گئے کہ خدا کی پناہ۔

مکہ معظمہ میں ایام حج میں حافظ احمد حسین کے پاس ایک درویش وضع شخص کچھ امانت لایا کہ اسے رکھ لیجئے۔ انہوں نے کہا کہ میاں میں کیا چیز ہوں رکھ جاؤ اور اللہ کے سپرد کر جاؤ تو کہنے لگا کہ ان کے سپرد تو ہرگز نہ کرنا چاہیے، دیکھئے۔

حکایت ہے کہ ایک شخص جب کہیں جاتا تھا تو اپنے اسباب کو بڑے پیر صاحب کے سپرد کر جاتا تھا۔ ایک مرتبہ اس کے بھائی نے اللہ کے سپرد کر دیا۔ اتفاق سے اس روز چوری ہوگئی۔ جب وہ آیا تو اس نے کہا کہ تو نے ان کے ناحق سپرد کیا۔ وہ تو ادھر کا ادھر کیا ہی کرتے ہیں اور پھر ان سے تو کوئی باز پرس نہیں کر سکتا، بڑے پیر صاحب کے سپرد کرتے تو وہ خدا کی باز پرس کے خیال

سے اچھی طرح حفاظت کرتے۔

الغرض اللہ سے اس قدر بدگمانی ہے کہ زمانہ طاعون میں دعا تک نہیں کرتے اور جیسے ویسے کرتے ہیں۔ الغرض یہ سب باتیں اس وجہ سے ہیں کہ خدا سے تعلق کم ہے۔ اس تعلق کو بڑھاؤ اور یہ بڑھتا ہے علم و عمل اور اصلاح سے تو یتیموں کے لیے اس کا بھی اہتمام رکھو۔

خلاصہ یہ کہ روحانی و جسمانی اصلاح ان کی کرنی چاہیے اور بڑی قدر ان کی اس لیے بھی کرنی چاہیے کہ ان کا لقب ہے یتیم اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو بھی وہی لقب یتیم عطا فرمایا گیا۔ ''اَلَمْ یَجِدْکَ یَتِیْمًا فَاٰوٰی'' تو ان کے لئے یہ بڑا شرف ہے، یہ محبوب خاص کے ساتھ ان کی حالت میں مشابہت رکھتے ہیں۔ خلاصہ یہ کہ ہر طریقہ سے ان کی رعایت کیا کریں اور چندہ بھی دیا کریں، خواہ دوامی یا یکمشت اور مہتمم کے ذمہ یہ ہے کہ ان کے کھانے پینے کی آسائش کا خیال رکھیں اور ان کی اصلاح اخلاق کے قواعد مقرر کریں۔

تربیت اخلاق

میں نے یہاں کی حالت کا معائنہ کیا۔ اس وقت قواعد دیکھنا بھول گئے، اس سے معلوم نہیں کہ اخلاق کی حالت کا کیا انتظام ہے۔ سو اب بتلاتا ہوں کہ تعلیم کا انتظام اتنا ضروری نہیں جتنا تربیت اخلاق کا اہتمام ضروری ہے۔ صحابہ رضی اللہ تعالیٰ عنہم کون سے پڑھے ہوئے تھے۔ ہاں ان کے اخلاق نہایت اعلیٰ درجے کے تھے۔ بس یہ بھی اگر نہ پڑھیں تو مضر نہیں، ہاں اخلاق درست ہوں اور اس کے لیے قواعد مقرر ہونے چاہئیں۔ مثلاً یہ کہ دولڑکے آپس میں دوستی نہ کرنے پائیں کیونکہ یہ دوستی فساد کی جڑ ہے۔ یہ بہت سے منہیات کا ارتکاب کراتی ہے۔ بس نہ دوستی ہو نہ دشمنی اور اس طور پر آپس میں رہیں۔

بہشت آنجا کہ آزارے نباشد کسے رابا کسے کارے نباشد

(بہشت وہ مقام ہے جہاں تکلیف کا نام ونشان نہیں اور کسی کو کسی سے کوئی کام نہیں)

آج کل لوگ کہتے ہیں کہ اتفاق ہونا چاہیے۔ میں کہتا ہوں کہ مگر بچپن کے اتفاق میں فساد کا احتمال ہے اس لیے بالغ ہونے کے بعد دوستی ہونی چاہیے اور بچپن میں یہی دوستی ہے کہ دشمنی نہ ہو۔ اس کا بھی خیال رکھنا چاہیے کہ ان کا لباس متکبرانہ نہ ہو۔ قصداً ان سے ایسے کام لیں کہ تکبر پیدا ہی نہ ہونے پائے۔ اپنے کام تو ان سے نہیں لینا چاہیے کیونکہ نابالغ سے متمتع ہونا جائز نہیں۔ البتہ ایسے

کام لو جس میں ان کا نفع بھی ہو کیونکہ یہ ابھی اوپر معلوم ہو چکا ہے کہ "وَ اللّٰهُ يَعْلَمُ الْمُفْسِدَ مِنَ الْمُصْلِحِ" (اور اللہ تعالیٰ مفسد اور مصلح کو جانتا ہے) کام لینے میں ان کی اصلاح مدنظر ہونی چاہیے۔ اپنی غرض ملحوظ نہ ہونی چاہیے۔ اس کا بھی خیال رکھیں کہ ان میں حرص بھی پیدا نہ ہونے پائے۔ نیز انہیں امراض شہوانیہ سے بھی بچانا چاہیے۔ بس اس طرح کی نگرانی باعث اجر عظیم ہے۔

ان یتیموں کا حق اس وجہ سے بھی ہے کہ وہ یتیم ہیں اور اس وجہ سے بھی ہے کہ جب وہ یتیم ہیں تو غالباً مسکین بھی ہیں۔ اب دو حیثیتیں پیدا ہو گئیں اور غالباً کا لفظ اس لیے کہا کہ اگر مسکین نہ بھی ہو تب بھی یتیم ہونا ہی اس کے استحقاق کے لئے کافی ہے۔

تعلیم نسواں

آخر میں تربیت کے متعلق ایک اور مسئلہ بحث کے قابل رہ گیا اور وہ تعلیم نسواں کا مسئلہ ہے کیونکہ جب یتیم خانہ ہے تو یہاں یتیم لڑکے بھی آئیں گے اور یتیم لڑکیاں بھی آئیں گی مگر تعلیم نسواں کا مسئلہ بڑا مشکل ہے۔ ہم تو یہ دیکھتے ہیں کہ جہاں مدرسہ لڑکیوں کا ہوتا ہے وہاں مفاسد بھی ضرور پیدا ہوتے ہیں، کہیں آنکھ لڑ گئی، کہیں اور بے حیائی کی باتیں ہوتی ہیں، ایسے واقعات بہت ہوتے ہیں۔ اس کا یہ اثر ہوا کہ بڑے بوڑھوں کا طبقہ تو خود تعلیم نسواں ہی کا مخالف ہو گیا۔ حالانکہ یہ مخالفت غلطی پر مبنی ہے کہ اس میں تعلیم کا قصور نہیں بلکہ منتظمین اور طرز تعلیم کا قصور ہے ورنہ تعلیم دین تو وہ چیز ہے۔

اِنَّمَا يَخْشَى اللّٰهَ مِنْ عِبَادِهِ الْعُلَمٰٓؤُا۔

(خدا سے ڈرنے والے علماء ہی ہوتے ہیں) لیکن افسوس یہ ہے کہ اکثر ایسے مدارس ان ہی لوگوں کے زیر اہتمام ہیں جو علم دین سے بالکل بے بہرہ ہیں اور اسی وجہ سے ان کا طرز تعلیم بھی اچھا نہیں ہے اور نصاب بھی ناقص ہے۔ سو اس کے لئے ایک تو چند رسالے ایسے ہونے چاہئیں جن میں دینیات کے مسائل روزہ، نماز، طہارت اور ضروری احکام نکاح، طلاق اور بیع وشراء وغیرہ ہوں اور عقائد ضرور یہ کچھ قیامت کے واقعات مختصری نیک بیبیوں کی تاریخ اور کچھ سلیقہ کی باتیں سینے پرونے وغیرہ جو خانہ داری کے لئے ضروری ہیں، کچھ بیماریاں اور ان کے علاج کا بھی بیان ہونا چاہیے کہ بال بچے والے گھر میں اس کی بھی ضرورت ہے اس کے لیے بہشتی زیور کے مکمل حصے بہت کافی ہیں اور اگر بہشتی زیور نا پسند ہو تو اور کوئی رسالہ جن میں یہ مضامین ہوں جمع کر دیا جاوے

بلکہ اس میں جو مصارف ہوں گے بقدر امکان ووسعت میں بھی بطور چندہ کے اس میں امداد دینے کو تیار ہوں۔ مگر شرط یہ ہے کہ جو عبارت کاٹی جاوے یا بڑھائی جاوے اسے حاشیہ پر ظاہر کر دیا جاوے کہ اصل میں یوں تھا اور اب یوں بنائی گئی اور کوئی مضمون شرع کے خلاف نہ ہو۔

یا یہ کہ آپ بہشتی زیور کو آگ لگائیے اور اپنی عبارت میں کوئی ایسی کتاب لکھ دیجئے میں اپنے دوستوں کو ایک اشتہار دے دوں گا کہ وہ بہشتی زیور کو ترک کر دیویں اور یہ نئی کتاب جو اس کے ہم مضمون ہے بجائے اس کے لے لیں مگر یہ کچھ نہیں ہوگا۔ وہ تو سارا بہشتی زیور ہی بعض مسائل سے اختلاف ہونے سے ردی ہو گیا۔ ایک پسو کمبل میں گھس گیا تو سارا کمبل ہی جلا دیا۔ ارے پسو ہی نکال ڈالو جو مضمون ناپسند ہو وہی نہ حذف کر دو مگر بشرطیکہ حاشیہ پر ظاہر کر دو جیسا اوپر عرض کیا ہے اور خیر اگر تمہیں اس سے ضد ہی ہے تو جانے دو اور علماء کے رسائل کا انتخاب کر لو۔ مگر اسی شرط سے کہ ان میں عبادات، معاملات، ترہیب وترغیب اور اخلاق وتہذیب کے مضامین اور ضروری معاشرت کی باتیں بھی ہوں۔ یہ ہے نصاب کامل جس کی تعلیم نسواں کے لیے ضرورت ہے۔

مگر آج کل خدا جانے کیا خبط ہے کہ عورتوں کو بھی نئی تعلیم دلانا چاہتے ہیں۔ بھلا بتلائیے جغرافی کی تعلیم کی عورتوں کو کیا ضرورت ہے؟ اس سے انہیں کیا فائدہ ہوگا بجز اس کے کہ بھاگنے کا طریقہ معلوم ہو جاوے کہ غازی آباد جنکشن ہے وہاں سے ریل بدل جاتی ہے وغیرہ وغیرہ۔ بہر حال ایسی مضر چیزوں سے انہیں بچاؤ، اسی طرح ناول بھی انہیں نہ دیکھنے دو کیونکہ اس سے آوارگی کی تدابیر بہت آسانی سے سمجھ میں آ جاتی ہیں، غرض ایک فہرست غیر ضروری کتابوں کی بنا کر یہ ہدایت کر دو کہ بھولے سے بھی ان کا مطالعہ نہ کریں، یہ تو نصاب تعلیم پر کلام تھا سو ایک تو اس کا اہتمام ہو۔

دوسری چیز ہے طرز تعلیم تو ایک طرز تو یہ ہے جیسے ہمارے قصبات میں ہے کہ اکثر اپنے گھروں میں یا اپنے کسی عزیز، قریب یا تعلق خصوصیت والے گھر میں لڑکیاں جمع ہو کر اچھا خاصہ نصاب پڑھ لیتی ہیں۔ محلہ کی شریف بیبیاں اپنی لڑکیوں کے ساتھ انہیں بھی پڑھاتی ہیں اور جس طرح اپنی لڑکیوں کی نگرانی کرتی ہیں اسی طرح ان کی بھی کرتی ہیں۔ یہ طرز تو بہت اسلم ہے۔

اور ایک طرز سکول کا کہ وہاں وقت معین پر جمع ہوتی ہیں، ڈولی پر گو معلم اور پہرہ کا بظاہر کافی انتظام ہوتا ہے مگر پھر بھی برابر فتنے پیدا ہوتے رہتے ہیں اور اکثر لڑکیاں آوارہ ہو جاتی ہیں۔ یہ تو ظاہر ہے کہ تعلیم انہیں خراب نہیں کرتی کیونکہ اگر تعلیم ہی اس کا سبب ہوتی تو گھر کی پڑھنے والیاں

بھی خراب ہوا کرتیں۔ معلوم ہوا کہ یہ طرزِ تعلیم کے فرق کا اثر ہے۔

گھر کی تعلیم میں خاص بات یہ ہے کہ آزادی نہیں آتی۔ لڑکی پر خصوصیت کی وجہ سے معلّمہ کا دباؤ پڑتا ہے اور معلّمہ خاص طور پر اس لیے خیال رکھتی ہے کہ اس کے سرپرستوں سے خصوصیات ہوتی ہیں اس لیے معلّمہ پر ان کا رعب ہوتا ہے۔ پس معلّمہ پر سرپرستوں کا دباؤ ہوتا ہے اور لڑکی پر معلّمہ کا بھی اور سرپرستوں کا بھی دباؤ ہوتا ہے۔ پھر ماں باپ کی نگرانی کے ہوتے ہوئے ان کی جانب کسی کا رجحان بھی نہیں ہوتا بلکہ ہمت ہی نہیں پڑسکتی اور سکول میں یہ بات نہیں ہوسکتی، نہ لڑکی سے نہ مہتمم سے رشتہ، نہ معلّمہ سے کوئی خصوصیت کا تعلق، تو مہتمم کا معلّمہ پر رعب نہیں اور معلّمہ کا جوکہ نوکر ہے، لڑکی پر رعب نہیں بلکہ اکثر جو معلم لڑکوں کو گھر پڑھاتے ہیں ان کا کچھ رعب زیادہ ہوتا ہے بخلاف ان کے جوکہ سکول میں پڑھاتے ہیں ان کا رعب نہیں ہوتا کیونکہ گھر کے معلموں کو تو باپ کا نوکر سمجھتے ہیں اور سکول کے معلموں کو اپنا، غرض سکول میں نہ لڑکی پر معلّمہ کا رعب نہ معلّمہ پر لڑکی کے ماں باپ کا رعب اور بغیر رعب کے کافی نگرانی نہیں ہوسکتی اور اگر اس قسم کا رعب نہ ہو تو ایک رعب کی چیز اور بھی ہے وہ یہ ہے کہ

ہر کہ ترسید از حق و تقویٰ گزید ترسد از وے جن و انسان ہر کہ دید

(جو شخص حق سبحانہ وتعالیٰ سے ڈرتا ہے اور تقویٰ اختیار کرتا ہے انسان اور شیاطین جو بھی اسے دیکھتے ہیں اس سے ڈرتے ہیں) اور اس کے رعب کی صورت یہ ہے کہ سیکرٹری اگر دیندار کامل ہو تو معلّمہ اس سے ضرور مرعوب ہوگی۔ پھر اندیشہ نہیں ہے کسی خرابی کا۔ یہ تو نصاب اور طرز تعلیم کے متعلق بحث ہے۔

دوسری بات سکول میں خرابی کی یہ ہے کہ مردوں کا اختلاط ہوتا ہے، امتحان کے وقت سیکرٹری اور دوسرے ممتحنوں کے سامنے سیانی سیانی لڑکیاں آتی ہیں اس سے ان کا دل کھل جاتا ہے، ہواؤ ٹوٹ جاتا ہے اور دیدہ پھٹ جاتا ہے تو یہ بڑی خرابی کی بات ہے۔ سیکرٹری کو چاہیے کہ اس سے احتراز رکھے۔

میں نے بھی تھانہ بھون میں لڑکیوں کا ایک مدرسہ قائم کیا ہے۔ لڑکیاں ایک معلّمہ کے گھر میں جمع ہوجاتی ہیں میں ان کی خدمت کردیتا ہوں لیکن میں نے یہاں تک احتیاط کر رکھی ہے کہ میں خود کسی کو لڑکی کے بھیجنے کی ترغیب نہیں دیتا۔ یہ انہی معلّمہ سے کہہ دیا ہے کہ یہ سب تمہارا کام ہے، تم جتنی لڑکیوں کو بلاؤ گی تنخواہ زیادہ ملے گی، اس میں امتحان ماہواری بھی ہوتا ہے، سو لڑکیاں کبھی تو امتحان دینے میں میرے گھر پر چلی آتی ہیں اور میری اہل خانہ یا میرے خاندان کی کوئی بی بی ان کا امتحان

لے لیتی ہیں اور کبھی لڑکیوں کو نہیں بلایا جاتا بلکہ ممتحنہ وہیں چلی جاتی ہیں اور امتحان لے لیتی ہیں، صرف نتیجہ میرے سامنے پیش ہو جاتا ہے اور باقی میرا نہ کوئی ان پر اثر اور نہ دخل۔ نمبر ممتحنہ دیتی ہیں ان نمبروں پر انعام دیتا ہوں۔ الحمد للہ! اس طرز پر مدرسہ برابر چلا جارہا ہے اور ایک بات بھی خرابی کی کبھی نہیں ہوئی۔ تو ان کی تعلیم کا انتظام یا تو اس طور پر ہو کہ لڑکیاں جمع نہ ہوں، اپنے اپنے گھروں پر یا محلّہ کی بیبیوں سے تعلیم پائیں یا اگر ایک جگہ جمع ہوں تو پھر یہ انتظام ہو کہ مردان سے سابقہ نہ رکھیں اور اپنی مستورات سے نگرانی کرائیں، ان سے خود بات چیت تک بھی نہ کریں۔ دوسرے اس بات کی بھی ضرورت ہے کہ سیکرٹری بضرورت متقی بن جائے چاہے وہ آزاد خیال ہو مگر اسے ملا کی شکل بنانا چاہیے تاکہ معلّمہ پر اس کے اس صوری تقویٰ کا اثر پڑے۔ میری دانست میں یہ اصول ہیں تعلیم نسواں کے آگے اور لوگ اپنے تجربوں سے کام لیں کچھ میرے خیال کی تقلید ضروری نہیں۔

بہر حال یہ تھے حقوق یتامیٰ کے جو اس آیات کے ضمن میں بیان کیے گئے اور جن سب کی میزان یہ ایک چھوٹا سا جملہ ''قُلْ اِصْلَاحٌ لَّهُمْ خَيْرٌ'' ہے کہ ان کی اصلاح سب سے بہتر بات ہے فی نفسہ ان کے حقوق کی وجہ سے بھی اور تشبہ بالنبی کی وجہ سے بھی ان کی خدمت تمام مستحقین پر مقدم ہے۔ اب میں ختم کرتا ہوں اور اس وعظ کا نام اصلاح الیتامیٰ رکھتا ہوں، حق تعالیٰ سے دعا فرمائیے کہ وہ ہمارے قلوب کو نرم کرے اور عمل کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین یارب العالمین!

ضمیمہ ضروریہ

یہ ایک خط ہے جو ایک صاحب نے ایک سیدزادہ یتیم کو یتیم خانہ میں داخل کرنے کی درخواست کے سلسلہ میں اس یتیم خانہ کے مہتمم کو لکھا ہے چونکہ اس میں بعض ضروری مسائل ہیں جن کا تعلق یتامیٰ سے بھی ہے اس لیے اس مضمون کو اس وعظ کا ضمیمہ بنا دینا مناسب معلوم ہوا ہے۔ ''وھو ھذا''

مخدوم مکرم جناب سیکرٹری صاحب! السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

والا نامہ نے بجواب نیاز نامہ صدور فرما کر کوائف مندرجہ سے اعزاز بخشا

منظوری درخواست کا شکر گزار ہوں۔ ان شاء اللہ اس یتیم کو ہمراہ لاؤں گا۔ اپنے عیبوں اور کوتاہیوں پر نظر کر کے اس امید پر کہ آپ اہل ہیں اور جو کوتاہی مضر سمجھ کر عرض کی جاوے گی اس کی اصلاح پر آپ قادر ہوں گے اور تھوڑی توجہ سے بہت بڑے اجر کے آپ مستحق ہوں گے۔ سطور ذیل عرض کر رہا ہوں جن کی تحریک آپ کے والا نامہ کے مضمون نے دل میں پیدا کر دی۔

۱۔ جو رقم سیدزادوں پر زکوٰۃ میں سے صرف ہوگی اس سے زکوٰۃ دہندوں کی زکوٰۃ ادا نہ ہوگی۔
۲۔ جو رقم زکوٰۃ کی صرف ہو اور وہ مستحق کی ملک نہ ہو سکے جیسا کہ آپ کے یہاں کھانے کی تقسیم ہوتی ہے وہ کھانا جو یتامیٰ کو تقسیم ہوتا ہے وہ ان کی ملک نہیں ہو جاتا بلکہ مباح ہوتا ہے اس سے بھی اہل زکوٰۃ کی زکوٰۃ ادا نہ ہوگی۔

ان امور سے غالباً جناب بھی واقف ہوں گے لیکن یا تو خیال نہیں ہوا یا اس کے انتظام سے معذور سمجھ کر توجہ نہیں کی گئی چونکہ میں آپ کی خدمات کو قدر کی نگاہوں سے دیکھتا ہوں اور یہ دلی تمنا ہے کہ جس طرح اور انتظامات نے خوش ہونے کا موقع دیا ہے خدا کرے اس شرعی نقص کو دور فرما کر مزید اجر حاصل کرنے کا آپ کو موقع ملے اور ہم کو خوشی نصیب ہو، آپ کو راستہ بتلانا گویا آفتاب کو چراغ دکھلانا ہے لیکن از راہ ہمدردی و خیر خواہی جو صورت اس انتظام کی ذہن میں آئی ہے اس کو پیش کرتا ہوں۔ آپ کو اختیار ہے کہ اس میں سے جس قدر مناسب اور ضروری سمجھیں قبول فرماویں یا اس سے اور جو بہتر صورت ہو اس پر عمل فرما کر نقص شرعی کو دور فرماویں۔

غالباً آمدنی زکوٰۃ کا حساب آپ کے دفتر میں ہوگا اور یتامیٰ کی قومیت بھی آپ کے دفتر میں درج ہوگی۔ لہٰذا کاغذی صورت میں ان دونوں کو مخلوط نہ کیا جاوے، غیر زکوٰۃ کے روپیہ سے سیدزادوں کی پرورش کی جاوے اور زکوٰۃ سے دیگر کی اور بجائے اس کے کہ ان کو جتنی روٹی اور کپڑا دیا جاتا ہے آئندہ سے روپیہ ان کی ملک کر دیا جایا کرے اور اس کے واسطے آسان طریقہ یہ ہوگا کہ ان لوگوں کو ماہوار رقم زکوٰۃ کی مد کی دے کر ان کو اس رقم کا مالک بنا دیا جایا کرے اور بعد کو اس رقم سے ان سے کھانے کی قیمت یا دیگر اخراجات جو ان کے واسطے ہوا کرتے ہیں لے لیے جایا کریں۔ اس صورت میں زکوٰۃ دہندوں کی زکوٰۃ بھی ادا ہو جائے گی اور غالباً جناب والا کو زیادہ زحمت بھی نہ ہوگی کیونکہ تملیک کے واسطے صرف ماہوار ان کو دے کر اور بعد کو صرفہ میں ان سے واپس لینے کا کام ضرور بڑھ جاوے گا جس کے واسطے اگر موجودہ ملازمین کافی نہ ہوں تو اگر ایک آدمی خاص اس کام کے لئے مقرر کر دیا جاوے اس میں صرف تو ضرور کچھ زیادہ ہوگا لیکن زکوٰۃ دینے والوں کی زکوٰۃ ادا ہو جاوے گی اور آپ بھی مواخذہ سے بری ہو جاویں گے۔

مگر تملیک فرضی یا نمائشی نہ ہونا چاہیے بلکہ واقعاً تملیک ہونی چاہیے یعنی اگر خدانخواستہ وہ یتیم خانہ سے علیحدہ ہونا چاہے تو وہ رقم جو اس سے لی گئی تھی واپس دینا چاہیے، اگر بھاگ جاوے تو

سبیل مناسب اس کو ادا کی جاوے یا اس کے پاس پہنچا دی جاوے اور اگر مر جاوے تو تفتیش و تلاش سے اس کے ورثاء معلوم کر کے ان کو ادا ہونا چاہیے۔(۱)

(۱)۔اور اگر رقم کی تملیک کو مصلحت یتیم خانہ کے خلاف سمجھا جاوے تو ایک صورت یہ بھی ہے کہ پکا ہوا کھانا بٹھلا کر نہ کھلایا جاوے بلکہ ہاتھ میں دے کر ملک کر دیا جاوے مگر اس صورت میں ان کو یہ بھی اختیار دینا ضروری ہوگا کہ خواہ مل کر کھائیں یا علیحدہ کھائیں اور دوسری شرط یہ ہوگی کہ وہ پکا ہوا کھانا جو ان کو ملا ہے جو قیمت میں رقم زکوٰۃ کے برابر ہو مثلاً کسی نے پانچ روپیہ زکوٰۃ کے دیئے اور اس کا کھانا پکا کر تقسیم کیا گیا تو یہ پکا ہوا اور تقسیم کیا ہوا کھانا پانچ روپیہ کی قیمت کا ہونا چاہیے اور ایک شرط یہ ہے کہ اس رقم زکوٰۃ سے کسی ملازم کو نہ کھانا دیا جاوے اور نہ تنخواہ دی جاوے۔۱۲ اشرف علی)

اس صورت میں زکوٰۃ بھی ادا ہو جاوے گی اور یتامیٰ کی پرورش بھی بوجہ احسن ہو گی اور جناب کو ان شاء اللہ ذات باری تعالیٰ سے امیدوں سے زیادہ اجر ملے گا۔

دوران قیام تھانہ بھون میں فیض صحبت حضرات مولانا سے میں ان امور پر مطلع ہوا اور حضور حضرت مولانا مرشد کے ایماء سے اس قدر مفصل عریضہ جناب کو لکھ رہا ہوں اور حضرت موصوف نے اس کو ملاحظہ فرمالیا ہے۔اگر ضرورت ہو تو جناب بھی حضرت مولانا یا اور حضرات علماء جن سے آپ چاہیں اس معاملہ کو صاف کر سکتے ہیں۔

فقط والسلام! از مقام تھانہ بھون ضلع مظفر نگر

خادم: ناظر حسن عفا اللہ عنہ

حقوق السراء والضراء

حقوق مصیبت وراحت کے متعلق یہ وعظ ۶ ذی الحجہ ۱۳۳۰ھ کو سہارنپور میں اعانت دین کے جلسہ میں ہوا جو سوا دو گھنٹوں میں ختم ہوا۔ بیان بیٹھ کر فرمایا، حاضری تخمیناً تین ہزار کی تھی۔

یہ وعظ حضرت شیخ الاسلام مولوی ظفر احمد صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے قلمبند فرمایا۔

خطبہ ماثورہ

الحمدللہ نحمدہ ونستعینہ ونستغفرہ ونؤمن بہ ونتوکل علیہ ونعوذ باللہ من شرور انفسنا ومن سیئات اعمالنا من یھدہ اللہ فلا مضل لہ ومن یضللہ فلا ھادی لہ ونشھدان لا الہ الا اللہ وحدہ لا شریک لہ ونشھدان سیدنا ومولانا محمداً عبدہ ورسولہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وعلیٰ وآلہٖ واصحابہ وبارک وسلم۔

اما بعد فاعوذ باللہ من الشیطان الرجیم، بسم اللہ الرحمٰن الرحیم، قال اللہ تبارک وتعالیٰ یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْٓا اِذَا لَقِیْتُمْ فِئَةً فَاثْبُتُوْا وَاذْکُرُوااللّٰہَ کَثِیْرًا لَّعَلَّکُمْ تُفْلِحُوْنَ وَاَطِیْعُوا اللّٰہَ وَرَسُوْلَہٗ وَلَا تَنَازَعُوْا فَتَفْشَلُوْا وَتَذْھَبَ رِیْحُکُمْ وَاصْبِرُوْٓا ط اِنَّ اللّٰہَ مَعَ الصّٰبِرِیْنَ وَلَا تَکُوْنُوْا کَالَّذِیْنَ خَرَجُوْا مِنْ دِیَارِھِمْ بَطَرًا وَّرِئَآءَ النَّاسِ وَیَصُدُّوْنَ عَنْ سَبِیْلِ اللّٰہِ ط وَاللّٰہُ بِمَا یَعْمَلُوْنَ مُحِیْطٌ وَاِذْ زَیَّنَ لَھُمُ الشَّیْطٰنُ اَعْمَالَھُمْ وَقَالَ لَاغَالِبَ لَکُمُ الْیَوْمَ مِنَ النَّاسِ وَاِنِّیْ جَارٌلَّکُمْ فَلَمَّا تَرَآءَ تِ الْفِئَتٰنِ نَکَصَ عَلٰی عَقِبَیْہِ وَقَالَ اِنِّیْ بَرِیٓءٌ مِّنْکُمْ اِنِّیْٓ اَرٰی مَالَا تَرَوْنَ اِنِّیْٓ اَخَافُ اللّٰہَ ط وَاللّٰہُ شَدِیْدُ الْعِقَابِ

ترجمہ:۔ اے ایمان والو جب تم کو کسی جماعت سے (جہاد میں) مقابلہ کا اتفاق ہوا کرے تو ثابت قدم رہو اور اللہ کا خوب کثرت سے ذکر کرو تا کہ تم کامیاب ہو جاؤ اور اللہ اور اس کے رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) کی اطاعت کا لحاظ کیا کرو اور نزاع مت کرو ورنہ کم ہمت ہو جاؤ گے اور تمہاری ہوا اُکھڑ جائے گی اور صبر کرو۔ بے شک اللہ تعالیٰ صبر کرنے والوں کے ساتھ ہے اور ان (کافر) لوگوں کی مشابہت مت ہونا جو اپنے گھروں سے اتراتے ہوئے اور لوگوں کو دکھلاتے ہوئے نکلے اور لوگوں کو اللہ کے راستے (دین) سے روکتے تھے اور اللہ تعالیٰ ان کے اعمال کو اپنے احاطہ میں لیے ہوئے ہے اور اس وقت کا ان سے ذکر کیجئے جبکہ شیطان نے ان کو انکے اعمال خوشنما کر کے دکھلائے اور کہا لوگوں میں آج تم پر کوئی غالب آنے والا نہیں اور میں تمہارا حامی ہوں، پھر دونوں جماعتیں ایک دوسرے کے مقابلہ

ہوئیں تو وہ الٹے پاؤں بھاگا اور یہ کہا کہ میرا تم سے کوئی واسطہ نہیں، میں ان چیزوں کو دیکھ رہا ہوں جو تم کو نظر نہیں آتیں اور میں تو خدا سے ڈرتا ہوں اور اللہ تعالیٰ سخت سزا دینے والے ہیں۔

تمہید: اس رکوع کے ترجمہ کی حاجت نہیں۔ اس میں سے جستہ جستہ مضامین ضرورت کے مطابق بیان کر دوں گا جس سے آیت کا مضمون بھی سمجھ آ جائے گا۔ اس آیت کو میں نے اس لیے اختیار کیا ہے کہ ان لوگوں کی غلطی ظاہر ہو جائے جو یہ سمجھتے ہیں کہ شریعت کی تعلیم کامل نہیں۔ جملہ حالات کے متعلق اس میں احکام نہیں۔ ان کا یہ خیال ہے کہ شریعت نے صرف عبادات و معاملات ہی کے احکام بیان کیے ہیں۔ سیاسیات کے متعلق شریعت میں تعلیم نہیں ہے۔ اس خیال فاسد سے بڑا ضرر یہ ہوا کہ وہ لوگ حد شرعی سے آگے بڑھنے لگے اور جو کچھ جی میں آیا کرنے لگے کیونکہ ان کے خیال میں شریعت نے تو ان امور کی بابت گفتگو کی ہی نہیں، احکام بیان ہی نہیں کیے۔ پھر غیر اقوام بھی ان لوگوں کے طرز عمل کو دیکھ کر یوں سمجھتے ہیں کہ دین اسلام کی تعلیم ناقص ہے جس نے ایسے وقت کے لئے کوئی قانون مقرر نہیں کیا بلکہ بعض لوگ تو آج کل کے مسلمانوں کے طرز عمل کو دیکھ کر دین اسلام کو وحشت اور عدم تہذیب کی طرف منسوب کرتے ہیں اور بے خبری کی وجہ سے اس نسبت کا منشاء کسی قدر صحیح بھی ہے کیونکہ غیر اقوام ہمارے مذہب کو کہاں معلوم کرتی پھرتی ہیں۔ ان کے نزدیک تو ہمارے افعال ہی مذہب کا آئینہ ہیں جیسے ہمارے افعال ہوں گے اسی پر مذہب کو محمول کریں گے۔

تو مجھے اس واہمہ کا دور کرنا بھی مقصود ہے جس سے سب کو بخوبی معلوم ہو جائے گا کہ اسلام کی تعلیم ہر شعبہ کے لئے کافی ہے، موجود ہے اور جن لوگوں کی حرکتیں تہذیب سے دور ہیں، وہ قانون اسلامی سے ناواقف ہیں۔ اس وقت میں نے قرآنی آیتیں اسی غرض کے واسطے پڑھی ہیں ورنہ اگر میں کوئی مضمون فقہی یا کوئی حدیث نبوی پڑھ دیتا تب بھی کافی تھا اور حدیث تجویز بھی کی تھی مگر آجکل مذاق ایسا بدلا ہے کہ مسلمانوں ہی میں مختلف خیالات پیدا ہو گئے ہیں حتیٰ کہ ایک جماعت حدیث و فقہ کو بھی حجت نہیں سمجھتی۔ (انا للہ و انا الیہ راجعون) مگر چونکہ مجھے اس وقت تعلیم اسلامی کا اکمل ہونا اور اس کا تمام حالات کے احکام کو جامع ہونا ہر فرقہ کے سامنے ظاہر کرنا مدنظر ہے۔ اس لیے میں نے سب کے خیالات اور مذاق کی رعایت کر کے قرآن کی آیتیں تلاوت کیں کیونکہ اگر حدیث پڑھتا تو بعض لوگوں کے نزدیک وہ حجت تامہ نہ ہوتی اگرچہ اس فرقہ کا خیال نہایت فاسد اور غلط ہے مگر اس وقت اس سے بحث مقصود نہیں۔ اس وقت تو عام طور پر سب کے سامنے یہ بات ظاہر کر دینی

ہے کہ دین اسلام میں ہر حالت اور ہر شق پر پوری نظر ڈالی گئی ہے اور جس قدر اعتراض تعلیم اسلامی پر کیے جاتے ہیں سب غلط ہیں اور ان کا منشاء قانون شرعی سے ناواقفیت ہے۔

اہمیت شریعت

تعلیم اسلامی کے کامل ہونے کا ایک راز ہے وہ یہ ہے کہ متکلم حکیم دو قسم کے ہوتے ہیں۔ ایک تو حکیم متاثر دوسرے حکیم غیر متاثر، سو حکیم متاثر کے کلام میں بعض کیفیات غالب بعض مغلوب ہوں گی اور جو متکلم کہ حکیم غیر متاثر ہے چونکہ اس کی ذات پر کسی خاص کیفیات کو غلبہ نہیں ہو سکتا اس لیے جس واقعہ میں جو حکم اس کی طرف سے صادر ہو گا نہایت کامل اکمل ہو گا۔ پس اس سے معلوم ہو گیا کہ خدا کا کلام سب سے زیادہ کامل ہو گا کیونکہ حالات کا سب سے زیادہ علم بھی اسی کو ہے۔ پھر وہ باختیار مالک اور تمام اشیاء میں خود مؤثر ہے، کوئی کیفیت اس پر غالب نہیں جو حکم اس کی طرف سے صادر ہو گا وہ نہایت کامل ہو گا۔ اس کے احکام بہت سخت ہو سکتے ہیں کیونکہ اس پر کیفیت غضب غالب نہیں: نہ بہت نرم ہو سکتے ہیں کیونکہ اس پر کیفیت رحمت غالب نہیں بلکہ وہ باختیار خود قہار ہے اور باختیار خود رحیم و کریم ہے۔ کسی صفت میں مجبور یا مغلوب نہیں بخلاف انسان کے کہ وہ کیفیات سے مغلوب ہو جاتا ہے۔ پس معلوم ہوا کہ جو کلام خداوندی ہے اس کے تمام احکام افراط و تفریط سے پاک ہوں گے۔ یہی وجہ ہے کہ شریعت کا پابند ہونا ہر بشر پر لازم ہے کیونکہ وہ احکام سب کی مصالح کو جامع ہیں۔

میں اس وقت ضرورت اتباع شریعت پر بحث نہیں کرتا اور نہ یہ وقت تمام فروعی مسائل پر بحث کرنے کا ہے مگر اتنا اجمالاً ضرور کہوں گا چونکہ ہماری یہ حالت مشاہد ہے کہ جو کیفیت شدید ہوتی ہے وہ ہم کو مغلوب کر دیتی ہے اس لیے ہم کو شریعت الٰہی کی پابندی ضروری ہے تاکہ ہم اعتدال پر قائم رہ سکیں۔ ہماری رائے قابل اعتبار نہیں ہو سکتی اور اتباع کے لئے اپنے اپنے زمانہ میں ہر شریعت اگرچہ کافی تھی مگر اس وقت شریعت اسلامیہ ہی کا پابند ہونا ضروری ہے۔ دو وجہ سے ایک تو شریعت اسلامیہ دیگر شرائع سے زیادہ کامل اور کافی ہے۔ دوسری شرائع میں تحریف بہت واقع ہوئی ہے۔ پتہ نہیں چل سکتا کہ خدا کا حکم کیا ہے اور اسی حکمت سے دوسری شرائع منسوخ کر دی گئیں اور ہمارے لئے اصل وجہ دوسری شرائع پر عمل کرنے کا بھی نسخ ہے وہ دونوں وجہ حکمت ہیں نسخ کی۔ میں دیگر شرائع کو (نعوذ باللہ) ناکافی وغیرہ نہیں کہتا۔ جیسا کہ بعض لوگ تفاضل کے وقت کہہ دیتے ہیں میرا اس سے دل کانپتا ہے کہ دوسری شریعتوں کو ناکافی وغیر کامل کہوں۔ وہ بھی اپنے مخاطبین کے لئے کافی اور کامل تھیں مگر

ہماری شریعت مقدسہ اکمل اور اکمل ہے اور یہی اکمل ہونا ختم نبوت کی حکمت بھی ہوسکتی ہے کیونکہ شریعت محمدیہ صلی اللہ علیہ وسلم سے زیادہ کوئی شریعت کامل نہیں کہ اس کے بعد اس کی حاجت ہو۔ اسی لیے میں نے ان آیات کو اختیار کیا ہے تاکہ معلوم ہوجائے کہ شریعت مقدسہ نے سیاسیات کے متعلق بھی کافی قانون مقرر کیا ہے جس کے بارے میں لوگوں کو خیال ہے کہ اسلام کی تعلیم ناکافی ہے۔ واللہ العظیم شریعت ہی کے پابند ہوکر ہم سب کچھ ہوسکتے ہیں۔ شریعت کی وہ حالت ہے۔

زفرق تابقدم ہر کجا کہ می نگرم کرشمہ دامن دل می کشد کہ جاں اینجاست

(از سرتاپا جدھر بھی نگاہ ڈالتا ہوں کرشمہ دامن دل کو کھینچتا ہے کہ یہی جگہ ہے)

چنانچہ اس وقت جو میں نے آیتیں تلاوت کی ہیں ان میں ایک بہت بڑے حادثہ کے متعلق احکام اوامر ونواہی بیان کیے گئے ہیں۔ میں اپنے اجزائے بیان میں ان سب باتوں کو بیان کروں گا۔

فکر دین

مگر اول میں ایک ضروری مضمون بیان کرتا ہوں جس میں بعض ان شبہات کا جواب ہے مگر میرے ایک عزیز کے بیان سے بوجہ پورا نہ سمجھنے کے پیدا ہوگئے اور یہ خوشی کی بات ہے کہ لوگوں کو دین کی فکر ہے۔ چنانچہ چند مسلمانوں نے اس وقت سوال کرکے اس کا عملی ثبوت دیا کہ دین کی طرف توجہ ہے اس لیے کہ حدیث میں ہے العی السوال کہ ناواقف کی شفاء سوال سے ہوتی ہے۔ (واقعہ یہ ہوا تھا کہ ان کے بیان کے بعد بعض لوگوں نے کچھ شبہات بھی پیش کردیئے) جو مسئلہ بیان کیا گیا ہے وہ بالکل صحیح ہے مگر میں اس کے متعلق بیان نہیں کرتا کیونکہ اس میں پھر شبہ ہوگا کہ بلکہ ایک آسان عمل بتاتا ہوں جس کے بعد اس مسئلہ ہی کے سمجھنے کی ضرورت نہ رہے گی۔ وہ یہ ہے کہ یہ تو سب معلوم ہوگیا کہ اس ضلع میں کام کرنے کے لئے علماء ہیں اور دوسرے اضلاع میں بھی۔ میں بھی رائے دیتا ہوں کہ علماء کو اپنا شریک حال بنائیں۔ اگرچہ ان کا عنصر غالب نہ ہو۔ علماء کو صدارت وغیرہ کا شوق نہیں ہے بلکہ وہ تو اس سے پریشان ہوتے ہیں اور قبول اس لیے کرلیتے ہیں کہ شریعت کا حکم ہے کہ جو کام ضروری سپرد ہو اس کو کرو۔ تو میں ایک مختصر بات بتلاتا ہوں کہ چرم قربانی کی قیمت وغیرہ دینے کے لئے جو شرائط ہیں ان کو سمجھنے کی ضرورت نہیں۔ آسان یہ ہے کہ جو رقم داخل کریں علماء کو اطلاع کردیں کہ یہ چرم قربانی کی قیمت ہے، علماء خود تمام شرائط کا انتظام کرلیں گے۔

مگر اس سے یہ نہ سمجھیں کہ اس عزیز کا بیان بے نتیجہ تھا، ہرگز نہیں کیونکہ اس بیان کے بعد

سوالات اور شکوک پیدا ہونے سے یہ تو معلوم ہو گیا کہ بعض معمولی دیندار کا کوئی فعل بیکار نہیں جاتا اور یہاں سے معلوم ہو گیا کہ ایک ذرا سی بات جب آپ کی سمجھ میں نہیں آتی تو آپ علماء کے کس قدر محتاج ہیں۔ یہ تو اس شبہ کا جواب ہو گیا جو آں عزیز کے بیان پر واقع ہوا تھا اس کے ساتھ یہ بھی بیان کرنا ضروری ہے کہ چرم قربانی کی طرح ادائے زکوٰۃ کے لئے بھی خاص شرطیں ہیں۔ ان شرطوں کی رعایت کر کے زکوٰۃ بھی اس چندہ میں ادا ہو سکتی ہے، وہ بھی علماء کے ہی ذریعے اور اطلاع سے داخل کرو۔

پیشگی زکوٰۃ

نیز بڑی خوشی کی بات ہے کہ شریعت نے کئی سال کی پیشگی زکوٰۃ ادا کرنے کو بھی جائز کیا ہے۔ اگر کوئی شخص سالانہ ایک سو روپے زکوٰۃ میں نکالتا ہے تو اکٹھے پانچ سو روپے پانچ سال کی طرف سے پیشگی دے سکتا ہے۔ اگر کوئی کہے کہ اس میں خوشی کی بات کیا ہے یہ تو مصیبت ہوئی کہ پانچ سو روپے ایک دفعہ گھر سے نکل گئے، میں کہتا ہوں کہ "حفظت شیئا غابت عنک اشیاء" (تو نے ایک چیز کی حفاظت کی اور بہت سی چیزیں تجھ سے غائب ہو گئیں)۔ اس وقت پانچ سو کا نکلنا واقعی گراں ہو گا مگر پانچ سال تک بےفکر بھی تو ہو جاؤ گے یہ کتنا بڑا آرام ہوا۔ دنیا میں بےفکری سے زیادہ کوئی آرام نہیں مگر یہ زکوٰۃ پیشگی اسی قدر روپیہ کی ادا ہو گی جو اس وقت موجود ہے اس کے اوپر جو مال بڑھے گا اس کی پھر زکوٰۃ دینا ہو گی یہ نہیں کہ مولوی صاحب نے پانچ سو روپے لے کر پانچ سال کا ٹھیکہ لے لیا ہے کہ تم کو زکوٰۃ سے بالکل سبکدوش کر دیا کہ اگر کچھ مال بڑھے تو اس کی بھی ادا کرنا پڑے۔

اس پر مجھے ایک بڑھیا کی حکایت یاد آئی کہ وہ جب حج کرنے گئی اور صفاء و مروہ کے درمیان سعی کرنا پڑی، غریب بڑھیا تو تھی ہی تین چار شوط میں تھک گئی تو آپ مطوف سے کیا کہتی ہیں کہ مولوی صاحب! اب تو معاف کر دو گویا مطوف ٹھیکیدار ہے جس کو چاہے معاف کر دے جس کو چاہے معاف نہ کرے۔

یہیں سے میں ایک چھوٹی سی بات اور بتلاتا ہوں کہ آج کل کے ذی رائے مولویوں کو رائے دیا کرتے ہیں کہ زمانہ کی ضرورت کے موافق یوں کرنا چاہیے۔ فلاں بات جائز ہونا چاہیے تو صاحبو! مولویوں کو دین میں تصرف کرنے کا کچھ اختیار نہیں، ہاں آپ اللہ میاں کو جا کر رائے دیجئے کیونکہ احکام تو ان کے ہیں اور ان شاء اللہ دنیا سے ختم ہونے سے پہلے خدا سے بھی ملیں گے، ان سے غرض

کرنا تو برمحل ہے۔ مولویوں سے کہنا سننا فضول ہے اور ان کے کرنے سے کیا ہوتا ہے، کوئی لاکھ دین کو بدلنا چاہے مگر خدا تعالیٰ اس دین کے محافظ ہیں، یہ ہرگز نہیں بدل سکتا البتہ بدلنے والے کی عاقبت خراب ہو ہی جائے گی تو مولوی دین کے ٹھیکیدار نہیں یہ کسی بات کا ٹھیکہ نہیں لے سکتے۔

تو کوئی یہ نہ سمجھے کہ پانچ سال کی زکوٰۃ پیشگی دے دی گئی تو مال بڑھنے سے بھی اس کی زکوٰۃ نہیں دینی پڑے گی۔ اگر پیشگی زکوٰۃ دینے پر کوئی یہ شبہ کرے کہ پانچ چھ سال کی زکوٰۃ دینے میں کیا نفع؟ کیا خبر کہ پانچ سال تک مال رہے یا نہ رہے، اگر پہلے ہی مال فنا ہو گیا تو زائد زکوٰۃ فضول ہی ہو گئی۔

تو صاحبو! اول تو یہ شبہ لغو ہے کیونکہ اکثر مال زکوٰۃ ادا کردہ باقی رہتا ہے۔ تجربہ کر کے دیکھ لیجئے اور اگر تلف ہونے کے اندیشہ کو صحیح مان لیا جائے تب بھی ہم کہتے ہیں کہ پیشگی زکوٰۃ دینا پھر بھی مفید ہے کیونکہ اگر پیشگی زکوٰۃ میں نہ دیئے جاتے تو وہ زکوٰۃ کے روپے بھی تلف ہو جاتے اب اتنی مقدار جو زکوٰۃ میں پہلے دیدی گئی ہیں وہ تلف ہونے سے بچی اور ثواب کا ذخیرہ ہو گیا تو کیا آپ کے نزدیک روپیہ کا زکوٰۃ میں صرف ہو کر غریب مسلمان بھائیوں کے پاس جانا اور ان کے کاموں میں معین بننا تلف ہونے سے بھی اچھا نہیں۔

مجھے ایک غیر مسلم کی حکایت یاد آئی تھی۔ تھانہ بھون کے قریب ایک گاؤں ہے وہاں سے ایک ہندو میرے پاس آیا کرتا تھا اور مجھ سے محبت کرتا تھا حتیٰ کہ کبھی کبھی خدمت بھی کیا کرتا، ایک دن آیا اور قصہ بیان کیا کہ میرے گھر چوری ہو گئی ہے مجھے اس کے حال پر ترس آیا اور میں کڑھنے لگا تو اس نے کہا میرے پاس ایک گائے ہے مجھے اس سے بہت محبت ہے وہ تم لے لو، میں نے کہا کہ تمہارے گھر اس وقت چوری ہو گئی ہے اس وقت دینا کیا مناسب ہے، کہنے لگا کہ اسی وقت دینا زیادہ مناسب ہے کیونکہ اگر میں تم کو دے دیتا تو میرے یہاں چوری ہی نہ ہوتی، مجھے اس کی عقل پر بڑی حیرت ہوئی۔ پھر کہنے لگا کہ میرا چچا اس کا مالک تو نہیں ہے مگر میں اس کے خلاف کرنا پسند نہیں کرتا۔ شاید اسے مفت دینا ناگوار ہو۔ یہ اکیس روپیہ میرے پاس ہیں یہ لے لو اور اس کو میرے پاس بھیج دینا، میں اس سے کہہ دوں گا کہ میں نے فروخت کر دی تو اب غور کیجئے کہ ایک غیر مسلم شخص تو سمجھے کہ ایک نیک مصرف میں صرف کرنے سے سب مال محفوظ ہو جاتا ہے اور آپ اس راز کو نہ سمجھے کہ جو مال زکوٰۃ ادا کردہ ہے وہ تلف نہیں ہو سکتا بلکہ اگر آپ کا مال تلف بھی ہو جائے تو تلف کا اندیشہ بھی ہو تب تو اور بھی زیادہ ضروری ہے کہ زکوٰۃ پیشگی دے دی جائے تاکہ اس قدر تو باقی رہے۔

اس پر مجھے ایک اور حدیث یاد آئی کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی دولت سرائے میں ایک بکری ذبح ہوئی تھی۔ آپؐ نے دریافت فرمایا کہ سب تقسیم ہوگیا یا کچھ باقی ہے؟ گھر والوں نے عرض کیا کہ صرف ایک ذراع باقی ہے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ذراع ہی فانی ہے اور سب باقی ہے کیونکہ وہ تو مصرف میں صرف ہوگیا اور اس سے نفع لے لیا گیا۔ اس لیے حقیقتاً وہی باقی ہے اور جو ظاہراً باقی ہے اس میں اندیشہ ہے کہ ہلاک ہو جائے اور کام نہ آئے تو جو کام میں آ گیا وہ باقی ہے اور جو ابھی کام میں نہیں آیا اس میں اندیشہ ہلاک بھی ہے اس لیے وہی فانی ہے تو حدیث میں بھی اس مضمون کی تصریح ہے۔

چونکہ بہت سے لوگ اتنی وسعت نہیں رکھتے کہ زکوٰۃ بھی دیں اور زکوٰۃ کے علاوہ زیادہ بھی دیں۔ اس لیے میں نے زکوٰۃ کے مسئلہ کو بھی بیان کر دیا کہ اگر تطوعاً دینے کی ہمت نہ ہو تو زکوٰۃ ہی سے مدد کر دیں یہ تو ان شبہات کے متعلق ضروری مضمون تھا جسکی تقدیم کر دی گئی اب میں اصل مضمون آیت کو بیان کرتا ہوں۔

خلاصہ بیان

گو بعض لوگوں کا یہ خیال ہے کہ اس کی عادت تطویل کی ہے مگر اس کو طویل نہ کروں گا جلد ہی ختم کر دوں گا اور گو اس وقت مجھے بیان کی چنداں ضرورت نہ تھی کیونکہ جس کام کے لیے جلسہ منعقد ہوا ہے اس کو اچھی طرح میرے ایک عزیز نے اپنے بیان میں ظاہر کر دیا ہے مگر میں ایک دوسرا مضمون جو کہ فی نفسہ ضروری ہے اور قابل اہتمام ہے بیان کروں گا۔ وہ یہ کہ تحریک چندہ کے شرائط کیا کیا ہیں کیونکہ شریعت نے ہر تعلیم کو کافی طور پر سمجھایا ہے یہ نہیں کہ سونے کا کشتہ کھانے کو بتلا دیا نہ کچھ بدرقہ ہے نہ پرہیز۔ شریعت کی تعلیم میں غایت تعدیل ہے۔ اس کو معلوم کرنے کے بعد کسی کو الزام دینے کی مجال نہیں اور اس وقت جن لوگوں کو شریعت میں کچھ شبہ ہو جاتا ہے تو اس لیے کہ انہوں نے تعلیم شریعت سنی ہی نہیں۔

اس وقت بیان سے دو غرض ہیں۔ ایک تو یہی تحریک چندہ جس کے لئے جلسہ وضع ہوا ہے دوسرے یہ کہ اس میں نشیب و فراز ہو وہ دور کر دیا جائے کیونکہ جب کوئی کام تمام شرائط کے ساتھ نہیں ہوتا قابل اعتبار نہیں ہوتا بالکل ضائع سمجھا جاتا ہے اور اس پر کوئی صاحب اعتراض نہ کرنے لگیں کہ ہم نے بارہا بدون لحاظ شرائط کے چندہ دیا اور چندہ ادا بھی ہو گیا مگر یہ اعتراض ایسا ہی ہے کہ کسی نے کہا تھا کہ بے وضو نماز نہیں ہوتی۔ ایک صاحب بولے ''بارہا کردیم وشد''۔

استاد رحمۃ اللہ علیہ فرماتے تھے کہ میرے پاس ایک شخص مسئلہ پوچھنے آیا کہ عورت اور مرد میں یہ رشتہ ہے، نکاح درست ہے یا نہیں؟ میں نے کہا کہ نکاح نہ ہوگا تو کیا کہتا ہے کہ ہم نے تو کیا تھا اور ہو بھی گیا تو اس نے نہ ہونے کے معنی یہ سمجھے کہ شوہر کی زبان سے قبول کا لفظ نہ نکلے گا۔

ایسے ہی کوئی صاحب چندہ ادا نہ ہونے کے بھی یہی معنی سمجھتے ہوں کہ دینے والے کا ہاتھ رک جائے گا تو وہ یہ اعتراض کر سکتے ہیں مگر ایسے غبی لوگوں سے میرا خطاب ہی نہیں۔ غرض اس تحریک چندہ کے آداب بھی معلوم ہونے چاہئیں۔ یہ ہے خلاصہ میرے بیان کا اور تحریک چندہ بھی اس ضمن میں ہو جائے گی۔

کمال شریعت

حاصل یہ ہے کہ شریعت نے ہر حالت کے متعلق ضروری قواعد بتلائے ہیں اور اسی سے ہم کہتے ہیں کہ شریعت کامل ہے۔ بعض لوگ اعتراض کرتے ہیں کہ مولوی ہر بات کے متعلق مسئلہ نکالتے ہیں، پائجامہ، اچکن کے واسطے بھی مسئلہ موجود ہے۔ یہ لوگ شریعت کو تو مختصر سمجھتے ہیں اور یوں خیال کرتے ہیں کہ یہ تفصیل مولویوں نے اپنی طرف سے کی ہے مگر میں اس کو ایک نظیر سے سمجھنا چاہتا ہوں۔

اگر کوئی یوں کہے کہ گورنمنٹ کا قانون مکمل ہے تو میں پوچھتا ہوں کہ اس کے کیا معنی ہیں۔ ہر عاقل یہی کہے گا کہ اس کا مطلب یہ ہے کہ دوسری سلطنتوں کی نسبت اس میں ہر محکمہ کے لئے کافی قانون موجود ہے اور پھر ہر محکمہ کے جزئیات پر پوری تفصیل سے بحث کی گئی ہے۔ مثلاً محکمہ تجارت میں بارود کی تجارت کو بشرط لائسنس جائز اور تیل کی تجارت کو بلا کسی شرط کے جائز بتلایا گیا ہے۔ تو معلوم ہوا کہ کسی قانون کا مکمل ہونا یہ ہے کہ اس میں تمام حالات کے متعلق قواعد ہوں۔ اگر ہم پوچھیں کہ بازار میں چار گھنٹہ کھڑا رہنا ہے یا نہیں تو وکیل کا فرض ہے کہ جواب دے کہ جائز ہے، نہیں تو معلوم ہو جائے گا کہ گورنمنٹ کا قانون ناقص ہے، کامل نہیں تو شریعت کا مختصر ہونا حقیقت میں یہ اس کا نقصان ہے۔ کمال شریعت یہی ہے کہ اس میں تمام انسانی حالات کے متعلق مفصل قواعد موجود ہیں، کوئی جزئی ایسی نکلنی ممکن نہیں جس میں شریعت کا کوئی حکم نہ ہو تو جب ایک سلطنت کے قانون کا مکمل ہونا اس کا عمدہ وصف ہے تو خدا کے قانون کے لیے نقصان کیوں تجویز کیا جاتا ہے اور اگر خدا کے قانون کے لئے مکمل ہونا ضروری ہے تو پھر بدوں اس کے تمام حالات کے متعلق مفصل احکام بیان کیے جائیں تکمیل قانون کیونکر ہو سکتی ہے اور ظاہر ہے کہ اس صورت میں شریعت مختصر نہیں ہو سکتی۔

بعض لوگوں کا خیال ہے کہ شریعت میں سختی بہت ہے جو مسئلہ پوچھو ناجائز بہت اور جائز کم نکلتے ہیں۔ صاحبو! آپ نے مسائل پوچھے نہیں۔ غضب یہ ہے کہ کبھی کبھی برسوں میں تو مولویوں کی صورت دیکھنے میں آتی ہے اور اتفاقاً اس وقت جو مسئلہ پوچھا تو اس کو عالم نے ناجائز بتایا اس سے سائل یہ سمجھا کہ شریعت میں ناجائز کا حکم بہت ہے۔ صاحبو! ایک ہزار مسئلے پوچھو، پھر دیکھو کہ کتنے کو جائز کہیں گے اور کتنے ناجائز نکلیں گے۔ ان شاء اللہ چھ سو جائز اور چار سو ناجائز بلکہ اس سے بھی کم ناجائز ثابت ہوں گے۔ سو اول تو یہی خیال غلط ہے کہ شریعت میں ناجائز کا فتویٰ بہت زیادہ ہے، دوسرے اگر ناجائز کا فتویٰ زیادہ ہو بھی تب بھی آپ کو پوچھنا ضروری ہے کہ تا کہ تمہارا عقیدہ تو درست ہے کیونکہ حرام کو حلال جاننا بعض صورتوں میں کفر ہو جاتا ہے۔ بہرحال شریعت میں انسان کی ہر حالت کے متعلق احکام ہیں۔

احکام مصیبت

حالات دو قسم کے ہیں۔ ایک سرا یعنی نعمت و خوشی کی حالت، دوسرے ضراء یعنی مصیبت و رنج کی حالت۔ اس آیت میں دونوں کے احکام بتلائے گئے ہیں۔ یہ آیتیں ان دونوں کے احکام کو مشتمل ہیں۔ اسی لیے ان کو پڑھا گیا تو سمجھو کہ نعمت میں کیا احکام ہیں اور مصیبت میں کیا تو خوشی کے احکام تو قریب قریب سب کو معلوم ہیں۔ اگرچہ تفاصیل میں کوتاہی ہو مگر مجملاً اکثر لوگ جانتے ہیں کہ خوشی کے کیا احکام ہیں مگر احکام مصیبت بہت کم لوگ جانتے ہیں کیونکہ یہ طبیعت کے خلاف حالت ہے اور انسان کو ناگوار ہے اور ظاہر ہے کہ ناگوار چیز کی طرف توجہ کم ہوا کرتی ہے۔ نیز مصیبت میں چونکہ اشتعال ہوتا ہے یا پژمردگی اس لیے بھی اس کے احکام معلوم کرنے کی طرف توجہ کم ہوا کرتی ہے اس لیے میں اس کو بیان کرتا ہوں۔

سب سے اول تو یہ حکم ہے کہ جب مصیبت میں ابتلاء ہو تو صبر کیا جائے کہ مومن کی یہی شان ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں:

عجبا لامر المؤمن (الی ان قال) ان اصابة سراء شكر فكان خير اله وان اصابة ضراء صبر فكان خيراً له. (موارد الظمآن للهيثمي: ١٨١٤، اتحاف السادة ٩: ١٤٠، كنز العمال: ٦٦٣٧)

''کہ مومن کی بھی عجیب حالت ہے، کوئی حالت اس کو خسارہ نہیں پہنچا سکتی اگر اس کو خوشی

پہنچتی ہے شکر کرتا ہے اور اگر مصیبت پہنچتی ہے صبر کرتا ہے تو دونوں حالتوں میں نفع میں رہا۔"

دوسرا حق مصیبت کا یہ ہے کہ خدا کی رحمت سے مصیبت میں مایوس نہ ہو بلکہ فضل و کرم الٰہی کا امیدوار رہے۔ حق تعالیٰ فرماتے ہیں:

لَا تَايْئَسُوْا مِنْ رَّوْحِ اللّٰهِ ۭ اِنَّهٗ لَا يَايْئَسُ مِنْ رَّوْحِ اللّٰهِ اِلَّا الْقَوْمُ الْكٰفِرُوْنَ

(ناامید مت ہو اللہ کے فیض سے، بیشک ناامید نہیں ہوتے اللہ کے فیض سے مگر وہی لوگ جو کافر ہیں)

کہ خدا کی رحمت سے ناامید نہ ہو کیونکہ خدا کی رحمت سے تو کافر ہی مایوس ہوتے ہیں، مسلمانوں کو تو خدا سے بہت بڑی امید رکھنا چاہیے۔ پس کتنی ہی بڑی مصیبت کیوں نہ ہو دل شکستہ ہرگز نہ ہونا چاہیے۔

ایک حکم یہ ہے کہ مصیبت کی وجہ سے دوسرے احکام شرعیہ میں کوتاہی نہ کرے، اور ان کو ہاتھ سے نہ چھوڑے۔ ہر کسی کو معلوم ہے کہ عزیز کا مرجانا کتنی بڑی مصیبت ہے مگر حکم یہ ہے کہ صرف آنسو بہا سکتے ہو، چلانا اور شور مچانا حرام ہے اس سے معلوم ہوا کہ احکام شرعیہ کا لحاظ رکھنا بڑی سے بڑی مصیبت میں بھی واجب ہے۔

ایک حکم یہ ہے کہ خدا سے اس مشکل کے آسان کر دینے کی دعا کرتا رہے اور تدابیر میں مشغول رہے مگر تدبیر کو کارگر نہ سمجھے۔ شریعت کا یہ مقصود نہیں کہ تمام تدابیر چھوڑ کر ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر بیٹھ جاؤ۔ دعا کا حکم تو اس لیے ہے کہ تدبیر میں بغیر دعا کے برکت نہیں ہوتی اور یہ مقصود نہیں کہ صرف دعا پر اکتفا کیا جائے اور تدبیر کچھ نہ کی جائے۔ البتہ جن کی کوئی تدبیر نہیں جیسے بارش، ان کے لئے صرف دعا جائز ہے اور جس میں تدبیر ہو سکتی ہے اس میں تدبیر دعا دونوں کرو۔

اب ہمارے اندر یہ کوتاہی ہے کہ دو جماعتیں ہو گئیں، بعض نے تو دعا کو اختیار کر کے تدبیر کو چھوڑ دیا اور بعض محض تدبیر کے پیچھے پڑ گئے اور دعا سے منکر ہو گئے۔ مگر ہم نے تو یہ دیکھا ہے کہ جو منکر دعا ہیں مصیبت کے وقت وہی زیادہ گڑگڑاتے ہیں۔ ہائے افسوس! جو چیز اضطراری ہو لوگ اس سے منکر ہوتے ہیں۔ خدا تعالیٰ کا خالق و فاعل ہونا کہ یہی مبنیٰ ہے دعاء کا ایک ایسی فطری بات ہے جس کا ہر دل اضطراراً قائل ہوتا ہے۔ ایک ملحد نے لکھا ہے کہ میں مدتوں خدا کا منکر رہا مگر دل کبھی زبان کے ساتھ متفق نہیں ہوا تو دعا ایک فطری چیز ہے، فطرت سلیمہ خود اس کے ماننے میں سبقت کرتی ہے۔

ایک حکم مصیبت کا یہ ہے کہ استغفار کرو یعنی اپنے گناہوں سے معافی چاہو کیونکہ مصیبت اکثر گناہوں کی بدولت آتی ہے۔

مَآ اَصَابَکُمۡ مِّنۡ مُّصِیۡبَۃٍ فَبِمَا کَسَبَتۡ اَیۡدِیۡکُمۡ

اس پر یہ شبہ نہ کیا جائے کہ انبیاء پر بھی تو مصیبت نازل ہوتی ہے تو کیا ان پر بھی گناہوں کی بدولت نازل ہوتی ہے کیونکہ دیکھنا یہ ہے کہ آیت قرآنی میں مَآ اَصَابَکُمۡ کے مخاطب کون لوگ ہیں۔ اس کے مخاطب اہل مصائب ہیں اور انہی لوگوں کا اس آیت میں حکم مذکور ہے اور جو اہل مصیبت نہ ہوں وہ اس آیت کے نہ مخاطب اور نہ ان کے واسطے یہ حکم اور حضرات انبیاء کرام علیہم السلام واقع میں اہل مصیبت نہیں کیونکہ مصیبت میں مرض کا نام نہیں بلکہ یہ تو صورت مصیبت ہیں۔ بادام وہ ہے جس میں مغز بھی ہو، مٹی کا خربوزہ خربوزہ ہی نہیں پس انبیاء پر جو مصائب نازل ہوتی ہیں وہ صورت مصیبت ہیں، حقیقت مصیبت ان پر نہیں آتی کیونکہ اصل مصیبت وہ ہے جس سے دل میں پریشانی اور بے چینی پیدا ہو۔ پس جو شخص بیمار ہو اور دل کو پریشان پائے، اس کے حق میں یہ مرض مصیبت ہے۔ انبیاء علیہم السلام اور ان کے ورثاء اولیاء کرام چونکہ مرض وغیرہ میں بھی پریشان نہیں ہوتے اس لئے یہ مرض ان کے حق میں رحمت ہے۔ اگرچہ صورۃً مصیبت ہے۔

رہی یہ بات کہ پھر ان پر یہ بلائیں کیوں آتی ہیں۔ سو ان پر امراض وغیرہ کا نزول رفع درجات کے لئے ہوتا ہے۔ البتہ ہمارے یعنی گنہگاروں کے اوپر جو مصائب نازل ہوتی ہیں وہ گناہوں کی وجہ سے نازل ہوتی ہیں اس لیے استغفار کرنا بہت ضروری ہے۔ مولانا فرماتے ہیں:

ہرچہ برتو آید از ظلمات وغم　　آں زبیا کی وگستاخی ہمت ہم
غم چو بینی زود استغفار کن　　غم بامر خالق آمد کارکن

(جو کچھ تجھ کو ظلمات اور غم والم پیش آتے ہیں وہ تیری بے باکی اور گستاخی سے پیش آتے ہیں، جب کوئی غم پیش آئے تو فوراً استغفار کر، غم حق تعالیٰ سے کارکن ہو کر آیا ہے)

سو مصیبت کے چار حکم تو یہ ہوئے۔ ایک پانچواں اور ہے وہ یہ کہ اگر مصیبت ہمارے کسی بھائی مسلمان پر نازل ہو تو اس کو اپنے اوپر نازل سمجھا جائے اور اس کے لیے ویسی ہی تدبیر کی جائے جیسا کہ اپنے اوپر مصیبت نازل ہوتی اس وقت کرتے۔ واللہ! انسان کا دل تو وہ ہے کہ کتے کی مصیبت کو بھی نہیں سہہ سکتا نہ کہ مسلمان کی مصیبت کو۔

حضرت سید احمد کبیر رفاعی رحمۃ اللہ علیہ کی حکایت لکھی ہے کہ آپ نے ایک کتے کو دیکھا کہ چلا جا رہا ہے اور خارش میں مبتلا ہے۔ آپ کو اس کی حالت دیکھ کر رنج ہوا اور طبیب کے پاس

تشریف لے گئے اور نسخہ لکھوا کر لائے اور اپنے ہاتھ سے دوا اس کے بدن پر ملی، یہاں تک کہ جب وہ بالکل تندرست ہو گیا تو آپ خوش ہوئے۔

کوئی یہ نہ سمجھے کہ یہ کوئی مجذوب یا سڑی ہوں گے۔ استغفر اللہ! یہ بڑے پایہ کے شخص ہیں۔ حضرت سید غوث اعظم رحمۃ اللہ علیہ کے معاصر ہیں۔ حضرت غوث اعظم سے ان کے مناقب منقول ہیں اور خود ان کا قصہ ہے کہ ان سے ایک مرید نے دریافت کیا کہ آپ کا کون سا مقام ہے، کیا آپ غوث ہیں؟ تو آپ نے فرمایا: "**نزہ شیخک عن الغوثیہ**" کہ اپنے شیخ کو مرتبہ غوثیہ سے برتر سمجھو۔ اس نے عرض کیا کہ پھر آپ قطب ہیں؟ فرمایا: "**نزہ شیخک عن القطبیۃ**" کہ اپنے شیخ کو مرتبہ قطبیہ سے بھی برتر سمجھو۔ پھر فرمایا کہ حق تعالیٰ نے تمام ارواح اولیاء کو جمع فرمایا اور ارشاد ہوا کہ جو جس کا جی چاہے مانگے۔ ہر ایک نے جو اس کے دل میں تھا عرض کیا، کسی نے مرتبہ غوثیت طلب کیا، کسی نے مرتبہ قطبیہ حتیٰ "**دارت النوبۃ الی ھذا الاشیء احمد**" یہاں تک کہ نوبت مجھ تک پہنچی تو میں نے عرض کیا: "**رب اریدانی ان لا ارید و اختاران لا اختار**" کہ الٰہی! میں یہ چاہتا ہوں کہ کچھ نہ چاہوں اور یہ تجویز کرتا ہوں کہ کچھ تجویز نہ کروں۔ "**فاعطانی مالا عین رات ولا اذن سمعت ولا خطر علی قلب بشر من اھل ھذا العصر**" (پس مجھے وہ چیز عنایت ہوئی جو اس زمانہ والوں میں سے نہ کسی کی آنکھ نے دیکھی اور نہ کسی کے کان نے سنی اور نہ کسی کے دل پر گزری)

تو اتنے بڑے مرتبہ والے شخص اور کتے کا آپ نے خود علاج کیا مگر اس واقعہ سے ہمارے بھائی کتے کے پالنے پر استدلال نہ کریں وہ الگ مسئلہ ہے۔ گفتگو مصیبت کے وقت میں ہو رہی ہے ایسے وقت میں ہر جاندار پر رحم کرنا ضروری ہے۔ اس کا یہ مطلب نہیں کہ اس کو بلاضرورت بھی اپنا رفیق بنا لیا جائے البتہ ضرورت ہو تو مضائقہ نہیں تو جو لوگ کتوں پر مصیبت میں رحم کرتے ہیں ان کو انسان پر کیونکر رحم نہ آئے گا مگر اس کو اہل دل ہی سمجھے گا۔

اثر اخلاص

حدیث شریف میں وارد ہے کہ ایک فاحشہ عورت چلی جا رہی تھی کہ راستہ میں اس نے ایک کتے کو دیکھا کہ پیاس کی وجہ سے جاں بلب ہو رہا ہے۔ اس کو ترس آ گیا اپنا چمڑے کا موزہ پیر سے نکال کر اس کا ڈول بنایا اور اوڑھنی اتار کر رسی بنائی اور کنویں سے پانی نکال کر اس کتے کو پلا دیا۔

جب وہ مری ہے تو اس فاحشہ کو اس عمل کی وجہ سے بخش دیا گیا۔

اخلاص کے ساتھ تھوڑا سا عمل بھی قبول ہو جاتا ہے اور اخلاص بھی نہ ہو تو خالی الذہن ہو کر بھی عمل مقبول ہو جاتا ہے چنانچہ اس عورت کے ذہن میں بھی نہ تھا کہ یہ عمل اتنا بڑا ہے نہ اس نے اخلاص کا قصد کیا نہ ریا سے کیا بلکہ خالی الذہن تھی۔ اس لیے خدا تعالیٰ کو وہ کام پسند آ گیا اور جب عمل میں ریا شریک ہو جاتا ہے تو کام غارت ہو جاتا ہے، ہاں صورت ریا جائز ہے۔ یہ میں نے اس لیے کہہ دیا ہے کہ شاید کوئی جلسہ میں چندہ بھی نہ دے اس خیال سے کہ ریا ہو جائے گا کیونکہ یہ صورت ریا ہوگی اس کا مضائقہ نہیں، اصل ریا دل میں ہوتا ہے۔

حدیث شریف میں ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ دو جگہ خیلاء (تفاخر) جائز ہے۔ ایک صدقہ میں دوسرے عدو دین کے مقابلہ میں۔ تو دکھلا کر دینا ریا نہیں ہے۔ اس میں بعض لوگوں کو غلطی ہو جاتی ہے وہ یہ خیال کرتے ہیں کہ جس کام کو لوگ دیکھ لیں وہ ریا ہے مگر یہ صحیح خیال نہیں ریا کا مدار نیت پر ہے۔ اگر کوئی شخص سب کو دکھا کر اس لیے دیتا ہے کہ دوسروں کو بھی رغبت ہو تو یہ ریا میں داخل نہ ہوگا۔ ہاں حقیقی ریا اگر دل میں ہوگا تو پھر صدقہ مقبول نہ ہوگا اور اگر خالی الذہن ہو کر نہ دکھاوے کی نیت ہے نہ خدا کے لئے نیت ہے، تب بھی قبول ہے۔ جیسا اوپر مذکور ہوا کہ وہ فاحشہ عورت محض اس ذرا سے عمل پر کہ اس نے ایک کتے کو پانی پلا دیا تھا، بخش دی گئی اور اس کا عمل قبول ہو گیا حالانکہ اس نے خالی الذہن ہو کر یہ عمل کیا تھا۔

ایسے ہی اگر آپ کے چندہ سے کسی بیمار کے منہ میں دودھ ڈالا گیا اور اس بے چارہ کو راحت پہنچی تو کیا خدا کو اس کی اتنی بھی قدر نہ ہوگی اس لیے سب لوگوں کو اس چندہ میں شریک ہونا چاہیے۔ جتنا ہو سکے اپنی وسعت کے موافق دینا چاہیے جو لوگ ایک دو پیسہ دے سکتے ہیں وہ بھی شریک ہوں، دیکھو حضور صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں:

من بنی لله مسجدا ولو کمفحص قطاة بنی الله له بیتا فی الجنة. (المسند الامام احمد ۱:۲۴۱، تفسیر ابن کثیر ۸:۱۷)

(یعنی اگر کوئی قطاۃ پرندہ کے آشیانہ کے برابر بھی مسجد بنائے تو اس کیلئے جنت میں گھر بنے گا)

تو دیکھئے کتنے قلیل عمل پر کتنی عظیم فضیلت فرمائی۔ بعض لوگ جن کو شبہات نکالنے کی عادت ہے شاید یہ کہیں کہ یہ حضور کا کلام نہیں کیونکہ اتنی چھوٹی مسجد ہی نہیں ہوگی تو اگرچہ اس کا جواب یہ ہو

سکتا ہے کہ تمام اہل زبان میں مبالغہ کلام کا حسن سمجھا جاتا ہے مگر ہم حدیث کا دوسرا مطلب بیان کرتے ہیں کہ اگر کسی نے مسجد میں مثلاً چار آنے دیئے جس سے عمارت میں اس کے حصہ میں گھونسلہ کے برابر جگہ آئی تو اس کو بھی جنت میں پورا گھر ملے گا۔ اگر چہ اس نے پوری مسجد نہیں بنوائی تو اگر کسی نے خدا کی راہ میں ایک پیسہ بھی دیا تب بھی نجات کے لیے ویسا ہی کافی ہے جیسا کہ ہزار دو ہزار، بلکہ غرباء کے دو چار پیسے امراء کے ہزاروں سے بڑھ جاتے ہیں۔

مثلاً ایک شخص نے لاکھ روپے میں سے ایک ہزار روپے دیئے اور ایک نے ایک پیسہ دیا مگر اس کے پاس یہی ایک پیسہ تھا۔ یہ شخص پہلے سے بڑھ کر ہے کیونکہ اس کے پاس جو کچھ تھا سب دیدیا، اپنی ضرورت کا بھی خیال نہ کیا اور پہلے شخص نے ۹۹ ہزار اپنے کاموں کے لئے بچا کر ایک ہزار خدا کی راہ میں دیئے۔ اس لیے دوسروں کو بھی چاہیے کہ غریب کے چندہ کی قدر کریں اور ان پر ہنسیں نہیں کہ یہ بڑا جرم ہے۔ تعزیرات الٰہیہ کا بھی اور تعزیرات ہند کا بھی کیونکہ اہانت ہے لیکن اگر تعزیرات ہند کا جرم نہ بھی ہو تو تعزیرات الٰہیہ کا تو یقیناً ہے۔ دسویں سپارہ میں فرماتے ہیں:

اَلَّذِیْنَ یَلْمِزُوْنَ الْمُطَّوِّعِیْنَ مِنَ الْمُؤْمِنِیْنَ فِی الصَّدَقٰتِ وَالَّذِیْنَ لَا یَجِدُوْنَ اِلَّا جُهْدَهُمْ فَیَسْخَرُوْنَ مِنْهُمْ ط سَخِرَ اللّٰهُ مِنْهُمْ وَلَهُمْ عَذَابٌ اَلِیْمٌ اِسْتَغْفِرْ لَهُمْ اَوْ لَا تَسْتَغْفِرْ لَهُمْ ط اِنْ تَسْتَغْفِرْ لَهُمْ سَبْعِیْنَ مَرَّةً فَلَنْ یَّغْفِرَ اللّٰهُ لَهُمْ

"یہ (منافقین) ایسے ہیں کہ نفل صدقہ دینے والے مسلمانوں پر طعن کرتے ہیں اور (خصوص) ان لوگوں پر جن کو محنت مزدوری کے سوا اور کچھ میسر نہیں ہوتا، ان سے تمسخر کرتے ہیں، اللہ تعالیٰ ان کو اس تمسخر کا بدلہ دے گا اور ان کے لئے دردناک سزا ہوگی تو آپ ان (منافقین) کے لئے استغفار کریں یا نہ کریں اگر آپ ان کے لئے ستر بار بھی استغفار کریں گے تب بھی اللہ تعالیٰ ان کو نہ بخشے گا۔

اس کا واقعہ یہ ہے کہ ایک مرتبہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے چندہ کی ترغیب دی تھی تو حضرت عبدالرحمٰن بن عوف تو اتنا لائے کہ اٹھ بھی نہ سکا اور ایک صحابی جو کے دانے لائے۔ منافقین دونوں پر ہنسے، ایک کو ریا کار بنایا، ایک کو بے شرم، حق تعالیٰ اس کو بھلا کیا دیکھ سکتے تھے۔ ایک قدسی میں فرماتے ہیں: میں نے تفسیر مظہری میں یہ حدیث دیکھی ہے کہ مجھے اپنے مقبول بندے کو چھیڑنے پر ایسا غصہ آتا ہے جیسے شیر کے بچوں کے چھیڑنے پر شیر کو۔ دوسری حدیث قدسی میں ہے: "**من عادلی ولیاً فقد اذنته بالحرب**" (کہ جو میرے ولی سے عداوت رکھے اس کو میری طرف سے اعلان جنگ ہے)

بس تجربہ کردیم دریں دیر مکافات   با دردکشاں ہر کہ در افتادہ برافتاد

(اس دیرِ مکافات میں بہت تجربہ ہم نے کیا ہے کہ جو شخص اہل اللہ سے الجھا ہلاک ہوگیا)

اور فرماتے ہیں:

ہیچ قومے را خدا رسوا نہ کرد   تا دل صاحب دلے نامد بدرد

(کسی قوم نے اس وقت تک اللہ تعالیٰ کو ناراض نہیں کیا جب تک انہوں نے کسی اہل اللہ کو تکلیف نہیں پہنچائی)

ایک مقبول بندے کے ستانے پر شہر کے شہر تباہ کردیے ہیں۔ حق تعالیٰ اپنے مقبول بندے پر طعن کو نہیں دیکھ سکتے، فوراً اس کا بدلہ لیتے ہیں۔ اسی طعن کے بارے میں فرماتے ہیں:

اَلَّذِیْنَ یَلْمِزُوْنَ الْمُطَّوِّعِیْنَ مِنَ الْمُؤْمِنِیْنَ فِی الصَّدَقٰتِ وَالَّذِیْنَ لَا یَجِدُوْنَ اِلَّا جُهْدَهُمْ فَیَسْخَرُوْنَ مِنْهُمْ

کہ جو لوگ طعن کرتے ہیں ان لوگوں پر بھی جو رغبت ظاہر کرتے ہیں صدقات میں اور وہ مومن ہیں اور ان لوگوں پر بھی جو نہیں پاتے خرچ کرنے کو مگر اپنی طاقت کے موافق، تو جو ان سے تمسخر کرتے ہیں، خدا ان کے تمسخر کا بدلہ لے گا اور وہ بدلہ یہ ہے۔ **وَلَهُمْ عَذَابٌ اَلِیْمٌ** کہ ان کو سخت عذاب ہوگا۔ آگے اس کو اچھی طرح موکد فرماتے ہیں کہ آپ ان کے لئے استغفار کریں یا نہ کریں برابر ہے۔ اگر آپ ستر مرتبہ بھی استغفار کریں گے تو خدا تعالیٰ ان کو نہ بخشیں گے۔

اس سے کوئی یہ نہ سمجھیں کہ کوئی گناہ ایسا بھی ہے کہ وہ توبہ و استغفار سے بھی نہیں بخشا جاسکتا کیونکہ اس آیت میں تو حضور کو ارشاد ہے کہ آپ ان کے واسطے کتنا ہی استغفار کریں ہم نہیں بخشیں گے۔ بات یہ ہے کہ وہ لوگ خود استغفار نہ کرتے تھے اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی دعا و استغفار اسی وقت مفید ہوسکتی ہے کہ گناہ کرنے والا خود بھی توبہ کرنا چاہے۔ حق تعالیٰ نے یہ تو نہیں فرمایا کہ یہ لوگ استغفار کریں یا نہ کریں ہم بخشیں گے۔ اگر یہ فرماتے تو شبہ کی گنجائش تھی کہ کیا بعضے گناہ استغفار سے بھی معاف نہیں ہوسکتے تو اگر وہ خود استغفار کرتے تو ایک مرتبہ "**اللّٰهم اغفرلی**" کہنا بارود کی طرح گناہوں کو اڑا دیتا ہے۔

غرض چھوٹے چندوں کو بھی حقیر نہ سمجھو جو کچھ بھی کوئی دے اس کی قدر کرو۔ اگر کوئی آدھا چھوارہ بھی دے تب بھی لے لو، موجب اجر ہے۔ یہ نہیں کہ انبار میں رل جائے گا۔ ہر چیز خدا کے

سامنے ہے (یہاں تک بیان فرما کر مولانا نے ارشاد فرمایا کہ میرا چوغہ اونی چندہ میں دے دیجئے) (یہ چوغہ ۴۰=۴۵ روپے میں فروخت ہوا)

حدثواب

ہر چیز پر ثواب ملے گا بلکہ ذرا سا صدقہ بہت ہو کر ملے گا۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم ارشاد فرماتے ہیں کہ "اگر ایک خرما خدا تعالیٰ کی راہ میں دے گا اللہ تعالیٰ اپنے دست مبارک میں اس کو لے لیتے ہیں اور اس کو بڑھاتے ہیں۔ یہاں تک کہ وہ احد پہاڑ سے بڑا ہو جاتا ہے۔" تو خیال کیجئے کہ احد پہاڑ کتنا بڑا ہے۔ تو میں آپ کو متوجہ کرتا ہوں کہ اگر کوئی احد پہاڑ کے ٹکڑے چھوارے کے برابر کرے تو وہ کتنے ہوں اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ "وہ صدقہ احد سے بھی بڑا ہو جاتا ہے۔" اس سے سمجھ میں آ گیا ہوگا کہ ثواب کس قدر بڑھتا ہے۔ اکثر لوگ سمجھتے ہیں کہ حد سے حد ثواب سات سو تک بڑھتا ہے۔ میں حدیث سے بتلاتا ہوں کہ لاکھوں کروڑوں تک بڑھتا ہے۔ دیکھو حدیث سے کیسے نفع کی بات معلوم ہوئی اور لیجئے میں قرآن سے بھی بتلاتا ہوں کہ سات سو تک حد نہیں، آگے ثواب بھی بڑھتا ہے۔ ارشاد ہے:

مَثَلُ الَّذِيْنَ يُنْفِقُوْنَ اَمْوَالَهُمْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ كَمَثَلِ حَبَّةٍ اَنْبَتَتْ سَبْعَ سَنَابِلَ فِيْ كُلِّ سُنْبُلَةٍ مِّائَةُ حَبَّةٍ ط وَاللّٰهُ يُضٰعِفُ لِمَنْ يَّشَآءُ ط وَاللّٰهُ وَاسِعٌ عَلِيْمٌ

ارشاد ہوتا ہے کہ "جو لوگ خدا کی راہ میں خرچ کرتے ہیں ان کی ایسی حالت ہے کہ کسی نے ایک دانہ بو دیا، اس نے سات بالیاں اُگائیں، ہر بالی میں سو دانے پیدا ہوئے تو ایسے ہی ان لوگوں کو ایک چیز کے بدلہ میں سات سو گنا ثواب ملے گا۔" اس کے بعد فرماتے ہیں کہ خدا جس کسی کو چاہے اس سے بھی زیادہ بڑھا دے کیونکہ خدا صاحب وسعت ہے اور جاننے والا ہے۔ وَاللّٰهُ وَاسِعٌ سے ایک شبہ دور کر دیا کہ یہ خیال نہ کرنا کہ اتنا ہر ایک کو کہاں سے ملے گا۔ تو فرماتے ہیں کہ ہم دنیا کے بادشاہوں کی طرح عاجز نہیں، خدا بہت بڑا صاحب وسعت ہے مگر جہاں اس قدر ترغیب دی یہ انتظام بھی کر دیا کہ کوئی اتنا ثواب سن کر عجب و تکبر نہ کرے تو فرماتے ہیں کہ علیم کہ ہم نیتوں کو بھی جانتے ہیں۔ نیت درست کر لو تو صدقہ قبول ہوگا۔ پس واسع میں تو پھاٹک کھول دیا اور علیم فرما کر ایک قفل لگا دیا اور یہ نہیں کہ راہ تنگ کر دیا کیونکہ تنگ کرنا اس وقت ہوتا کہ کوئی بڑی سخت شرط لگاتے۔ یہاں تو ایسی شرط لگائی کہ دینے سے بھی زیادہ آسان ہے کیونکہ خلوص تو دل

میں سمجھ لینا ہے، تو آیت اور حدیث دونوں سے معلوم ہو گیا کہ ثواب کی کوئی حد نہیں تو کسی کے صدقہ کو حقیر نہ سمجھو، قبول و تضاعف کا مدار نیت پر ہے، خواہ کیسا ہی قلیل ہو۔

حتیٰ کہ آپ نے سنا ہوگا کہ ایک بڑھیا یوسف علیہ السلام کو سوت کی آنٹی لے کر خریدنے گئی تھی مگر یوسف تو ایک تھے وہ دس کو کیسے ملتے۔ پھر تاجر طماع تھے اس لیے ان کو بڑھیا کی قدر نہ ہوئی اور یہاں خریدنے والا قدردان ہے۔ اگر سوت کی آنٹی بھی خلوص کے ساتھ دی جائے گی تو وہ بھی بہت زیادہ ثواب کی موجب ہوگی۔

فضائل خیرات

حدیث شریف میں اس کی نظیر ایک واقعہ ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم جب مدینہ میں تشریف فرما تھے تو آپ کی خدمت میں چند آدمی قبیلہ مضر کے حاضر ہوئے۔ بیچارے کمبلوں میں لپٹے ہوئے تھے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو ان کی اس بے سروسامانی پر ترس آیا۔ حدیث کے الفاظ یہ ہیں۔ "فتمعر وجه رسول الله صلى الله عليه وسلم (یعنی حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کا چہرہ مبارک رنج سے متغیر ہو گیا)۔ ہمارے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ حالت تھی کہ ہماری ذراسی تکلیف بھی گوارہ نہ تھی۔ جب دنیا کی تکلیف سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم پر اتنا اثر ہوتا تھا تو بھلا آخرت کی تکالیف سے کیونکر اثر نہ ہوگا۔ مسلمانوں کے لئے بڑی خوشی کی بات ہے کہ خدا نے ان کو ایسا پیغمبر دیا کہ ہماری خراب وخستہ حالت دیکھ کر ان کو بے چینی ہو جاتی ہے۔

نماند بعصیاں کسے درگرو　　　　که دارد چنیں سید پیشرو

(وہ شخص گناہوں کے باعث رہن رہے گا جو ایسا پیشتر و سردار رکھتا ہو)

تو ان شاءاللہ ہم کو بہت بڑی امید ہے مگر کچھ اپنا عمل بوتا چاہیے ورنہ ایسی مثال ہوگی کہ ایک شخص اولاد کا خواہش مند ہے مگر نکاح نہیں کرتا بلکہ تعویذوں پر بھروسہ کیے ہوئے ہے۔ ظاہر ہے کہ ہر عاقل اس کو بیوقوف کہے گا کیونکہ تعویذوں کا تو یہ فائدہ ہے کہ تم تدبیر کرو تعویذ سے اس تدبیر میں برکت ہو جائے گی۔ یہ تو نہیں کہ سارا کام تعویذ ہی کر دے گا، وہی عورت کا کام دے اور اسی میں سے بچہ پیدا ہو جائے۔ اسی طرح انبیاء اور اولیاء سے بھی جو امید ہے وہ اس وقت ہے کہ خود بھی کچھ کیا جائے اور محض شفاعت کے بھروسہ پر کام چھوڑ دینا اور ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر بیٹھ جانا سخت نادانی اور حماقت ہے۔

بہر حال ان لوگوں کی بے سروسامانی دیکھ کر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا چہرہ متغیر ہو گیا اور آپ ؐ نے خطبہ فرمایا جس میں لوگوں کو صدقہ کی ترغیب دی۔ مسلم اور نسائی کی حدیث میں آپ ؐ کا ارشاد ہے:

تصدق رجل من دينار، من درهم من ثوبه من بره من صاع من تمر.

(الصحيح مسلم الزكاة: ٦٩، سنن النسائي الزكاة ب: ٦٣)

(لوگوں نے اپنے دینار میں سے، اپنے درہم میں سے، اپنے کپڑوں میں سے، اپنی گندم، جو اور کھجوروں سے صدقہ دیا)

لوگوں نے لانا شروع کیا یہاں تک کہ دو ڈھیر لگ گئے اور بحمد اللہ ہمارے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت سے معلوم ہو گیا کہ جس کو جو دینا آسان ہو وہ دے۔ مثلاً شہریوں کو کپڑا اور نقد دینا آسان ہے، یہ کپڑا اور نقدی دیں اور دیہاتیوں کو غلہ دینا آسان ہے، وہ غلہ ہی دیں، غرض جس سے ہو سکے وہ دے۔ صاحبو! گھروں کا جائزہ لو، زیادہ وہ چیزیں نکلیں گی جو برسوں صندوقوں میں رہتی ہیں۔

حرص قانع نیست صائب ورنہ اسباب معاش آنچہ مادر کار داریم اکثر در کار نیست

(صائب حرص قناعت کرنے والی نہیں ورنہ اسباب معاش میں ہمارے پاس اکثریت اس سامان کی ہے جس کی ہمیں ضرورت نہیں)

واقعی اکثر حرص کی وجہ سے اسباب معاش بڑھ جاتے ہیں ورنہ جو چیزیں ہم کام میں لاتے ہیں اکثر بے کار ہیں۔ دیکھو ضرورت کی وہ چیز ہے جس کے بغیر تکلیف اور ضرر ہو۔ ذرا انصاف کے ساتھ دیکھا جائے کہ گھر میں کتنی چیزیں ایسی ہیں کہ جن کے نہ ہونے سے تکلیف ہو گی تو جو چیزیں ضرورت سے زائد ہوں ان کے کام میں لانے کا اس سے زیادہ کیا موقع ہو گا۔ اللہ کی راہ میں اس کو خرچ کیا جائے۔ دیکھو! حق تعالیٰ کی کتنی بڑی رحمت ہے کہ دین کے کاموں میں خرچ کرنے کو فی سبیل اللہ یعنی خدا کی راہ میں خرچ کرنا کہا۔ کیا معاذ اللہ اس میں کوئی خدا کا نفع ہے بلکہ تمہارا ہی نفع ہے اور یہ خرچ واقع میں فی انفسکم ہے۔ مگر حق تعالیٰ کی رحمت تو دیکھئے کہ ہم کو نفع حاصل کرنے کی کس طرح ترغیب دی کہ اس خرچ کو اپنی طرف منسوب فرمایا کہ ہمارے واسطے اور ہماری راہ میں خرچ کرو حالانکہ اس میں سراسر ہمارا ہی نفع ہے اور ہم اپنے ہی واسطے خرچ کرتے ہیں۔

اس لحاظ سے تو اگر یہ قانون کر دیا جاتا کہ صدقہ اس شخص کا قبول ہو گا جو پہلے اتنی فیس داخل کرے تو ہم کو فیس دے کر خرچ کرنا چاہیے تھا کیونکہ ہمارے نفع کا کام تھا، دیکھو! بینک میں یا کسی کوٹھی میں

روپیہ داخل کیا جاتا ہے تو بینک کو بھی اس میں نفع ملتا ہے اور خدا کے ہاں بلا فیس داخل کیا جاتا ہے اور بینک میں تو اپنا نفع کاٹ کر بقیہ واپس کیا جاتا ہے اور خدا تعالیٰ کے ہاں اپنے پاس سے ملا کر دیا جاتا ہے۔ مگر افسوس! آج کل مسلمانوں کو بینکوں میں تو روپیہ داخل کرنے کی ہوس ہے اور خدا کے پاس جمع کرنے کی ہوس نہیں اور یہ میں کوئی اپنی طرف سے نہیں کہتا بلکہ آیت وحدیث سے دکھلا چکا ہوں۔

بہر حال چونکہ خدا کے یہاں ہر چیز کی قدر ہوتی ہے اس لیے ہر شخص کو چندہ میں شرکت کرنی چاہیے۔ پھر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ بھی فرمایا ہے:

من سن سنة حسنة فله اجرها واجر من عمل بها. (سنن ابی ماجه:۷، ۲۰۷، المسند الامام احمد بن حنبل ۴: ۳۶۱، ۳۶۲)

(نیک کام کی ابتدا کرنے والے کو اپنی نیکی کا بھی اور جس نے اس پر عمل کیا اس کا بھی ثواب ملے گا)

تو بانی یعنی ابتداء کرنے والے کو بہت زیادہ ملتا ہے اور ممکن ہے کہ بعض کو یہ شبہ ہو کہ ہم تو ابتداء نہیں کر سکے کیونکہ ہم سے پہلے بہت لوگ دے چکے ہوں گے تو سمجھو جبکہ مجمع میں چندہ ہوتا ہے تو ہر ایک دوسرے کے لئے بانی ہے۔ یعنی بعض مرتبہ ایک شخص کے دینے سے دوسرا ابھر جاتا ہے۔ تو وہ اس کے لئے بانی اور محرک ہوا اس کے دینے کا ثواب اس کو بھی ملے گا۔ حاصل یہ کہ بانی عام ہے، اضافی ہو یا حقیقی، تو اگر ابتداء حقیقی نہیں کر سکتے تو ابتداء اضافی تو کر سکتے ہو اور حق تعالیٰ کی رحمت بہت بڑی ہے۔ فرماتے ہیں: "اِنْ مِّنْ شَیْءٍ اِلَّا عِنْدَنَا خَزَآئِنُهٗ". (سب چیزوں کے خزانے اسی کے قبضہ میں ہیں) پھر ناامید کیوں ہوتے ہو۔ امید رکھو، ان شاء اللہ ہر ہر بانی کو سب برکات عطاء ہوں گی یہ تو مطلق خیرات کے فضائل تھے۔

فضیلت صدقہ

اب سنئے کہ صدقہ کی فضیلت خصوصیت محل سے بھی بڑھ جاتی ہے۔ آج کل بہت سے یتیم ہیں، بہت سی عورتیں بیوہ ہیں اور یتیم اور بیواؤں پر رحم کرنا بہت بڑے ثواب کا کام ہے۔ حدیث میں وارد ہے:

الساعی علی الارملة کالصائم یفطر والقائم لایفتر او کمال قال. (الصحیح للبخاری ۷: ۸۰، ۸: ۱۰، ۱۱، الصحیح لمسلم الزهد: ۴۱)

(ساری رات کا جاگنا اور ساری عمر روزہ رکھنا جتنی فضیلت رکھتا ہے، اتنی ہی مساکین کی

نگہداشت میں فضیلت ہے)

ارملہ کی فرد بیوہ عورتیں بھی ہیں اور حدیث میں وارد ہے:"انا و کافل الیتیم کھاتین أو کما قال". (یعنی جو شخص یتیم کی کفالت کرے جنت میں وہ اور میں مثل ان دو انگلیوں کے ہوں گے یعنی سبابہ اور وسطیٰ کی۔ حدیث میں یہ بھی مذکور ہے۔"وفرج بینھما" کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد کے وقت دونوں انگلیوں میں کشادگی فرمائی تھی۔ اس تشبیہ سے حضور کا مقصود قرب کا بتلانا ہے کہ ایسے شخص کو جنت میں مجھ سے قرب حاصل ہوگا جیسا کہ سبابہ کو وسطیٰ سے قرب ہے۔

اس سے یہ شبہ نہ ہو کہ وہ شخص حضور کے برابر ہو جائے گا۔ (معاذ اللہ)! کیونکہ اول تو یہ شبہ اسی سے زائل ہو گیا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے تشبیہ میں انگشت شہادت اور وسطیٰ استعمال فرمایا۔ اور ظاہر ہے کہ ان دونوں انگلیوں میں سے انگشت دوسری سے بڑھی ہوئی ہے اور اس کے ساتھ باہم قرب بھی ہے۔ ایسے ہی سرور دو عالم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بوجہ نبوت و رسالت کے اس شخص سے بڑھے ہوئے ہیں مگر اس فضیلت کے ساتھ ہی اس عمل مقبول کی وجہ سے کافل یتیم کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ ایک قسم کا قرب بھی ہے۔

دوسرے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اشارہ میں کشادگی ظاہر کر دینے سے بھی یہ بتلا دیا کہ علاوہ فرق مراتب کے حضور میں اور اس میں حسی فرق بھی ہوگا تو مساوات کا وہم بالکل نہیں ہو سکتا۔

اگر کوئی کہے کہ پھر کیا ہوا پیغمبر تو نہ ہوئے۔ میں کہتا ہوں کہ یہ کمی نہیں تمہارے لیے بڑی رحمت ہے۔ میں ایک گاؤں کے جاہل آدمی سے پوچھتا ہوں کہ اگر کوئی تم کو ڈپٹی کلکٹری دینا چاہے تو کیا تم قبول کر لوگے اور ظاہر ہے کہ یہ شخص قبول نہ کرے گا۔ یہی ڈپٹی کلکٹری ایک شخص کے لئے باعث راحت ہے اور گاؤں والے کے لئے عذاب ہے۔

پس تمہارا پیغمبر نہ ہونا کوئی نقص نہیں بلکہ خدا کی بہت بڑی رحمت ہے کیونکہ ہر چیز کا ایک بار ہوتا ہے کہ اس کا متحمل ہر شخص نہیں ہو سکتا۔ نبوت کا ایک تو دنیا میں بار تھا جس کو سب جانتے ہیں کہ اس کا برداشت کرنا اور کما حقہ اس کا حق ادا کرنا حضرات انبیاء علیہم السلام ہی کا کام تھا اور ایک بار وہاں ہوگا، آخرت میں بھی اس کا تحمل بجز ان ذات مقدسہ کے کسی سے نہ ہوگا۔

اگر کہوں کہ وہاں کیا بار ہوتا وہاں تو کھانا پینا ہی ہوگا۔ تو میں کہتا ہوں کہ یہ غلط ہے، کھانا پینا تو بعد وصول جنت کے ہوگا۔ وصول جنت سے پہلے بہت سے مرحلے طے کرنے ہوں گے بلکہ

بعض مرحلے ایسے ہوں گے کہ انبیاء علیہم السلام میں بھی حضور صلی اللہ علیہ وسلم ہی کے ساتھ خاص ہوں گے۔ مثلاً حق تعالیٰ سے حساب و کتاب شروع کرنے کی بابت عرض کرنے کی کسی کو ہمت نہ ہوگی۔ سارے انبیاء علیہم السلام بوجہ خوف کے اس سے انکار کر دیں گے۔ آخر کار حضور صلی اللہ علیہ وسلم اس کا ذمہ لیں گے اور فرمائیں گے "انا لہا" کہ میں اس کے لائق ہوں۔ جب مرتبہ رسالت محمدیہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعض کام ایسے دشوار ہوں گے کہ اس کے متحمل دیگر انبیاء بھی نہ ہو سکیں گے۔ پھر بھلا ہماری اور تمہاری تو کیا حقیقت ہے۔ معلوم ہوا کہ آخرت میں بھی انبیاء کرام علیہم السلام پر منصب نبوت کا ایک ایسا بار ہوگا جس کا تحمل ہر شخص سے نہیں ہو سکتا۔

دوسرے یہ کہ کھانے پینے میں بھی تو سب برابر نہیں ہو سکتے۔ مرتبہ محمدیؐ کے لائق جو انواع و اقسام کی نعمتیں ہوں گی ہر شخص ان کے قابل اور ان کا متحمل نہیں ہوگا۔ اگر کوئی کہے کہ دیدار خداوندی حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو ہوگا اگر اتنا ہی اس شخص کو بھی ہو جو یتیم کی پرورش کرتا ہے البتہ اس کو ہم حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے قریب سمجھیں گے۔ تو میں کہتا ہوں کہ صاحبو! اگر نگاہ کمزور ہے تو پانی میں آفتاب کو دیکھا کرتے ہیں۔ قوی نگاہ بلا واسطہ آفتاب کو دیکھ سکتی ہے تو ایسا ہی خداوند کریم کا دیدار ہے۔ آپ کو دیدار الٰہی کا اس قدر تحمل نہیں جس قدر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو ہے۔ اگر اتنا دیدار آپ کو ہو جائے تو آپ فنا ہو جائیں۔ سچ کہا ہے:

اگر یک سرموئے برتر پرم　　فروغ تجلی بسوزد پرم

(اگر میں ایک بال کے سر کے برابر آگے بڑھوں تو تجلیات الٰہی سے خاکستر ہو جاؤں)

آپ کے لئے زیادہ قرب نہ ہونا ہی رحمت ہے اور مطلق قرب نعمت نہیں، غرض دنیا میں یتیم بھی ہیں، بیوہ عورتیں بھی ہیں اور ان لوگوں پر رحم کر کے ان کی اعانت کرنا دینی کام ہے اور بہت بڑے اجر کا باعث ہے اور زخم تو سخت تکلیف کی چیز ہے۔ ذرا کہیں کانٹا چبھ جاتا ہے تو سارا بدن بے چین ہو جاتا ہے، زخمی بھی قابل رحم ہیں، مسلمان وہ ہے جو دوسرے مسلمان کی مصیبت سے بے چین ہو جائے کہ فرماتے ہیں:

بنی آدم اعضائے یک دیگراند　　کہ در آفرینش زیک جوہر اند

چو عضوے بدرد آورد روزگار　　دگر عضوہا را نماند قرار

چواز محنت دیگراں بے غمی　　نشاید کہ نامت نہند آدمی

(تمام اولادِ آدم (علیہ السلام) ایک دوسرے کے اعضاء کی مانند ہیں کیونکہ ان کی پیدائش ایک ہی جوہر سے ہے، اگر کسی وقت بدن کے کسی عضو میں درد ہو تو سارا بدن بے قرار رہتا ہے، اگر تو دوسروں کی تکلیف و رنج سے لاپرواہ ہے تو تجھے آدمی کا نام دینا جائز نہیں)

تو ادنیٰ مصیبت میں یہی حال سب کا ہونا چاہیے۔ چہ جائیکہ بڑی مصیبت میں پڑیں اور اسی جلسہ تک بس نہ کیجئے بلکہ اس کے بعد بھی اس کا سلسلہ قائم رکھئے اور دوسروں کو ترغیب دیجئے۔ یہاں تک کہ حق تعالیٰ اس غم کو خوشی میں بدل دیں اور مسلمانوں میں چونکہ باہم اجتماعی شان مرعی ہے اسی لیے آپ کو چاہیے کہ اس میں سب کو شریک کریں اور جس سے جتنا ہو سکے اس میں کمی نہ کریں۔ تو ایک حق یہ ہے کہ اس مصیبت کا جو بواسطہ دوسرے کی مصیبت کے اور حقیقت میں ایسی مصیبت بواسطہ کا علاج بھی اپنی ہی مصیبت کا علاج ہے کیونکہ دوسرے کی تکلیف سے دل کڑھتا ہے تو اس کی اعانت کر کے اپنی ہی طبیعت کو راحت پہنچائی۔ یہ احکام ہیں مصیبت کے متعلق جن کا مجموعہ پانچ حکم ہوئے جن میں سے ایک کی تو میں نے خوب تفصیل کر دی، دوسروں کو بھی مختصر بیان کر کے ختم کرتا ہوں۔ ان میں سے ایک اس کا بھی بیان کیا تھا کہ صبر کرو۔

اطاعت احکام

سو صبر کہتے ہیں استقلال کو، تو ایسا نہ کرنا چاہیے جیسا کہ آج کل لوگ ہر واقعہ سے بے استقلالی ظاہر کرنے لگتے ہیں۔ مثلاً زیادہ شور و غل کرنا زیادہ پریشانی ظاہر کرنا جس سے معلوم ہو کہ ان کو بہت رنج ہے۔ صاحبو! شریعت نے ہم کو اس قدر شور و غل کی اجازت نہیں دی بلکہ یہ حکم دیا ہے:

يَآأَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اصْبِرُوْا وَصَابِرُوْا

''اے ایمان والو! صبر کرو اور مقابلہ میں مضبوط رہو۔''

نیز شور و غل خلاف احتیاط بھی ہے۔ بعض اوقات اس سے حکام کو غلط شبہات ہو جاتے ہیں تو کوئی بات خلاف احتیاط مت کرو۔ دیکھو! حکام کی کتنی بڑی مہربانی ہے کہ ہم کو ہمارے بھائیوں کے ساتھ ہمدردی کرنے سے روکا نہیں ہم کو چندہ بھیجنے کی اجازت دیدی۔ اگر حکام منع کر دیتے تو ہم کو اطاعت ضروری تھی، بدوں اجازت چارہ نہ تھا مگر دل پر ایک عظیم صدمہ ہوتا کہ ہم اپنے بھائیوں کی امداد نہیں کر سکتے تو جب حکام نے ہم کو اجازت دیدی ہے اس کا ہمیں شکر گزار ہونا چاہیے اور اس احسان کی قدر

کرنی چاہیے اور ایسی کوئی بات ظاہر نہ کرنی چاہیے جس سے حکام کو تشویش ہو۔ شریعت نے ہمیں تعلیم دی ہے کہ محسن کا شکریہ ادا کرو۔ جب کوئی تمہارے ساتھ بھلائی کرے تم بھی اس کے ساتھ بھلائی کرو۔

آج کل بعض نام کے مولویوں نے مطلق حکام کی اطاعت اس آیت سے نکالی ہے۔

یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْٓا اَطِیْعُوا اللّٰہَ وَاَطِیْعُوا الرَّسُوْلَ وَاُولِی الْاَمْرِ مِنْکُمْ

''اے ایمان والو اطاعت کرو اللہ کی اور اطاعت کرو رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی اور جو تم میں سے حاکم ہو۔''

کیونکہ اس آیت میں صیغہ امر مطلق اولی الامر کے لئے وارد ہے اور اولی الامر کو عام لے لیا ہے مگر یہ محض خوشامد ہے۔ اس آیت میں ہر حاکم ہرگز داخل نہیں ہوسکتا۔ اولی الامر سے مراد خلفائے اسلام ہیں، منکم اس کی کھلی دلیل ہے۔ البتہ دوسرے حکام کی اطاعت ایک دوسری دلیل شرعی سے ضروری ہے۔ وہ یہ کہ یہ لوگ محسن ہیں کیونکہ ہمارے امن و آسائش کے ذمہ دار ہیں، ہمارے دین کی باتوں میں دخل نہیں دیتے، اس احسان کے صلہ میں ہمارے ذمہ ضروری ہے کہ ہم بھی ان کو تشویش میں نہ ڈالیں اور دنیوی امور میں بہ پابندی احکام شرعیہ ان کی اطاعت کریں۔

ایک حدیث سے یہ مسئلہ ثابت ہوتا ہے۔ حدیث میں وارد ہے کہ جب غزوۂ بدر میں مسلمانوں کو غلبہ ہوا اور بہت سے کفار مارے گئے اور بہت سے قید ہو کر آئے تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

لو کان مطعم بن عدی حیا و کلمنی فی ھؤلاء النتنی لترکتھم لہ. (سنن ابی داؤد: ۲۶۸۹، السنن الکبریٰ للبیھقی ۶:۳۱۹، ۹، ۶۷)

''کہ اگر مطعم بن عدی زندہ ہوتے اور ان گندہ کفار کی بابت گفتگو کرتے تو میں ان کو ان کی خاطر چھوڑ دیتا۔''

بعض روایتوں میں آیا ہے کہ کان یشکو لہ کہ حضرت صلی اللہ علیہ وسلم ان کی شکر گزاری کے لئے ایسے فرماتے تھے کیونکہ جس وقت حضور صلی اللہ علیہ وسلم مکہ معظمہ سے طائف تشریف لے گئے کہ شاید وہاں کے باشندے مسلمان ہو جائیں اور وہاں تکلیف سے نجات ملے گی مگر وہاں کے لوگوں نے آپؐ کے ساتھ نہایت گستاخانہ سلوک کیا تو آپؐ بددل ہو کر مکہ معظمہ واپس تشریف لائے اور مطعم بن عدی کو اطلاع فرمائی کہ اگر اہل مکہ مجھے امن دیں تو شہر میں آؤں ورنہ کسی دوسری جگہ چلا جاؤں، اس وقت مطعم بن عدی نے اہل مکہ سے کہا کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو میں نے پناہ دی ہے، خبردار کوئی ان کو ہاتھ نہ لگائے۔ چنانچہ اس وقت سے ہجرت مدینہ تک حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم مطعم بن عدی کی پناہ کی وجہ سے مکہ میں تشریف فرما رہے۔ ان کی اس ہمدردی کا ہمیشہ

حضور صلی اللہ علیہ وسلم شکریہ ظاہر فرماتے تھے۔ اسی کے صلہ میں یہ ارشاد فرمایا تھا:

اس وقت بعینہ یہی حالت ہے ہماری ان احکام کے ساتھ کہ جس طرح مطعم بن عدی نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی حمایت کی تھی اور آپؐ ان کے شکر گزار اور ممنون تھے۔ اسی طرح حکام وقت ہمارے محافظ ہیں اور ہمارے امن کے ذمہ دار ہیں ہم کو بھی ان کا شکر گزار رہنا چاہیے جس کا ادنیٰ اثر یہ ہونا چاہیے کہ کوئی ایسی شورش نہ کریں جس سے حکام تشویش میں پڑ جائیں۔ دیکھو شریعت نے جہاں مصیبت زدہ کے ساتھ ہمدردی کا حکم کیا ہے صبر کا حکم بھی دیا ہے تو یہ تمام جوش و خروش خلاف شرع ہے اور جہاں تک میں اندازہ کرتا ہوں یہ شورش اکثر بے دینوں میں ہے جن کو دین کا علم بہت کم ہے، دینداروں میں امن وسکون ہے۔

غور سے معلوم ہوا کہ یہ نئی روشنی والے اس شورش کے اندر بھی یورپ کی تقلید کرتے ہیں۔ یہ طریقہ یورپ ہی کا ہے کہ جو کام کرتے ہیں بڑھا چڑھا کر لوگوں کو دکھلا کر کرتے ہیں۔ اگر کسی قوم سے مخالفت ہوگی تو اہل یورپ اس کی بنائی ہوئی چیزیں استعمال نہیں کریں گے اور جو پہلے سے گھر میں ہوں ان کو جلا پھونک دیتے ہیں۔ چنانچہ پچھلے دنوں اٹلی کی مخالفت میں ہمارے نوجوان تعلیم یافتوں نے بہت سے کپڑے، ٹوپیاں وغیرہ جلا دیں کیونکہ وہ مال اٹلی کا بنایا ہوا تھا۔ ہم کو تو یہ بات پسند نہیں، لوگ کہتے ہیں کہ اہل شریعت میں تہذیب نہیں، اس وقت تو شریعت سے بعید ہونے والوں کی تہذیب معلوم ہوگئی۔ دوسرے ٹوپی وغیرہ کا جلانا اضاعت مال ہے جو شرعاً وعقلاً کسی طرح جائز نہیں۔

اسی طرح اخبار نویسوں نے بھی زیادہ لوگوں کو پریشان کر دیا ہے۔ ایسے ایسے مضامین لکھتے ہیں جس سے خواہ مخواہ دیکھنے والے کو جوش آئے کیونکہ ان لوگوں کو تجارت مقصود ہے۔ ایسے مضامین سے ان کے اخبار کی اشاعت خوب ہو جاتی ہے یہ لوگ اہل دنیا ہیں، اہل دین کا طریقہ تو رضا بر قضا ہے۔

دلارامے کہ داری دل درو بند   دگر چشم از ہمہ عالم فرو بند

(جس دل آرام یعنی محبوب سے تم نے دل لگا رکھا ہے تو پھر تمام دنیا سے آنکھیں بند کر لو)

وہ کتاب وسنت کو دیکھتے ہیں ان کو تو کوئی تجارت مقصود نہیں جو خواہ مخواہ جوش وخروش ظاہر کریں۔ یہ سب باتیں صبر وقناعت کے خلاف ہیں اور شریعت میں ایک تاکید یہ کی گئی ہے کہ مصیبت میں یاس نہ ہوں۔ حق تعالیٰ سے امیدوار رہنا چاہیے کیونکہ اسباب سے فوق بھی تو کوئی چیز ہے۔ تو یاس کی بات تو وہ کہے جس کا دین تقدیر پر نہ ہو محض تدبیر پر ہو۔ یہ سب آداب ہیں ضراء یعنی مصیبت کے۔ فقط

ضروری عرض

اشرف علی عرض کرتا ہے کہ نظر اصلاحی کے وقت معلوم ہوا کہ یہ وعظ ناتمام لکھا گیا۔ وعظ میں آیات متلو کے سب اجزاء پر کلام ہوا تھا جو اس مسودہ میں نہیں ہے۔ وجہ ناتمام لکھے جانے کی یہ معلوم ہوتی ہے کہ یہ مرحوم کا بالکل اخیر لکھا ہوا تھا، پھر تاریخ وعظ سے پانچ مہینہ بعد ان کا انتقال ہو گیا، جیسا وعظ ہذا کے شروع صفحوں کے حاشیہ پر بھی لکھا ہوا ہے اور اسی وعظ کی تاریخ کے قبل متصل دو وعظ اور ہوئے تھے یعنی مواساۃ المصابین جز واول و جز و دوم تو تین مسودے جمع ہو گئے۔ معلوم ہوتا ہے کہ بہ ترتیب سب کو صاف کرنا چاہا سو وہ دونوں صاف ہو گئے۔ یہ تیسرا پورا صاف نہ ہونے پایا تھا کہ ان کا انتقال ہو گیا جتنا بھی ضبط ہوا وہ اپنے مدلول میں کافی وافی ہے۔

وصلی اللہ تعالٰی علیہ خیر خلقہ محمد وآلہ واصحابہ اجمعین۔

الوقت

وقت کے حقوق کے متعلق یہ وعظ ۱۲ رجب ۱۳۱۳ھ کو جامع مسجد تھانہ بھون
میں ہوا جو ساڑھے تین گھنٹہ میں ختم ہوا۔

بیٹھ کر بیان فرمایا: ۳۰۰ کی حاضری تھی، عبدالمجید صاحب لکھنوی نے قلم بند فرمایا:

خطبہ ماثورہ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

الحمدللہ نحمدہ ونستعینہ ونستغفرہ ونؤمن بہ ونتوکل علیہ ونعوذ باللہ من شرور انفسنا ومن سیئات اعمالنا من یھدہ اللہ فلا مضل لہ ومن یضللہ فلا ھادی لہ ونشھدان لا الہ الا اللہ وحدہ لا شریک لہ ونشھدان سیدنا ومولانا محمداً عبدہ ورسولہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وعلیٰ وآلہٖ واصحابہ وبارک وسلم۔

اما بعد فاعوذ باللہ من الشیطان الرجیم، بسم اللہ الرحمٰن الرحیم، وَالْعَصْرِ اِنَّ الْاِنْسَانَ لَفِیْ خُسْرٍ اِلَّا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ وَتَوَاصَوْا بِالْحَقِّ وَتَوَاصَوْا بِالصَّبْرِ۔ (سورۃ العصر پارہ ۳۰)

''یعنی ہے کہ انسان بڑے خسارہ میں ہے مگر جو لوگ ایمان لائے اور انہوں نے اچھے کام کیے اور ایک دوسرے کو اعتقاد حق پر قائم رہنے کی فہمائش کرتے رہے اور ایک دوسرے کو پابندی اعمال کی فہمائش کرتے رہے۔''

مصلحت وحکمت قسم

یہ ایک سورت چھوٹی سی ہے۔ گو الفاظ اس کے کم ہیں مگر اس میں مضمون بہت ضروری اور عام ضرورت کا ہے ویسا ہی جامع بھی ہے اور جامع اس معنی ہے کہ کوئی عمل اور کوئی حالت انسان کی ایسی نہیں جو فی الوقت نہ ہو اور اس وقت کے متعلق کوئی خاص حکم نہ ہو۔ اس واسطے اس وقت اس کو اختیار کیا گیا حق جل شانہ نے اپنی سورت کو شروع کیا ہے ایک قسم کے ساتھ۔ آگے اس کے جواب قسم ہے اور قسم کھائی ہے ایک ایسی چیز کی جس کی کوئی وقعت بھی عام قلوب میں نہیں۔ اس کی طرف کوئی خاص التفات بھی نہیں مگر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ حق تعالیٰ نے جو مخلوق کی قسم کھائی ہے وہ ایسی چیزیں ہیں جو نہایت قابل التفات اور مہتم بالشان ہیں۔

اب رہا یہ کہ حق تعالیٰ نے اپنی قسم کو چھوڑ کر مخلوق کی قسم کیوں کھائی۔ یہ ایک نہایت عجیب اور حل طلب سوال ہے۔ سو ہم مختصراً یہ کہیں گے کہ خدا کو اختیار ہے جو جی چاہے کرے آپ کون ہوتے ہیں۔ ہاں اگر کوئی اس سوال کو یوں بدل کر کہے کہ حق تعالیٰ نے ہمیں غیر مخلوق کی قسم کھانے سے کیوں ممانعت کی۔ ممانعت تو اس چیز سے ہوا کرتی ہے جو بری ہو اور جو شے بری ہو حق تعالیٰ سے اس کا صدور کیسے ہو سکتا ہے۔ البتہ ان عنوان سے سوال ہو سکتا ہے۔ بات یہ ہے کہ بعض چیزوں کا قبیح بعینہ (اپنی ذات کے اعتبار سے) ہوتا ہے اور بعض کا لغیرہ (غیر کے اعتبار سے) ہوتا ہے اور جو چیزیں قبیح بعینہ ہیں مثلاً زنا سرقہ وغیرہ ان کی اجازت کسی کو نہیں ہوتی اور ان کا صدور حکم سے بھی نہیں ہو سکتا اور بعض چیزیں قبیح لغیرہ ہیں۔ یعنی ان میں کوئی خاص مفسدہ اور وہی مانع ہے اجازت سے، جب وہ مرتفع ہو جائے گا قبیح بھی مرتفع ہو جائے گا۔

اس کی ایک مثال سمجھ لیجئے کہ مثلاً اذان جمعہ کے وقت بیع وشراء (خرید وفروخت) کرنا کہ اگر جمعہ کی طرف چلتے ہوئے راہ میں بیع وشراء کریں تو جائز ہے مگر افسوس ہمارے قصبہ میں عین جمعہ ہی کے وقت بازار لگتے ہیں۔ شاید یہ کسی بڑے بوڑھے کی اچھی نیت تھی کہ گاؤں والے لوگ بھی آ کر نماز جمعہ میں شریک ہو سکیں گے مگر "حفظت شیئا وغابت عنک اشیاء" (ایک چیز کا تو خیال کیا اور بہت سی چیزوں کو نظر انداز کر دیا)

ایک چیز کا تو خیال کر لیا کہ نماز جمعہ میں شریک ہو سکیں گے مگر اس کا خیال نہ کیا کہ جب تک وہ گاؤں میں ہیں اس وقت تک ان پر جمعہ واجب نہیں۔ اگر جمعہ پڑھنے کے لئے یہاں نہ آئیں تو کچھ حرج نہیں اور جب یہاں آ گئے تو ان پر جمعہ واجب ہو گیا۔ اب اگر نہ پڑھیں گے تو گنہگار ہوں گے اور اذان جمعہ کے وقت بیع وشراء کرنا بھی حرام ہے اس حرام میں بھی مبتلا ہوں گے۔ خیر اہل علم اس مسئلہ کو تو خوب جانتے ہیں۔ مگر ایک شخص نے مجھ سے ایک اور مسئلہ اسکے متعلق پوچھا کہ کیا اذان جمعہ کے بعد کھانا پینا بھی حرام ہے۔ سو اس مسئلہ پر کسی کو التفات بھی نہیں حالانکہ وہ بھی حرام ہے جسکے بعد اہل علم اس پر ناز نہ کریں کہ ہم کو بیع سے سابقہ ہی نہیں پڑتا۔ اس لیے ہم اس آیت کے خلاف سے محفوظ ہیں۔ میں کہتا ہوں کہ اذان جمعہ کے بعد جیسا بیع وشراء حرام ہے ویسا ہی کتاب دیکھنا بھی حرام ہے، پڑھنا پڑھانا بھی حرام ہے۔

رہا یہ کہ بعض اہل علم کو شاید شبہ ہو کہ قرآن میں تو "وذروا البیع" (خرید وفروخت ترک کرو) آیا ہے "وذروا القراءة" (پڑھنا ترک کردو) نہیں آیا ہے تو جناب فقہاء نے لکھ دیا ہے کہ تخصیص

جزئیاً علی العادۃ (بیع کی تخصیص قرآن پاک میں بیع کی عادت پڑھنے کی وجہ سے) ہے ورنہ حکم میں تخصیص نہیں حکم عام ہے۔ بیع صرف اس لیے حرام ہے کہ مخل سعی جمعہ ہے تو جو چیز مخل سعی جمعہ ہوگی وہ حرام ہے۔ ہاں جب یہ مانع مرتفع ہو جائے گا حرمت بھی مرتفع ہو جائے گی۔ مثلاً دو شخص چلتے چلتے ایک قلمدان کی بیع کریں تو چونکہ یہ بیع مخل سعی نہیں اس لیے حرام بھی نہ ہوگی، یہ قبیح لغیرہ کہلاتی ہے۔

اب سمجھئے کہ مخلوق کی قسم قبیح لغیرہ ہے، قبیح بعینہ نہیں، وہ قباحت عارضی ایسی ہے کہ اگر مخلوق مخلوق کی قسم کھائے تو قباحت ہے اور اگر خالق مخلوق کی قسم کھائے تو قباحت نہیں اور وہ شرک و ایہام شرک ہے۔ اس طرح سے کہ اس میں شبہ ہوتا ہے تعظیم مخلوق کا کیونکہ عادۃً قسم معظم چیز کی کھائی جاتی ہے اس لیے ممانعت ہوگئی ہے قسم کھانے کی، جیسے بعض مشرکین قسم کھاتے ہیں دریاؤں کی، پہاڑوں کی، مقصود ان کا یہ ہوتا ہے کہ اتنی بڑی چیز کا نام لے کر جھوٹ نہیں بولیں گے۔ اس میں ایہام شرک ہے اور ایہام شرک کا شبہ اسی میں ہو سکتا ہے جو خود چھوٹا ہو اور اس سے دوسری چیز بڑی ہو اور خداوند جل جلالہ چونکہ سب سے بڑا ہے اس لیے اس میں یہ شبہ نہیں ہو سکتا چونکہ اس میں ایہام شرک نہیں اس لیے وہ عارضی قبح اس میں نہیں ہے۔

ایک سوال اور رہ گیا کہ قباحت تو لازم نہیں آتی مگر اپنی قسم چھوڑ کر چھوٹی شے کی قسم کیوں کھائی، بات یہ ہے کہ قسم سے تین غرضیں ہوتی ہیں۔

۱۔ غالب تو یہ کہ کسی شے کو معظم بتلانا اور یہ گمان کرنا کہ اگر ہم اس کا نام لے کر جھوٹ بولیں گے تو ہم پر اس کا وبال ہوگا۔

۲۔ دوسری غرض یہ کہ اس مقسم بہ (جس کے ساتھ قسم کھائی ہے) کا اپنے سے خاص تعلق ہے اگر جھوٹ بولیں تو ہمارے منافع اس سے منقطع ہو جائیں۔ مثلاً بیٹے کی قسم

۳۔ تیسری غرض یہ کہ مقسم بہ کا کثیر النفع ہونا فی نفسہ بیان کرنا مقصود ہے کہ بڑے کام آتی ہے۔

ہر چند کہ مخلوق کی قسم کھانے سے تینوں احتمال ہو سکتے ہیں مگر شریعت میں احتیاط بہت کی گئی ہے کہ شبہ شرک تو ہر جگہ ہوتا ہی ہے۔ رہا خداوند جل جلالہ جو کسی مخلوق کی قسم کھاتے ہیں اس کی حکمت کیا ہے یا بلفظ دیگر آج کل کی مخترع (من گھڑت) اصطلاح کے موافق یوں کہیے کہ اس کی فلاسفی کیا ہے۔ وہ یہ ہے کہ پہلی اور دوسری غرض تو وہاں ہے نہیں لیکن تیسری غرض یعنی حکمت مذکورہ ہے اور غرض کی تفسیر حکمت سے اس لیے کی کہ حق تعالیٰ کو کسی کی کیا غرض ہوتی۔ غرض تو مخلوق کو ہوا

کرتی ہے وہاں حکمت ہوا کرتی ہے۔

من نکردم خلق تا سودے کنم　　　　بلکہ تابر بندگاں جودے کنم

یعنی ہم نے اس لیے مخلوق کو نہیں پیدا کیا کہ ہم اس سے نفع اٹھائیں یا اس سے ہماری کوئی غرض اٹکی ہوئی ہو بلکہ محض اس لیے تاکہ مخلوق پر احسان کریں۔ پس خداوند جل جلالہ جس چیز کی قسم کھاتے ہیں اس کے معنی یہ ہوتے ہیں کہ اے سننے والو! یہ شے کثیر النفع ہے اس کی طرف التفات کرو اور اس سے منتفع ہو، مفسدہ کا احتمال تو پہلے ہی دفع ہو چکا تھا اب مصلحت کا سوال بھی ختم ہو چکا۔

ایک راز خاص

خداوند جل جلالہ نے بہت کثرت سے مخلوق کی قسم کھائی ہے۔ مثلاً "لَآ اُقْسِمُ بِیَوْمِ الْقِیٰمَۃِ وَلَآ اُقْسِمُ بِالنَّفْسِ اللَّوَّامَۃِ" (قسم کھاتا ہوں میں قیامت کے دن کی اور قسم کھاتا ہوں میں ایسے نفس کی جو اپنے اوپر ملامت کرے) "والعصفات عصفا" (یعنی قسم ہے ان ہواؤں کی جو تندی کے ساتھ چلتی ہیں)۔ الفجر (قسم ہے فجر کی) والشمس (قسم ہے سورج کی) ہر جگہ یہی مراد ہے کہ یہ اشیاء کثیر النفع ہیں ان کی طرف التفات کرو اور حق تعالیٰ کے مخلوق کی قسم کھانے میں ایک راز خاص اور بھی ہے وہ یہ کہ جس مقام پر قسم کھائی ہے اس کے بعد ایک جواب قسم بھی ہوتا ہے تو غور کرنے سے معلوم ہوا کہ مقسم بہ جواب قسم کی جو ایک دعویٰ ہے بمنزلہ دلیل کے ہوتا ہے یعنی خداوند جل جلالہ نے جس چیز کی قسم کھائی ہے اس کے آگے جواب قسم سے معلوم ہو جاتا ہے کہ یہ مقسم بہ اس دعوے کی دلیل ہے اسے ایک مثال سے سمجھئے۔ مثلاً فرماتے ہیں "والمرسلت عرفا الخ" (قسم ہے ان ہواؤں کی جو نفع پہنچانے کے لئے بھیجی جاتی ہیں) اس کے آگے فرماتے ہیں "انما توعدون لواقع" (جس چیز کا تم سے وعدہ کیا جاتا ہے وہ ضرور ہونے والی ہے) قسم کھا کر فرماتے ہیں کہ قیامت ضرور آنے والی "والنزعت غرقا" (قسم ہے ان فرشتوں کی جو کافروں کی جان سختی سے نکالتے ہیں) یہاں بھی قسم کھا کر فرماتے ہیں قیامت ضرور آنے والی ہے۔

اسی طور پر جا بجا قسمیں کھائی ہیں خاص خاص اشیاء کی۔ یہاں ایک دعویٰ ہے کہ قیامت ضرور آئے گی۔ اب اس کی دلیل کی ضرورت ہے۔ مثلاً ہوا ہے کہ اس کے اندر ایک تغیر بتلایا ہے اور ہوا ایک ایسی بڑی چیز ہے جو دم بھر میں بڑے بڑے پہاڑوں کو ہلا دیتی ہے، جمے ہوئے

درختوں کو اکھاڑ پھینکتی ہے۔ کیا قدرت اور رحمت ہے اللہ جل جلالہ کی کہ ہر وقت لاکھوں من ہوا ہمارے سر پر رہتی ہے کیونکہ جو (آسمان وزمین کے درمیان خلا) میں تمام ہوا بھری ہوئی ہے جتنی جگہ ہمارے جسم سے رکی ہوئی ہے صرف وہ ہوا سے خالی ہے اور باقی تمام ہوا ہی ہوا ہے اور ہم کو محیط اور ہم کچلتے ہیں دبتے نہیں مرتے نہیں تو اس تغیر سے معلوم ہوتا ہے کوئی بڑا قادر ہے جو ہوا جیسی طاقتور چیزوں کو دم بھر میں اُلٹ پلٹ کر دیتا ہے اس کو قیامت لانا کیا مشکل ہے۔

یہاں منکرین کے پاس دو مقام ہیں۔ ایک یہ کہ قیامت محال ہے اور یہ خیال تھا فلاسفہ کا۔ اسکے مقابلہ میں امکان ہے دوسرے یہ کیا ضرور ہے کہ ہر ممکن واقعہ ہی ہوا کرے۔ جائز ہے کہ کسی سے اس کا امکان تو ہو مگر وقوع اس کا مستبعد ہو اور یہ خیال تھا مشرکین عرب کا۔

فلاسفہ کے مقابلہ میں تو امکان کا اثبات درکار ہے اور دفع استبعاد اثبات امکان کو مستلزم تھا اور فلاسفہ قلیل بھی تھے۔ اس لیے استقلالاً ان کے شبہ سے تعرض نہیں کیا اور عوام الناس زیادہ ہیں اس لیے انہی کے مذاق کے موافق دلائل بیان کیے گئے۔ پس یہاں گفتگو ان لوگوں کے جواب میں ہے جو قیامت کو مستبعد سمجھتے تھے۔ چنانچہ کہا کرتے تھے کہ ''ءَ اِذَا مِتْنَا وَكُنَّا تُرَابًا '' (کیا ہم جب مر جائیں گے اور ہو جائیں گے ہم مٹی) کیا ہماری ہڈیاں جب گل سڑ جائیں گی اور ہم بالکل خاک ہو چکیں گے اس وقت ہم پھر زندہ کیے جائیں گے۔ بھلا یہ کیسے ہو سکتا ہے۔ قرآن مجید میں اسی استبعاد کو رفع کیا گیا ہے اور جا بجا مذکور ہے کہ خدا نے جب ابتداء اپنی مخلوق کو پیدا کر دیا کہ اس وقت بظاہر زیادہ مشکل تھا۔ گو واقع میں خدا جل جلالہ کو کچھ بھی مشکل نہیں تو اب دوبارہ پیدا کرنا کیا مشکل ہے۔ پس جہاں کہیں قرآن مجید میں قسمیں وارد ہوئی ہیں ان قسموں سے ان کے جواب کا استبعاد دفع ہو جاتا ہے کہ جو ہوا کو جو ایسی طاقتور ہے دم بھر میں اُلٹ پلٹ کر دیتا ہے اس کو کیا مشکل ہے اور مستبعد ہے جو سب کو اُلٹ پلٹ کر دے۔ بہر حال یہ راز تھا خداوند جل لالہ کی قسموں کا۔

اس تقریر سے معلوم ہو گیا ہوگا کہ جن کی قسمیں کھائی جاتی ہیں ان کے احوال نہایت قابل تدبر و تفکر ہیں۔ گو بظاہر وہ کیسی ہی سرسری اور معمولی ہوں جب حق تعالیٰ نے ان کی قسم کھائی ہے وہ ضرور قابل اہتمام ہیں اور اس کی دو صورتیں ہیں، کہیں تو ایسی چیزوں کی قسم کھائی ہے جو ظاہر میں باوقعت ہیں۔ مثلاً ''والسماء'' (قسم ہے آسمان کی) ''والارض'' (قسم ہے زمین کی) اور کہیں ایسی چیزوں کی قسم کھائی ہے جو بظاہر بے وقعت ہیں مثلاً ''والتین'' یعنی (قسم ہے انجیر کی)۔ مقصود یہاں

بھی یہی ہے کہ انجیر کثیر النفع شے ہے اس کے منافع کی طرف التفات کرو۔ اسی طرح یہاں فرمایا "والعصر" یعنی (قسم ہے زمانہ کی)۔ زمانہ تو انجیر سے بھی نہایت کمتر ہے۔ انجیر جو ہر محسوس تو ہے زمانہ تو عرض غیر محسوس ہی ہے۔ اسی وجہ سے متکلمین اور فلاسفہ میں زمانہ کی تحقیق میں اختلاف ہے۔ فلاسفہ تو کہتے ہیں کہ زمانہ فلک الافلاک کی حرکت کا نام ہے اور متکلمین اسے امتداد موہوم مانتے ہیں۔ یعنی زمانہ ایک وہمی اور خیالی شے ہے۔ سو گو وہ (زمانہ) محض موجود انتزاعی ہی ہے مگر ہے ایسی چیز جو قابل اہتمام ہے۔ اس واسطے اس کا تعلق ہے واقعات سے اور ان کے خاص آثار ہوتے ہیں اور وہ قابل اہتمام ہوا کرتے ہیں مگر چونکہ متلبس بالزمان (زمانہ سے متلبس) ہیں اس لیے زمانہ بھی قابل نظر ہوا۔ پس حق تعالیٰ اس زمانہ کی یا بلفظ دیگر وقت کی قسم کھاتے ہیں اور اس دوسرے عنوان کے اعتبار سے میرا یہ بیان صرف پرانے ہی خیال والوں کے مذاق پر منطبق نہ ہوگا بلکہ نئے خیال والوں کے مذاق کے بھی موافق ہوگا۔ یعنی وقت کیسی باوقعت چیز ہے۔ نئے خیال والوں کو میرا ممنون ہونا چاہیے کہ میں نے وقت کے باوقعت ہونے کو قرآن سے ثابت کر دیا۔ لوگ یہ کہا کرتے ہیں کہ اہل یورپ وقت کی بہت قدر کرتے ہیں اور اہل اسلام کے یہاں وقت کی قدر نہیں۔ میں کہتا ہوں بڑی قدر ہے اگر نہ ہوتی تو قرآن مجید میں وقت کی قسم کیوں مذکور ہوتی مگر ہم لوگوں نے بالکل اسلام پر عمل ہی چھوڑ دیا۔ ذرا آنکھ اٹھا کے بھی نہیں دیکھتے کہ اس میں کیا کیا خوبیاں ہیں اور کیسی عمدہ تعلیم ہے۔

اسلام اور یورپ

جو خوبیاں اہل یورپ میں کہی جاتی ہیں وہ دراصل انہوں نے اسلام ہی سے لی ہیں اور ہم اپنے یہاں غور نہیں کرتے اور سمجھتے ہیں کہ یہ انہی کی ملک ہیں۔ ہاں اس معنی کر انہی کی ملک ہیں جیسا کاشت کار ۱۲ برس تک اگر زمیندار کی زمین پر قابض رہے تو یہ قانون ہے کہ وہ زمین موروثی ہو کر کاشت کار کی بمنزلہ ملک ہو جاتی ہے۔ اسی طرح اہل یورپ نے عرصہ سے ان کی خوبیوں پر قبضہ کر کے ان کو اپنا دستور العمل بنا لیا تو ہم یہ سمجھنے لگے کہ یہ موروثی ہو کر انہیں کی ملک ہو گئیں۔

نہایت افسوس کے ساتھ کہا جاتا ہے کہ آج کل اہل یورپ کی تقلید کا اس قدر غلبہ ہو گیا ہے کہ اگر ان کے منہ سے کوئی بات نکلے اور قرآن میں اس کے خلاف ہو تو اہل یورپ کے قول کا یقین کر لیا جاتا ہے اور قرآن پر برخلاف واقعہ ہونے کا شبہ کیا جاتا ہے۔ کتنے افسوس کی بات ہے کہ محمد صلی اللہ

علیہ وسلم تو فرمائیں کہ انسان کی اصل انسان ہے اور ڈارون جو ایک ملحد وہ کہے کہ سب سے پہلے ایک مادہ مطلقہ موجود تھا اور پھر تحرک سے اس میں حرارت پیدا ہوئی اور شمس وغیرہ بنا اور اس کے بعد پھر نباتات بنے، پھر حیوانات بنے ان میں بندر بنا، یکا یک جست کر کے انسان بن گیا، اسی طور پر وہ تمام حیوانات ونباتات ہیں۔ اسی کا قائل ہے کہ ایک دوسرے سے نکلتے چلے آئے تو محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے فرمانے پر تو شبہ کیا جاتا ہے اور ڈارون کے کہنے پر یقین کر لیا جاتا ہے، یہی ایمان ہے۔ ڈارون تو صانع کا قائل نہیں تھا اس لیے ایسی بعید اور بیہودہ تاویلیں کرتا تھا مگر ان لوگوں کو کیا ہو گیا ہے کہ صانع کو مانتے ہیں اور پھر ایسی مہمل تاویلوں سے قرآن پر شبہ کرتے ہیں۔

شاید کوئی یہاں کہے کہ ہم کو تحقیقات جدیدہ سے قرآن پر شبہ اس سے ہو جاتا ہے کہ حکماء کو تو مشاہدہ ہے اور اسی بناء پر ہم کو قرآن پر یہ شبہ ہے کہ مشاہدہ کے خلاف کیوں ہے۔

یہ پہلے سے بھی زیادہ ضرورت انگیز بات ہے، میں کہتا ہوں کہ آپ مشاہدہ کی حقیقت ہی کو نہیں جانتے۔ میں پوچھتا ہوں کہ کیا یہ بھی مشاہدہ ہے کہ مادہ خود بخود متحرک ہو کر اس سے ایک صورت پیدا ہو گئی۔ پھر شمس وکواکب ہوئے، نباتات ہو گئی اور نباتات سے حیوانات میں ایک خاص نوع بندر بنے، پھر بندر یکا یک جست کر کے انسان ہو گیا۔ یہ سب ڈھکوسلے ہیں۔ ہم تو یہ چاہتے ہیں کہ خود ان ''مقرین بالقرودیت'' (بندر ہونے کے مقرین یعنی اقرار کرنے والوں) کو بھی بندر نہ بننے دیں آدمی ہی بنائیں۔ یہی مشاہدات ہیں انہی ڈھکوسلوں اور مہمل اور وہمی باتوں کو مشاہدات قرار دے کر خدا اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر شبہات اور پھر اپنے کو مسلمان کہتے ہیں۔ افسوس کی بات ہے۔

زمین وسورج کی حرکت

کیا یہ مشاہدہ ہے کہ آفتاب کو سکون ہے، زمین کو حرکت ہے۔ خیر ہمیں اس سے بحث نہیں کہ کس کو سکون ہے اور کس کو حرکت کیونکہ یہ قرآن کے مخالف نہیں مگر یہ سوچ لو کہ اتنا بڑا دعویٰ کس بنا پر ہے، دلیل کچھ بھی نہیں۔ مگر ہم کہیں گے ''الشَّمْسُ تَجْرِیْ'' (سورج چلتا رہتا ہے) چونکہ قرآن میں وارد ہوا ہے اس لیے آپ آفتاب کو ساکن محض ماننے سے گنہگار ہوں گے۔ زمین کو چاہے آپ ساکن نہ مانئے متحرک مانئے مگر آفتاب کو بھی متحرک ماننا پڑے گا۔

شاید کسی کو یہ شبہ ہو ''وَجَعَلْنَا فِیْ الْاَرْضِ رَوَاسِیَ الخ'' (یعنی اور ہم نے زمین میں

اس لیے پہاڑ بنائے کہ زمین ان لوگوں کو لے کر ہلنے نہ لگے) اسے تو زمین کا سکون ثابت ہوتا ہے۔ پھر یہ کیوں کہتے ہو کہ حرکت ارض کا ماننا قرآن کے خلاف نہیں۔

جواب یہ ہے کہ اس سے نفی حرکت اضطرابیہ کی مراد ہے حرکت غیر اضطرابیہ کی نفی مراد نہیں، غرض اس کی آپ کو اجازت ہے کہ زمین کو اگر جی چاہے متحرک مانیں کچھ حرج نہیں۔

اسی طرح اس کی خبر دی گئی ہے کہ آسمان موجود ہے۔ یہ کون سے مشاہدے کے خلاف ہے۔ گو اس نظام طلوع وغروب کے لئے سموات کی ضرورت نہ ہو لیکن نظام خاص کی ضرورت نہ ہونا نفی کی تو دلیل نہیں ہوسکتی۔ آسمان دوسری مستقل دلیل سے ثابت ہوتا ہے اس کی نفی کرنا جائز نہیں۔ یہ کس مشاہدے سے ثابت ہوا کہ آسمان نہیں ہے بلکہ ہم آپ کے ممنون ہیں آپ نے اس نیلگوں صورت کو حد نظر جان کر آسمان کی نفی کا جواب سکھا دیا کیونکہ قرآن مجید میں کہیں بھی یہ نہیں آیا ہے کہ یہ نیلا نیلا جو نظر آتا ہے یہی آسمان ہے۔ پس اگر آپ کہیں گے کہ اگر آسمان کوئی چیز ہے تو نظر کیوں نہیں آتا ہم یہ کہیں گے نظر اس لیے نہیں آتا کہ آپ نے اس سقف نیلی کو حد نظر مان لیا۔ پس جب یہ حد نظر ہے تو آسمان اس کے آگے ہے اور چونکہ نظر کی یہاں تک انتہا ہو جاتی ہے اس لئے آگے کچھ نظر نہیں آتا۔ اب آپ کو آسمان کی نفی کرنے کی بالکل گنجائش نہیں رہی۔

اب اس شبہ کی بالکل گنجائش نہ رہی کہ ہم حکماء کے قول پر قرآن کی تکذیب نہیں کرتے بلکہ مشاہدہ کی بناء پر جس کی مثال میں یہ پیش کرتے ہیں کہ مشاہدہ سے ثابت ہوا ہے کہ غروب کے وقت آفتاب زمین کے اندر نہیں جاتا اور قرآن مجید میں سکندر ذوالقرنین کے قصہ میں مذکور ہے کہ آفتاب کو کیچڑ اور دلدل میں غروب ہوتے پایا۔ بھلا دیکھو کتنا مشاہدہ کے خلاف ہے۔ آفتاب ایک جرم عظیم ہے، زمین سے کتنے ہی حصے بڑا ہے کہ زمین کی دلدل اور کیچڑ میں غروب ہوسکتا ہے۔

لیکن اگر عقل ہوگی تو اس میں جواب نظر آجائے گا یعنی قرآن مجید میں وجد (پایا) الخ وارد ہوا ہے۔ اپنی اس کو بادی النظر میں ایسا پایا۔ یعنی اس وقت ایسا معلوم ہوتا تھا کہ کیچڑ میں دھنس رہا ہے۔ یہ نہیں فرمایا غربت فی...... (کیچڑ میں ڈوب گیا) جہاز پر سوار ہو کر دیکھئے تو معلوم ہوتا ہے کہ آفتاب سمندر میں سے نکلتا ہے اور اسی میں ڈوب رہا ہے۔ اسی طور پر ہم روزانہ مشاہدہ کرتے ہیں آفتاب کے طلوع وغروب کا۔ یہی معلوم ہوتا ہے کہ زمین ہی سے نکلا اور زمین میں ہی گھس گیا۔ پھر مشاہدہ کے خلاف کیا ہوا۔ اب فرمایئے مشاہدہ سے کہاں تعارض ہے۔ تعارض کبھی بھی نہیں۔ پھر

افسوس ہے کہ مسلمان ہونے کا دعویٰ کرتے ہیں اور قرآن اگر فیثا غورس کے قول کے مخالف ہو تو قرآن پر خلاف مشاہدہ کا شبہ کرتے ہیں۔ فیثا غورس کے قول پر خلاف واقعہ ہونے کا شبہ نہیں ہوتا۔

اصول وفروع کا فرق

اسلام کی عظمت قلوب سے جاتی رہی۔ غرض یہ ہے کہ نئے مذاق میں یہ خرابی ہوگئی ہے کہ سائنس والے جو کہہ دیں اس پر تو "امنا و صدقنا" (اس پر ہم ایمان لائے اور ہم نے اس کو سچ مان لیا) اور قرآن پر شبہات مگر وقت کے باوقعت ہونے میں تو فلسفہ اور قرآن دونوں متفق ہوگئے کہ اس کی قسم کھانے سے خود اس کی وقعت پر دلالت ہوگئی۔ اب اس کو قاعدہ پر بھی منطبق کرنا چاہتا ہوں کہ مقسم بہ دلیل ہوتی ہے جواب قسم کی سو یہاں جواب قسم میں حق تعالیٰ فرماتے ہیں: "اِنَّ الْاِنْسَانَ لَفِیْ خُسْرٍ" (انسان بڑے خسارہ میں ہے) "اِلَّا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ وَتَوَاصَوْا بِالْحَقِّ وَتَوَاصَوْا بِالصَّبْرِ" (یعنی خسارہ سے وہ مستثنیٰ ہیں جو ایمان لائے اور عمل صالح کیے اور ایک دوسرے کو حق اور استقلال کے لیے کہتے اور سنتے رہے۔ یہاں چار چیزیں ذکر فرمائیں۔

۱۔ ایمان۔ ۲۔ اعمال صالحہ

۳۔ تواصی بالحق (اعتقاد حق پر ایک دوسرے کو قائم رہنے کی فہمائش کرتے رہنا)

۴۔ تواصی بالصبر (ایک دوسرے کو پابندی اعمال کی فہمائش کرتے رہنا)

سبحان اللہ! کیسی جامع تعلیم ہے۔ اصل یہ ہے کہ انسان جن امور کا مکلف ہوا ہے وہ دو قسم کے ہیں، ایک اصول، ایک فروع، اول عقائد میں دوسرے اعمال اصول وفروع اس لیے کہلاتے ہیں کہ اصل مدار ایمان کا عقائد ہیں پھر اس کا مکمل اعمال۔

مثلاً ایک شخص ہے کہ وہ گورنمنٹ کے شاہانہ اقتدار کو مانتا ہے مگر ہمیشہ قانون کے خلاف کرتا ہے، چوری بھی کرتا ہے، جوا بھی کھیلتا ہے اور بدتہذیب بھی ہے تو ایسے شخص کے قلب میں چونکہ گورنمنٹ کا اقتدار ہے اس لیے اسے بغاوت کی سزا نہ ہوگی اور ہمیشہ کے لئے مردود نظر نہ ہوگا بلکہ صرف اختتام سزائے معین تک اور اس کے بعد پھر وہ گورنمنٹ کی محبوب رعایا میں داخل ہو جائے گا۔ برخلاف اس شخص کے کہ جو نہایت مہذب ومتین ہو اور افعال قبیحہ خلاف قانون سے بھی بچتا ہو مگر گورنمنٹ کے اقتدار شاہانہ کو تسلیم نہ کرتا ہو، اس کو بغاوت کی یہ سزا ہوگی کہ عبور دریائے شور کر دیا جائے گا یا پھانسی دیدیا جائے گا اور ہمیشہ کے لئے معتوب رہے گا۔

اے صاحبو! سمجھ لیجئے کہ اسی طرح اسلامی قانون بھی ہے کہ جس کے عقائد اچھے نہیں وہ باغی ہے اگرچہ نماز و روزہ کرے اور کیسا ہی شائستہ ہو ہمیشہ کے لیے مردود بارگاہ ایزدی ہوگا۔ اگر توبہ نہ کرے، برخلاف اس شخص کے جو نماز و روزہ کچھ نہیں کرتا اور ہر قسم کے معاصی میں مبتلا رہتا ہے مگر عقائد اچھے ہیں تو اس کو وہی معیادی سزا خلاف قانون عمل کرنے کی ہوگی، اگر توبہ نہ کرے لیکن باغیوں میں شمار نہ ہو گا اور اختتام سزا کے بعد پھر وہی حق تعالیٰ کی محبوب رعایا یعنی جنتیوں میں داخل ہو جائے گا۔

مگر یہاں پر بعضے شبہ کیا کرتے ہیں کہ جب کسی غیر مسلم میں اخلاق اعمال شائستہ ہوں تو کیا وجہ ہے کہ وہ ناجی نہیں۔ میں کہتا ہوں گورنمنٹ پر بھی یہی اعتراض کیا ہوتا کہ کیا وجہ ہے کہ جب ایک باغی مہذب ہے بقیہ جرائم قانونی سے بھی محفوظ ہے، پھر کیوں اس کو سزا ہوتی ہے۔ اس کے سزا ہونے کی وجہ یہ ہے کہ جب وہ باغی ہے تو اس کے کمالات ہیچ در ہیچ ہیں، پس اسلامی قانون میں بھی ایسا ہے۔ میں سچ کہتا ہوں کہ جتنے شبہے اسلام پر ہیں اپنے معاملات پر غور کریں تو سب کا جواب نکل آئے گا مگر غور کون کرے، دین تو آنکھوں میں کھٹکتا ہے۔ افسوس کیسی آفت ہے، کیسا طوفان بے تمیزی برپا ہے اور پھر اپنے کو مسلمان کہتے ہیں۔

صاحبو! کیا یہی اسلام ہے۔ اس تقریر سے اصول و فروع کا فرق معلوم ہو گیا ہوگا کہ اصول قلب کے متعلق ہیں اور فروع اعمال کے متعلق، پھر ان دونوں عقائد و اعمال میں ایک تقسیم اور ہے۔ ایک تو خود اختیار کرنا ایک دوسروں کو تعلیم کرنا جس کو ہمدردی کہتے ہیں۔ یہاں سے ایک اعتراض کا جواب بھی ہو گیا۔ وہ یہ ہے کہ جب مولوی لوگ نصیحت کرتے ہیں تو کہا جاتا ہے کہ مولوی لوگ بڑے متعصب ہوتے ہیں، ہمیشہ پیچھے پڑے رہتے ہیں، اسی بات کو حق تعالیٰ فرماتے ہیں۔

اَفَنَضْرِبُ عَنْكُمُ الذِّكْرَ صَفْحًا اَنْ كُنْتُمْ قَوْمًا مُّسْرِفِيْنَ

(کیا تمہارے تجاوز عن الحد (حد سے گزر جانے کی) وجہ سے ہم اپنی نصیحتیں ہٹا لیں گے، خوب کہا ہے)

حافظ وظیفہ تو دعا گفتن است و بس در بند آں مباش کہ نشنید یا شنید

(تمہارا کام بس دعا مانگے جانا ہے اس کی فکر میں مت رہو کہ انہوں نے سنی یا نہیں، یا تمہارا کام نصیحت کیے جانا ہے، کوئی سنے یا نہیں اس کی فکر میں مت پڑو)

یعنی کہے جاؤ کوئی سنے یا نہ سنے، ہمدردی کا مقتضا تو یہی ہے کہ جو اپنے لیے پسند کرے دوسروں کے لیے بھی پسند کرے۔ اب یہیں سے کچھ سمجھ میں آ گیا ہوگا کہ "نهي عن المنكر"

(بری باتوں سے روکنا) "وامر بالمعروف" (اچھی باتوں کا حکم کرنا) "شرعاً وعرفاً" کہ حقیقت اس کی ہمدردی ہے فرض ہے۔ اب کل چار چیزیں ہیں۔

ایک اصول کو اختیار کرنا۔ ایک انکی ترغیب دینا۔ ایک فروع کو اختیار کرنا۔ ایک انکی ترغیب دینا۔

یہی قرآن شریف میں بھی مذکور ہے۔ میں نے اصول وفروع کی ترغیب کو "تواصوا بالحق والصبر" سے سمجھا ہے۔ صبر کے معنی ہیں "حبس النفس علی ماتکرہ" یعنی نفس کو ایسی چیز کا پابند کرنا جو ناگوار ہو۔ مطلب یہ ہے کہ ہر قسم کے اعمال کا نفس کو پابند کرنا۔ اس میں نماز، روزہ، حج زکوۃ سب داخل ہیں۔ تواصوا باب تفاعل سے ہے جس کی خاصیت مشارکت ہے۔ اب معنے یہ ہو گئے کہ ہر شخص دوسرے کو کہے، چھوٹے بڑے کو بڑا چھوٹے کو، اس میں بڑے لوگوں کے کان کھولے گئے ہیں کہ تم چھوٹوں کو اور چھوٹوں کو بھی حق ہے بڑوں کے کہنے کا، اب بڑوں کو چھوٹوں کے کہنے کا برا ماننے کی گنجائش نہیں بلکہ حق بات قبول کرنا چاہیے۔

مقام واخلاق محمدی

جناب رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم کہ آپؐ سے سوائے خدا کے کون اشرف واعلیٰ ہوگا، کسی نے خوب کہا ہے۔

یا صاحب الجمال و یا سید البشر　　　من وجہک المنیر لقد نور القمر

(اے صاحب جمال اور اے تمام لوگوں کے سردار یعنی اے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم آپ کے رخ روشن سے چاند منور ہو گیا)

لایمکن الثناء کما کان حقہ　　　بعداز خدا بزرگ توئی قصہ مختصر

(آپ کے لائق تعریف کرنا ممکن نہیں، قصہ مختصر یہ ہے کہ خدا کے بعد آپ ہی بزرگ ہیں)

اس مصرعہ پر (بعداز خدا بزرگ توئی قصہ مختصر) بہت عمدہ عمدہ تضمینیں ہیں۔

شاباش آں صدف کہ چناں پرورد گہر　　　آبا از و مکرم و ابناء عزیز تر

(اس صدف کو شاباش کہ ایسا گہر پالا، آباؤ اجداد اس سے مکرم اور بیٹے عزیز تر ہیں)

صلو اعلیہ ما طلع الشمس والقمر　　　بعد از خدا بزرگ توئی قصہ مختصر

(یعنی جب تک سورج اور چاند طلوع ہوں یعنی قیامت تک آپ صلی اللہ علیہ وسلم پر دُرود بھیجو۔

قصہ مختصر خدا کے بعد آپ صلی اللہ علیہ وسلم ہی بزرگ ہیں)۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی شان یہی ہے۔

بعد از خدا بزرگ توئی قصہ مختصر

(قصہ مختصر یہ ہے کہ خدا کے بعد آپ صلی اللہ علیہ وسلم ہی بزرگ ہیں)

اور کسی نے خوب کہا ہے

آنچہ خوباں ہمہ دارند تو تنہا داری

(جو کمالات تمام انبیاء علیہم السلام میں پائے جاتے ہیں وہ سب کے سب تنہا آپ صلی اللہ علیہ وسلم میں موجود ہیں)

باوجود اتنے کمالات اور خوبیوں کے آپ کی حالت یہ تھی کہ اگر چھوٹے سے چھوٹے صحابہ رضی اللہ تعالیٰ عنہم بھی مشورہ دیتے تھے تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم قبول فرما لیتے تھے۔ مثلاً حدیبیہ کا واقعہ ہے کہ باوجود آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے فرمانے کے لوگ احرام نہیں کھولتے تھے۔ حضور اُم سلمٰی رضی اللہ تعالیٰ عنہا کے پاس تشریف لائے اور فرمایا کہ کیا کروں، لوگ احرام نہیں کھولتے، انہوں نے عرض کیا کہ یا رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم!) سب سے پہلے آپؐ احرام کھول کر قربانی کر دیجئے پھر سب احرام کھول دیں گے۔ چنانچہ آپ نے قربانی کر دی۔ پھر کیا تھا تمام صحابہ رضی اللہ تعالیٰ عنہم ٹوٹ پڑے اور احرام کھول کر قربانی کرنے لگے۔

اس سے بڑھ کر ایک مرتبہ جناب رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم انصار کے ایک باغ میں تشریف فرما تھے۔ وہاں ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ بھی پہنچے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اے ابو ہریرہؓ! جاؤ اور جو تمہیں ملے بشارت دو کہ جو لا الہ الا اللہ پڑھتا ہوگا وہ جنت میں داخل ہو گا۔ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے عرض کیا کہ یا رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم)! یہ تو بڑی بات ہے۔ میرے کہنے کا کون یقین کرے گا، آپؐ نے فرمایا کہ میری نعلین مبارک لے جاؤ اور یہ دکھا کر کہو۔ حضرت ابو ہریرہؓ بہت خوشی خوشی آ رہے تھے کہ سب سے پہلے راستہ میں حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ ملے اور پوچھا کہ اے ابو ہریرہؓ یہ نعلین کیسی ہیں۔ عرض کیا کہ یہ جناب رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم کی ہیں، مجھ کو دے کر بھیجا ہے کہ جو شخص تمہیں ملے اور یقین کے ساتھ لا الہ الا اللہ کہے اسے بشارت دو۔ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے زور سے دھکا دیا اور فرمایا کہ لوٹ جاؤ کیسی بشارت۔ یہ روتے روتے گئے اور سارا بیان کیا۔ اتنے میں حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ بھی حاضر

ہوئے۔ جناب رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے پوچھا کہ اے عمرؓ! تم نے ایسا کیوں کیا، عرض کیا کہ میرے ماں باپ آپؐ پر فدا ہوں کیا آپؐ نے حضرت ابو ہریرہؓ کو نعلین دے کر بھیجا تھا کہ جو لا الہ الا اللہ کہے اسے جنت کی بشارت دو۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ہاں! عرض کیا کہ یا رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم)! مجھے اندیشہ ہے کہ لوگ اس پر بھروسہ کر کے نماز روزہ نہ چھوڑیں بیٹھیں۔ اس لیے بہتر ہے چند روز اوران لوگوں کواسی حالت میں چھوڑ دیا جائے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا! بہتر ہے اور چند روز اسی حالت میں رہنے دو۔

یہ تو بھلا خیر دوستوں سے برتاؤ تھا، آپ کا تو دشمنوں سے بھی یہی برتاؤ تھا اور آپؐ کی تو بڑی شان ہے آپؐ کے غلاموں کا یہی برتاؤ تھا۔

شنیدم کہ مردان راہ خدا دل دشمناں ہم نکردند تنگ

(ہم نے اہل اللہ کے قصے سنے ہیں کہ انہوں نے دشمنوں کے دل کو بھی رنجیدہ و ناگوار نہیں کیا)

ترا کے میسر شود ایں مقام کہ با دوستانت خلافست و جنگ

(تم کو یہ مرتبہ کیوں کر حاصل ہو سکتا ہے اس لئے کہ دوستوں کے ساتھ تمہارا اختلاف ولڑائی سے دشمن تو رہے درکنار)

مقام اولیاء

ایک شخص امام اعظم ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے پاس آیا اور پوچھا کہ کیا آپ کے والد کا انتقال ہو گیا ہے؟ آپ نے فرمایا، ہاں! پھر پوچھا، آپ کی والدہ زندہ ہیں؟ فرمایا، ہاں زندہ ہیں۔ کہنے لگا کہ میں نے سنا ہے کہ آپ کی والدہ بڑی حسینہ جمیلہ ہیں، اس لیے میں ان سے نکاح کرنے آیا ہوں۔ آپ ان کا نکاح میرے ساتھ کر دیجئے۔ فرمایا کہ وہ عاقل بالغ ہیں انہیں اپنے نکاح کا اختیار ہے، میں جبر نہیں کر سکتا۔ البتہ ان سے پوچھ سکتا ہوں، پوچھنے جا رہے تھے اتفاق سے پیچھے مڑ کر دیکھا تو اس شخص کی گردن الگ تھی، فرمایا کہ ابوحنیفہؒ کے صبر نے اسے قتل کر دیا۔

ہیچ قومے را خدا رسوا نہ کرد تا دل صاحب دلی نامد بدرد

(کسی قوم کو اللہ تعالیٰ نے رسوا نہیں کیا جب تک کہ اس نے کسی اہل اللہ کے دل کو درد نہیں پہنچایا)

چوں خدا خواہد کہ پردہ کس درد میلش اندر طعنہ پاکاں برد

(جب اللہ تعالیٰ کسی کی پردہ دری اور رسوائی چاہتے ہیں تو اس کا میلان نیک لوگوں کے طعن میں پیدا کرتے ہیں)

چوں خدا خواہد کہ پوشد عیب کس　　　کم زندہ درعیب معیوباں نفس

(جب اللہ تعالیٰ کو کسی کی عیب پوشی منظور ہوتی ہے تو وہ شخص عیب دار لوگوں کے عیب میں بھی کلام نہیں کرسکتا)

بس تجربہ کردیم دریں دیر مکافات　　　با دردکشاں ہر کہ درافتاد برافتاد

(اس دیر مکافات یعنی دنیا میں ہم نے بہت تجربہ کیا ہے کہ جس نے عاشقان الٰہی سے مزاحمت کی وہ خستہ و برباد ہوگیا)

یہ لوگ خدا کے محبوب ہوتے ہیں ان سے گستاخی کرنا سزا سے خالی نہیں جاتا۔ امام ابوحنیفہؒ کے صبر کو ملاحظہ کیجئے کہ اس شخص نے کیسی سخت گستاخی کی اور آپ کس نرمی اور تحمل سے جواب دیتے رہے۔

امام صاحب کی ایک حکایت یاد آئی کہ ایک مرتبہ ایک لڑکے کو کودتا ہوا دیکھ کر فرمایا کہ میاں لڑکے سنبھل کر چلو کہیں پھسل کر گر نہ پڑنا۔ اس لڑکے نے کہا کہ آپ اپنی خبر لیجئے کہ کہیں آپ نہ پھسل جائیں کہ تمام عالم گمراہ ہو جائے اور میرا کیا ہے میں اگر پھسل بھی جاؤں گا تو فقط میرے ہی تھوڑی سی چوٹ آئے گی، دوسروں کو کچھ ضرر نہ پہنچے گا۔ امام صاحب روئے اور فرمایا کہ اے میاں لڑکے ہمارے پاس آؤ اور علم حاصل کرو، وہاں تو یہ خیال تھا کہ بھلا اس لڑکے کی کیا مجال جو کہتا، یہ سب ادھر ہی کا کھلوایا ہوا کہتا ہے۔

دودہاں داریم گویا ہم چونے　　　یک دہاں پنہاں ست درلب ہائے وے

(بانسری کی طرح ہم گویا دو منہ رکھتے ہیں، ایک منہ اس کے لبوں میں پوشیدہ ہے)

یک دہاں نالہ شدہ سوئے شما　　　ہائی و ہوئی درفگندہ درسما

(ایک منہ تمہاری طرف نالاں ہے، ہائے وہو عالم میں ڈالے ہوئے ہے)

جیسے بانسری ہوتی ہے کہ جس وقت آواز نکلتی ہے تو معلوم ہوتا ہے کہ نے بول رہی ہے مگر واقع میں وہ نے کی آواز نہیں بلکہ پھونکنے والے کی آواز ہے کیونکہ اگر نہ پھونکے تو نے نہیں بول سکتی۔ اسی طرح جن کی نظر ناقد ہے وہ یہ سمجھتے ہیں کہ جو کچھ ہے ادھر ہی سے ہے۔ عارف شیرازی فرماتے ہیں۔

اگر عزوجاہ است وگر ذل و قید　　　من از حق شناسم نہ از عمر و زید

(یعنی اگر عزت و مرتبہ ملتا ہے اور اگر ذلت و رسوائی پیش آتی ہے تو اس کو ہم حق تعالیٰ شانہ

کی طرف سے جانتے ہیں، نہ عمرو زید کی جانب سے کیوں کہ مؤثر حقیقی حق سبحانہ ہی ہیں، مخلوق تو محض آلہ کار ہے) اور جن کی نظر نا تمام ہے وہ غلطیاں کرتے ہیں۔

ایک جاہل صوفی تھے، راستہ گلیوں میں ہمہ اوست (سب وہی ہے) کا نعرہ لگاتے پھرتے تھے۔ اتفاق سے ایک ہاتھی آتا تھا۔ اس کے فلیبان نے ہٹو بچو بہت کہا مگر یہ نہ ہٹے اور ہمہ اوست کہتے رہے یہاں تک کہ کچل کر مر گئے۔ ایک بزرگ نے سنا اور کہا کہ اس ہاتھی نے اس ہاتھی کو تو ہمہ اوست میں سمجھا اور اس آواز کو کیوں نہ ہمہ اوست میں داخل سمجھا، خوب کہا ہے۔

در پس آئینہ طوطی صفتم داشتہ اند　　　آنچہ استاد ازل گفت ہماں می گویم

(یعنی اپنی طرف سے با اختیار خود کچھ نہیں کہتے بلکہ جو استاذ ازل یعنی حق تعالیٰ نے فرمایا ہے وہی ہم کہتے ہیں)

بس عارفین یہی سمجھتے ہیں کہ سب کچھ وہیں سے ہے۔ اسی وجہ سے کسی مصیبت سے پریشان نہیں ہوتے۔

از خدا دان خلاف دشمن و دوست　　　کہ دل ہر دو در تصرف اوست

(خدا تعالیٰ کی جانب سے خلاف دشمن و دوست کو سمجھو اس لیے کہ دونوں کے دل اللہ تعالیٰ کے قبضہ قدرت میں ہیں)

تو جن کی نگاہ حقیقت بین ہے وہ کسی کا برا نہیں مانتے۔ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کی انصاف پسندی یہ تھی کہ احباء کی بات بھی قبول فرما لیتے تھے۔

اتفاق کی جڑ

آج کل اتفاق کے حسن پر باوجودیکہ اتفاق ہے مگر پھر نہیں ہوتا۔ وجہ اس کی یہ ہے کہ ہر شخص یہ چاہتا ہے کہ اور لوگ میرے تابع رہیں۔ اگر یہ ہوتا کہ ہر ایک دوسرے کے تابع بنے تو اتفاق ہونا مشکل نہیں ہوتا۔

سلف میں سے دو شخص سفر میں جا رہے تھے۔ ایک نے دوسرے سے پوچھا کہ تم سردار بنو گے یا خادم؟ انہوں نے کہا کہ خادم۔ پھر پہلے شخص نے کہا کہ اچھا جب میں سردار ہوں تو میں جو کچھ کہوں اسے ماننا ہوگا۔ انہوں نے کہا کہ ہاں مانوں گا۔ یہ طے ہونے کے بعد دونوں سردار خادم سفر میں روانہ ہوئے۔ منزل پر پہنچ کر سردار نے خادم سے کہا کہ تم الگ بیٹھے رہو، میں سب کام کروں گا۔ انہو

ں نے کہا کہ یہ کیسے ہوسکتا ہے میں تو خادم ہوں۔ انہوں نے کہا کہ میں سردار ہوں، میرا کہا تم کو ماننا پڑے گا، تمام راہ سفر میں سردار صاحب کام کرتے چلے گئے۔ سبحان اللہ! **سید القوم خادمهم** (قوم کا سردار قوم کی خدمت کرنے والا ہوتا ہے) کے یہی معنی ہیں۔ اتفاق کے لئے یہی لازم ہے کہ جو کچھ آپس میں طے ہوگیا اس کے خلاف نہیں کرتے لیکن اب اتفاق کے معنی ہی بدل گئے۔

ہمارے حضرت رحمۃ اللہ علیہ فرماتے تھے کہ آج کل کے لیڈر جو اتفاق اتفاق پکارتے ہیں انہیں اس کی جڑ معلوم نہیں۔ اس کی جڑ ہے تواضع اور تواضع کاغذ پر نام کے ساتھ حقیر، ذلیل، نیاز مند، خاکسار کے لکھنے سے نہیں ہوتی۔

لفظ مومن جز پے تعریف نیست   میم واؤ میم ونون تشریف نیست

(یعنی لفظ مومن کے اجزاء میم واؤ اور میم ونون میں کوئی بزرگی نہیں ہے۔ یہ تو صرف شناخت و امتیاز کے لئے ہے اور جو کچھ بزرگی ہے وہ اس کے مدلول میں ہے کہ وہ صفت کمال ہے۔

اور آج کل تو وہ کاغذی تواضع بھی گم ہوگئی۔ کاغذی نام بھی ایسے ایسے متکبرانہ ایجاد کیے ہیں۔ پریذیڈنٹ، سیکرٹری، ممبر، محراب، رکن یعنی ستون وغیرہ وغیرہ۔ ہاں یہ نام ہیں، تکبر سے خالی مہتمم، منتظم وغیرہ۔ مگر آج کل تو زیادہ مقصود نمائش ہے اس لیے اکثر انجمنوں میں بجائے اس کے کہ کام کرنے والوں کی اہلیت پر نظر ہوتی، تمول اور شہرت پر نظر ہے۔

کان پور میں ایک جلسہ ہوا۔ اس کے سیکرٹری صاحب نے کسی اپنے دوست سے کہا کہ میں ایک رائے پیش کروں گا تم کہنا میں بھی تائید کرتا ہوں۔ چنانچہ جلسہ میں سیکرٹری صاحب نے رائے پیش کی۔ اتفاق سے وہ دوست صاحب گو امیر تھے مگر جاہل تھے، باوجود رٹنے کے بھی ان کو لفظ تائید یاد نہ رہا۔ مجبوراً کھڑے ہوئے اور کہنے لگے کہ میں بھی آپ کی رائے کی تارید کرتا ہوں۔ سیکرٹری نے اشارہ سے منع کیا تو کہا میں بھی تردید کرتا ہوں پھر انہوں نے اشارہ سے بتلایا تو یہ کہا کہ میں بھی تاکید کرتا ہوں بیٹھ رہے۔

ایک صاحب رئیس دیہاتی گنوار جاہل آنریری مجسٹریٹ مقرر ہوئے، کام تو جانتے نہ تھے۔ ایک دوسرے آنریری مجسٹریٹ کے یہاں کام سیکھنے پہنچے۔ اتفاق سے جس وقت پہنچے تو دو درخواستیں پیش ہوئیں۔ اس میں پہلی منظور کرنے کے قابل تھی اور دوسری منظور کرنے کے قابل نہیں تھی۔ انہوں نے پہلی کو دیکھ کر کہا منظور اور دوسری کو نامنظور۔ بس آپ نے کہا کہ یہی آنریری مجسٹریٹی ہے تو یہ کیا

مشکل ہے، آئے اور اجلاس کیا، درخواستیں پیش ہوئیں، پہلی کو کہاں منجور (منظور) دوسری نامنجور (نامنظور) اسی طرح تمام درخواستوں پر منجور نامنجور کہتے رہے۔ یہ آنریری مجسٹریٹ تھے۔

جب ایسے ایسے جاہل سید القوم (قوم کے سردار) بنیں تو وہ رعایت مصالح کیا کریں گے اور اتفاق کیسے ہوگا۔ دوسروں کو اپنا ہمسر سمجھو اور کمتر نہ سمجھو تو اتفاق ہو اور یہ تواضع سے ہوسکتا ہے۔

تواضع کی شناخت

تواضع بزرگوں کی صحبت سے ہے۔

قال را بگذار مرد حال شو　　　پیش مردے کاملے پامال شو

(قال کو چھوڑ و حال پیدا کرو، یہ حال جب پیدا ہوگا کہ کسی مرد کامل کے قدموں میں جا کر پڑو)

کسی کی جوتیاں اٹھا کر سر پر رکھو تو اضع ہو، پس حتیٰ الامکان کوشش کرو، تواضع کے پیدا ہونے کی کیونکہ یہ شخص بظاہر متواضع ہو بھی گیا تو اس سے کیا ہوتا ہے۔ جب کبھی کوئی بات پیش آجاتی ہے اس وقت ظاہر ہو جاتا ہے کہ یہ تواضع عارضی تھی تو بات یہ ہے کہ اچھی طرح نفس کی صفائی نہیں ہوئی تھی اور مقتضی تواضع نہیں پیدا ہوا تھا یہ بزرگوں کی صحبت سے ہوتا ہے کیونکہ وہ ان امراض روحانی کے طبیب ہوتے ہیں۔ اچھی طرح اس کے سبب کے ازالہ کی کوشش کرتے ہیں۔

خود اختیار کی ہوئی تواضع تو ایسی ہے جیسا کہ ایک بلی کو بادشاہ نے سکھلوایا تھا کہ اگر اس کے سر پر شمعدان رکھ دیا جاتا تھا وہ خاموش بیٹھی رہتی تھی۔ بادشاہ بہت خوش تھے کہ بلی نے بالکل اپنی خصلت چھوڑ دی۔ وزیر نے کہا حضور اس سے اس کی خصلت نہیں چھوٹی بلکہ کوئی بات ایسی نہیں پیش آئی جس سے اس کی خصلت کا چھوٹنا یا نہ چھوٹنا ظاہر ہوتا۔ اس کے سامنے چوہا چھڑوا کر دیکھئے پھر دیکھیں یہ کیسے اسی طرح بیٹھی رہتی ہے۔ چنانچہ اس کے سامنے چوہا چھوڑا گیا، وہ شمعدان پھینک کر دوڑی چوہے کے پکڑنے کو۔

اس تواضع کی بھی ایسی مثال ہے جو کسی بزرگ کی تربیت اور صحبت سے حاصل نہ کی جائے۔ مولانا رومی فرماتے ہیں کہ تمہاری تواضع کی ایسی مثال ہے کہ گوبر ہے کہ پانی کی تہہ میں بیٹھ گیا ہے۔ بظاہر نظر پانی نہایت صاف شفاف نظر آتا ہے لیکن اگر ذرا بھی ہل جائے تو تمام گوبر ظاہر ہو جائے۔

دریائے فراواں نشود تیرہ بسنگ　　　عارف کہ برنجید تنگ آب ست ہنوز

(یعنی بڑا دریا پتھر سے گدلا نہیں ہوتا جو عارف کہ رنجیدہ ہو وہ ہنوز تھوڑے پانی کے مشابہ

ہے کہ ذرا سی چیز پڑنے سے گدلا ہو جاتا ہے)

تو آپ کی تواضع مصنوعی تواضع ہے کہ ابھی اگر کوئی ذرا خلاف مرضی بات کہہ دے پھر دیکھئے آپ کیسا بھڑکتے ہیں۔

مولانا شہید رحمۃ اللہ علیہ کا ایک شخص نے امتحان کیا۔اس نے سنا تھا کہ بڑے تیز ہیں۔دہلی کی جامع مسجد میں مولانا تشریف رکھتے تھے۔وہ آیا اور مجمع میں باآواز بلند پوچھا کہ میں نے سنا ہے کہ آپ حرامی ہیں۔مولانا نے فرمایا کہ تم سے کس نے کہا یہ غلط ہے۔میری ماں کے نکاح کے گواہ اب تک زندہ ہیں، اگر یقین نہ ہو تو پوچھوا دوں۔وہ شخص قدموں پر گر پڑا اور کہنے لگا کہ میں تو امتحان کرتا تھا کہ آپ کی تیزی تکبر سے تو نہیں ہے۔معلوم ہو گیا کہ سارا غصہ اور تیزی اللہ ہی کے لیے ہے، اپنے نفس کے لیے نہیں۔

مولانا شہید سے کسی نے پوچھا کہ شاہ صاحب کے ہوتے ہوئے سید صاحب سے آپ کیوں بیعت ہوئے۔فرمایا کہ جس کو جس سے مناسبت ہوتی ہے اسی سے فیض ہوتا ہے۔سید صاحب جب کافیہ پڑھتے تھے تو ایک دن اتفاق سے اس کے حرف نظر نہ آئے۔کاغذ بالکل صاف نظر آتے تھے اور دوسرے طالب علموں کو دکھایا تو ان کو نظر آتے تھے۔بہت حیران ہوئے، صبح کو شاہ صاحب کے پاس آئے اور تمام ماجرا بیان کیا۔شاہ صاحب نے فرمایا تم کو اس کی اجازت نہیں ہے کہ تم ذکر و شغل کرو۔

ہر کسے را بہر کارے ساختند

مولانا شہید بہت بڑے عالم تھے اور بہت مشہور تھے۔بڑے بڑے امراء قدموں پر سر رکھتے تھے اور سید صاحب ایسے مشہور آدمی نہ تھے مگر مولانا شہید کی حالت یہ تھی کہ سید صاحب کی سواری کے ساتھ ان کی جوتیاں لیے دوڑے جا رہے ہیں۔لوگ ہر طرف سے سلام کر رہے ہیں، ان کے جواب بھی دیتے جا رہے ہیں۔حضرت! یوں نفس مرتا ہے اور اسی کو تواضع کہتے ہیں۔اسی لیے مولانا فرماتے ہیں۔

قال را بگذار مرد حال شو   پیش مردے کاملے پامال شو

(قال کو چھوڑو اپنے اندر حال پیدا کرو، یہ حال اس وقت پیدا ہوگا کہ کسی مرد کامل کے قدموں میں جا کر پڑو) یہ نہیں کہ چندروز ذکر و شغل کر لیا۔ذرا نفس دب گیا، اس کے بعد جب گئے پھر وہ شرارتیں کرنے لگا۔ایک بزرگ فرماتے ہیں۔

صوفی نشود صافی تا در نکشد جامی   بسیار سفر باید تا پختہ شود خامی

(جب تک بہت سے مجاہدات و ریاضت نہ کیے جائیں اس وقت تک نفس کا تصفیہ نہیں ہو

سکتا ہے۔ پختگی کے لیے بہت سے مقامات وسفر طے کرنے کی ضرورت ہے) مولانا فرماتے ہیں۔ ان سفروں کے بعد بھی نفس پر اعتماد نہ کرو۔

نفس اژدھاست او کے مردہ است　　　　از غم بے آلتی افسردہ است

(نفس اژدھا ہے وہ کب مردہ ہوتا ہے، بے آلتی کے غم کے سبب سے افسردہ ہوجاتا ہے)

حکایت ہے کہ کوئی شخص شہر میں ٹھٹھرے ہوئے اژدھے کو مردہ سمجھ کر لایا تھا۔ جب آفتاب کی گرمی پہنچی اس میں ذرا جان آئی اور ذرا ذرا سرکنے لگا، بس پھر کیا تھا، وہ سپیرا بھی اور تماشائی سب بھاگے، نفس کی بھی یہی حالت ہے، چار دن کے ذکر و شغل سے ذرا دب جائے تو اسے مردہ نہ سمجھو۔

ہمارے حضرت الحزم سوء الظن کی تفسیر میں فرماتے تھے کہ ہوشیاری بدگمانی ہے۔ یعنی اپنے نفس سے ہمیشہ بدگمان رہو، ذرا دب جائے تو یہ نہ سمجھو کہ متواضع ہوگیا، تمام امراض دور ہوگئے۔

اب ایک بات جملہ معترضہ کے طور پر کہتا ہوں کہ جب معلوم ہوگیا کہ تواضع کا سبب اہل اللہ کی صحبت ہے اور ان کے انکسار و سادگی سے ان کے ساتھ لوگوں کے یہ گمان ہیں کہ بدتہذیب ہیں، متعصب ہیں تو بلا نفع کیونکر ہو، سوبات یہ ہے کہ

نباشد اہل باطن درپئے آرائش ظاہر　　　　بہ نقاش احتیاجے نیست دیوار گلستاں را

(اہل باطن ظاہری ٹیپ ٹاپ کے درپے نہیں ہوتے، دیوار گلستاں کو نقاش کی احتیاج نہیں ہے)

زعشق ناتمام ما جمال یار مستغنی ست　　　　باب ورنگ وخال وخط چہ حاجت روئے زیبا را

(ہمارے عشق ناقص سے جمال یار بے پرواہ ہے، رخ زیبا کو آب ورنگ اور خط وخال کی کیا حاجت ہے۔ یعنی محبوب حقیقی کا جمال ہمارے عشق ناقص سے بے نیاز ہے)

حسن الحضارۃ مجلوب متنبی کہتا ہے بتطریہ　　　　وفی البداوۃ حسن غیر مجلوب

(شہروں میں بناؤ سنگار کا حسن ہے اور دیہات میں سادگی کا حسن ہے)

دلفریبان نباتی ہمہ زیور بستند　　　　دلبر ماست کہ باحسن خدا داد آمد

(یعنی نباتی دلفریب یعنی گلاب وسنبل وریحان وغیرہ پھولوں سے آراستہ پیراستہ ہیں، ہمارے محبوب میں حسن خداداد ہے، اس زیور کو متعارف کی ضرورت نہیں)

زیر بارند درختاں کہ ثمرہا دارند　　　　اے خوشا سرو کہ از بند غم آزاد آمد

(جو درخت پھلدار ہیں وہ زیربار ہیں، سرو بہت اچھا ہے کہ بندہ غم سے آزاد ہے)

وہ آزاد ہیں انہیں کیا حاجت ہے کوٹ کی پتلون کی، انہیں کیا حاجت ہے میز کی، کرسی کی، انہیں کیا حاجت ہے کوٹھی کی، بنگلہ کی، صاحبو! میں رائے دیتا ہوں کہ اپنے لڑکوں کو جہاں اور تعلیم دیجئے وہاں اہل اللہ کی صحبت میں بھی چندروز رکھئے تا کہ اخلاق حمیدہ ان میں پیدا ہوں۔

کمال محمدی صلی اللہ علیہ وسلم

اب مطلب کی طرف عود کرتا ہوں کہ حضرات اہل اللہ نے اپنے کو تواضع کر کے یہاں تک پہنچا لیا کہ انہیں کوئی بات ناگوار نہیں ہوتی۔ یہ نہیں کہ وہ بے حس ہوتے ہیں، بہت زیادہ لطیف المزاج ہوتے ہیں لیکن متحمل مزاج ہوتے ہیں۔ میں حضرت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حکایت بیان کر رہا تھا کہ اپنے دوستوں ہی کا مشورہ نہیں قبول فرما لیتے تھے بلکہ مخالفوں کی بات کو بھی مان لیتے تھے۔

مقام بدر میں ایک جماعت تاجروں کی شام سے مکہ معظمہ مال لے کر جا رہی تھی۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ رضی اللہ تعالیٰ عنہم سے مشورہ کیا کہ جا کر ان کا مقابلہ کریں۔ صحابہ رضی اللہ تعالیٰ عنہم نے مشورہ دیا مقابلہ کرنے کا، اس کا چرچا ہو گیا، رفتہ رفتہ مکہ تک یہ خبر پہنچی وہاں سے انہوں نے ایک جماعت مسلح کو مقابلہ کے لیے بھیجا، وہ جماعت آئی اور اس نے مقابلہ کیا اور شکست اٹھائی۔ ستر سردار مارے گئے اور اتنے ہی قید کیے گئے۔ قرآن میں اسی کے متعلق مذکور ہے۔

وَاِذْ يَعِدُكُمُ اللّٰهُ اِحْدَى الطَّآئِفَتَيْنِ اَنَّهَا لَكُمْ وَ تَوَدُّوْنَ اَنَّ غَيْرَ ذَاتِ الشَّوْكَةِ تَكُوْنُ لَكُمْ وَيُرِيْدُ اللّٰهُ اَنْ يُّحِقَّ الْحَقَّ بِكَلِمٰتِهٖ وَيَقْطَعَ دَابِرَ الْكٰفِرِيْنَ

(یعنی اللہ تعالیٰ نے وعدہ کیا تھا کہ دو جماعتوں (تجار و محاربین) میں سے تمہیں ایک جماعت ملے گی اور تم چاہتے تھے کہ جماعت تجار ملے لیکن اللہ تعالیٰ چاہتا تھا کہ حق غالب کرے اور کفار کی بیخ کنی کرے) جب اس جماعت محاربین سے جہاد ہو چکا اور ستر سردار قید میں آئے۔ حضرت عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ بھی انہیں اساری (قیدیوں) میں تھے تو حضور سرور عالم صلی اللہ علیہ وسلم صحابہؓ سے مشورہ کرنے لگے کہ اب اس جماعت تجار سے مقابلہ کریں۔ حضرت عباسؓ جو قیدیوں میں تھے بول اٹھے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم ایسا نہ کیجئے گا کیونکہ اللہ تعالیٰ نے احد الطائفتین۔ یعنی ایک گروہ کا وعدہ فرمایا تھا سو وہ پورا ہو چکا۔ اب اگر آپ حملہ کریں گے تو ضرور ناکام ہوں گے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ سن کر اپنی رائے کو بدل دیا اور پھر اس جماعت پر حملہ نہ کیا۔

دیکھئے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ایسا خیال نہیں فرمایا کہ ہمارا ایک مفتوح قیدی ہم کو مشورہ دے رہا ہے کہ ہم کیوں قبول کریں بلکہ چونکہ بات معقول تھی اس لیے فوراً قبول فرمالیا۔

لوگ یہاں یہ کہیں گے کہ حضور نبی صلی اللہ علیہ وسلم تھے اور قرآن کو نہیں سمجھے، میں قسم کھا کے کہوں گا کہ حضرت عباسؓ جو سمجھے وہ بھی حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی صحبت کی برکت سے سمجھے اور یہ جو علم حاصل ہوا محض حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا فیض تھا اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو بھی علم تھا مگر التفات نہ تھا کیونکہ اس وقت حضور صلی اللہ علیہ وسلم صحابہؓ کے مشورہ کی طرف متوجہ تھے۔

نیا وردم از خانہ چیزی نخست　　　　تو دادی ہمہ چیز من چیز تست

(گھر سے ہم کوئی چیز نہیں لائے، ہمارے پاس جتنی چیزیں ہیں وہ سب آپ کی عطا کی ہوئی ہیں) اسی کا ترجمہ ہے۔

بابا کے یہاں سے کون لایا　　　　جس نے پایا یہاں سے پایا

وہ تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم ہی کے یہاں سے ملا ہے جو کچھ جس کے پاس ہے مگر بات یہ ہے کہ اختلاف استعداد کی وجہ سے مختلف پیراؤں میں ان کا ظہور ہوا ہے۔

جملہ نوراست لیکن رنگ ہائے مختلف　　　　اختلافی درمیان ایں و آں انداختہ

(وہی ایک نور ہے لیکن الوان مختلف ہیں جس کی وجہ سے ایک دوسرے میں اختلاف ہوگیا ہے)

وہی ایک کمال محمدیؐ ہے جو مختلف پیرایوں میں ظاہر ہوتا ہے، کہیں فیض کی شکل میں، کہیں وجد کی شکل میں، کہیں قبض کی شکل میں، کہیں بسط کی شکل میں، کہیں جذب کی شکل میں، غرض سب کمالات محمدیہ صلی اللہ علیہ وسلم ہی ہیں جن کا مختلف پیرایوں میں ظہور ہو رہا ہے۔ جیسا توحید افعالی کے باب میں کہا گیا ہے۔

گرم بعلم آئیم ما ایوان اوست　　　　ور بجہل آئیم ما زندان اوست

(اگر علم تک ہماری رسائی ہو جائے تو یہ ان کا ایوان ہے اور اگر ہم جہل میں مبتلا رہیں تو یہ ان کا ہی زندان ہے۔ یعنی حق تعالیٰ ہی کا تصرف ہے۔

گر بخواب آئیم مستان ویئم　　　　ور بہ بیداری بدستان ویئم

(اگر ہم سو رہیں تو انہیں کے بیہوش کیے ہوئے ہیں اور اگر جاگ اٹھیں تو بھی انہیں کی گفتگو میں ہیں)

یہ تو ایک حالت کی نسبت تھا اور کہیں تزاحم بھی ہوتا ہے۔

در تردد ہر کہ او آشفتہ است　　　　حق بگوش او معما گفتہ است

(جو شخص کسی تردد میں پریشان ہو رہا ہے، گویا حق تعالیٰ نے اس کے کان میں کوئی معمہ کہہ دیا ہے) یعنی اس کے کان میں کیا معمہ کہہ دیا ہے۔

بگوش گل چہ سخت گفتہ کہ خنداں است ‌ ‌ ‌ ‌ بعند لیب چہ فرمودہ کہ نالاں است

(پھول سے کیا کہہ دیا کہ ہنس رہا ہے، بلبل سے کیا کہہ دیا ہے کہ رو رہی ہے)

غرض یہ ہے کہ یہ انہیں کے تصرفات ہیں جو سب میں ظاہر ہو رہے ہیں۔ اسی طرح صحابہؓ میں بھی پرتو جناب رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم کا تھا۔ چنانچہ ایک کاتب وحی سے آپؐ نے یہ آیت لکھوائی تھی۔

فَخَلَقْنَا النُّطْفَةَ عَلَقَةً فَخَلَقْنَا الْعَلَقَةَ مُضْغَةً فَخَلَقْنَا الْمُضْغَةَ عِظٰمًا فَكَسَوْنَا الْعِظَامَ لَحْمًا ثُمَّ اَنْشَاْنٰهُ خَلْقًا آخَرَ.

(پھر ہم نے اس نطفہ کو خون کا لوتھڑا بنایا، پھر ہم نے اس خون کے لوتھڑے کو گوشت کی بوٹی بنا دیا، پھر ہم نے اس بوٹی کو ہڈیاں بنا دیا، پھر ہم نے ان ہڈیوں پر گوشت چڑھا دیا، پھر ہم نے اس کو ایک دوسری ہی طرح کی مخلوق بنا دیا)

اتنا لکھنے کے بعد انکے منہ سے بے اختیار نکل گیا ''فتبارک اللہ احسن الخالقین'' (سو کیسی شان ہے اللہ کی جو تمام صناعوں سے بڑھ کر ہے۔ آپؐ نے فرمایا ''اکتب ھکذا انزل'' (لکھ لو اسی طرح اتاری گئی ہے) سبحان اللہ! کیا صحبت فیض ہے جناب رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم کا کہ وحی کے الفاظ بھی القاء ہو جاتے تھے۔ اب یہ شبہ نہ رہا کہ حضرت عباس نے کیسے سمجھ لیا اور جناب رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم نے کیوں نہ سمجھا۔ یہاں سے ایک طالب علموں کے کام کی بات ہے۔ وہ یہ کہ اگر کہیں کوئی بات مطالعہ میں سمجھ نہ آوے اور استاد کے سامنے آتے ہی سمجھ میں آ جائے تو استاد کی برکت سمجھے۔ اسی طور پر استاد کے بھی اگر کوئی بات پڑھانے سے پہلے سمجھ میں آ جائے تو طالب علموں کی برکت سمجھیں۔ اسی طور پر مجلس وعظ میں بھی کوئی ایسا ہے جو وعظ کے مضامین کھینچ رہا ہے۔ خلاصہ یہ کہ ان چار صفتوں کا حاصل ہے۔

وَتَوَاصَوْا بِالْحَقِّ وَتَوَاصَوْا بِالصَّبْرِ.

(یعنی ایک دوسرے کو اعتقاد حق پر قائم رہنے کی فہمائش کرتے رہیں اور ایک دوسرے کو پابندی اعمال کی فہمائش کرتے رہیں)

تمہید گو بہت بڑھ گئی مگر بحمد اللہ بہت ضروری مضامین بیان ہو گئے۔

قسم کی اہمیت

میں نے کہا تھا کہ قسم جس چیز کی کھائی جاتی ہے وہ اپنے آگے سے مضمون کی دلیل ہوتی ہے۔ فرماتے ہیں "والعصر" (یعنی قسم ہے زمانہ کی) اس میں اشارہ ہے اس بات کی طرف کہ زمانہ کی حالت دیکھ لو، کوئی خسارہ میں ہے کوئی توقع میں۔ مقصود البیان میرا اس سے یہ ہے کہ یہ مہینہ رجب کا ہے، اس میں ایک تاریخ آتی ہے، ستائیسویں، اس میں لوگ روزہ رکھنے کا اہتمام کرتے ہیں اور رجب المرجب کے بعد شعبان ہے۔ یہ بھی ایک ایسا وقت ہے جس کے متعلق احکام ہیں اس کے بعد رمضان اور اس کے احکام تو بالکل ظاہر ہیں۔ اسی طرح محرم الحرام تک اتفاقی بات ہے کہ رجب المرجب کو چھوڑ کر اس کے بعد کے مسلسل چھ مہینے ایسے ہیں کہ ان میں سے ہر ایک کے متعلق کچھ نہ کچھ احکام ہیں۔ یوں تو کوئی بھی ایسا نہیں ہے جس کے متعلق کچھ احکام نہ ہوں مگر یہاں روزمرہ بیان کرنا مقصود نہیں کیونکہ وہ ہر شخص جانتا ہے یہاں صرف وہی احکام بیان کیے جائیں گے جن کے متعلق کچھ خاص احکام ہیں جو اور ایام کے لیے نہیں اور ان میں اکثر لوگ غلطی بھی کرتے ہیں۔

چنانچہ شعبان کے متعلق پندرہویں کا روزہ رکھنا اور مردوں کو ثواب بخشنا ہے۔ بلا تخصیص حلوے کے اور انتیس شعبان کو چاند دیکھنا اور رمضان کے احکام بالکل ظاہر باہر ہیں ہر شخص جانتا ہے اور شوال کے متعلق پہلی تاریخ کو افطار کرنا اور چھ روزے رکھنا۔ ان میں سلسلہ وار رکھنے کی ضرورت نہیں۔ اس مہینے میں پورے ہونا چاہئیں۔ یوں کوئی اپنی سہولت کے لیے سلسلہ وار رکھے تو حرج نہیں۔ بہر حال دونوں طرح اجازت ہے جس میں سہولت ہو۔ ان روزوں کی حدیث شریف میں بڑی فضیلت آئی ہے۔ حدیث میں ہے کہ جس نے یہ روزے رکھے گویا اس نے سال بھر کے روزے رکھے۔

اس میں راز یہ ہے کہ ایک نیکی کے بدلے دس نیکیاں لکھی جاتی ہیں اور رمضان کے روزے پورے ایک مہینہ کے ہیں اس لیے دس مہینہ کے تو یہ ہوئے اور چھ روزے یہ شوال کے جس میں ہر روزہ برابر دس روزہ کے ہو کر ساٹھ ہوئے اور ساٹھ دن کے دو مہینے ہوئے۔ تو یہ دو مہینے اور وہ دس مہینے ملا کر بارہ مہینے ہو گئے۔ اب سال بھر روزے رکھنا سمجھ میں آ گیا ہو گا۔

اب اگر کوئی کہے کہ شوال ہی میں ان چھ روزوں کے پورا کرنے کی کیا ضرورت ہے۔ دوسرا رمضان آنے سے پہلے پہلے پورا کر لینا چاہیے۔ تو بات یہ ہے کہ وقت کی بھی تو خصوصیت ہوتی

ہے۔ ذی قعدہ اشہر حج (حج کے مہینوں) میں سے ہے۔ اشہر حج میں سے ہونے کے یہ معنی ہیں کہ اس میں اگر کوئی حج کرنے لگے تو ادا ہو جائے بلکہ معنی یہ ہیں کہ احرام بلا کراہت باندھ سکتے ہیں اور اشہر حج سے پہلے احرام باندھنا مکروہ ہے۔

دوسرا حکم اس کے متعلق یہ ہے کہ یہ اشہر احرام میں سے ہے یعنی اس میں قتل وقتال حرام تھا اور اب حکم کے بقاء میں اختلاف ہے۔ ایک حکم یہ کہ لوگ اس کو منحوس سمجھتے ہیں۔ اسی سے ان کا نام خالی رکھا گیا ہے مگر تعجب ہے کیونکہ یہ تو نہایت مبارک مہینہ ہے کہ اس کے ادھر اُدھر عید ہے اور کوئی مہینہ تو ایسا ہے بھی نہیں، اسے تو کہنا چاہیے تھا۔

صد شکر کہ ہستیم میان دو کریم

(سینکڑوں شکر کہ ہم دو کریموں کے درمیان میں ہیں) ہاں اگر خالی کے معنی یہ ہیں کہ خالی عن النحوستہ (نحوست سے خالی) مگر میں تو اس تسمیہ کے عدم جواز پر فتویٰ دیتا ہوں کیونکہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے عشاء کو عتمہ کہنے سے منع فرمایا تھا حالانکہ ایام جاہلیت ہی سے یہ لوگ عتمہ کہتے تھے اور یہاں تو اسلامی نام ہونے کے باوجود اس کو خالی کہا جاتا ہے، پھر کیسے خالی کہنے کی اجازت ہوسکتی ہے اور ذوالحجہ کے متعلق حج کرنا قربانی کرنا ہے اور محرم میں نویں، دسویں کو روزہ ہے اور گنجائش ہو تو خرچ میں بھی وسعت کی جائے۔ مثلاً جو دال پکاتا ہے، گوشت پکالے، اسی طرح حسب حیثیت سب اپنے اپنے گھر خرچ میں وسعت کریں۔ ایک حکم یہ ہے کہ بدعات سے بچا جاوے تو چھ مہینے متصل ایسے ہیں کہ ان کے متعلق کچھ احکام ہیں۔

ذکر رسول صلی اللہ علیہ وسلم

اور کچھ ایسے ہیں جن کے متعلق کوئی احکام نہیں۔ مثلاً ربیع الاول کہ کوئی حکم اس کے متعلق نہیں۔ بعض لوگوں نے مولود کو اس میں ضروری کرلیا ہے اور اگر کوئی منع کرتا ہے تو کہتے ہیں ذکر رسول صلی اللہ علیہ وسلم سے منع کرتے ہیں، اس کی مثال تو ایسی ہے کہ کوئی نماز پڑھے، نجس کپڑوں سے تو اسے منع کریں گے کہ نماز نہ ہوگی بلکہ گناہ ہوگا، نیکی برباد گناہ لازم (نعوذ باللہ) جناب رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم کے ذکر سے کون منع کرتا ہے۔ یہ تو تہمت ہے بلکہ بے طریقہ ہونے کی وجہ سے منع کرتے ہیں۔ اس کا معیار ہمارے پاس صحابہ کا طریقہ ہے۔ چنانچہ اس زمانہ میں ذکر

شریف ہوتا تھا نہ مٹھائی کی قید تھی نہ اس طور پر فرش وفروش و روشنی وغیرہ کا اہتمام تھا، نہ کوئی خاص زمانہ مقرر تھا، نہ کوئی قیام کرتا تھا بلکہ شوق ومحبت سے ذکر کرتے تھے جیسے حکایت ہے۔

دید مجنوں را یکے صحرا نورد　　در بیابان غمش بنشتہ فرد

کسی نے مجنوں کو جنگل میں دیکھا کہ تنہا بیٹھا ہے

ریگ کاغذ بود انگشتاں قلم　　می نمودی بہرکس نامہ رقم

ریت کو کاغذ بنا کر انگلیوں سے مٹی پر لکھ رہا تھا

گفت اے مجنون شیدا چیست ایں　　می نویسی نامہ بہر کیست ایں

کسی نے پوچھا کہ اے مجنوں کسے خط لکھ رہے ہو

گفت مشق نام لیلیٰ می کنم　　خاطر خود را تسلی می دہم

(کہا دوست کے نام کی مشق کرتا ہوں اور اپنے دل کی تسلی کر رہا ہوں)

جب ہر وقت یہ لوگ ذکر رسول صلی اللہ علیہ وسلم میں لگے رہتے ہیں تو وہاں کیسی گیارہویں، کیسی بارہویں، بڑے پیر کی گیارہویں کے متعلق بھی کچھ بیان کرتا مگر چونکہ اب وقت تنگ ہے اس لیے پھر کبھی دیکھا جاوے گا۔ دوسرے مولود پر قیاس کر سکتے ہیں تو یہ لوگ ہر وقت ذکر رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم میں لگے رہتے ہیں کیونکہ جتنے احکام شریعت کے ہیں سب رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم کے فرمائے ہوئے ہیں۔ ہر ایک کا ذکر رسول صلی اللہ علیہ وسلم ہی کا ذکر ہے اور پھر کبھی جی نہیں بھرتا۔

دل آرام در بر دل آرام جو　　لب از تشنگی خشک برطرف جو

(محبوب پہلو میں بیٹھا ہے اور محبوب کو ڈھونڈ رہے ہیں، نہر کے کنارے پر اور ہونٹ پیاس سے سوکھے ہوئے ہیں)

نگویم کہ برآب قادر نیند　　کہ بر ساحل نیل مستسقی اند

(ہم یہ تو نہیں کہتے کہ پانی پر ان کو قدرت نہیں بلکہ دریائے نیل کے کنارے پر جلندھر کے بیمار کی طرح مریض ہیں) ان کا جی تو کبھی ذکر رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم سے بھر نہیں سکتا۔

مولانا فضل الرحمٰن صاحب مرحوم سے کسی نے پوچھا کہ ذکر مولد کیسا ہے؟ آپ نے فرمایا کہ ہم تو ہر وقت کرتے ہیں۔ پوچھا یہ کیسے؟ فرمایا لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ اگر محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پیدا نہ ہوتے تو کلمہ کیسے پڑھتے۔

لوگوں نے یہ روایت سن لی ہے کہ ابولہب کی ایک لونڈی نے ابولہب کو پیدائش رسول مقبول

صلی اللہ علیہ وسلم کی خبر دی تو اس نے خوش ہو کر اسے آزاد کر دیا۔ اس کی وجہ سے اس کے عذاب میں تخفیف ہوگئی۔ میں کہتا ہوں، دیکھو بدون ایمان واطاعت وہ فرحت کافی تو نہ ہوئی۔

اسی طرح تبرکات کی زیارت مثلاً موئے مبارک وہ بھی خاص اسی مہینے میں نکالا جاتا ہے۔ تبرکات اوران کی تعظیم میں کوئی شک وشبہ نہیں مگر اس کی خرابیوں کو کیا کیا جائے۔ مثلاً عورتیں جمع ہوتی ہیں ایک ہجوم ہوتا ہے، نماز کی بھی کسی کو فکر نہیں ہوتی، کیا نماز ذکر رسول صلی اللہ علیہ وسلم نہیں، روزہ ذکر رسول نہیں، سب ذکر رسول صلی اللہ علیہ وسلم ہے اور مقدم ہے کیونکہ فرمایا ہوا ہے جناب رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم کا

عبار اتنا شتی وحسنک واحد (عنوانات مختلف ہیں معنون ایک ہی حسن ہے)

بہر رنگے کہ خواہی جامہ می پوش   من انداز قدت رامی شناسم

(یعنی جس رنگ کا جوڑا چاہو پہن لو ہم تمہارے پاؤں کی رفتار سے پہچان لیں گے۔)

جتنے احکام جناب رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم کے فرمائے ہوئے ہیں ان کا بجالانا آپ ہی کا ذکر کرنا ہے۔ خواہ وہ صوم کی صورت میں ہو یا صلوٰۃ کی، خواہ حج کی صورت میں ہو یا زکوٰۃ کی۔

شرک فی النبوۃ

صاحبو! بات یہ ہے کہ لوگوں نے مولود شریف تو اپنی طرف سے مخترع کیا اور غضب یہ کیا کہ اس کا نام عید اکبر رکھا۔ غضب کی بات ہے کہ رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم تو فرماتے ہیں کہ ہمیں اللہ تعالیٰ نے دو عیدیں دی ہیں اور انہوں نے تیسری اور ایجاد کر دی۔ اچھا خاصہ معارضہ ہو گیا جناب رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم سے۔

اگر کوئی یہ شبہ کرے کہ اس میں شوکت اسلام کی ظاہر ہوتی ہے اس کی مثال ایسی ہے کہ کسی نے تعزیرات ہند کی سزاؤں کو چھاپتے وقت مضاعف (دوچند) کر دیا کہ جس جرم میں چھ مہینے کی قید تھی وہاں برس روز لکھ دیا اور باز پرس ہونے پر یہ جواب دیدیا کہ کیا حرج ہے، اس میں گورنمنٹ کا رعب زیادہ ہوگا اور اس سے سلطنت میں استحکام ہوگا۔ اب بتلایئے اس نے جو سزاؤں میں اضافہ کیا مقبول ہوگا یا نہیں، مردود ہوگا بلکہ اس شخص پر مقدمہ قائم ہو جائے گا کہ تم اپنے کو شریک سلطنت سمجھتے ہو کہ قانون وضع کرتے ہو۔ بس تو پھر اگر کوئی احکام شریعت میں کچھ اضافہ کرے یا بدل دے تو وہ مجرم ہے یا نہیں؟

صاحبو! یہ شرک فی النبوۃ (نبوت میں اپنے آپ کو شریک کرنا) ہے کیونکہ ایسی مصلحتوں کا دیکھنا نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا کام ہے۔ یہ وجہ ہے اس کے جرم ہونے کی، اب تو قانونی نظیر سے سمجھ میں آ گیا

ہوگا کہ اس لیے بدعات سے منع کیا جاتا ہے کہ یہ شرک فی النبوۃ ہے۔ شیطان بدعت سے بہت خوش ہوتا ہے کیونکہ یہ سمجھتا ہے کہ گناہ جو شخص کرتا ہے اس کو گناہ تو سمجھتا ہے مگر بدعت کو تو دین سمجھ کر کرتا ہے اور عمر بھر مبتلا رہتا ہے۔ جب یہ آیت نازل ہوئی کہ "الیوم اکملت لکم دینکم...... الخ" (ہم نے آج تمہارے دین کو کامل کردیا) تو ایک یہودی کہنے لگا کہ ہم پر یہ آیت نازل ہوتی تو ہم تو اس دن عید مناتے۔ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا کہ کچھ دیوانہ ہوا ہے ہمیں علیحدہ علیحدہ منانے کی کیا ضرورت یہ تو خود عید کا دن ہے۔ جب یہ آیت نازل ہوئی تو یوم عرفہ تھا، سب عرفات میں تھے۔ اگر کوئی یہ شبہ کرے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم یوم دوشنبہ میں روزہ رکھتے تھے۔ صحابی رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے پوچھا کہ یا رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم)! آپؐ اس دن میں روزہ کیوں رکھتے ہیں؟ تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ:

ذالک الیوم الذی ولدت فیہ۔

(یعنی یہ وہ دن ہے جس میں میں پیدا ہوا ہوں) تو جب ایک عبادت یعنی روزہ رکھنا یوم ولادت ہونے کی وجہ سے حضور سے ثابت ہے تو ہم اس عبادت پر دوسری عبادتوں کو بھی قیاس کر کے اسی سے ثابت کر سکتے ہیں۔

ہمیں اس میں کلام ہے کہ روزہ اس لیے رکھا تھا کہ یہ یوم ولادت ہے ممکن ہے روزہ اسی لیے رکھا ہو کہ وہ پہلے سے یوم الفضیلت ہے اور یوم ولادت ہونا اسی فضیلت کے سبب تجویز کیا گیا ہو اور اس پر کہ روزہ کا سبب اس یوم کا کسی دوسری وجہ سے افضل ہونا ہے۔ ایک دلیل بھی ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا ہے کہ اس روز میں نامہ اعمال پیش ہوتے ہیں تو میں چاہتا ہوں کہ میرا عمل روزہ کی حالت میں پیش ہو۔ تو معلوم ہوا کہ یوم دوشنبہ پہلے سے ذی فضیلت ہے اور اسی وجہ سے اس میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی ولادت بھی محقق ہوئی۔

جیسے دسویں محرم کہ اس میں حضرت حسین رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی شہادت ہوئی لیکن وہ دن شہادت کی وجہ سے افضل نہیں ہوا بلکہ اس کے ذی فضیلت ہونے کی وجہ سے اس میں آپؓ کی شہادت واقع ہوئی اور اگر ثابت بھی ہو جائے کہ فضیلت اسی وجہ سے ہے تو زیادہ سے زیادہ اسی قدر تم بھی کر لو جو حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے ثابت ہے اور اگر قیاس ایسا ہی عام ہے تو چاہیے کہ مکہ والے ہر دوشنبہ کو حج بھی کر لیا کریں کہ جب روزہ ثابت ہے حج کرنا بھی قیاس کر لیں۔ حضرات! قیاس کرنا آپ کا کام نہیں ہے۔ اگر قیاس ایسا سستا ہے تو غیر مقلدوں کو ہرگز برا نہ کہو، غیر مقلد صرف اسی کو

نہیں کہتے جو اپنے کیو غیر مقلد کہے بلکہ آج بلاضرورت شرعیہ جولوگ قرآن وحدیث سے استخراج کی کوشش کرتے ہیں یہ سب غیر مقلد ہیں اور لطف یہ کہ سب سے زیادہ یہی لوگ غیر مقلدوں کے دشمن ہیں۔ غرض جو شخص اعمال ظاہرہ کے اثبات میں "كذا في الهداية" (اسی طرح ہدایہ میں ہے) "كذا في الدر مختار" (ایسے ہی درمختار میں ہے) نہ کہے وہ غیر مقلد ہے۔

خیر......! غرض یہ ایک عجیب سلسلہ ہے کہ بارہ مہینوں میں سے چھ مہینوں کے متعلق کچھ احکام ہیں اور چھ کے متعلق کوئی حکم نہیں۔ مجھے اس کا بیان کرنا مقصود تھا کہ رجب کے متعلق بتادوں کہ کوئی خاص حکم نہیں، لوگ ۲۷ رجب کو روزہ کا اہتمام کرتے ہیں اور اس روزہ کا نام ہزاری روزہ رکھا ہے یعنی ہزار روزہ کا ثواب اس ایک روزہ کے رکھنے سے ملتا ہے۔ اس دن میں روزہ ہی ثابت نہیں تو ہزار روزوں کا ثواب کدھر سے ثابت ہوا اور اگر کوئی اس واسطے رکھے کہ اس تاریخ کی شب میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو معراج ہوئی ہے تو بات یہ ہے کہ جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے خود روزہ نہیں رکھا تو یہ کیوں رکھتے ہیں۔ دوسرے یہ کہ اس نفل روزہ کے ثواب کو اتنا بڑھانا جو فرض سے بھی بڑھ جائے اور پھر اپنے رائے سے شرک فی النبوۃ ہے۔

شاید کوئی یہ کہے کہ اس باب میں روایات ہیں تو خوب سمجھ لو وہ سب روایات غیر ثابت ہیں۔ علماء نے ان کی سند میں کلام کیا ہے۔

نظام الاوقات

اس تقریر سے معلوم ہو گیا ہوگا کہ بعض اوقات کو دخل ہے بعض احکام میں کہ وہ احکام مختص ہوتے ہیں، انہیں اوقات کے ساتھ، اگر کوئی اس اختصاص پر یہ شبہ کرے کہ شب قدر تو یہ ایک مرتبہ ہوتی ہے اور ایک ہی ہوتی ہے اور اوقات میں ہے۔ تفاوت مثلاً کہیں آفتاب ایک گھنٹہ پہلے غروب ہوتا ہے کہیں دو گھنٹہ پہلے حتیٰ کہ چھ چھ گھنٹہ کا بلکہ اس سے بھی زیادہ کا فرق ہو جاتا ہے تو اس حالت میں بعض جگہ رات ہوگی اور بعض جگہ دن اور شب قدر رات کے ساتھ مختص ہے اور ایک ہی ہے تو جہاں رات ہے وہاں تو شب قدر ہو جائے گی اور جہاں دن ہے وہاں ہو ہی نہیں سکتی۔

جواب یہ ہے کہ اس کا وقت ہر جگہ کے لیے جدا جدا ہے۔ مثلاً عدالت کے کھلنے کا وقت ۱۰ بجے ہے تو ہر جگہ کے دس بجے وہاں کی عدالت کھلے گی۔ کلکتہ میں وہاں کے ٹائم سے اور لندن میں وہاں کے ٹائم سے۔ غرض یہ کہ انسان کا نظام الاوقات یہ ہوا کہ اپنے اوقات کو دیکھے کہ کس وقت کیا حکم ہے جو وقت آتا ہے اپنے ساتھ ایک حکم لاتا ہے۔

یک چشم زدن غافل ازاں شاہ نباشی شاید کہ نگاہے کند آگاہ نباشی

(یعنی حق تعالیٰ شانہ سے ایک پل بھر بھی غافل نہ ہو، ممکن ہے کہ کسی وقت پر وہ تم پر توجہ فرمائیں اور تم بے خبر ہو)

انسان کو چاہیے کہ ایک لحہ غافل نہ رہے اس پر کسی طالب علم کو شبہ ہوگا۔ قرآن مجید میں ہے۔

یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا اذْكُرُوا اللّٰهَ ذِكْرًا كَثِیْرًا وَّسَبِّحُوْهُ بُكْرَةً وَّاَصِیْلًا

(یعنی اے ایمان والو! تم اللہ کو خوب کثرت سے یاد کرو اور صبح و شام اس کی تسبیح و تقدیس کرتے رہو)

اس میں تو صبح و شام ذکر کرنے کو بتلایا ہے نہ کہ ہر لحظہ۔ تو اس کے یہ معنی نہیں ہیں کہ صرف صبح اور شام ذکر کرو اور باقی اوقات میں خالی رہو بلکہ محاورہ ہے کہ جس کام کو ہر وقت کرانا مقصود ہوتا ہے تو کہتے ہیں کہ رات دن کرتے رہو۔ ذکر ضدین سے مقصود استیعاب اس جنس کا ہوتا ہے اور ذکر صرف یہی نہیں ہے کہ بس تھوڑی دیر اللہ اللہ کر لیا بلکہ "لَا تَقْرَبُوا الزِّنٰۤى اِنَّهٗ كَانَ فَاحِشَةً" (یعنی زنا کے پاس نہ پھٹکو بلاشبہ وہ بڑی بے حیائی کی بات ہے) پر عمل کرنا بھی ذکر ہے کیونکہ یہ بھی فرمایا ہوا ہے اللہ تعالیٰ کا۔

اس پر عمل کرنے کو یوں سمجھو کہ "لاتقربوا" کے معنی یہ ہیں کہ زنا کرنا تو بہت بری بات ہے تو اس کے پاس بھی نہ پھٹکو۔ یعنی جو چیزیں، دواعی زنا ہیں ان کی طرف بھی متوجہ نہ ہو۔ مثلاً نگاہ کو بھی ادھر متوجہ نہ کرو، قلب کو بھی ادھر متوجہ نہ کرو۔ اسی طرح ہر وقت اس وقت کے احکام عامہ و خاصہ کا اہتمام رکھو، اس پروگرام کے منضبط ہو جانے کے بعد اب بتلایئے کہ غیبت کا کونسا وقت ہے، جھوٹ بولنے کا کونسا وقت ہے، ہارمونیم بجانے کا کونسا وقت ہے، گراموفون سننے کا کون سا وقت ہے۔

اعتدال شریعت

ہاں البتہ شریعت تنگ نہیں ہے، اجازت ہے کہ ورزش کیجئے، اجازت ہے کہ ہنسئے بولئے، بات کیجئے، یہاں تک اجازت ہے کہ اگر وظیفہ پڑھتے پڑھتے تھک جایئے تو چھوڑ دو، باہر بیٹھ کر ہنس لو، بول لو مگر کوئی ناجائز بات مت کرو، شریعت میں یہ تعلیم نہیں کہ بیوی کو طلاق دے دو، بچوں کو عاق کر دو اور بس ایک کونہ میں بیٹھ کر اللہ اللہ کرنے لگو۔

ایک صاحب قنوج میں کہنے لگے شریعت کا خلاصہ یہ ہے کہ خوشی کی بات پر خوشی نہ ہو، رنج کی بات پر رنجیدہ نہ ہو، استغفر اللہ! بھلا شریعت ایسی کیوں ہوتی۔

اس کی ایسی ہی مثال ہے کہ کسی نے کہا کہ صاحب جج بڑے خلیق ہیں۔اس کے بعد ایک شخص ملنے کے لئے عدالت میں اور اتفاق سے اس وقت جج صاحب کسی خونی کو پھانسی کا حکم سنا رہے تھے، پس یہ بھاگا وہاں سے، پوچھا ملے تھے؟ کہا، ہاں! پوچھا پھر کیا ہوا؟ کہا کہ صاحب ہم باز آئے ایسی خوش خلقی سے، وہ پھانسی کا حکم سنا رہے تھے۔اگر بد خلق ہوتے تو نہ معلوم کیا کرتے۔ اس نے کہا ارے دیوانے صاحب جج کو ان کے بنگلہ پر جا کر دیکھ کہ کیسے خلیق ہیں کہ ہر ایک سے محبت واخلاق سے پیش آتے ہیں۔احکام شرعیہ کی نسبت تو یہ کہنا بے تکلف صحیح ہے۔

بہار عالم حسنش دل و جاں تازہ میدارد　　برنگ اصحاب صورت رابو ارباب معنی را

(اس کے عالم حسن کی بہار دل وجان کو تازہ رکھتی ہے۔ظاہر پرستوں کے دل وجان کو رنگ سے اور حقیقت پرستوں کے دل وجان کو بُو سے)

شریعت کو ذرا غور سے دیکھو کہ کیسی شفیق ہے تو شریعت یہ نہیں سکھاتی کہ حجرہ میں دروازہ بند ہو کر بیٹھ جاؤ۔

ایک شخص تھے صحابہؓ میں سے کہ وہ کبھی نہ ہنستے تھے، نہ کبھی بولتے تھے تو کسی شخص نے حضرت عائشہ کے سامنے کہا فلاں جد کلہ یعنی فلاں شخص بڑا امتین ہے تو حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا فرماتی ہیں ''هو هزل'' کلہ یعنی وہ ہزل محض ہے۔

آج کل بزرگی اسی کو سمجھا جاتا ہے کہ بس منہ پھولا کر ایک کونہ میں بیٹھ گئے، نہ کسی سے بولنا نہ چالنا، کبھی تیوری کے بل ہی نہیں اترتے، یہ بزرگی ہے؟ ہرگز نہیں! بزرگی تو وہ ہے جس میں انبیاء کی سی شان پیدا ہو۔حدیث میں آیا ہے کہ جناب رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم فجر کی نماز پڑھ کر بیٹھ جایا کرتے تھے۔اس میں ادھر اُدھر کی باتیں ہوا کرتی تھیں، یہ نہیں تھا کہ منہ پھولا کر ایک کونہ میں بیٹھ جایا کرتے تھے۔

بزھد وورع کوش و صدق و صفا　　ولیکن میفزائے بر مصطفیٰ

(زہد وتقویٰ اور صدق وصفاء میں کوشش کرو لیکن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے آگے مت بڑھو) تقویٰ اختیار کرو مگر نہ اتنا کہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے بڑھ جائے۔

ایک مرتبہ صحابہ کے مجمع میں سے ایک صحابی سب کو ہنسا رہے تھے تو جناب رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم نے آ کر ان کے پہلو میں مزاحاً انگلی چبھودی۔انہوں نے کہا کہ میں تو آپؐ سے بدلہ لوں گا، آپ نے مجھے کیوں مارا۔آپؐ نے فرمایا بدلہ لے لو۔انہوں نے کہا کہ میرے بدن پر تو کرتا نہ تھا! آپ بھی کرتا

اتاریئے، آپؐ نے کرتہ اٹھادیا، بس پھر کیا تھا انہوں نے بوسہ دیا اور لپٹ گئے اور کہنے لگے یارسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم)! میرا مطلب یہی تھا بس وہ پورا ہو گیا اور معاذ اللہ! بھلا میں آپؐ سے بدلہ لیتا۔

غرض بہت سی روایات ہیں جن سے جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا مزاح کرنا ثابت ہے اور گوشہ نشینی جو اس قدر غلو کے ساتھ ہو کہیں ثابت نہیں جو لوگ ایسے بزرگ ہوں وہ بزرگ نہیں بلکہ بزرگ (بفتح اول وسکون ثانی وفتح ثالث وسکون رابع) یعنی حروف میں تو برابر ہیں اور معنی اور ہیں۔ سبحان اللہ! ہمارے حضرات میں یہی خوبی ہے۔ بالکل سنت کے موافق عمل ہے، پھر لوگ انہیں بدنام کرتے ہیں، خیر اس کا انصاف تو قیامت کے حوالہ ہے۔

غرض شریعت نے جس طور پر انضباط اوقات کر دیا ہے اس میں نہ افراط کرو نہ تفریط، ضبط اوقات میں تجربہ کیا ہوگا کہ قلب میں فرحت زیادہ ہوتی ہے جو لوگ برکات شرعیہ کو محسوس کرتے ہیں ان کا تو کیا کہنا وہ لوگ بھی جو صرف ضابطہ کی پابندی کرتے ہیں اپنے ٹھیک وقت پر نماز سے فراغت کر لینے پر اپنے قلوب میں فرحت محسوس کرتے ہیں۔ صاحبو! وقت کی قدر کرنی چاہیے۔

الحمدللہ! وقت کے متعلق بہت ضروری مضامین بیان ہو گئے۔ اب وقت تنگ ہے صرف ایک حکایت پر وعظ ختم کرتا ہوں۔ ایک بزرگ کہتے ہیں کہ ایک برف سے مجھ کو بہت عبرت ہوئی۔ وہ کہتا جا رہا تھا کہ اے لوگو! مجھ پر رحم کرو کہ میرے پاس ایسا سرمایہ ہے کہ ہر لحہ تھوڑا تھوڑا ختم ہو جاتا ہے۔ اسی طرح کی ہماری بھی حالت ہے کہ ہر لحہ برف کی طرح تھوڑی تھوڑی ختم ہوتی جاتی ہے۔ اسے گھلنے سے پہلے جلدی بیچنے کی فکر کرو، کس کے ہاتھ جس نے یہ فرمایا:

اِنَّ اللّٰهَ اشْتَرٰى مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ اَنْفُسَهُمْ وَاَمْوَالَهُمْ بِاَنَّ لَهُمُ الْجَنَّةَ (التوبہ)

یعنی بلاشبہ اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں سے ان کی جانوں اور مالوں کو اس بات کے عوض خرید لیا ہے کہ ان کو جنت ملے گی) اور اس عمر کو ضائع مت کرو۔

عمر عزیز قابل سوز و گداز نیست — ایں رشتہ رامسوز کہ چنداں دراز نیست

(پیاری عمر ضائع و برباد کرنے کے لائق نہیں اس کو ضائع مت کرو کیونکہ اس کا سلسلہ اتنا دراز نہیں کہ اس کو فضولیات میں برباد کیا جائے)

بس اب میں وعظ کو ختم کر چکا۔ اب اللہ سے دعا کیجئے کہ ہم کو فہم عطا کرے اور عمل کی توفیق دے۔ آمین۔

حقوق المعاشرت

طرز معاشرت کے متعلق یہ وعظ ربیع الاول ۱۳۳۹ھ کو جامع مسجد تھانہ بھون میں بیٹھ کر ارشاد فرمایا۔

جسے مولوی نور حسین صاحب پنجابی نے قلمبند کیا۔

خطبہ ماثورہ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

الحمدللہ نحمدہ ونستعینہ ونستغفرہ ونؤمن بہ ونتوکل علیہ ونعوذ باللہ من شرور انفسنا ومن سیئات اعمالنا من یھدہ اللہ فلا مضل لہ ومن یضللہ فلا ھادی لہ ونشھدان لا الہ الا اللہ وحدہ لا شریک لہ ونشھدان سیدنا ومولانا محمداً عبدہ ورسولہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وعلیٰ وآلہ واصحابہ وبارک وسلم.

اما بعد فاعوذ باللہ من الشیطان الرجیم، بسم اللہ الرحمٰن الرحیم، يَاَهْلَ الْكِتٰبِ لاَ تَغْلُوْا فِيْ دِيْنِكُمْ غَيْرَ الْحَقِّ وَلاَ تَتَّبِعُوْا اَهْوَاءَ قَوْمٍ قَدْ ضَلُّوْا مِنْ قَبْلُ وَاَضَلُّوْا كَثِيْراً وَّاَضَلُّوْا عَنْ سَوَاءِ السَّبِيْلِ. (المائدہ:۷۷)

''اے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم، آپ فرمائیے کہ اے اہل کتاب تم اپنے دین میں ناحق کا غلو مت کرو اور ان لوگوں کے خیالات پر مت چلو جو پہلے خود بھی غلطی میں پڑ چکے ہیں اور بھی بہتوں کو غلطی میں ڈال چکے ہیں اور وہ لوگ راہ راست سے دور ہو گئے ہیں۔''

تمہید: پہلے میں نے ایک وعظ میں کچھ حقوق کے متعلق بیان کیا تھا کہ مسلمان کے دوسرے مسلمان پر کتنے حقوق ہیں اور وہ چند ہیں۔

۱۔اسلام ۲۔اجابت الداعی

ہر دو معنی کے اعتبار سے یعنی دعوت قبول کرنا اور بلائے تو جواب دینا، چھینکنے کے وقت الحمدللہ کہے تو جواب دینا، بیمار ہو تو بیمار پرسی کرنا، مر جائے تو جنازے میں شریک ہونا۔ یہ تو حاضر ہونے کی حالت میں ہیں اور بعض ایسے حقوق ہیں جو غائب ہونے کے وقت کے ہیں۔ مثلاً اس کی غیبت کو دفع کرنا، اس پر کوئی بہتان باندھے، اس کو دور کرنا وغیرہ۔ میں نے وعدہ کیا تھا کہ ان کے حقوق کے ضروری آداب کسی موقع پر بیان کروں گا۔ سو ان حقوق کے متعلق بعض ضروری آداب کو آج بیان کرتا ہوں۔

افراط وتفریط

جاننا چاہیے کہ اخلاق ومعاشرت کے بھی کچھ حدود وقوانین ہیں۔ مثل احکام نماز روزہ وغیرہ کے جن کی کمی بیشی سے افراط وتفریط میں مبتلا ہو کر ادائے حقوق سے آدمی قاصر رہتا ہے پس جس طرح چار رکعت والی نماز پانچ رکعت یا تین رکعت پڑھنے سے ادا نہیں ہوتی اور عصر کی نماز ظہر کے وقت پڑھنے سے نہیں ہوتی یا جیسے رکوع میں قرأت جائز نہیں بلکہ اور گناہ ہے یا جیسے روزہ عصر تک روزہ نہیں ہوتا اور نیز عشاء تک روزہ رکھنے سے معصیت لازم آتی ہے۔ اسی طرح حقوق معاشرت واخلاق کے بھی حدود ہیں کہ ان میں کمی بیشی کرنے سے قبیح کا ارتکاب لازم آتا ہے۔ اس لیے ان کے آداب اور حدود کو جاننا ضروری ہے۔

آج کل باہمی برتاؤ کے طرز سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ احکام معاشرت سے اکثر کو ناواقفی ہے، گویا اس کو دین ہی نہیں سمجھتے، اس لیے اپنی رائے میں جو آیا کر لیا، اس لیے اس کے احکام کی تحقیق بھی نہیں کرتے اور بعض جاننے والے معاشرت اور اخلاق میں کمی اور تفریط کو برا تو جانتے ہیں مگر افراط کو برا نہیں جانتے بلکہ مطلقاً کثرت کو مطلوب اور محبوب سمجھتے ہیں اور حالانکہ اوپر غلو کے مذموم ہونے سے معلوم ہو چکا ہے کہ جس طرح کمی بری ہے اسی طرح زیادتی بھی بری ہے۔

مثلاً سلام ہے کہ لوگ اس میں کتنی زیادتی کرتے ہیں کہ ذکر، قرآن، خطبہ، اذان وغیرہ سب میں آتے جاتے سلام کرتے ہیں۔ مثلاً مشہور ہے اوچھے نے سیکھا سلام، نہ صبح دیکھے نہ شام۔ اس قسم کے افراط بھی دین میں پسندیدہ نہیں بلکہ حدود سے تجاوز اور غلو فی الدین ہے جس کو اس آیت "لَا تَغْلُوْا فِیْ دِیْنِکُمْ" (اپنے دین میں غلو مت کرو) میں منع فرمایا گیا ہے۔ اس کی مثال نسخے کی سی سمجھنا چاہیے۔

مثلاً طبیب نسخے میں ۶ ماشہ کوئی دوا لکھے تو اگر یہ خیال کر کے یہ چیز جب طبیب نے لکھی ہے تو مفید ضرور ہے، زیادہ ڈالنے سے اور زیادہ فائدہ ہوگا، کوئی شخص وزن بڑھا دے تو وہ دوا ہرگز مفید نہ رہے گی کیونکہ نفع مقدار خاص کے ساتھ مشروط تھا۔ اسی طرح شریعت جب طب ہے تو اس کے احکام کی مثال نسخے کی سی سمجھنا چاہیے تو اس میں کمی بیشی کرنے سے ضرور نقصان ہوتا ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

تِلْکَ حُدُوْدُ اللّٰہِ فَلَا تَعْتَدُوْھَا۔ (یہ اللہ تعالیٰ کے حدود ہیں اس سے آگے نہ بڑھو)

آداب وحقوق کے بیان کرنے کا وعدہ میں نے کیا تھا۔ اس لئے آج اس کا ایفاء کرتا ہوں کیونکہ یہ

بھی ضروری ہے اور ایفائے وعدہ بطور دین کے واجب الذمہ ہو جاتا ہے اور لوگ اس میں بھی سستی کرتے ہیں اور اس کی پروا نہیں کرتے لیکن بعض اوقات بعض ایسے حقوق کا جو کہ دراصل کم درجہ کے ہیں یعنی بڑے حقوق سے زیادہ شرع نے اہتمام کیا ہے کیونکہ ضروری حقوق کو خود ہی لوگ ضروری سمجھ کر ادا کر لیں گے مگر جن حقوق کو ہلکا سمجھ رہے ہیں ان میں ضرور کوتاہی کریں گے اس لیے ان پر خاص تنبیہ کی جاتی ہے۔

اور یہ نکتہ ہے قرآن میں وصیت کو دین پر ذکر میں مقدم کرنے کا چنانچہ ارشاد ہے۔ "مِنْ م بَعْدِ وَصِيَّةٍ يُّوْصِيْ بِهَآ اَوْ دَيْنٍ" (وصیت نکالنے کے بعد جس کی وصیت کر دی جائے یا دین پر قرض کے بعد) حالانکہ شرعاً تجہیز و تکفین کے بعد سب سے مقدم دین ہے اور اس کے بعد وصیت مگر ذکر میں اللہ تعالیٰ نے وصیت کو اس لیے مقدم فرمایا کہ لوگ وصیت کے باب میں تساہل زیادہ کرتے ہیں اور قرض تو سب کے نزدیک ضروری چیز ہے پھر اس مطالبہ میں جبر کرنے والے بھی موجود ہیں اور وصیت فی نفسہ تبرع ہے اس میں جبر کرنے کا کسی کو حق نہ تھا اس لیے وصیت کو ذکر میں مقدم کر کے تنبیہ کر دی کہ دیکھو اس کا بہت بہت خیال رکھنا۔

آداب سلام

خیر یہ ایفائے وعدہ کا ذکر بطور جملہ معترضہ کے ہو گیا تھا۔ اب آداب ان حقوق کے بیان کیے جاتے ہیں۔

ایک اسلام ہے کہ یہ کفایہ کے طور پر سنت ہے مگر اس میں یہ بے احتیاطیاں کی جاتی ہیں کہ ایک تو یہ نہیں دیکھا جاتا کہ یہ وقت سلام کا ہے یا نہیں، بعض اوقات سلام ممنوع بھی ہے۔ مثلاً عبادت کے وقت خواہ وہ ذکر ہو یا قرآن یا نماز سلام ممنوع ہے کیونکہ ایسے وقت سلام کرنا خدا تعالیٰ کی طرف سے ہٹا کر اپنی طرف مشغول کرنا ہے اس کی مثال ہے جیسے کوئی شخص حاکم کے پاس بیٹھا ہوا اس سے باتیں کر رہا ہو اور ایک دوسرا شخص اس کو اپنی طرف مشغول کرنا چاہے کیا یہ خلاف ادب نہ ہو گا۔

ایک بزرگ فرماتے ہیں کہ جو شخص مشغول خدا کو اپنی طرف مشغول کرنا چاہتا ہے اور "کما المقت فی الوقت" (اسی وقت اس کو غضب الٰہی پہنچتا ہے) ہاں اگر ضرورت شدیدہ آ پڑے تو اس وقت ذکر کو چھوڑ کر دوسرا کام کرنا یہ اور بات ہے۔ مثلاً نابینا کنوئیں میں گرنے لگے تو ایسے وقت میں نماز توڑ کر بھی اس کو بچانا ضروری ہے اور یاد رکھنا چاہیے کہ جب علت اس منع کی قلب کا مشغول بغیر حق ہونا ہے تو اس سے

معلوم کرنا چاہیے کہ جیسے ذکر کے وقت سلام ممنوع ہے ایسے ہی کوئی حرکت جس سے دل بٹ جائے ممنوع ہے۔ مثلاً اس کو آگاہ کرنے کے لئے کھنکھارنا، کھانسنا یا اس کی عین پشت کے پیچھے بیٹھ جانا کہ اس سے دوسرے آدمی کی طبیعت پریشان ہوتی ہے، اپنے اوپر قیاس کر کے دیکھ لینا چاہیے۔

آنچہ بر خود نہ پسندی بر دیگراں مپسند

(جو اپنے لئے ناپسند سمجھتے ہو دوسروں کے لئے پسند مت کرو)

بعض لوگ پیٹھ پیچھے بیٹھنے کو ادب سمجھتے ہیں حالانکہ ادب ویسی چیز میں کبھی نہیں ہو سکتا جس میں تکلیف ہو وہ تو بے ادبی ہوئی۔

بہشت آنجا کہ آزارے نباشد کسے را با کسے کارے نباشد

(وہ جگہ جہاں تکلف نہیں جنت ہے وہاں کسی کو کسی سے کام نہیں ہے)

جو لوگ ایسا کرتے ہیں اگر کوئی شخص ان کے پیچھے اسی طرح آکر بیٹھ جائے تب حقیقت معلوم ہو جائے۔ بعض نے ان مضامین کے بیان کرنے پر اعتراض کیا کہ تمہارے مزاج میں تو انگریزی انتظام ہے افسوس! در مختار تو کوئی انگریزی کتاب نہیں آج تو اس میں سلام کے یہ آداب مذکور لکھے ہیں۔

اسی طرح ذکر کرتے وقت دوسرے آدمی کو انتظار میں تکتے رہتے ہیں اس سے بھی طبیعت پریشان ہوتی ہے بلکہ اگر انتظار کرنا ہو تو ایسی جگہ انتظار کرنا چاہیے کہ ذاکر اس شخص کو نہ دیکھے تاکہ اس کا قلب پریشان نہ ہو اور یہ شخص اس کو دیکھ سکے۔

اسی طرح بعض لوگ اور جگہ موجود ہونے کے باوجود عین پیٹھ پیچھے نیت باندھ کر کھڑے ہو جاتے ہیں۔ سو اول تو یہ مشابہ شرک ہے، دوسرے کسی آدمی کو مقید و محبوس کر دینا کہ جب تک یہ سلام نہ پھیریں وہ غریب کہیں جا بھی نہیں سکتا، کون سی عقل کی بات ہے۔

بعضے بخیال فیض لینے کے پیچھے بیٹھ جاتے ہیں۔ سو یاد رہے فیض تکلیف دینے کی حالت میں نہیں ہو سکتا یہ سخت غلطی ہے کہ تکلیف بھی دیں اور فیض کی بھی تمنا رکھیں۔ یہ واقعی بعضا ادب بھی تکلیف دہ ہوتا ہے تو ایسا ادب خود چھوڑ دینا چاہیے۔

دیکھئے! حضرات صحابہؓ خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے نہیں اٹھتے تھے چونکہ ان کو معلوم ہو گیا تھا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اس سے کراہت و ناگواری ہے۔ ادب یہی ہے کہ اپنے بزرگ کی رضا و خوشنودی کی کوشش کرے حتیٰ کہ اگر تصریح یا قرینے سے یہ معلوم ہو جائے کہ

راہ میں ان کے ساتھ ہمارے چلنے سے تکلیف ہوتی ہے تو ساتھ بھی نہ جانا چاہیے، اسی طرح جوتا اٹھانے سے اگر تکلیف ہو تو جوتا بھی نہ اٹھائے۔

جناب مولانا فتح محمد صاحب مرحوم و مغفور کی حکایت ہے کہ جمعہ کے بعد مسجد سے باہر کو تشریف لے جارہے تھے کہ ایک شخص نے آ کر جوتا لینا چاہا، مولوی صاحب نے تواضعاً نہ دیا۔ اس نے اصرار کیا، مولوی صاحب نے زور سے پکڑ لیا تو اس شخص نے ایک ہاتھ سے تو مولوی صاحب کا ہاتھ دبایا اور دوسرے ہاتھ سے زور سے جھٹکا دے کر جوتا چھین لیا، دیکھئے کہ اس شخص نے ایک ذرا سے خیالی ادب کے لئے ان بزرگ کو کیسی اذیت اور تکلیف دی اور اس ادب سے بڑھ کر بے ادبی ہوگی۔

یہ سب ناسمجھی کی باتیں ہیں اور یہ باتیں ہلکی نہیں ہیں اور گو یہ نماز روزہ کی طرح ارکان و شعائر اسلام سے نہیں لیکن اس حیثیت سے کہ اخلاق کا تعلق دوسروں سے ہے اور اس طور پر یہ حقوق العباد سے ہیں اس لیے ان میں خرابی اور افراط تو فریط کرنے سے نماز، روزہ کی کوتاہی سے بھی زیادہ ان میں مواخذہ کا اندیشہ ہے کیونکہ عبادات تو اللہ تعالیٰ کے حقوق ہیں۔ ان میں اگر کچھ کمی ہو تو اللہ تعالیٰ چونکہ کریم ہیں، عفو کی امید بعید نہیں مگر حقوق العباد صاحب حق کے ہیں، معاف کرنے سے معاف ہوتے ہیں اس لیے ان کی رعایت بھی ضروری ہے۔ چنانچہ حدیث شریف میں حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کا وہ قصہ جس میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا رات کو قبرستان کی طرف تشریف لے جانا اور حضرت کی پشت پیچھے جانا مذکور ہے، آداب معاشرت کے مہتم بالشان ہونے کیلئے کافی دلیل ہے۔

وہ قصہ یہ ہے کہ ایک رات کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کے مکان سے قبرستان تشریف لے گئے۔ انہوں نے سمجھا کہ شاید کسی اور بیوی کے ہاں تشریف لے جارہے ہیں اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ معلوم نہ ہوا کہ جاگتی ہیں کیونکہ علم محیط صرف خدائے تعالیٰ ہی کو ہے اس لیے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کہ حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کی آنکھ نہ کھل جائے آہستہ سے اٹھے اور آہستہ سے دروازہ کھولا اور آہستہ بند کیا (ان باتوں کا خیال رکھنا چاہیے کہ سونے والوں کو تکلیف نہ ہو) اور قبرستان کی طرف تشریف لے گئے۔ حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا چونکہ جاگتی تھیں اور ان کا خیال تھا کہ شاید کسی اور بیوی کے ہاں تشریف لے گئے ہیں۔ یہ بات ان کو بوجہ غایت تعلق و محبت گوارا نہ ہوئی اور دبے پاؤں پیچھے پیچھے ہولیں۔

آپ کی شان محبوبیت تو اس درجہ تھی کہ حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کو یا آدمیوں کو تعلق عشق

ہوتا ہوتو کیا عجیب ہے جبکہ حیوانات تک آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت سے بے قرار تھے۔ حج میں جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے سواونٹ ذبح کیے ہیں جن میں تریسٹھ اونٹ اپنے ہاتھ سے ذبح کیے تھے۔ (اس سے قوت جسمانیہ کا بھی اندازہ ہوسکتا ہے) اونٹوں کی یہ حالت تھی کہ بے قرار ہو کر اپنی گردنیں جھکاتے تھے اور آپ کی طرف مشتاقانہ بڑھتے تھے کہ ہم کو ذبح کریں۔ حدیث میں ہے کہ "کلھن یزدلفن الیہ" (ان میں سے ہر ایک آپ کی طرف جھپٹتا تھا)۔ خوب کہا ہے۔

ہمہ آہوان صحرا سر خود نہادہ برکف بامید آنکہ روزے بشکار خواہی آمد

(اس امید پر کہ آپ شکار کو آئیں گے جنگل کے سب ہرنوں نے اپنا سر ہتھیلی پر رکھ دیا ہے)

جب حیوانات کو یہ بے قراری ہو تو حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کو تو خاص تعلق تھا ان کی بے قراری کیا عجیب ہے، غرض کہ حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا پیچھے پیچھے قبرستان میں پہنچیں۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے وہاں اموات کے لئے دعا فرمائی اور اس کے بعد گھر کی طرف لوٹے اور یہ بھی لوٹیں تو اب یہ آگے ہولیں۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے آگے آدمی دیکھ کر تحقیق کے لیے اس طرف تیز چلنا شروع کیا۔ حضرت عائشہ دوڑیں، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی دوڑ کر آگے بڑھنا چاہا اور دوڑیں اور گھر آکر بستر ے پر چپکے سے لیٹ گئیں۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لائے تو پوچھا کہ سانس کیوں چڑھا ہوا ہے۔ الی اخر الحدیث

بعض لوگوں کو ان آداب کی تعلیم بضرورت ذرا سخت الفاظ سے کی جاتی ہے (کیونکہ تعلیم کے لئے بعض حالات و بعض طبائع کے اعتبار سے ذرا سختی کی ضرورت ہوتی ہے) تو برا مانتے ہیں اور اس کو اخلاق کے خلاف سمجھتے ہیں۔ سو جان لینا چاہیے کہ بے تمیزی پر تشدد کرنا اور سختی سے تعلیم کرنا اخلاق کے خلاف نہیں ہے کیونکہ حدیث ہے کہ ایک شخص نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے لقطہ کی نسبت پوچھا کہ اگر کوئی آوارہ بکری ملے تو کیا کیا جائے۔ آپ نے فرمایا کہ لے لینا چاہیے ورنہ کوئی اور یا کہ بھیڑیا لے لے گا۔ پھر ایک شخص نے اونٹ کی نسبت بھی یہی سوال کیا تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ناخوش ہوئے اور تیزی سے جواب دیا۔ اس سے معلوم ہوا کہ غصہ کرنا بے تمیزی پر جائز ہے۔

درشتی و نرمی بہم در بہ است چو رگ زن کہ جراح و مرہم نہ است

(سختی اور نرمی ساتھ ساتھ اچھی ہوتی ہے جس طرح فصد کھولنے والا نشتر بھی لگاتا ہے اور مرہم بھی رکھتا ہے)

پس اصول اخلاق کا یہ ہے کہ بلاوجہ کسی کو تکلیف واذیت نہ پہنچائے۔ بعض لوگ گھر پر آ کر تقاضے پر تقاضا اور آوازیں دینا شروع کر دیتے ہیں یہ بھی تکلیف دینا ہے۔

اِنَّ الَّذِيْنَ يُنَادُوْنَكَ مِنْ وَّرَآءِ الْحُجُرَاتِ اَكْثَرُهُمْ لَا يَعْقِلُوْنَ

پہلے سے سلام کے آداب بیان ہو رہے تھے تو ایک ادب تو مذکور ہوا کہ اطاعت و ذکر میں جو شخص مشغول ہو اس کو سلام نہ کرے اور ایک ادب یہ ہے کہ جو شخص کسی گناہ میں مشغول ہو اس کو سلام نہ کرے کیونکہ عاصی کا اکرام جائز نہیں اور ایک ادب یہ ہے کہ حاجت ضروریہ یعنی بول و براز کی حالت میں سلام نہ کرے، نیز کھانے پینے کی حالت میں سلام نہ کرنا چاہیے اس وقت اگر جواب دیا تو احتمال ہے کہ گلے میں پھندا پڑ جاوے۔ اس بیان کے ضمن میں بہت آداب اور احکام آ گئے۔

آداب مصافحہ و معانقہ

پھر سلام کا متمم مصافحہ ہے۔ اس کے بھی چند ضروری آداب بیان ہوتے ہیں۔ سو جاننا چاہیے کہ مصافحہ اول ملاقات میں بالاتفاق مسنون ہے اور رخصت کے وقت مختلف فیہ اور ان دو کے سوا تیسرا ثابت نہیں۔ پس اس کے لیے بھی ضوابط اور شرائط ہیں کہ بدون ان کے وہ چیز درست نہیں ہوتی۔ مثلاً نماز ہے اگر کوئی چار رکعت کی جگہ پانچ رکعت پڑھنے لگے تو صحیح نہیں ہوگی یا جمعہ حنفیہ کے نزدیک دیہات میں پڑھنے لگے تو نہیں ہوگا یا حج ممبئی جا کر کرے تو نہیں ہوتا۔ اسی طرح ہر امر میں ضابطہ اور قاعدہ ہے چنانچہ مصافحہ و معانقہ کے بھی قاعدہ مقرر ہیں۔

مثلاً عیدین اور جمعہ میں جو لوگ محض رسم جان کر مصافحہ یا معانقہ کیا کرتے ہیں کہیں ثابت نہیں اور عیدین اور جمعہ کو کوئی دخل نہیں۔ اس لیے یہ رسم بدعت ہے اس کو ترک کر دینا چاہیے اور بتلانے والے علماء سے ایسے امور میں مزاحمت نہ کرنا چاہیے کہ صاحب اس کی کیا وجہ ہے یہ کیوں منع ہے کیونکہ دلائل کا سمجھنا آسان نہیں ہے کہ اس کے لیے خاص علوم کی بھی ضرورت ہے۔ البتہ احکام بے شک آسان ہیں کہ مسئلہ معلوم کر لو اور عمل کر لو، باقی دلائل ہر شخص کی سمجھ میں نہیں آ سکتے مگر عوام کے حال پر افسوس ہے کہ باوجود جہل کے علماء سے مقابلہ کرتے ہیں۔ اصل یہ ہے کہ ان کے دل میں علماء کی وقعت نہیں ورنہ وقعت خود مانع ہوتی ہے مزاحمت سے۔

دیکھو اگر کوئی انجینئر کسی سرکاری عالی شان قیمتی عمارت کے گرانے کا حکم دیدے اور اس

عیب ونقصان کی تفصیل نہ بیان کرے تو وہ عمارت فی الفور گرادی جاتی ہے۔ ذرا تامل نہیں کیا جاتا کہ کیونکہ اس کو ماہر و معتبر سمجھ کر اس کی اس تجویز کو باوقعت سمجھا جاتا ہے اور بڑے سے بڑا فاضل دل میں یوں جانتا ہے کہ جس بات کو انجینئر کی عقل اور نظر معلوم کرسکتی ہے وہ میری سمجھ میں نہیں آسکتی۔ افسوس! علماء کو اتنا بھی نہیں سمجھا جاتا جتنا انگریز ڈاکٹر اور انجینئر کو سمجھتے ہیں۔

احکام کا آسان اور دلائل کا مشکل ہونا ایسا ہے جیسا اقلیدس کا یہ دعویٰ سمجھنا تو چنداں دشوار نہیں کہ مثلث کے تین زاویے مل کر دو قائموں کے برابر ہوتے ہیں مگر اس کی دلیل ہر شخص کو آسان نہیں بجز اس کے جو اس۔ کے مبادی جانتا ہو۔ بعض اس سے بڑھ کر شریعت میں ترمیم کی رائے دیتے ہیں اگر ایسی رائے دینے والوں کی باتیں مانی جاویں تو شریعت تو تمام مٹ کر رہ جائے اور بجز کفر و دہریت کے اسلام کا نام بھی باقی نہیں ہے۔ ان رائے دہندگان کی بالکل ایسی مثال ہے۔

گربہ میر سگ وزیر و موش را دیواں کنند   ایں چنیں ارکان دولت ملک را ویراں کنند

(بلی حاکم، کتا وزیر اور چوہا دیوان ہو تو ایسے اراکین سلطنت ملک کو ویران کر دیں یعنی نااہلوں سے ملک برباد ہوجاتا ہے)

مسلمان من حیث مسلمان کا مشرب تو احکام الٰہیہ میں یہ ہے۔

زباں تازہ کردن باقرار تو   میِنگیختن علت از کار تو

(آپ کی ربوبیت کا اقرار کرنا آپ کے کاموں میں علتیں نکالنے کو مانتے تھے)

افسوس! یہ لوگ اتنا نہیں سمجھتے کہ وکیل سے قانون اور دفعہ پوچھی جاوے تو معقول ہے مگر بنا قانون دریافت کرنا محض غیر معقول ہے، اول تو اکثر وکیل جانتے ہی نہ ہوں گے اور جو جانتے ہیں وہ بھی کہہ سکتے ہیں کہ ہمارا فرض منصبی قانون بتلانا ہے نہ کہ علت قانون۔ اگر بنا قانون کی تحقیق منظور ہے تو واضعان قانون سے جاکر پوچھو اور تبدیل قانون کی رائے دینا اور اس میں بحث و گفتگو کرنا تو صریح انکار حکومت ہے۔

افسوس! حکومت دنیویہ کے قانون میں تو یہ مداخلت ناجائز سمجھی جاوے مگر شریعت کے احکام مداخلت کو سہل سمجھا جاوے۔ حکیم، ڈاکٹر، سول سرجن جب کوئی نسخہ تجویز کرتا ہے اس سے کوئی نہیں پوچھتا کہ یہ نسخہ کیوں تجویز کیا ہے اس کی وجہ اور علت کیا ہے مگر علماء سے علتیں پوچھی جاتی ہیں اور حجتیں نکالی جاتی ہیں۔ اصل یہ ہے کہ وہاں تو اصلاح اور شفا مقصود ہے اور یہاں یہ مقصود ہی نہیں ورنہ اطباء روحانی کے نسخہ کو بعد تحقیق ان کے طبیب ہونے کے بے چون چرا پی جاتے ہیں۔ ان کے

دلوں میں خود احکام ہی کی وقعت اور عظمت نہیں بلکہ احکام خداوندی کو کھیل بنا رکھا ہے۔ احکام کا حال رسم ورواج کا سا سمجھتے ہیں کہ ان میں حسب مصلحت تغیر وتبدل ہوا کرتا ہے۔

سحر را با معجزہ کردہ قیاس   ہر دو را بر مکر بنہادہ اساس

(سحر اور معجزہ کو یکساں سمجھا اور دونوں کو مکر اور نظر بندی پر مبنی قرار دیا)

احکام کے دلائل سمجھنا محققین کا کام ہے اور محقق ہونے کے لئے خاص اسباب وآلات کی ضرورت ہے اور جو آدمی درجہ تحقیق تک پہنچنے کی ہمت نہ رکھتا ہو اس کو محققین کی تقلید اور اتباع کرنا چاہیے اور اگر نہ محقق ہوا نہ مقلد تو عنقریب وہی حالت ہوگی جیسا ارشاد فرمایا ہے:

وَقَالُوْا لَوْ كُنَّا نَسْمَعُ اَوْ نَعْقِلُ مَا كُنَّا فِيْٓ اَصْحٰبِ السَّعِيْرِ

(اور کہیں گے کہ ہم سنتے یا سمجھتے تو ہم اہل دوزخ میں نہ ہوتے)

اب مصافحہ کے متعلق عرض کرتا ہوں۔ بعض وقت مصافحہ کرنے سے دوسرے آدمی کو بار ہوتا ہے۔ فرض کیجئے ایک ہاتھ میں جوتا ہے دوسرے ہاتھ میں چھتری ہے۔ اب مصافحہ کرے کیسے بجز اس کے کہ جوتے کو رکھے تو خود اس کو تکلیف دینا یہ امر غیر معقول ہے۔ اسی طرح جو آدمی کام میں مشغول ہو اس سے مصافحہ نہ کرنا چاہیے اس سے تکلیف بھی ہوتی ہے اور حرج بھی ہوتا ہے۔ اسی طرح جو شخص تیز چلتا ہے اس کو مصافحہ کے لئے محبوس کرنا مناسب نہیں کیونکہ اس میں دوسرے ضروری کام کا حرج ہوتا ہے۔ اس لیے تنگی ہوتی ہے اسی طرح بعض آدمیوں کی عادت ہے کہ مجلس میں پہنچ کر سب آدمیوں سے مصافحہ کرتے ہیں اور اگر وہ لوگ کسی شغل میں ہوں تو اتنی دیر تک سب بیکار ہو جاتے ہیں اور اس سے تنگی ہوتی ہے۔ اسی طرح اکثر لوگوں کی عادت ہے کہ بعد وعظ واعظ سے ضرور مصافحہ کرتے ہیں۔ سو اول تو یہ بدعت ہے اور پھر تکلیف بھی ہے۔

آداب سفارش

جس بات میں دوسرے کو تکلیف ہو وہ نہ کرنا چاہیے۔ مثلاً اگر قرائن سے معلوم ہو کہ سفارش کرنے سے دوسرے آدمی پر بوجھ ہوگا تو ایسی سفارش نہ کرے۔ بعض دفعہ سفارش پر عمل کرنا اس آدمی کی مصلحت کے خلاف پڑتا ہے اور سفارش کنندہ کے لحاظ اور دل شکنی کی وجہ سے اپنی مصلحتوں کے خلاف پر اس کو مجبور ہونا پڑتا ہے اور اب سفارش کنندہ تو اس خیال میں مست ہیں کہ ہم نے فلاں کی حاجت روائی کر دی مگر

اس کی خبر نہیں کہ بلا وجہ اور ناحق دوسرے آدمی پر بوجھ ڈال کر اس کی مصلحتوں کا خون کیا۔ ایک نیکی کے لیے جو کہ واجب بھی نہ تھی مفت میں کئی برائیاں ذمہ لیں۔ اکثر لوگ ایک مصلحت کو دیکھ لیتے ہیں کہ ایک آدمی کو نفع پہنچ گیا مگر ان مضرتوں اور کلفتوں کو نہیں دیکھتے جو دوسروں کو پہنچیں۔

حفظت شیئا وغابت عنک اشیاء

(ایک چیز تجھے یاد رہی اور بہت سی چیزیں تجھ سے غائب ہوگئیں)

اگر سفارش کی ضرورت ہو تو اس میں صاف ظاہر کر دینا چاہیے کہ تمہاری مصلحت کے خلاف نہ ہو تو یہ کام کر و ورنہ...... خیر تا کہ دوسرے آدمی پر بوجھ نہ پڑے۔

دیکھئے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت بریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے مغیث رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی سفارش کی کہ ان کو نکاح میں قبول کرلو، بریرہؓ چونکہ جانتی تھیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سفارش میں بوجھ نہیں ڈالتے اس لیے انہوں نے پوچھا کہ آپ حکم فرماتے ہیں یا سفارش؟ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ نہیں حکم نہیں دیتا سفارش کرتا ہوں۔ اس پر بریرہؓ کو چونکہ معلوم تھا کہ آپؐ اس سے ناخوش نہ ہوں گے، انہوں نے صاف انکار کر دیا۔

تو بس سفارش ایسی ہونی چاہیے کہ دوسرے پر بوجھ نہ پڑے بلکہ صاف کہہ دے کہ اگر خلاف مصلحت نہ ہو تو کرو کچھ زور نہیں ڈالا جاتا ہے کہ صاحب! یہ کام آپ کو ضرور کرنا ہوگا۔ افسوس! ہم نے سب طریقے اور معاملات اور طرز معاشرت وغیرہ کو بدل دیا ہے، کس کس چیز کی اصلاح کی جاوے۔ مثلاً اونٹ رے اونٹ تیری کونسی کل ہے سیدھی۔

تن ہمہ داغ داغ شد پنبہ کجا کجا نہم

(تمام بدن پر داغ ہی داغ ہیں، کہاں کہاں پھایا رکھا جائے)

یہ ایسا وقت ہے کہ ان سب خرابیوں کو دیکھ کر زبان پر یہ شعر آ جاتا ہے۔

اے بسرا پردہ یثرب بخواب   خیز کہ شد مشرق و مغرب خراب

(اے وہ ذات اقدس جو یثرب میں آرام فرما ہے اُٹھ کہ مشرق و مغرب خراب ہوگئی)

آداب دعوت

غرض اس بات کا خیال رکھے کہ جو کام کلفت دہ ہو وہ نہ کرے۔ مثلاً دعوت تو کم آدمیوں کی

اور آئیں زیادہ، یہ مرض بھی کچھ ایسا عام ہو رہا ہے کہ اکثر لوگ شادی بیاہ میں اس کی پروانہیں کرتے۔ خواہ اہل خانہ کے ہاں اتنا سامان نہ بھی ہو۔ ایک ظریف آدمی تھے۔ انہوں نے جو دیکھا کہ شادی بیاہ وغیرہ عام دعوتوں میں ایک ایک اور دو دو کو ضرور ساتھ لے جاتے ہیں۔ انہوں نے کیا دل لگی کی کہ ایک دفعہ جو دعوت میں گئے تو ایک بچھڑے کو بھی ساتھ لے گئے اور جب کھانا رکھا جانے لگا تو انہوں نے بچھڑے کے حصہ کی بھی رکابی رکھوائی، لوگوں نے تعجب سے پوچھا کہ یہ کیا حرکت ہے۔ انہوں نے کہا کہ بھائی اور لوگ اپنی اولاد کو لاتے ہیں میری کوئی اولاد نہیں۔ میں اس کو عزیز رکھتا ہوں میں اس کو لایا۔ غرض سب شرمندہ ہوئے اور اس رسم کو موقوف کیا گیا۔

حدیث شریف میں ہے کہ ایک دفعہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ دعوت میں ایک آدمی ویسے ہی چلے گئے آپؐ نے مکان پر پہنچ کر صاحب خانہ سے صاف فرمادیا کہ یہ ایک آدمی ہمارے ساتھ ہولیا ہے اگر تمہاری اجازت ہو تو آوے ورنہ چلا جاوے۔ صاحب خانہ نے اس کی اجازت دے دی اور وہ شریک ہو گیا۔

رہا یہ شبہ کہ شاید آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے لحاظ سے اس نے اجازت دیدی ہو، اس کا جواب یہ ہے کہ ایسے امور میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس قدر آزادی دے رکھی تھی کہ جس کا جی چاہتا قبول کرتا تھا اور جس کا جی چاہتا تھا انکار کر دیتا تھا۔ چنانچہ حضرت بریرہؓ کا قصہ آپ نے ابھی سنا ہے ایک قصہ اس سے بڑھ کر سنئے۔

مسلم میں ہے کہ ایک دفعہ ایک فارسی شخص نے کہ شوربا عمدہ پکاتا تھا، شوربا پکا کر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت کی۔ آپؐ نے فرمایا: بشرطیکہ عائشہؓ کی بھی دعوت کرو تو قبول کرتا ہوں۔ اس شخص نے عرض کیا کہ نہیں حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کی نہیں۔ اس پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ہماری بھی نہیں۔ پھر اس نے اصرار کیا، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی یہی فرمایا، اس نے چند بار انکار کیا۔ اگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے لحاظ کا بوجھ اور دباؤ ہوتا تو وہ انکار کیوں کرتا۔ پھر اپنی خوشی سے اس نے حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کی بھی دعوت قبول کی اور آنحضرت نے قبول فرمائی اور یہ جائز ہے کہ دعوت قبول کرنے میں کوئی شرط لگادے۔

غرض اس قسم کا تکلف اور تکلیف جو آج کل ہم لوگوں میں ہے۔ اس زمانہ میں نہیں تھا، ہم لوگوں نے اپنی حالت خود بگاڑ رکھی ہے اور مذہب اسلام کو غیر قوموں کی نظروں میں ہلکا بنادیا ہے،

وہ ہماری بدحالت کو جو ہم نے خود اپنے افعال سے کر رکھی ہے دیکھ کر غلطی سے مذہب اسلام کو ناقص سمجھنے لگے ہیں اور دراصل ہم ہی نے اسلام کو بدنام کر رکھا ہے اور جس طرح بعض مواقع مذکور میں مصافحہ کرنا موجب اذیت ہیں، اسی طرح کھانے وغیرہ کے وقت مصافحہ کرنا بھی سراسر خلاف تہذیب ہے، ہاتھ تو سالن میں سن رہا ہے ان کو مصافحہ کی پڑی ہے۔ بعض ایسی بے تمیزی کرتے ہیں کہ ہاتھ میں قارورہ پیشاب کا ہے بس اس کو رکھا اور مصافحہ کرنے لگے۔ یہ بالکل نظافت کے خلاف ہے اگرچہ ہاتھ میں کچھ نہ لگا ہو۔

اصل اس کی حدیث "من مس فرجه فليتوضاء" (سنن النسائی ۱:۲۱۶، سنن ابی ماجہ ۱:۴۸۱، ۴۸۲) (جو شخص اپنی شرمگاہ کو مس کرے اسے چاہیے کہ وضو کرے) ہے۔ امام شافعی صاحب اس حدیث سے مس فرج کو ناقض وضو قرار دے کر وضو کا حکم فرماتے ہیں مگر ہمارے آئمہ اس کو نظافت پر محمول فرماتے ہیں اور کہتے ہیں مطلب یہ ہے کہ یہ ہاتھ اب قابل نماز کے نہیں۔ استحبا با وضو لغوی یعنی ہاتھ دھونا یا وضو شرعی کر لیا جاوے۔

اقسام دعوت

من جملہ حقوق اسلام ایک حق اجابۃ الداعی پھر دو معنی ہیں۔ یعنی ایک معنی یہ ہے کہ مسلمان بھائی کے پکارنے پر جواب دے، اس کے بھی آداب ہیں۔ چنانچہ امام ابو یوسف کو امام صاحبؒ نے وصیت فرمائی تھی کہ اگر کوئی تم کو پیچھے سے پکارے تو جواب مت دو کیونکہ اس نے تمہاری اہانت کی ہے اس نے تم کو حیوان چارپاؤں کی طرح پیچھے سے آواز دی ہے۔

كَمَثَلِ الَّذِىْ يَنْعِقُ بِمَا لَا يَسْمَعُ اِلَّا دُعَآءً وَّنِدَآءً

(اس کیفیت کے مثل ہے کہ ایک شخص ہے اور وہ اس جانور کے پیچھے جا رہا ہے جو بجز پکارنے اور بلانے کے کوئی بات نہیں سنتا)

اور یہ جواب نہ دینا تکبر نہیں ہے بلکہ ایک شخص کی اصلاح ہے اور واقع میں پیچھے سے آواز دینا کتنی بے تمیزی کی بات ہے کہ کام تو ہمارا اور روکیں اس کو، یہ خلاف تہذیب ہے، خود آگے بڑھ کر سامنے کی طرف سے آ کر بولنا چاہیے۔

دوسرے معنی اجابت الداعی کے دعوت قبول کرنے کے ہیں، اس میں بھی آداب ہیں،

بعض آدمی تکبر کی وجہ سے دعوت غریب کی قبول نہیں کرتے۔ یہ تکبر مذموم اور قبیح ہے۔

ایک حکایت یاد آئی۔ ایک مولوی صاحب کی دعوت ایک بیچارے غریب نے کی۔ مولوی صاحب اس کے ساتھ دعوت کھانے جارہے تھے۔ راستہ میں ایک رئیس صاحب نے پوچھا مولوی صاحب کہاں تشریف لے چلے؟ مولوی صاحب نے جواب دیا کہ اس سقے نے دعوت کی ہے اس کے یہاں جارہا ہوں۔ رئیس صاحب ملامت کرنے لگے کہ مولوی صاحب آپ نے تو بالکل ہی بات ڈبودی اور ایسی ذلت اختیار کی۔ مولوی صاحب نے ایک لطیفہ کیا۔ اس سقے سے فرمایا کہ بھائی اگر ان کو بھی دعوت میں لے چلو تو چلتا ہوں ورنہ میں بھی نہیں چلتا۔ اب وہ سقہ امیر صاحب کے گرد ہوا اور منت سماجت کرنے لگا۔ اول اول تو بہت عذر کیے مگر خوشامد عجیب چیز ہے پھر اور لوگ بھی جمع ہو گئے اور مجبور کرنے لگے، لامحالہ جانا پڑا، وہاں جا کر دیکھا کہ غریب لوگ جس تعظیم وتکریم سے پیش آتے ہیں وہ امیروں ونوابوں کے یہاں خواب میں بھی نہیں دکھلائی دیئے تو قائل ہو گئے کہ واقعی راحت، عزت اور محبت غریبوں سے ملنے میں ہے۔ وہ امیروں سے ملنے میں قیامت تک نہیں اور حقیقت میں غریبی میں جو پریشانی کی حد تک نہ ہو جس قدر دینی اور دنیوی راحت ہے وہ ثروت میں نہیں اور فضیلت الگ حدیث میں ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم دعا فرماتے ہیں:

اللھم احینی مسکینا وامتنی مسکینا واحشرنی فی زمرته المساکین۔

(سنن الترمذی: ۲۳۵۲، سنن ابن ماجہ: ۴۱۲۶)

(یعنی اے اللہ مجھے مسکینوں میں زندہ رکھ اور مسکینوں میں موت دے اور قیامت کے دن مسکینوں کے ساتھ میرا حشر فرما)

پس مال کی اتنی ضرورت ہے کہ فاقہ نہ ہو اور پریشان نہ ہو۔ غرض یہ کہ غریب لوگ اگر دعوت کریں تو صاحب ثروت کو جاہ وتکبر کی راہ سے انکار نہیں چاہیے۔ باقی یہ کہ ہر جگہ کی دعوت بلا امتیاز اخلاق عدم اخلاق قبول کرے۔ گو زیادہ تحقیق وتفتیش اور کھود کرید کی ضرورت نہیں مگر تاہم جن لوگوں کے ہاں بظن غالب اکثر آمدنی حرام ہے ان کی دعوت قبول کرنا جائز نہیں۔ جیسے آج کل موروثی زمینوں کی کثرت ہے اسی طرح رشوت کی، سو ایسے لوگوں کے ہاں دعوت قبول نہ کرے ہاں اگر غالب مال حلال ہو تو جائز ہے لیکن اگر زجر کے لیے نہ کھاوے تو زیادہ بہتر ہے۔

اسی طرح اگر مجمع معصیت میں دعوت ہو قبول نہ کرے اور اگر اس کے جانے کے بعد فعل

معصیت شروع ہے مثلاً راگ باجا جو اکثر شادیوں میں ہوتا ہے تو اگر خاص اس جگہ ہے جہاں پر بیٹھا ہوا ہے تو چھوڑ کر چلا آوے اور اگر فاصلہ سے ہے تو اگر یہ شخص مقتدائے دین ہے تب بھی اس کو وہاں سے اٹھ آنا چاہیے۔ اگر مقتدائے دین نہیں تو خیر کھانا کھا کر چلا آوے۔

اسی طرح جو رسوم خلاف شریعت اکثر شادیوں میں ہوا کرتی ہیں ان ہی سے وہ مجمع، مجمع معصیت ہو جاتا ہے وہاں نہ بیٹھے اور رسوم تو الگ ہیں، خود آج کل برأت ہی مجمع معصیت ہے اگر کوئی اور خرابی نہ ہو تو یہ خرابی تو ضرور ہی براتوں میں ہوتی ہے کہ براتی مقدار دعوت سے زائد جاتے ہیں جس سے بچارے میزبان کو سخت وقت کا سامنا ہوتا ہے، کہیں قرض لیتا ہے کہیں اور کچھ فکر کرتا ہے، غرض بہت خرابی ہوتی ہے، پھر ایسے شخص کی نسبت حدیث شریف میں یہ الفاظ ہیں کہ "دخل سارقا خرج مغیرا" "بئس المطاعم عین الذل نکسبها فالقدر منصب والقدر مخصوص" (وہ کھانے برے ہیں جو ذلت کے وقت تجھ کو حاصل ہوتے ہیں، ہانڈی چڑھی ہوئی ہے اور عزت گری ہوئی ہے) ایسی ہی شادی غمی کے موقع پر جو اکثر لوگ تفاخر کے طور پر دعوت کرتے ہیں ان کی دعوت بھی قبول نہ کرنا چاہیے۔ اسی طرح جو دعوت دین اور طاعت کا عوض ہو وہ بھی درست اور جائز نہیں، جیسے تیجے وغیرہ میں قرآن اور کلمہ دُرود پڑھ کر اس کے عوض دعوت اور الا یچی دانہ اور چنے وغیرہ ملتے ہیں۔

زیاں می کند مرد تفسیرداں — کہ علم و عمل می فروشد بناں

(عالم قرآن نقصان کرتا ہے کہ علم و عمل کو روٹی کے عوض فروخت کرتا ہے)

اسی طرح وعظ کی خاص دعوت یا اجرت بھی ایسی ہی ہے جس کے دل میں کچھ بھی دین کی غیرت اور عزت ہوگی وہ خود ایسی باتوں سے پرہیز کرے گا۔ البتہ واعظ اگر مسافر ہو اور مسافرت کے طور پر کھالیوے تو یہ اور بات ہے مگر پھر بھی جہاں پر وعظ ہو اس جگہ سے نہ کھاوے، ایسا ہی مرید ہونے کے موقع پر پیر کی دعوت کرنا کیونکہ یہ بالکل صورت مبادلہ کی ہے۔

آداب ہدیہ

اسی طرح نذر ہدیہ وقت بیعت اور علاوہ اس کے کہ ہدیہ میں بیعت کے وقت کا مبادلہ کی صورت ہے اس میں کئی اور بھی خرابیاں ہیں۔ مثلاً بعض نادار غربا۔ جو بیعت ہونا چاہتے ہیں وہ بوجہ شرم کے رک جاویں گے۔ اسی طرح ذلت کی دعوت بھی قبول نہیں کرنا چاہیے کیونکہ ذلت سے

بچنا شریعت میں محمود ہے۔ حدیث شریف میں ہے کہ:

لا ینبغی للمؤمن ان یذل نفسہ. (سنن الترمذی: ۲۲۵۴، سنن ابی ماجہ: ۴۰۱۶)
(مؤمن کو اپنے نفس کو ذلیل نہ کرنا چاہیے)

ذلت کی دعوت آج کل زیادہ تر ایک ہے یعنی جو کہ مردوں کے ایصال ثواب کے لئے دعوت کی جاتی ہے اور طالب علموں اور ملاؤں وغیرہ کو بلایا جاتا ہے۔ بس یہ دعوت ہے کہ اس کے کھانے والے عام لوگوں میں حقیر سمجھے جاتے ہیں۔ چنانچہ کان پور میں ایک دفعہ دعوت میں جاتے ہوئے طالب علموں کی نسبت سنا کہ خدا خیر کرے کس کے گھر پر چڑھائی ہوئی ہے اور اس قسم کی دعوت طعام ذلت ہے اس سے بچنا چاہیے۔

علامہ شامی نے لکھا ہے کہ اہل علم کو اس دعوت سے بچنا چاہیے جس میں ذلت ہو۔ وجہ یہ کہ اہل علم کی ذلت خود علم کی ذلت ہے، قبول کرنے کے لائق صرف وہ دعوت ہے جو محض محبت سے ہو، حلال کھانا ہو، نہ اس میں رسم کی پابندی ہو نہ تفاخر اور نہ ریا ہو، نہ ذلت ہو بلکہ اس کی بنا محض محبت ہی محبت ہو۔ ایسی ہی ہدیہ میں بھی ہونا چاہیے۔ بس اس قسم کی دعوت اور ہدیہ مسنون ہے اس کا قبول کرنا سنت ہے کیونکہ صرف محبت سے ہے۔ "تھادوا وتحابوا" (آپس میں ہدیہ دیتے دلاتے رہو آپس میں محبت بڑھاتے رہو)۔ حدیث شریف ہے: باقی رسم کے طور پر جو کچھ دیا جاتا ہے مثلاً شادی کے جوڑے وغیرہ اس میں محبت کا نام بھی نہیں، ہاں اگر محض محبت سے بلا قیدو پابندی رسوم ہوں تو جائز ہے بلکہ ایسا ہدیہ کھانے سے دل میں نور پیدا ہوتا ہے۔

آداب عیادت

من جملہ ان حقوق کے جو ایک مسلمان کے دوسرے پر ہیں، عیادت یعنی بیمار پرسی ہے، اس کے بھی آداب ہیں۔ ان میں بھی افراط وتفریط ہو رہی ہے چنانچہ بعض آدمی تو سرے سے بیمار کو پوچھنے ہی نہیں جاتے یہ تفریط ہے اور بعض پوچھنے جاتے ہیں تو بجائے اس کے کہ بیمار کو ان سے راحت ہوتی یہ اور الٹے موجب تکلیف بنتے ہیں۔ مثلاً وہاں جا کر زیادہ دیر تک بیٹھا رہے یہ تکلیف کی بات ہے۔ بیمار آدمی کو مختلف حوائج اور ضروریات ہوتی ہیں اور وہ بے چارہ ان کا لحاظ کرتا اور تکلیف اٹھاتا ہے۔ حدیث شریف میں ہے۔ "من عادمنکم مریضا فلیخفف جلوسہ" (جو شخص تم میں سے مریض کی عیادت کرے اس کو چاہیے کہ اس کے پاس کم بیٹھے)

البتہ تیمارداری اور چیز ہے اس میں بیمار کے پاس ہر وقت بیٹھنا خدمت کے لئے ہے۔ خدمت ہر کسی پر ضروری نہیں مگر دفع اذیت اور راحت سب پر ضروری ہے۔ بعض آدمیوں کی عادت ہے کہ بیمار آدمی کے پاس بیٹھ کر فضول قصے ہانکا کرتے ہیں یا خود اس بیمار ہی سے بیماری کا سارا قصہ پوچھتے ہیں۔ ایسی باتوں سے بیمار کو تکلیف ہوتی ہے ان سے بچنا چاہیے۔

بہشت آنجا کہ آزارے نباشد (وہی جگہ جنت ہے جہاں کوئی تکلیف نہ ہو)

آدابِ تعزیت

ایک ان حقوق میں سے تعزیت وشرکت جنازہ ہے۔ اس کے بھی آداب ہیں۔ مثلاً کندھا دینا، قبر میں اترنا، کچھ پڑھ کر ثواب بخشنا مگر شریعت کے موافق اس کو نفع پہنچے ورنہ بیکار ہے۔ مثلاً بعض لوگ ایصال ثواب کے لیے میت کے تمام پارچات پوشیدنی دے دیتے ہیں اور تمام ورثاء سے اجازت نہیں لیتے یا ورثاء نابالغ ہیں جن کی اجازت قبل از بلوغ معتبر نہیں۔ سو یہ تصرف میت کے ترکہ میں جو کہ سب ورثاء میں مشترک ہے ناجائز ہے۔ ہاں بعد تقسیم ترکہ جس کا جی چاہے اپنے حصے میں سے دے سکتا ہے اور ایسے کپڑے وغیرہ اشیائے استعمال اکثر مساجد اور مدارس میں آتے ہیں۔ لہٰذا مدرسہ اور مسجد والوں کے ذمہ ضروری ہے کہ امور مذکورہ کی تحقیق کرلیا کریں، وعظ ختم ہوا۔

خلاصہ وعظ

تمام وعظ کا خلاصہ یہ ہوا کہ معاشرت باہمی میں اس کا خیال رہے کہ مردہ اور زندہ سب کو راحت اور نفع پہنچے اور کسی کو مضرت اور تکلیف نہ ہو اور ان امور میں سلیقہ صحبت اہل اللہ سے حاصل ہوتا ہے مگر بعضے لوگ خود بزرگوں کے ہاں جانے میں ایسی بے احتیاطی کرتے ہیں کہ ان کو تکلیف ہوتی ہے۔

مثلاً جانے کے وقت اپنی فرصت کا تو لحاظ رکھتے ہیں مگر یہ نہیں سوچتے کہ آیا یہ وقت ان کی فرصت کا بھی ہے یا نہیں۔ چاہے وہ وقت ان کے آرام کا ہو مگر ان کو اسی وقت جا کر تکلیف دی جاتی ہے اور صرف یہی نہیں بلکہ اتنی دیر بیٹھتے ہیں کہ ان کے آرام کا سارا وقت ختم ہو جاتا ہے۔ ان جانے والے بزرگ کا تو کوئی نقصان نہ ہوا مگر اگلے آدمی کو جو اذیت پہنچی وہ کس مد میں ہے۔ سو یہ نہایت بے تمیزی اور حماقت ہے۔ اگر اتفاق سے ایسے وقت جانا ہو تو نہایت اختصار کرنا چاہیے، تھوڑا بیٹھے۔ ایک شخص حضرت حاجی صاحب کے پاس عین دوپہر کے وقت آتے تھے اور حضرت کی نیند ضائع ہوتی مگر

حضرت اپنی خوش اخلاقی سے کچھ نہ فرماتے۔ ایک روز حضرت حافظ ضامن صاحب شہید رحمۃ اللہ علیہ کو تاب نہ رہی اور اس شخص کو سختی سے ڈانٹا اور کہا کہ بیچارے درویش رات کو جاگتے ہیں دوپہر کا وقت تھوڑا سا سونے کا ہوتا ہے تو وہ تم خراب کرتے ہو، یہ کس قدر بے انصافی ہے آخر کچھ لحاظ چاہیے۔

حضرت حافظ صاحب کی یہ تیزی بضرورت تھی۔ بعض اوقات اصلاح اخلاق بجز سیاست اور سختی کے نہیں ہوتی اور کسی کے پاس جانے میں ایک اس کا خیال رکھے کہ اطلاع کر کے جاوے اور عام بیٹھنے میں اگرچہ بلا اطلاع جائز ہے اور ''لاتدخلوا بیوتا'' (گھروں میں داخل نہ ہو)...... الخ سے مستثنیٰ ہے مگر خاص خلوت کے وقتوں میں وہاں بھی نہ جانا چاہیے شاید تکلیف ہو یا گرانی ہو۔ حالت یہ کہ ہر وقت ہر حالت میں اس کا خیال بہت رکھے کہ کسی کو اپنے سے تکلیف اور گرانی نہ ہو۔

الصلاح والاصلاح

ضرورت تبلیغ و اشاعت اسلام کے متعلق یہ وعظ ۳۰ رجب المرجب ۱۳۴۱ھ یوم جمعہ بعد مغرب دلدار خان صاحب کے مکان اشرف منزل کرنیل گنج کانپور میں بیٹھ کر فرمایا جو ۳ گھنٹہ میں ختم ہوا۔ ۲۰۰۰ کی حاضری تھی، اسے مولوی احمد عبدالحلیم صاحب نے قلم بند فرمایا۔

خطبہ ماثورہ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

الحمدللہ نحمدہ ونستعینہ ونستغفرہ ونؤمن بہ ونتوکل علیہ ونعوذ باللہ من شرور انفسنا ومن سیئات اعمالنا من یھدہ اللہ فلا مضل لہ ومن یضللہ فلا ھادی لہ ونشھدان لا الٰہ الا اللہ وحدہ لا شریک لہ ونشھدان سیدنا ومولانا محمداً عبدہ ورسولہ صلی اللہ تعالٰی علیہ وعلٰی آلہٖ واصحابہ وبارک وسلم۔

اما بعد فاعوذ باللہ من الشیطان الرجیم، بسم اللہ الرحمٰن الرحیم، وَمَا هٰذِهِ الْحَيٰوةُ الدُّنْيَا اِلَّا لَهْوٌ وَّلَعِبٌ وَاِنَّ الدَّارَ الْاٰخِرَةَ لَهِيَ الْحَيَوَانُ لَوْ كَانُوْا يَعْلَمُوْنَ.

(العنکبوت آیت نمبر ۶۴)

''یعنی نہیں ہے دنیا کی زندگی مگر لہو ولعب یعنی فضول و بے کار اور بلا شک دار آخرت ہی حیات ہے یعنی زندگی تو واقع میں آخرت ہی کی زندگی ہے اگر تم سمجھ رکھتے ہو۔''

رحمت حق

ہر چند کہ یہ مضمون جو ان آیات میں مذکور ہے کسی خاص وقت کے ساتھ مخصوص نہیں ہے بلکہ ہر وقت میں اس کی ضرورت ہے مگر اس وقت ایک خاص محرک اس کے بیان کا پایا گیا ہے اس لیے اس وقت اس کو اختیار کیا گیا ہے۔

وہ محرک یہ ہے کہ اس وقت ایک دار (یعنی مکان) کی بناء مکمل ہوئی ہے اور اس آیت میں جو مضمون ہے وہ بھی ایک دار ہی کے متعلق ہے اور اس پر تنبیہ کی اس لیے ضرورت ہوئی کہ تنبیہ ہمیشہ ایسے ہی امور پر کی جاتی ہے جن پر حاجت ہوتی ہے اور حاجت کا مدار حالت پر ہوتا ہے یعنی جیسی حالت ہوگی ویسی ہی حاجت ہوگی اور حالت مشاہدہ پر معلوم ہو سکتی ہے۔

اب دیکھنا یہ ہے کہ ہماری وہ حالت کیا ہے جس کی اصلاح اور علاج پر تنبیہ کی ضرورت ہے۔ سو وہ حالت یہ ہے کہ اہم اور غیر معمولی امور میں اشتغال غالب ہے اور اس حالت کا نہایت مضر ہونا ظاہر ہے کیونکہ جب غیری ضروری امور میں اشتغال ہوگا تو لازم ہے کہ ضروری امور میں لاپروائی ہوگی اور ضروری امور میں لاپروائی کا انجام بجز خسارہ کے اور کیا ہوگا۔ اس آیت میں ہم کو یہی تعلیم کی گئی ہے کہ ضروری امور کی طرف رغبت کرو اور غیر ضروری امور سے زیادہ دل نہ لگاؤ۔

سبحان اللہ! حق تعالیٰ کی ہم پر کیا رحمت و رافت ہے کہ ان کو ہر وقت ہماری اصلاح کی طرف توجہ ہے چنانچہ ان آیات میں ہمارے مرض اور ساتھ ہی ساتھ اس کے علاج کا ذکر کیا گیا ہے اور سبحان اللہ! یہ کیسی رحمت ہے کہ صرف غیر ضروری امور پر تنبیہ فرما کر محض ان کے بچنے ہی کا امر نہیں فرما دیا بلکہ وہ امور بھی بتا دیئے ہیں جن کے اختیار کرنے کی ضرورت ہے کیونکہ کسی چیز سے بچانا ایک تو یہ ہے کہ مخاطب کو اس کی ضد کی طرف متوجہ کر دیا جاوے اور ایک یہ ہے کہ اس فعل کی صرف برائی بیان کر دی جاوے۔

مثلاً ایک طبیب کسی بد پرہیزی کرنے والے کو جو سنکھیا کھاتا ہے یا افیون کھاتا ہے یہ بتا دے کہ یہ اشیاء نہ کھایا کرو اور یہ نہ بتاوے کہ پھر اس کے چھوڑنے کے بعد یہ مریض کیا کھاوے تو تعلیم ناقص ہے۔ کامل طبیب وہ ہے جو سنکھیا و افیون سے ممانعت کر کے کوئی ایسی شے بتلا دے جس میں ضرر تو کچھ نہ ہو اور افیون سنکھیا کے منافع موجود ہوں۔

چنانچہ یہاں حق تعالیٰ کی یہ رحمت نمایاں ہے کہ اس بد پرہیزی کی مضرت بتانے کے ساتھ وہ ضروری چیز بھی بتلا دی جسے اختیار کرنا چاہیے کیونکہ مصلح کا فرض ہے کہ مضر پر توجہ دلا کر اس کے بعد نافع پر بھی تنبیہ کر دے۔ اس واسطے کہ انسان کا ذہن کبھی خالی نہیں رہا کرتا وہ کوئی نہ کوئی مشغلہ اپنے واسطے ضرور تلاش کر لیتا ہے اور وہ مشغلہ نافع ہوتا ہے یا مضر، یا نہ نافع ہوتا ہے نہ مضر بلکہ عبث ہوتا ہے۔ اس واسطے کہ عبث اس کو کہتے ہیں جو نہ نافع ہو نہ مضر یعنی لغو اور مالا یعنی (بے فائدہ) تو اگر اصلاح میں صرف اسی پر اکتفا کیا جاوے کہ یہ کام نہ کرو یا نہ کھاؤ اور نافع پر تنبیہ نہ کی جاوے یعنی یہ نہ بتایا جاوے کہ پھر کیا کرو اور کیا کھاؤ تو اس صورت میں بھی ممکن ہے کہ مخاطب اسی طبعی عادت کے سبب اس مضر چیز کے ترک کے ساتھ کسی لغو میں مبتلا ہو جاوے۔ پھر اس حالت کا انجام یہ ہوگا کہ پہلے تو وہ عبث و مالا یعنی میں مبتلا ہوگا اور تجربہ کی بناء پر پھر شدہ شدہ کسی مضر میں مبتلا ہو جائے گا اس

لیے کہ ابتلاء بمالا یعنی (فضولیات میں مبتلا ہونا) کا اکثر انجام ابتلاء بمایضرہ (مبتلا ہونا ایسے امور میں جو اس کو ضرر رساں ہیں) ہی ہو جاتا ہے کیونکہ مالا یعنی شدشدہ امر مضر تک پہنچادیتا ہے۔

اسی واسطے رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے ”من حسن اسلام المراء ترکہ مالا یعنیه“ (مجمع الزوائد للهیثمی ۸:۱۸، المسند للامام احمد ۱:۲۰۱)

(یعنی لایعنی امور کا ترک کر دینا آدمی کے حسن اسلام سے ہے) اور لایعنی کے معنی ابھی مذکور ہوئے ہیں کہ عبث ولغو کو لایعنی کہتے ہیں۔ یعنی جو چیز نہ نافع ہو نہ مضر وہ لایعنی ہے۔ اسی کے ترک کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے حسن اسلام فرمایا ہے اور یہ نہیں فرمایا ”من حسن اسلام المرء ترک مالا یضرہ“ کہ مضر کا ترک کر دینا یقیناً حسن اسلام ہے مگر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے بجائے مالا یضرہ کے مالا یعنی فرما کر یہ بتلا دیا کہ جو عبث ہے وہ واقعہ میں مضر ہی ہے تو گویا ترک نافع کی دو صورتیں ہوئیں۔ ایک ارتکاب مضر اور ”خلوا عن الشغل المفید“ (شغل مفید سے خالی ہونا)

فطرت نفس

یہ دوسری قسم اپنے مآل کے اعتبار سے پہلی ہی قسم میں داخل ہو جاتی ہے اس سے معلوم ہوا کہ فقط مضر کا ترک کر دینا کافی نہیں ہے بلکہ نافع میں مشغول ہونا بھی ضروری ہے کیونکہ مشغلہ ہی ایک ایسی چیز ہے جو دوسرے مشغلہ سے روک سکتا ہے ورنہ بغیر مشغلہ کے مضر سے رکا رہنا ناپائیدار ہوگا کیونکہ چند روز تک تو نفس صبر کرتا ہے اس کے بعد پھر کسی نہ کسی مشغلہ کی طرف متوجہ کر دیتا ہے اور وہ اکثر مضر ہی ہوتا ہے۔

چنانچہ ایک بزرگ کا مقولہ ہے کہ تم نفس کو مشغول کر لو قبل اس کے کہ وہ تم کو مشغول کر لے۔ یعنی اگر تم نے نفس کو کسی کام میں نہ لگایا تو وہ خود تمہارے لیے کوئی دھندا نکال لے گا، وہ دھندا کیا ہے، اولاً وساوس وخطرات پھر ثانیاً معاصی ومنکرات اور نفس کی یہ ادھیڑ بن اسی وقت تک ہوتی ہے جب تک وہ کچھ نہیں کرتا ورنہ کام میں لگ جانے کے بعد خطرات نہیں آتے۔

دیکھئے ایک کارڈ لکھتے وقت کیا حال ہوتا ہے۔ اس وقت تک ایک بھی خطرہ نہیں آوے گا تو اس کا راز کیا ہے۔ راز یہ ہے کہ نفس کسی وقت بے کار نہیں رہنے پاتا اگر اس کے لیے کوئی مشغلہ تجویز نہ کیا جائے تو وہ خود بخود اپنے لیے کوئی شغل تجویز کر لیتا ہے۔ پس کارڈ لکھتے وقت چونکہ اپنے نفس کو ایک شغل میں لگا دیا ہے اس لیے کسی اور چیز کی طرف اس کو توجہ نہیں ہوتی اور نماز وغیرہ میں جو وساوس آتے ہیں تو اکثر اس کا

سبب یہی ہے کہ ہم لوگ نفس کو شغل صلوٰۃ میں نہیں لگاتے ورنہ وساوس ہرگز نہ آئیں یا بہت کم آئیں۔
غرض جب یہ نفس بدوں کسی شغل کے چھوڑا جاتا ہے تو یہ خود اپنا کوئی مشغلہ تجویز کر لیتا ہے اور یہ ظاہر ہے کہ نفس جو مشغلہ اپنے لیے تجویز کرے گا وہ شر ہی ہوگا کیونکہ نفس کا اصلی میلان شر ہی کی جانب ہے۔ دلیل اس کی قرآن مجید کی آیت ہے۔

وَمَآ اُبَرِّئُ نَفۡسِیۡ اِنَّ النَّفۡسَ لَاَمَّارَةٌۢ بِالسُّوۡٓءِ اِلَّا مَا رَحِمَ رَبِّیۡ ؕ اِنَّ رَبِّیۡ غَفُوۡرٌ رَّحِیۡمٌ.

(اور میں اپنے نفس کو بری اور پاک نہیں بتلاتا کیونکہ نفس (ہر ایک کا) بری بات بتلاتا ہے بجز اس (نفس) کے جس پر میرا پروردگار رحم کرے، بلاشبہ میرا رب بڑی مغفرت والا بڑی رحمت والا ہے)

یعنی نفس کی دو قسمیں نہیں بتائیں۔ ایک امارہ بالسوء اور ایک امارہ بالخیر یہ بتایا کہ نفس کی ایک ہی قسم ہے کہ وہ امارہ بالسوء ہے یعنی نفس ہمیشہ برائی ہی کا حکم کرنے والا ہے مگر جب خدا تعالیٰ رحم فرمائیں یعنی جب خدا کی رحمت متوجہ ہوتی ہے تو اس وقت عارض وقوی کی وجہ سے نفس برائی کا حکم نہیں کرتا اور جب یہ رحمت متوجہ نہیں ہوتی تو پھر بدستور اپنی اصلی حالت پر آجاتا ہے، یعنی برائی کا امر کرنے لگتا ہے۔ بہرحال استثناء سے نفس کی کوئی جداگانہ قسم بتانا مقصود نہیں ہے بلکہ امر بالسوء کے اوقات میں سے ایک وقت کو مستثنیٰ کرنا مقصود ہے۔ حاصل یہ ہوا کہ

اِنَّ النَّفۡسَ لَاَمَّارَةٌۢ بِالسُّوۡٓءِ اِلَّا مَا رَحِمَ رَبِّیۡ وما مصدریة ای وقت رحمة الله تعالیٰ علیها.

(بلاشبہ نفس بری بات کا حکم کرنے والا ہر وقت میں مگر اللہ تعالیٰ کے اس پر رحم کرنے کے وقت میں یہاں ما مصدریہ ہے)

شاید کسی کے ذہن میں یہاں یہ سوال پیدا ہو کہ اگر اس مضمون کو یوں تعبیر کرتے ہیں کہ "اِنَّ النَّفۡسَ لَاَمَّارَةٌۢ بِالسُّوۡٓءِ لَاَمَّارَةٌۢ بِالسُّوۡٓءِ" (بلاشبہ نفس نیکی کا حکم کرنے والا ہے) تو کیا حرج تھا۔

جواب یہ ہے کہ اس صورت میں یہ معنی نہ پیدا ہوتے جواب ہوئے کیونکہ محاورہ یہ ہے کہ مغلوب حالت کو غالب حالت سے استثناء کیا کرتے ہیں۔ مثلاً اگر زیادہ جماعت نے کھانا کھالیا تو یوں کہتے ہیں کہ سب لوگوں نے کھانا کھالیا، مگر زید و عمر نے۔ اس جملہ سے یہ سمجھا گیا کہ جماعت کثیر کھانا کھا چکی اور قلیل یعنی دو شخص باقی رہ گئے اور اگر اسی کو یوں تعبیر کریں کہ فلاں فلاں نے کھانا نہیں کھایا مگر سب نے تو محاورہ کے اعتبار سے یہ صحیح نہ ہوگا کیونکہ مستثنیٰ مغلوب نہ تھا بلکہ مستثنیٰ منہ پر غالب تھا تو معلوم ہو گیا کہ غالب حالت سے مغلوب حالت کو استثناء کیا جاتا ہے، اگر کھانے والے

زیادہ ہیں تو انہیں مستثنیٰ منہ بنائیں گے۔ بہرحال غالب حالت کا اعتبار استثناء میں ضروری ہے۔

جب یہ سمجھ میں آ گیا تو اب سمجھئے کہ "لامارة بالسوء" (برائی کا حکم کرنے والا) یہاں پر مستثنیٰ منہ ہے اس لیے با قاعدہ مذکورہ غالب حالت یعنی امر بالسوء کو مستثنیٰ منہ اور مغلوب یعنی عدم امر بالسوء کو مستثنیٰ بنانا چاہیے۔ سو قرآن میں ایسا ہی ہے کیونکہ غالب صفت نفس کی امارہ بالسوء ہی ہے۔

واقعی قرآن کے سمجھنے کے لیے ضرورت ہے کہ زبان کا ذوق بھی ہو اور عادات و محاورات میں بھی کامل دخل ہو۔ محض علوم عقلیہ سے قرآن حل نہیں ہو سکتا بلکہ عرف و عادات کو حکم بنا کر تب قرآن کو دیکھنا چاہیے ورنہ غلطی ہو جانے کا قوی احتمال بلکہ یقین ہے کیونکہ قرآن کا نزول عرف و محاوات کی رعایت کے ساتھ ہوا ہے۔

بہرحال نفس کی حالت غالبہ امر بالسوء ہے اس لیے جب اس کو کام میں نہ لگایا جاوے تو یہ اپنے لیے خود مشغلہ تجویز کرے گا اور جو مشغلہ یہ خود اپنے سلیے تجویز کرے گا چونکہ اس میں غلبہ ہے شر کا اس لیے وہ اکثر برا ہی ہوگا اور مضر ہی کو تجویز کرے گا۔

اسی واسطے مالا یعنی کے ترک کو جناب رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم نے حسن اسلام فرمایا کیونکہ مضر کو تو ہر شخص مضر سمجھتا ہے ہی خفا صرف لایعنی میں ہے۔ پس مقصود حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ہے کہ مضر کے چھوڑنے کے بعد لایعنی سے بچے اور وہ تجربہ سے موقوف ہے اس پر کہ مالا یعنی میں نفس کو لگا دے پس اس ترک کے لیے یہ فعل بھی لازم ہے۔

بہرحال نفس کا میلان الی الشر (برائی کی طرف مائل ہونا) تو قرآن سے ثابت ہے اور یہ تجربہ اور مشاہدہ سے ثابت ہے کہ نفس جب خالی ہوگا تو معصیت ہی تجویز کرے گا اور جب یہ بے کار رہو گا تو کسی نہ کسی بلا ہی میں مبتلا ہو گا تو ان دونوں مقدموں سے اس کی ضرورت ثابت ہوگئی کہ ترک مضر کے بعد اشغال بالنافع ضروری ہے۔ سو قرآن مجید کی تعلیم کا یہی حاصل ہے۔

تحفظ نفس

اب سوال یہ رہ گیا کہ نفس کو کسی خیر میں ہر وقت کیسے مشغول رکھا جا سکتا ہے جو وہ اس بلا لایعنی یا مضر سے بچے اور وہ کون سا دھندا ہے جس میں ہر وقت لگایا جا سکے کیونکہ جتنے دھندے ہیں ان میں ہر کام موقت ہے مثلاً کھانا، پینا، سونا اور نماز اور دوسری عبادات سب موقت ہی ہیں جو کام

بھی ہے وہ خاص وقت میں ہے تمام اوقات کو کوئی شغل محیط نہیں اور نفس کو بچانے کے لیے ضرورت ہے شغل غیر موقت کی جو ہر دم ہو سکے کیونکہ اس کا خلاصہ یہ ہے کہ جہاں ذرا بھی خالی ہوا اور بیہودگی میں مبتلا ہوا تو وہ کام کونسا ہے جو ہر وقت کیا جا سکے۔

صاحب! شریعت میں ایک ایسا شغل بھی ہے اور وہ بہت ہی سہل کام ہے اور بحمداللہ قرآن میں اسے بھی بتلا دیا گیا ہے۔ وہ کیا ہے؟ وہ ذکر ہے۔ سو نماز، روزہ، حج سب کو تو موقت بتلایا گیا ہے چنانچہ حدیث میں تو توقیت صلوٰۃ کی تصریح ہے۔ خمس صلوٰۃ (پانچ نمازیں) اور قرآن میں گو تصریح نہیں مگر اشارہ ہے اور روزہ کو تو قرآن ہی میں موقت کر دیا گیا ہے۔ "اَيَّامًا مَّعْدُوْدٰتٍ" (گنتی کے چند دن) اور اسی طرح حج میں بھی "اشهر معلومات" (چند معلوم مہینہ) فرمایا گیا مگر ذکر کو کہیں موقت نہیں کیا گیا نہ قرآن اور نہ حدیث میں بلکہ ارشاد ہے۔ "اُذْكُرُوا اللّٰهَ ذِكْرًا كَثِيْرًا" (اپنے رب کا بہت ہی ذکر کرو) اور ارشاد ہے۔ "اُذْكُرُوا اللّٰهَ" (اپنے رب کے نام کو یاد کرو)

اگر کوئی کہے ذکر بھی موقت ہے۔ دیکھئے قرآن مجید میں اسکا بھی وقت بتایا گیا ہے۔ چنانچہ "اُذْكُرُوا اللّٰهَ" (اللہ تعالیٰ کا ذکر کرو) کے بعد ارشاد ہے "وَسَبِّحُوْهُ بُكْرَةً وَّاَصِيْلًا" (یعنی صبح و شام تسبیح کرو)

جواب یہ ہے کہ یہ اعتراض بھی محاورہ نہ جاننے سے ہی پیدا ہوا۔ محاورہ یہ ہے کہ جب ایک جنس کی دو نوعوں کو جمع کیا جاتا ہے تو مراد اس سے احاطہ و استیعاب اس جنس کا ہوتا ہے۔ مثلاً یہ کہیں کہ میں نے تلخ و شیریں چکھا ہے اور ابتداء و انتہاء دیکھی ہے اور چھوٹا اور بڑا مجھے جانتا ہے وغیرہ وغیرہ تو اس سے بالبداہتہ استیعاب ہی مراد ہوتا ہے۔ اسی طرح یہاں صبح و شام سے بھی یہی مراد ہے کہ رات دن برابر ذکر کرو۔ یعنی کوئی وقت بھی ذکر سے خالی نہ ہو تو "بُكْرَةً وَّاَصِيْلًا" کے معنی فی کل وقت (ہر وقت میں) ہوئے۔

اب یہ بات رہ گئی کہ ہر وقت کیسے ذکر ہو، تو ہر وقت ذکر ہونے کی صورت میں ہے کہ محل ذکر میں تعمیم لی جاوے۔ یعنی خواہ قلب سے ہو خواہ زبان سے ہو۔ سو تعمیم محل کے بعد دوام ممکن ہو گیا اور پھر اگر کوئی کہے کہ قلب سے ذکر کے کیا معنی اور کیا اس کا شریعت میں کچھ ثبوت ہے تو میں کہتا ہوں کہ حدیث نے اس اشکال کو بھی صاف کر دیا ہے کیونکہ حدیث شریف میں ہے کہ:

"كان النبي صلى الله عليه وسلم يذكر الله في كل احيانه." (الصحيح للبخاري ۱: ۸۳، ۱۶۳، الصحيح لمسلم كتاب الحيض ب: ۳۰، رقم: ۱۱۷)

کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم ہر وقت ذکر الٰہی میں مشغول رہتے تھے اور کل احیان (ہر وقت) میں اوقات بول و براز وقضائے حاجات بھی شامل ہیں اور ظاہر ہے کہ بول و براز کے موقع پر زبان سے ذکر تلاوت مکروہ ہے۔ پس کل احیان سے معلوم ہوتا ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم ایسے احوال اور ایسے مواقع میں قلب سے ذکر کرتے تھے۔

دوسرے یہ کہ "اذْكُرُوا اللّٰهَ" (اللہ تعالیٰ کا ذکر کرو) یا "واذکر اسم ربک" (اپنے رب کے نام کو یاد کرو) میں حق تعالیٰ نے ذکر کو کسی قید کے ساتھ مقید نہیں کیا ہے خواہ لسان ہو یا اور کچھ، نیز ذکر باعتبار لغت کے عام بھی ہے۔ ذکر قلبی و ذکر لسانی دونوں کو بلکہ میں تو یوں کہوں گا کہ ذکر کے اصل معنی ذکر قلبی ہی کے ہیں اور جہاں کہیں ذکر لسانی مراد ہے وہاں قرآن سے اس پر محمول کیا گیا ہے کیونکہ ذکر کے معنی ہیں یاد، اب دیکھ لیجئے کہ یاد کس کا فعل ہے، زبان کا یا قلب کا۔ پس اب ذکر قلبی کے لیے تو ثبوت کی ضرورت نہ رہی۔ البتہ ذکر کا لسانی ہونا محتاج دلیل ہوگیا۔

میں نے یہ مضمون خصوصیت سے اس لیے بیان کردیا کہ بعض خشک لوگوں کو ذکر قلبی میں کلام ہے۔ بہر حال یہ ہے وہ کام جو ہر وقت کے کرنے کا ہے اگر زبان تھک جائے تو قلب سے ذکر کرو اور اگر زبان سے بھی برکت حاصل کرنا ہو تو زبان سے بھی کرو، بس ان کی یاد ہونی چاہیے۔ پھر خواہ الفاظ کے واسطے سے ہو، خواہ مذکورہ کے تصور سے مقصود تو یہ ہے کہ غفلت نہ ہو جو طریق تمہیں سہل معلوم ہو اس طریق سے کرو۔

اقسام ذکر

ذکر کے متعلق بعض اہل علم کو ایک اور شبہ ہوگیا ہے وہ یہ کہ انہوں نے "وَاذْكُرِ اسْمَ رَبِّكَ" (اپنے رب کے نام کو یاد کرو) میں لفظ اسم کو زائد رکھا ہے مگر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کو زائد ماننے کی ضرورت نہیں ہے جس کی سہل توجیہ یہ ہے کہ ذاکر دو قسم کے ہیں ایک مبتدی اور ایک منتہی۔ تو اسم ربک میں مبتدی کی حالت کا اعتبار کیا گیا ہے کیونکہ مبتدی کی اور حالت ہے اور منتہی کی اور۔ اس لیے یوں کیوں نہ کہا جاوے کہ مبتدی کے لیے "واذکر اسم ربک" ہے اور منتہی کے لیے "وَتَبَتَّلْ اِلَيْهِ تَبْتِيْلًا" ہے کیونکہ مبتدی کے لیے یہی ذکر کا درجہ بہت ہے کہ محبوب کا نام اسی کی زبان پر آجاوے یا قلب میں نام آجاوے۔ ذکر لفظی کی بھی صورتیں ہیں۔ ایک ذکر لفظی زبان سے ایک قلب سے۔ ایک ذکر منطوق ہے اور ایک متصور، منطوق تو ظاہر ہے متصور مثال سے سمجھ لیجئے۔

مثلاً اگر کوئی شخص "اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ" (سب تعریفیں اللہ ہی کے لیے ہیں جو ہر عالم کے مربی ہیں) کے معنی نہ جانتا ہو اور وہ اسکے ایک ایک لفظ کا دل میں خیال کرے اور زبان سے نہ ادا کرے، تو یہ محض الفاظ کا تصور ہوگا اور معنی سے اسے کچھ بھی علاقہ نہ ہوگا کیونکہ وہ معنی ہی نہیں جانتا۔ اس درجہ کو حدیث النفس اور کلام قلب کہتے ہیں۔ شاعر اسی کو کہتا ہے۔

ان الکلام لفی الفواد وانما جعل اللسان علی الفواد دلیلا

(کلام قلب میں ہوتا ہے اور زبان کو اس پر دلیل رہنما بنا دیا گیا ہے)

سو الفاظ متخیلہ کا درجہ بھی کلام لفظی ہی کا درجہ ہے کیونکہ ان میں ترکیب و تعاقب سب کچھ ہوتا ہے۔ بہر حال ذکر ہونا چاہیے اب ذکر کی اقسام چند ہو گئیں۔ ایک لسانی ایک قلبی اور ذکر قلبی کی خود دو قسمیں ہیں۔ ایک ذکر قلبی لفظی، ایک ذکر قلبی نفسی اور ان اقسام میں سے ذکر لسانی بھی غیر موقت نہیں بلکہ بعض احوال کے لحاظ سے وہ بھی موقت ہے کیونکہ نیند کے غلبہ میں اور بول و براز و جماع و مواقع قاذورات میں زبان سے ذکر کرنے کی ممانعت ہے۔ البتہ ذکر قلبی کی کسی حال میں بھی ممانعت نہیں، ہر وقت اجازت ہے۔ یہ بیشک محیط کل اور ہر جہت سے غیر موقت ہے۔ پس ذکر قلبی ہی اپنے دونوں قسموں کے ساتھ ایک ایسا مشغلہ ہے جو ہر وقت ہو سکتا ہے۔ گو سونے کے بعد نہ ہو، سو اس حالت میں انسان مکلف ہی نہیں اس لیے اس کے متعلق سوال ہی نہیں ہو سکتا۔ کھاتے وقت بھی ہو سکتا ہے بلکہ بعض اوقات یہ ذکر لسانی سے بڑھا ہوا ہے مثلاً جہاں ریا کا شبہ ہو، ایک شخص ہے کہ زبان سے تو ذکر کرتا ہے مگر قلب متوجہ نہیں ہوتا تو اس کے لیے یہ بہتر ہے کہ قلب سے ذکر کرے اور زبان سے نہ کرے تو ایسے شخص کے اعتبار سے محض ذکر قلبی ہی افضل ہے۔

مگر مہربانی کر کے اس مسئلہ کو نماز کی قراءت میں متعدی نہ کر لیجئے کیونکہ نماز کی قرأت و تکبیرات و تشہد وغیرہ اگر کوئی شخص قلب میں پڑھ لے اور زبان سے ادا نہ کرے تو نماز نہ ہوگی۔ ہاں گونگا البتہ معذور ہے اس کی نماز محض تصور ہی سے ہو جاوے گی۔

تین چار سال کی بات ہے کہ ایک بزرگ قنوج میں تشریف لائے تھے، بیچارے نرے جاہل، جو لوگ ان کے پاس مرید ہونے آتے، اول تعلیم ان کی یہ ہوتی تھی کہ نماز میں قرأت دل ہی دل میں پڑھا کرو اور یہ بھی ہدایت کر دیتے تھے کہ یہ بات کسی پر ظاہر مت کرنا۔ چنانچہ بہت سے لوگ اس کے بہکانے میں آ گئے۔

میں کہتا ہوں کہ اس سے تو وہ نماز نہ پڑھتے تو بہتر ہوتا کیونکہ اپنے کو بے نمازی سمجھتے اور شاید کبھی قضا کر لیتے اور اب تو بیچاروں نے محنت بھی کی اور پھر نماز نہ ہوئی اور نہ قضا کی طرف التفات، بڑی مدت کے بعد کسی ترکیب سے بعضے لوگوں کو اس کا پتہ لگا تو ان کی غلطی پر عام لوگوں نے متنبہ کیا اور ان کو وہاں سے نکالا گیا۔ اسی لیے طریق باطن میں بہت ضرورت ہے شریعت کی ورنہ ممکن ہے کسی کو کوئی رائے دے دے کہ جب ذکر قلبی افضل ہے، ذکر لسانی سے تو پھر نماز کو بھی دل میں کیوں نہ پڑھ لیا کریں۔ یاد رکھو اس طرح نماز نہ ہوگی۔

غرض ذکر قلبی کی فضیلت سے وہ مواقع مستثنیٰ ہیں جہاں احکام دینیہ مثلاً نماز وغیرہ یا احکام دنیویہ مثلاً طلاق، نکاح، عتاق وغیرہ کا تعلق ہے یہ امور ذکر قلب سے صحیح نہیں ہو سکتے۔ مثلاً دل ہی دل میں نکاح کر لے تو نکاح نہیں ہوگا۔ ایسے ہی دل ہی دل میں طلاق دے دے تو طلاق بھی نہ پڑے گی اور مراد اس سے وہ صورت نہیں کہ چپکے چپکے زبان پر طلاق آ گیا اور اس سے زبان کو حرکت بھی ہوئی گو کسی نے نہ سنا ہو۔ اس صورت میں تو طلاق پڑ جاوے گی کیونکہ یہ تو تلفظ باللسان ہی ہے، گو بالجہر نہ سہی۔ باقی اگر فقط دل میں طلاق کو سوچ لیا، زبان بالکل نہیں ہلی تو اس سے طلاق نہیں پڑے گی کیونکہ یہ عقود تکلم باللسان کے ساتھ متعلق ہیں۔ پس اس کی استثناء کے بعد جو اور امور رہ گئے ہیں جن میں تکلم شرط نہیں ہے ان کے متعلق یہ قاعدہ عام ہے کہ وہاں ذکر قلب بھی معتبر ہے بلکہ بعض کے لیے اور بعض جہات سے یہ افضل اور سب سے افضل یہ ہے کہ ذکر قلب اور ذکر لسانی دونوں کو جمع کیا ہے۔

درجات ذکر

اس اعتبار سے ذکر کے تین درجے ہوئے، ایک تو وہ جس میں صرف زبان کو حرکت دی جائے اور قلب متوجہ نہ ہو، یہ درجہ سب سے کم ہے۔ دوسرا درجہ وہ جس میں زبان کو حرکت نہ دی جائے صرف قلب سے ذکر کیا جائے۔ یہ پچھلے درجہ سے بڑھ کر ہے۔ تیسرا درجہ یہ ہے کہ زبان کو بھی حرکت دی جائے اور قلب کو بھی متوجہ کیا جائے یہ سب سے بڑھ کر اور افضل ہے۔

لیکن میں یہ پھر کہتا ہوں کہ بعض حالتوں میں دوسرا درجہ تیسرے درجہ سے بھی افضل ہو جاتا ہے یعنی کسی وقت وہ ذکر جو محض قلب سے ہو افضل ہوتا ہے اس ذکر سے جو قلب و زبان دونوں سے ہو۔ وہ کیسے؟ اس طرح جیسے خود حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد سے معلوم ہوتا ہے کہ جن کے

ہم غلام ہیں اور جن کے ارشاد ہی سے سیدھا راستہ نظر آتا ہے۔ سو یہ مسئلہ خود حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے بتلا دیا ہے جیسا عنقریب آتا ہے اور مسئلہ بتلانے کے ساتھ خود حضور صلی اللہ علیہ وسلم ہی نے اس کی حکمت بھی بتا دی ہے۔ گو حکمت یا علت کا بتانا حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا فرضِ منصبی نہ تھا۔ آپ کا منصب صرف حکم کا بتلانا ہے مگر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا تبرع واحسان ہے کہ کہیں کہیں حکمت بھی نمونہ کے طور پر بتا دیتے ہیں جیسے کوئی آقا اپنے نوکر کو کوئی کام بتا دے اور نوکر کا تحیر دیکھ کر اس کو حکمت بھی بتا دے تو گویا یہ آقا کا فرض نہ تھا کہ وہ حکمتیں بتا دے کیونکہ نوکر کو حکمت سے کیا واسطہ۔ اس کے ذمہ تو تعمیل حکم ہے۔ اگر یہ نہ ہو تو پھر وہ نوکر کس بات کا ہے مگر یہ اس کا تبرع و احسان ہے کہ کسی کام کی اسے حکمت بھی بتا دے۔ اسی طرح حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ذمہ بھی بیان حکمت لازم نہیں اس لیے جہاں کہیں حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے حکمت بتائی ہے وہ بطور نمونہ کے ہے جس سے مقصود یہ بتانا ہے کہ ہمارے احکام میں حکمتیں ضرور ہیں۔ چنانچہ دیکھو بعض بعض نمونہ کے طور پر تم کو بتا دی گئی ہیں مگر سب حکمتیں تم کو نہیں بتلائی گئیں۔ پس جہاں کوئی حکمت شرعی تمہیں نہیں معلوم ہوئی وہاں بھی سمجھ لو کہ حکمت ضرور ہے۔ چنانچہ جن احکام کی حکمتیں حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے نہیں بتلائیں ان کو اہل اللہ نے بڑی مقدار میں حل کر دیا ہے۔

غرض احکام کا دار و مدار حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد پر ہے، چاہے حکمت معلوم ہو یا نہ ہو، بہرحال سرسری نظر میں یہ ایک نیا دعویٰ ہے کہ ذکر قلب بعض اوقات مطلوبیت اور افضیلت میں مجموعہ ذکر لسانی و قلبی سے بڑھ کر ہے مگر اس کا مدلول نص ہونا ابھی ظاہر ہو جاتا ہے۔ سنئے حدیث شریف میں ہے:

اذا غلب احدکم النعاس وھو یذکر اللہ فلیرقدا وکما قال علیہ السلام

(اتحاف السادۃ المتقین ۸: ۱۶۰)

یعنی حضور صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ جس وقت تک نیند نہ آئے اس وقت تک تو نفلیں تسبیح اور ذکر وغیرہ سب کچھ کرو اور جب نیند کا غلبہ ہونے لگے تو سو رہو "فلیرقد" (تو سو رہو) امر کا صیغہ ہے، جو وجوب پر دلالت کرتا ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ اس حالت میں ذکر لسانی بند کر دینا ضروری ہے۔ آگے اس کی حکمت بیان فرماتے ہیں:

لعلہ یستغفر فیسب نفسہ۔

یعنی ممکن ہے کہ وہ قصد تو استغفار کا کرے اور بجائے استغفار کے اپنے آپ کو کوسنے لگے

کیونکہ اس وقت مارے نیند کے ہوش درست نہیں رہتا۔ لامحالہ کہے گا کچھ اور نکلے گا کچھ تو شاید دعا کے بدلے بدعا نکلے۔ چنانچہ علماء نے اس کی تفسیر میں مثال کے طور پر کہا بھی ہے کہ مثلاً وہ کہنا چاہتا ہے "اللهم اغفرلي" (کہ اے اللہ! مجھے بخش دے) تو ممکن ہے کہ بجائے اس کے "اللهم اغفرلي عين" مہملہ زبان سے نکلے۔ یعنی اے اللہ! مجھے تباہ کر دیجئے، برباد کر دیجئے، مٹی میں ملا دیجئے، صرف ایک نقطہ کے گھٹنے بڑھنے سے معنی کس قدر بدل گئے۔

تو یہ حدیث نص ہے کہ جب نیند کا غلبہ ہو تو زبان سے ذکر نہ کرے۔ پس اس وقت زبان سے ذکر ممنوع ہے اور اس سے پہلے نص گزر چکی ہے۔

كان رسول الله صلى الله عليه وسلم يذكر الله في كل احيانه. (انظر تخريج الحديث الرقم: ۴۴)

کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم ہر وقت ذکر کرتے تھے اور ہر وقت میں نیند کا وقت بھی داخل ہے اور ظاہر ہے کہ نیند کی حالت میں اس سنت پر ذکر لسانی کے طریق پر عمل نہیں ہو سکتا اس لیے دونوں روایتوں کو یوں جمع کریں گے کہ غلبہ نیند کے وقت ذکر لسانی کی ممانعت ہے خواہ محض ہو یا قلب کے ساتھ اور قلبی کی اجازت ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ بعض وقت ذکر قلبی محض افضل ہے۔ جمع "بين ذكر اللسان والقلب" (لسانی اور قلبی ذکر کو جمع کرنا) سے کیونکہ جب ذکر لسانی سے ممانعت ہوگئی تو اب یا تو بالکل ہی ذکر سے محروم رہو یا محض دل دل سے یاد کرتے رہو۔ ظاہر ہے کہ دوسری صورت یقیناً بہتر ہے کیونکہ صورت اولیٰ میں پوری محرومی ہے ذکر سے اور اس صورت میں کچھ تو ذکر ہوتا رہے گا اور قطعی محرومی سے یقیناً وہ صورت بہتر ہے جس میں فی الجملہ ذکر باقی ہے اور ایسے وقت میں یہ بقاء ذکر قلبی محض سے ممکن ہے۔ اب اس ذکر کو ذکر نہ کہنا "حرمان عن البركة" (برکت سے محروم ہونے کا) مشورہ دینا ہے تو بہر حال جہاں ذکر لسانی نہ ہو سکے وہاں ذکر قلبی جاری رکھے یعنی تصور رکھے، توجہ رکھے اور یاد رکھے، دھیان رکھے، پس ذکر ہر حالت میں مطلوب ہے تو جس حالت میں جو بھی ممکن ہے کرتا رہے۔

اب وہ شبہ جاتا رہا کہ وہ کونسا کام ہے جس سے وساوس بند ہو جاویں اور نفس ہر دم کسی شغل میں لگا رہے کیونکہ نفس کو بے کار چھوڑیں گے تو یہ خود اپنے لیے کوئی مضر مشغلہ تجویز کرے گا۔ اب معلوم ہو گیا ہے کہ وہ کام ذکر قلب ہے جو ہر وقت ممکن ہے۔ بس نفس کو اس شغل میں لگا دو تو پھر وہ کوئی مضر شغل خود بخود تجویز نہ کرے گا نہ غفلت میں مبتلا ہوگا۔

نماز اور وساوس

علاوہ مشاہدہ کے حدیث شریف میں اس کی تصریح بھی ہے۔
"الشیطان جاثم علی قلب ابن ادم فاذا ذکر اللہ خنس واذا غفل وسوس." (مشکوۃ المصابیح : ۲۲۸۱)

(یعنی ابن آدم کے قلب پر شیطان چڑھا ہوا بیٹھا ہے جب وہ ذکر اللہ کرتا ہے اس وقت تو ہٹ جاتا ہے اور جب خالی رہتا ہے تو وسوسے ڈالتا ہے)

اس سے معلوم ہوگیا ہے کہ اگر نفس کو مشغول نہ کرو گے تو یہ خود مشغلہ تجویز کرے گا اور اگر کوئی یہ شبہ کرے کہ نماز کا تو کوئی رکن بھی ذکر سے خالی نہیں، قرأت، تسبیح، تکبیر، تشہد، غرض سب ذکر ہی ہے مگر باوجود اس کثرت کے ساتھ اس کے مشتمل "علی الذکر" (ذکر کو مشتمل) ہونے کے سب سے زیادہ وسوسے نماز ہی میں پیدا ہوتے ہیں تو ہم یہ کیسے مان لیں کہ جب کسی کام میں مشغول ہوں تو وسوسہ نہیں آتا۔ اس مادہ جزئیہ سے تو معلوم ہوتا ہے کہ یہ قاعدہ صحیح نہیں کہ

"جب نفس کو کسی کام میں مشغول نہ کرو گے تب ہی وہ کسی کام میں لگ جاوے گا۔"

بلکہ یوں معلوم ہوتا ہے کہ یہ کم بخت تو کام کے اندر بھی اپنا کلام چلاتا رہتا ہے۔ اس کا جواب یہ ہے کہ ذکر کہتے ہیں یاد کو خواہ وہ تنہا قلب سے ہو، خواہ زبان بھی اس میں شریک ہو مگر محض زبان سے نہ ہو۔ اگر محض زبان سے یاد ہے تو وہ واقع میں ذکر نہیں بلکہ وہ تو صورت ذکر ہے۔ اب شبہ جاتا رہا کیونکہ دیکھ لیجئے کہ جہاں جس شخص کو وساوس آتے ہیں وہاں واقع میں ذکر کا وجود نہیں بلکہ محض ذکر کی صورت میں صورت ہوتی ہے۔ قلب اس کی طرف مشغول نہیں ہوتا۔ چنانچہ جس نماز میں وساوس آتے ہیں اس میں قلب نماز میں پورا مشغول نہیں ہوتا ورنہ "النفس لایتوجه الی شیئین فی آن واحد" (ایک آن میں نفس دو چیزوں کی طرف متوجہ نہیں ہوسکتا) کے قاعدہ سے پوری مشغولی کے ساتھ وساوس نہیں آسکتے۔

اب اس پر ایک اور شبہ رہا وہ یہ کہ جب قلب متوجہ نہیں ہوتا تو پھر ادا کیسے ہوتا ہے کیونکہ فعل اختیاری تو بدون ارادہ قلب کے ہو ہی نہیں سکتا اور ارادہ کے لیے توجہ لازم ہے۔

جواب یہ ہے کہ یہ کلیہ صحیح ہے مگر اس کے معنی یہ ہیں کہ جب بالکل توجہ نہ ہو تو فعل نہیں ہوسکتا

لیکن یہ ممکن ہے کہ شروع توجہ سے کیا ہو مگر استمرار میں توجہ نہ رہی ہو۔ اس کی مثال یوں سمجھئے کہ جیسے دو آدمی ساتھ ساتھ چلیں اور باتیں کرتے ہوئے راستہ طے کریں تو باتیں کرتے وقت توجہ فقط باتوں کی طرف رہے گی، چلنے کی طرف نہ رہے گی مگر مشی پھر بھی واقع ہوتی ہے جیسے گھڑی کی کوک کہ ابتداء میں حرکت چابی کو دینا پڑتی ہے پھر اس کی رفتار کے استمرار و بقاء کے لیے کوکنے کی ضرورت نہیں رہتی۔ اسی طرح مشی ممتد کے ساتھ قصد متجدد کی ضرورت نہیں۔ وہی پہلا قصد کافی ہے اور وہی ساری مشی میں مؤثر ہے یا جیسے ہارمونیم باجہ کہ جب ایک دفعہ کوئی اسے بجانے بیٹھ گیا تو ہر قرعہ پر جدید قصد کی ضرورت نہیں۔ بلکہ ابتداء ایک دفعہ قصد کرلیا اور بجانا شروع کر دیا۔ اس کے بعد خود بخود ہاتھ وہیں پڑتا ہے جہاں ضرورت ہوتی ہے۔ اب وہ ارادہ تو کیا کرتا اسے بعض دفعہ ایسی محویت ہو جاتی ہے کہ ہاتھ چلنے کی بھی خبر نہیں ہوتی اور جیسے قاری ہے کہ قرأت میں اگر ہر لفظ پر نیا قصد کرے تو اس کا لہجہ بے تکلف اور بے ساختہ نہیں ہوسکتا۔ چنانچہ بارہا تجربہ ہوا ہوگا کہ جب کسی نے بنا کر پڑھا وہیں اس کا لہجہ بگڑ گیا بلکہ بے ساختہ اور بے ارادہ پڑھنے سے نہایت اچھا پڑھا جاتا ہے۔

اس سے معلوم ہوا کہ کسی فعل اختیاری کی جب عادت اور مشق ہو جائے تو پھر ابتداء کے لیے قصد کی ضرورت ہوتی ہے۔ استمرار کے لیے قصد متجدد کی ضرورت نہیں ہوتی چنانچہ ان تمام مثالوں سے معلوم ہو گیا ہوگا کہ فعل اختیاری کے صدور کے لیے ضروری نہیں کہ ہر ہر آن میں اس پر توجہ ہو بس ابتداء کے لیے توجہ ضروری ہے۔

پس اب نماز اور وساوس کے جمع ہونے میں کوئی اشکال نہیں رہا کیونکہ ابتدائی توجہ سے نماز شروع ہوگئی اور وہ ہو رہی ہے اور درمیان میں وساوس کی طرف توجہ مبذول ہوگئی اس لیے وساوس بھی آرہے ہیں کیونکہ توجہ نماز کے ہر جزو کے ساتھ متعلق نہیں ہے۔ وہاں تو تکبیر تحریمہ سے السلام علیکم ورحمۃ اللہ تک کسی توجہ کی ضرورت نہیں ہے، ہاتھ پاؤں اس کام کے لیے اس قدر منجھے ہوئے ہیں کہ جب موقع رکوع کا آتا ہے خود رکوع کر لیتے ہیں اور سجدہ کا وقت ہوتا ہے خود ہی سجدہ کر لیتے ہیں۔ پس یہ شبہ حل ہو گیا کہ نماز میں سب سے زیادہ فکر ہے یہ کیوں مانع نہیں ہوئی وساوس کی۔

حاصل جواب کا یہ ہوا کہ یہ مانع کیسے ہو، وہاں تو یاد اور توجہ ہی نہیں ورنہ یہ ممکن نہیں کہ توجہ کامل ہو اور پھر وساوس آدیں۔ جب چاہو آزمالو۔ صاحب! تم ذرا ایک خط لکھنے بیٹھو اور پھر دیکھو کیسے وساوس آتے ہیں، میں نے بعض دفعہ ایسا کیا ہے کہ قرآن پڑھنے بیٹھا ہوں اور یہ چاہا کہ پڑھنے

میں خط بھی لکھوں تو نہیں ہوسکا۔ شاید الحمد اور قل ہو اللہ کی دوسری بات ہو کیونکہ وہ تو خوب یاد ہے۔ وہاں شدید توجہ کی ضرورت نہ ہو، باقی اور جگہ یا تو پڑھنے میں اٹکے گا یا لکھنے میں بھٹکے گا۔ اب تمام شبہات دور ہو کر وہ دعویٰ اچھی طرح ثابت ہو گیا کہ نفس بے شغل بھی نہیں رہ سکتا اور دو شغل میں بھی نہیں لگ سکتا، اس لیے فقط مضر سے بچنا کافی نہیں بلکہ نافع میں مشغول ہونے کی ضرورت ہے۔

حق تعالیٰ نے ان دو جملوں میں بھی رعایت کی ہے کہ پہلے تو یہ مرض بیان فرمایا کہ انسان غیر ضروری امور میں مشغول ہے اور غیر ضروری امور کی سب سے بڑی فرد یہ ہے کہ دنیا میں اس کو انہماک ہے اس لیے سب سے پہلے اس کی مذمت بیان فرما دی اور اس کے بعد امر ضروری یعنی آخرت کا ذکر کر دیا کہ ذکر آخرت میں مشغول ہونا چاہیے تاکہ اس انہماک کا ازالہ ہو۔ سو غیر ضروری کے ترک کرانے کی دو صورتیں تھیں۔ ایک تو یہ کہ اسکی مذمت کر دی جاوے اور اس سے ہٹایا جاوے مگر ابھی معلوم ہو چکا ہے کہ اس سے نفع نہیں ہو سکتا کیونکہ مشغلہ ضروری بتانا بھی ضروری ہے ورنہ یہ شخص اس غیر ضروری کو چھوڑ کر دوسرے غیر ضروری میں مبتلا ہوگا۔

چند غلط فہمیاں

دوسری صورت یہ ہے کہ غیر ضروری سے ہٹایا جاوے اور ضروری کی طرف متوجہ کیا جاوے۔ یہی دوسرا طریقہ جو اسلم واحسن ہے یہاں اختیار کیا گیا ہے۔ چنانچہ ارشاد ہے:

وَمَا هٰذِهِ الْحَيٰوةُ الدُّنْيَا اِلَّا لَهْوٌ وَّلَعِبٌ.

(کہ نہیں ہے حیواۃ دنیا مگر لہو ولعب یعنی فضول و بیکار ہے) دیکھئے صرف اتنے ہی پر اکتفا نہیں کیا کہ حیات دنیا کی مذمت کر دیں۔ آگے فرماتے ہیں:

وَاِنَّ الدَّارَ الْاٰخِرَةَ لَهِيَ الْحَيَوَانُ

(اور بے شک دار آخرت ہی حیات ہے) یعنی زندگی تو واقع میں آخرت ہی کی زندگی ہے، دنیا کی کیا زندگی۔ یہ تو اس کے سامنے بالکل ہیچ ہے۔ تو مذمت دنیا کے بعد آخرت کی طرف متوجہ کیا گیا ہے اس اسلوب ہی سے سمجھ میں آ گیا ہوگا کہ یہ مرض ایسا ہے جس کا مریض دائم المرض ہے جس کو آج کل کے جاہلانہ محاورہ میں دائم المریض کہتے ہیں۔

آج کل یہ بھی ایک فیشن ہو گیا ہے کہ جس لفظ پر دیکھو الف لام داخل کر دیتے ہیں۔ چنانچہ

قریب المرگ ہے۔ ایک مولوی صاحب فرمایا کرتے ہیں کہ اب تک تو الف لام چار ہی قسم کا تھا یعنی استغراقی، جنسی، عہد ذہنی، عہد خارجی مگر آج کل ایک پانچویں قسم الف لام نیچریت کی ایجاد ہوئی ہے۔ یعنی فیشن کے لوگ کتاب کا نام بھی رکھیں گے تو الف لام ضرور داخل کریں گے۔ مثلاً الفاروق، المامون، اگر فقط فاروق و مامون نام رکھ دیتے تو کیا حرج تھا۔ ایسے ہی الجزائر، الجبراء، غرض ہر چیز میں الف لام ایسے ہی قریب المرگ، دائم المریض کا الف لام کہ اس کے کوئی معنی ہی نہیں اور الف لام سے قطع نظر کرکے دائم المریض کی تو ترکیب ہی سمجھ میں نہیں آتی۔ ہمیشہ کے بیمار کو دائم المرض کہہ سکتے ہیں نہ کہ دائم المریض، اگر مریض ہی کا لفظ لانا ضروری تھا تو دائمی مریض کہہ لیتے۔ البتہ دائم المریض کے معنی یہ تو ہوسکتے ہیں کہ جس کے پاس ہمیشہ مریض رہیں جس طرح دائم المرض کے معنی یہ ہیں کہ جس کو ہمیشہ مرض رہے۔ پس اس معنی کو دائم المریض حکیم یا ڈاکٹر کو کہہ سکتے ہیں نہ کہ مریض کو۔

بہرحال جو دائم المرض ہوگا اس کو دوا بھی دائمی ہی دی جائے گی تو جب یہ مرض حب دنیا ہمیشہ کا ہے تو ہمیشہ اس کی دوا استعمال کرتے رہنا چاہیے۔ یہاں تک کہ اگر اتفاق سے بزرگ بھی ہو جائیں تو اس وقت بھی اس مرض سے اور اس کے علاج سے بے فکر نہ ہونا چاہیے کیونکہ اپنے نزدیک بزرگ بن جانے سے واقع میں بزرگ نہیں ہوسکتا مگر اب تو یہ حالت ہے کہ جہاں بھی کوئی درجہ مقصود کا حاصل ہوگیا مثلاً معصیت سے نفرت ہوگئی یا نفل میں دل لگنے لگا یا وساوس و خطرات بند ہوگئے تو سب گمان ہوگیا کہ اب میں کامل ہوگیا ہوں۔ پھر کیا تھا سب مجاہدے اور ریاضت چھوڑ بیٹھا، اس لیے ضرورت ہے شیخ کی۔

بنمائے بصاحب نظرے گوہر را　　　عیسیٰ نتواں گشت بہ تصدیق خرے چند

(کسی صاحب نظر کو اپنا جوہر دکھاؤ، چند احمقوں کی تصدیق سے عیسیٰ علیہ السلام نہیں ہوئے)

یعنی کسی کامل سے تشخیص کراؤ کہ یہ حالت کمال کی ہے یا نہیں ورنہ حالت ہوگی جیسے دق والے کو ایک دن بخار نہیں آیا تو وہ سمجھے کہ میں اچھا ہوگیا اور علاج چھوڑ بیٹھے۔ یاد رکھو! مرض کا نکس (یعنی ٹوٹنا) بداء سے (یعنی شروع ہونے سے) بھی اشد ہے۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ تمہاری بے احتیاطی سے مرض پھر لوٹے اور علاج مشکل ہوجائے تو جس طرح بعض مریض ظاہری ذرا بخار نہ آنے کو صحت سمجھ لیتا ہے اسی طرح بعض اہل طریق بھی جہاں تھوڑی سی سنسناہٹ بدن میں پیدا ہوئی اور سمجھ گئے کہ بس ہم کامل ہوگئے پھر تسبیح بھی چھوٹ گئی اور مجاہدہ بھی گیا اور یہ گمان ہوگیا کہ بس اب تو ہم

منتہی ہوگئے اب کسی ریاضت کی حاجت نہیں رہی اور اس کے مصداق ہو گئے۔ ''خلوت و چلہ برو لازم نماند'' (خلوت اور چلہ اس پر لازم نہ رہے) حالانکہ یہ خیال بالکل غلط ہے۔ ابھی تم تو جیسے تھے ویسے ہی ہو گئے بلکہ اس سے بھی بدتر ہو گئے کیونکہ ابتدائے مرض سے جیسے عود مرض سخت ہوتا ہے اسی طرح تمہاری یہ حالت اشد ہے۔ پہلی محجوبی کی حالت سے جس پر یہ حالت پیش آئے وہ خود غور کر کے دیکھ لے کہ اس وقت بہ نسبت پہلے کے طبیعت کی کیا کیفیت ہے۔

حالت یہ ہوتی ہے کہ طاعت سے دل گھبرانے لگتا ہے۔ حق تعالیٰ کی طرف متوجہ ہونے سے وحشت سی ہوتی ہے۔ حق تعالیٰ سے اباء و اعراض و انکار پیدا ہو جاتا ہے۔ یہ حالت یہاں تک ترقی کرتی ہے کہ اس کے بعد شدہ شدہ حق تعالیٰ سے عداوت پیدا ہو جاتی ہے، خدا کو اپنے سے اور اپنے کو خدا سے ناخوش پاتا ہے۔ بس یہ سرحد ہے کفر کی۔ (نعوذ باللہ منہ)

حضرت سلطان نظام الدین اولیاء رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی کتاب فوائد الفوائد میں لکھا ہے کہ حجابات کے سات درجے ہیں۔ ان میں ایک درجہ عداوت ہے۔ اولاً طبعی اور عداوت طبعی کے بعد پھر آخری درجہ کفر ہے، اختیاری اور ادنیٰ درجہ حجاب کا معمولات کا اختلال ہے کہ خدا کے ساتھ جو برتاؤ اور تعلق چلا آ رہا ہے اس میں کمی کر دے یہ ادنیٰ حجاب ہے اور اسی سے بڑھتے بڑھتے حجابات کثیرہ پیدا ہو جاتے ہیں اس لیے اس ادنیٰ سے بھی بچنا چاہیے۔

اسی واسطے حدیث میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے:

یا عبداللہ لاتکن مثل فلان کان یصلی من اللیل ثم ترکھا. (الصحیح للبخاری ۲: ۲۸، الصحیح لمسلم الصیام: ۱۸۵)

(کہ اے عبداللہ! ایسے مت ہو جانا جیسے فلاں شخص تھے کہ اول تہجد کی نماز پڑھتا تھا پھر چھوڑ دی)

باقی یہ سمجھنا کہ مجھے کمال حاصل ہو گیا، یہ تو صاف اعجاب اور کفر کا شعبہ ہے۔ صاحب! تھوڑی سی سنسناہٹ پیدا ہو جانے سے کمال حاصل نہیں ہو جاتا اسے کسی شیخ کی تشخیص پر چھوڑ دو اپنی رائے سے کچھ مت سمجھو۔

صوفی نہ شود صافی تا در نکشد جامی　　بسیار سفر باید تا پختہ شود خامی

(صوفی جب تک جام محبت نوش کر کے بہت سے مجاہدات نہ کرے ناقص ہی رہتا ہے)

صوفی کے صاف ہونے کے لیے ایک جام کی اور جام کی پختگی کے لیے بہت سفر کی ضرورت

ہے۔ بڑی مدت میں خام کے اندر پختگی آتی ہے۔ یہ نفس کا دھوکہ ہے کہ اپنے کو کامل سمجھ کر سب کام چھوڑ بیٹھے۔ اس دھوکے میں نہ پڑنا چاہیے اور اپنی حالت پر کبھی اعتماد نہ کرنا چا۔ یہ جو تجویز کسی مبصر نے کردی ہے عمر بھر اسی میں مشغول رہنا چاہیے کیونکہ اس کے ترک میں یہ ہوتا ہے کہ بتدریج کمی ہوتی رہتی ہے جس کا ادراک بھی مشکل ہے۔

مثال کے طور پر یوں سمجھئے کہ کسی نے ایک پھول کا درخت لگایا، اسے خوب پانی دیا اور بڑھ گیا، اب کثرت سے پھول بھی لگنے لگے، اب یہ سمجھ کر پانی دینا چھوڑ دیا کہ اب تو یہ مکمل ہو گیا مگر اس کا نتیجہ ہوگا کہ پہلے تو پھول چھوٹا پڑ جائے گا پھر پھول لگنا بند ہو جائے گا اور اس کے بعد درخت مرجھا کر خشک ہو جائے گا۔

ہاں اتنا تو کرسکتا ہے کہ پہلے کثرت سے مجاہدے کرتا تھا، اب کبھی کبھی کرلے، جیسے ابتداء میں درخت کو پانی کی زیادہ ضرورت ہوتی ہے، بڑھ جانے کے بعد اتنی ضرورت نہیں رہتی۔ اسی طرح مبتدی اور منتہی کی اطاعت میں بڑا فرق ہے۔ یہ ضروری نہیں کہ جتنے مجاہدے ریاضات مبتدی کرتا تھا اتنے ہی منتہی بھی کرے۔ مگر یہ تو ضرور ہے کہ منتہی بھی کچھ کرے اس کے تھوڑے مجاہدے بھی مبتدی کے بیسیوں مجاہدوں سے افضل ہیں اور صورت بھی دونوں مجاہدوں کی جدا جدا ہوتی ہے۔

اہل اللہ کا مقام

اور مولانا نے جو منتہی کی نسبت فرمایا ہے:

"خلوت و چله برو لازم نماند" (خلوت اور چلہ اس پر لازم نہ رہا)

سو یہ فرمایا کہ طاعت واحکام دین لازم نماند، بس اس کی شان عوام الناس کی سی ہو جاتی ہے۔ اس کی عبادت بھی ایسی ہوتی ہے کہ دوسرا ادراک نہیں کرسکتا۔ نہ وہ نفلیں بہت پڑھتا ہے نہ تلاوت بہت کرتا ہے بلکہ وہ خلق اللہ کی خدمت میں مشغول ہوتا ہے جس کو دیکھ کر بعض لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ اس کو وعظ وتقریر میں خوب حظ نفس ہوتا ہے۔ حالانکہ جو کچھ بات چیت منتہی کر رہا ہے وہ محض خدمت کے خیال سے کر رہا ہے۔ اس میں اسے کچھ حظ نہیں ہوتا بلکہ زبان سے تو بات چیت کر رہا ہے اور دل منقبض ہو رہا ہے مگر دوسرے کی مصلحت کے واسطے سب کچھ برداشت کر رہا ہے اس آیت سے اس کیفیت کا پتہ چلتا ہے۔

وَاصْبِرْ نَفْسَکَ مَعَ الَّذِيْنَ يَدْعُوْنَ رَبَّهُمْ بِالْغَدٰوةِ وَالْعَشِيِّ الخ

(اپنے نفس کو ضبط کرو، ان لوگوں کے ساتھ جو اللہ تعالیٰ کو صبح و شام پکارتے ہیں)

یعنی اپنے نفس کو ضبط کر کے اور گھونٹ کر بیٹھے۔ یہاں حق تعالیٰ نے صبر کا لفظ ارشاد فرمایا ہے اور صبر کے معنی ہیں۔ ''حبس النفس علی ما تکرھه'' (یعنی نفس کو ایسی بات کا پابند کرنا جو اس کو ناگوار ہو۔ اس سے معلوم ہوا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم مجمع سے گھبراتے تھے مگر لوگوں کی مصلحت کے لیے مجبوراً بیٹھتے تھے۔ صاحبو! ہمیں تو دوستوں میں بیٹھ کر حظ آتا ہے مگر اہل اللہ کو پریشانی ہوتی ہے کیونکہ ان کی نظر تو اور ہی طرف ہے۔ جس کو جامی فرماتے ہیں۔

خوشا وقتے و خرم روزگارے　　　　کہ یارے برخورد از وصل یارے

(کیا اچھا وقت اور کیا اچھا زمانہ ہے کہ محب اپنے محبوب کے وصال سے متمتع ہو) اور ان کی یہ شان ہوتی ہے۔

غیرت از چشم برم روئے تو دیدن ندہم　　　　گوش را نیز حدیث تو شنیدن ندہم

(مجھ کو آنکھوں پر رشک آتا ہے کہ ان کو محبوب کے چہرہ انور کو نہ دیکھنے دوں اور کانوں کو بھی اس کی باتیں نہ سننے دوں)

ان کو تو خود اپنا نفس بھی حجاب معلوم ہوتا ہے تو دوست کیوں نہ موجب پریشان ہوں گے۔ لوگ ان کو تعظیم و تکریم کی شان میں دیکھ کر یہ سمجھتے ہیں کہ بڑے چین میں ہیں مگر کوئی انہی کے دل سے پوچھے کہ ان پر کیا گزرتی ہے۔

ے ترا خارے بپا نشکستہ کے دانی کہ چیست　　　　حال شیرا نے کہ شمشیر بلا برسر خورند

(تمہارے پاؤں میں کانٹا بھی نہیں لگا ہے، تم ان لوگوں کی حالت کو کیا سمجھ سکتے ہو جن کے سروں پر بلا اور مصیبت کی تلوار چل رہی ہے)

کسی کو کیا خبر ہے کہ وہ کس طرح ان مصائب کو یعنی مخلوق کی مجامعت و مخالطت کو برداشت کرتے ہیں۔

در نیابد حال پختہ ہیچ خام　　　　پس سخن کوتاہ باید والسلام

(کامل کی باتیں ناقص کی سمجھ میں نہیں آسکتیں۔ سلامتی اسی میں ہے کہ کلام کو تاہ کریں)

غرض ان کو اپنے اوپر قیاس مت کرو کہ جس طرح دوستوں میں بیٹھ کر حظ آتا ہے اسی طرح انہیں بھی آتا ہوگا۔

کار پاکاں را قیاس از خود مگیر گرچہ ماند در نوشتن شیر و شیر

(پاک لوگوں کو اپنے اوپر قیاس مت کرو۔ اگرچہ شیر (درندہ) شیر بمعنی (دودھ) لکھنے میں ایک ہی طرح ہیں مگر معنوں میں زمین آسمان کا فرق ہے)

انہیں بے حد انقباض ہوتا ہے دوستوں سے اور وہ اس سے اس قدر پریشان ہوتے ہیں کہ آپ کو اس کا اندازہ نہیں ہو سکتا مگر باوجود اس کے وہ ظاہر میں سب سے بول بھی رہے ہیں اور ہنس بھی رہے ہیں۔ اس پریشانی اور ضحک کے اجتماع پر ایک قصہ یاد آیا۔

لکھا ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام ہنستے بہت تھے اور حضرت یحییٰ علیہ السلام روتے بہت تھے۔ ایک بار دونوں میں مناظرہ ہوا۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے فرمایا کہ معلوم ہوتا ہے کہ آپ رحمت سے مایوس ہو گئے ہیں جو اس قدر روتے ہیں۔ حضرت یحییٰ علیہ السلام نے فرمایا کہ شاید آپ عذاب سے بے خوف ہو گئے ہیں جو اس قدر ہنستے ہیں۔ حق تعالیٰ کی طرف سے ایک فرشتہ فیصلہ کے لیے آیا اور اس نے یہ فیصلہ کیا کہ اے یحییٰ علیہ السلام آپ خلوت میں تو ایسے رہیے جیسے اس وقت ہیں اور جلوت میں ایسے رہیے جیسے عیسیٰ ہیں اور اے عیسیٰ علیہ السلام آپ جلوت میں تو ایسے ہی رہیے جیسے اس وقت ہیں اور خلوت میں ایسے رہیے جیسے یحییٰ علیہ السلام۔ آپ کو خلوت میں ہنسنے کی کیا ضرورت ہے یہ تو نڈر اور بے خوف کا کام ہے اور اے یحییٰ علیہ السلام اگر آپ جلوت میں بھی ایسے ہی روتے رہیں گے تو میرے بندے نا اُمید ہو جائیں گے۔

تو وہ اس لیے ہنستے ہیں تا کہ مخلوق نا اُمید نہ ہو جائے۔ ان کی ہنسی لوگوں کی مصلحت کے لیے ہوتی ہے کہ انہیں نفع پہنچے اور تا کہ وہ دل شکستہ نہ ہو۔ تو صاحبو! ان کی عبادت اس قسم کی ہوتی ہے کہ لوگ اسے لذت اور حظ نفس سمجھتے ہیں حالانکہ حقیقت میں وہ مجاہدات ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ جناب رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم نے تبسم سے زیادہ ضحک کبھی نہیں فرمایا اس کی وجہ یہ ہے کہ جس کے دل پر چوٹ لگی ہوتی ہے اور غم ایک اثر ہوتا ہے وہ جب بھی ہنسے گا کوشش اور قصد سے ہنسے گا اور قصد کی ہنسی قابو میں ہوتی ہے۔ اس لیے آپ کی ہنسی تبسم سے زیادہ نہ ہوتی تھی۔ شب و روز دیکھ لو اگر کسی کو ذرا رنج ہوتا ہے تو یہ حالت ہوتی ہے کہ جہاں کسی نے اس سے ہنسی کی بات کی فوراً غصہ آ جاتا ہے لیکن اگر رنج کا سبب قابل اخفا ہوتا ہے تو اس کو خیال سے ہنسی کی صورت بنانا پڑتی ہے کہ اگر نہ ہنسوں گا راز کھل جائے گا اس لیے زبردستی منہ چڑانا پڑتا ہے۔ غرض بڑی مصیبت سے ہنسی آتی ہے۔

بس یہی حال اہل فکر کا ہوتا ہے اور ایک ہم بے فکرے ہیں کہ ذرا سے اشارے میں محلہ کو سر پر اٹھا لیتے ہیں۔ معمولی سی ہنسی کی بات پر لوٹ جاتے ہیں اور ایک حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ہنسنا ہے کہ فقط تبسم فرماتے ہیں اور وہ بھی اُمت کی مصلحت کے لئے اور آپ ہنستے بھی کیسے آپ صلی اللہ علیہ وسلم تو اُمت کے لیے طویل الاحزان دائم الفکر (بہت ہی غمگین دائم الفکر) رہتے تھے جو ہر وقت فکر میں ہوگا اسے کیونکر ہنسی آئے گی۔

چوں چنیں کارے ست اندر راہ ترا　　　خواب چوں می آید اے ابلہ ترا

(جب تجھ کو طریق میں ایسا بڑا کام درپیش ہے تو اے بیوقوف تجھ کو نیند کیوں کر آتی ہے)

امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ نے ایک بزرگ کی حکایت لکھی ہے کہ ان کے سامنے جماعت بے فکروں کی نکلی، ہنستے ہوئے جارہے تھے۔ انہوں نے کہا تم کو پل صراط پر چڑھنا تو معلوم ہے اور اترنے کی خبر نہیں، پھر کیسے ہنسی آتی ہے۔ (مطلب یہ تھا کہ بمقتضائے "اِنْ مِّنْکُمْ اِلَّا وَارِدُھَا" ہر شخص کو جہنم کے اوپر سے گزرنا ضرور ہے اور یہ خبر نہیں کہ پھر پار ہوں گے یا دو چار ہوں گے۔ اس حالت میں تمہارا ہنسنا حیرت انگیز ہے۔ واقعی خوب کہا ہے۔ (ایسی بے ساختہ ہنسی تو اسی کو آتی ہے جس کے قلب میں بے فکری ہو)۔

غرض ہمیں ہر وقت اپنی حالت کو سوچتے رہنا چاہیے اور کبھی اپنے متعلق کمال کا گمان نہ ہونا چاہیے جس سے عبادت میں کمی کر دی جاوے اور بالفرض اگر کمال کو حاصل بھی فرض کر لیا جاوے تب بھی بے فکری کی کوئی وجہ نہیں۔ اگر خلوت و چلہ لازم نہیں رہا تو عبادت سے تو خالی نہیں رہنا چاہیے بلکہ اس درجہ پر پہنچ کر تو عبادت زیادہ دقیق ولطیف ہو جاتی ہے جس کی رعایت میں خاص اہتمام کی حاجت ہوتی ہے۔

خلاصہ یہ کہ عبادت کا ترک ہر وقت مضر ہے اور کمال کا اعتقاد بھی مضر ہے کہ یہ عبادات ترک کرا دیتا ہے۔ اسی واسطے یہ مضمون یعنی فکر اصلاح و تکمیل دین ہر وقت کی ضرورت کا ہے۔

ہر چند کہ اس کا بیان ضرورت کی قدر بھی کافی تھا کیونکہ سب کے نزدیک مسلم ہے، زیادہ تطویل کی ضرورت نہ تھی مگر اس کے متعلق زیادہ بیان کرنے کی ایک خاص وجہ یہ بھی ہے کہ جس مکان میں اس وقت بیان ہو رہا ہے اس وقت اس کی تکمیل ہو چکی ہے اور اس کے مالک کا سکونت کے لیے اس میں آجانے کا ارادہ ہے اور یہ حالت مظنہ تھا اس کے ساتھ زیادہ قلب کے شغل کا جو ایک قسم کا انہماک ہے دار دنیا کے ساتھ۔ اس لیے ضرورت تھی کہ اس انہماک کی مذمت اور شغل آخرت کی ضرورت کا کسی قدر خاص اہتمام سے بیان کیا جاوے۔ یہ وجہ ہوگئی کسی قدر تطویل کی۔

تعمیر و آرائش مکان

بہر حال اس آیت میں دار دنیا اور دار آخرت کے ساتھ جو معاملہ کیا جاوے اس کا ذکر ہے جس کے عموم میں خاص مکان بھی آ گیا اور ایک آیت میں خاص مکان یعنی مساکن کا معاملہ بھی ذکر فرما دیا گیا ہے۔ جس سے معلوم ہوتا ہے کہ دنیوی مساکن کے ساتھ اتنا محفوظ ہونا کہ آخرت سے غافل کر دے، نیز مذموم ہے چنانچہ ارشاد ہے:

قُلْ اِنْ كَانَ اٰبَآؤُكُمْ وَاَبْنَآؤُكُمْ وَاِخْوَانُكُمْ وَاَزْوَاجُكُمْ وَعَشِيْرَتُكُمْ وَاَمْوَالُ نِ اقْتَرَفْتُمُوْهَا وَتِجَارَةٌ تَخْشَوْنَ كَسَادَهَا وَمَسٰكِنُ تَرْضَوْنَهَآ اَحَبَّ اِلَيْكُمْ مِّنَ اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ وَجِهَادٍ فِيْ سَبِيْلِهٖ فَتَرَبَّصُوْا حَتّٰى يَاْتِيَ اللّٰهُ بِاَمْرِهٖ

(یعنی فرما دیجئے کہ اگر تمہارے باپ اور بیٹے اور بھائی اور بیویاں اور کنبے والے اور وہ مال جس کو تم نے محنت سے حاصل کیا ہے اور وہ تجارت جس کے گھاٹے کا تمہیں اندیشہ رہتا ہے اور گھر جنہیں تم پسند کرتے ہو زیادہ محبوب ہیں تمہارے نزدیک خدا اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم سے اور اس کے راستہ میں جہاد کرنے سے تو انتظار کرو یہاں تک کہ اللہ اپنے حکم کو لاوے)

یہ محل وعید میں ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اگر تمہیں سب چیزیں جو مذکور ہوئی ہیں خدا سے اور اس کے احکام سے زیادہ محبوب ہیں تو حکم ثانی کا انتظار کرو۔ اس آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ حق تعالیٰ کی کتنی رحمت ہے کہ محض حب مساکن پر وعید نہیں ہے اور نہ رضا بالساکن پر وعید ہے۔ یعنی مکان کو پسند کرنے پر بھی وعید نہیں ہے اس سے معلوم ہوا کہ اچھا اور پسندیدہ مکان بنانے کی اجازت ہے، اب وعید کا ہے پر صرف ''احب الیکم'' پر کہ وہ خدا سے زیادہ محبوب ہوں تب محل وعید ہیں، اس میں بھی مطلق محبوب ہونے پر وعید نہیں تو مکان کا نہ مرضی پر ہونا محل وعید ہے نہ محبوب ہونا بلکہ ''احب من اللہ'' ہونا (اللہ تعالیٰ سے زیادہ محبوب ہونا) محل وعید ہے۔

اب اگر کوئی شخص بقدر ضرورت مکان بنوا لے جس میں اسراف و تفاخر نہ ہو تو کوئی حرج نہیں اور یہ ہر شخص خود سمجھ سکتا ہے کہ اس کو کتنا مکان ضروری ہے کیونکہ لوگوں کے درجات مختلف ہیں اور انہیں درجات کے لحاظ سے ضروریات بھی مختلف ہیں، کسی کو ایک حجرہ آسائش و راحت کے لیے کافی ہو جاتا ہے اور کسی کو ایک بڑا مکان بھی مشکل سے کافی ہوتا ہے۔ بہر حال عمدہ اور پختہ اور بڑا مکان

بنانا ''شرعا ماذون فیه'' (اس میں اجازت دی گئی) ہے۔ چنانچہ اس کے عدم جواز کا کسی کا بھی مذہب نہیں ہے۔ ایک شخص کو زیادہ سردی لگتی ہے وہ لحاف اوڑھتا ہے اور ایک شخص کا جاڑا ہلکی رضائی میں چلا جاتا ہے، دونوں کا اسراف الگ الگ ہے۔ بہر حال ہر شخص اپنی ضرورت کو خود ہی سمجھ سکتا ہے۔ ہاں ضرورت سے آگے ایک درجہ آرائش کا ہے وہ بھی جائز ہے بشرطیکہ اس میں اسراف اور حدود شرعیہ سے تجاوز نہ ہو اور نہ قصد فخر و عجب کا اختلاط ہو کیونکہ یہ درجہ نمائش کا ہے جو ناجائز ہے۔

اسراف کی تفصیل

اسراف کے معنی یہ ہیں کہ منہی عنہ کا ارتکاب نہ ہو اور جو خرچ بھی ہو وہ معصیت میں خرچ نہ ہو۔ اس میں بھی تھوڑی سی تفصیل ہے۔ بعض دفعہ ایک ہی شے ایک شخص کے اعتبار سے اسراف ہو سکتی ہے اور دوسرے شخص کے اعتبار سے اسراف نہیں ہوتی۔

مثلاً ایک شخص کو دس روپے گز کا کپڑا پہننے کی وسعت ہے اور ایک شخص کو ایک روپیہ گز کے کپڑے کی بھی وسعت نہیں۔ یہ اگر دس روپیہ گز کا کپڑا خریدے گا تو ضرور قرض دار ہوگا۔ اب دونوں نے کپڑا خریدا تو جس کو وسعت ہے اس کے لیے تو کچھ حرج نہیں نہ اس پر اسراف کا الزام اور جس نے قرض لیا وہ بے ضرورت گردن پھنسانے سے گنہگار ہوگا۔ مسرف شمار ہوگا کیونکہ بلا ضرورت مقروض ہونا گناہ ہے۔

دیکھیے دس روپے گز کا کپڑا خریدنا ایک ہی فعل ہے مگر ایک کے لیے گناہ نہیں ہے اور ایک کے لیے گناہ ہے۔ بات یہ ہے کہ واقع میں تو وہ فعل مباح ہے مگر ایک عارض کی وجہ سے اس کے لیے موجب گناہ بن گیا اور وہ عارض کیا تھا، بلا ضرورت قرض لینا۔ اگر یہ اس قدر قیمتی لباس نہ پہنتا تو بے ضرورت قرض کی معصیت میں مبتلا نہ ہوتا اس لیے اس کے لیے اتنا اچھا اور قیمتی پہننا بھی گناہ ہے کیونکہ مقدمہ گناہ بھی گناہ ہوتا ہے تو بہر حال ہر چیز میں تین درجے ہیں۔

۱۔ ایک آسائش ۲۔ ایک آرائش ۳۔ ایک نمائش

تو آسائش ہر ایک کے لیے مستحب ہے اور آرائش یا زیبائش میں اگر معصیت کا مثلاً بلا ضرورت قرض وغیرہ کا ارتکاب نہ کرنا پڑے تو یہ بھی مباح ہے۔ گو اس کا ترک اولیٰ ہے اور نمائش جس میں ریا و کبر و عجب و فخر ہوتا ہے یہ حرام ہے۔ اب اس کا فیصلہ ہر شخص کے تدین پر ہے کہ اس کی

نیت کیا ہے۔ اگر دل میں غور کر کے یہ دیکھے کہ یہ کام میں نے نمائش کے لیے کیا ہے تو تاویل کر کے اس کو آرائش میں داخل نہ کرے مگر اس کے ساتھ دوسرے کے فعل کو بھی خواہ مخواہ معصیت میں داخل نہ کرے کہ ہر ایک کے فعل کو نمائش پر محمول کرنے لگے بلکہ حسن ظن رکھے۔

تو خلاصہ یہ ہوا کہ مساکن مرضیہ اگر احب من اللہ (اللہ تعالیٰ سے زیادہ محبوب) ہوں۔ تب محل وعید میں ورنہ نہیں، سومدار وعید مساکن مرضیہ نہیں۔ پس "قید ترضونھا" (وہ گھر جنہیں تم پسند کرتے ہو) بیان فرما کر اس پر وعید کا مدار نہ رکھ کر اپنے پسند کا مکان بنانے کی اجازت مستنبط ہوتی ہے اور اس سے بھی بڑھ کر یہ کہ پھر اس سے محبت کرنے کی بھی اجازت ہے۔ یعنی اس کی جانب سے میلان قلب کی بھی اجازت ہے بشرطیکہ وہ محبت خدا اور رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت سے بڑھ کر نہ ہو۔ اگر زیادہ ہوگی تو گنہگار ہوگا۔ خلاصہ یہ کہ مساکن کے متعلق یہ آداب ہیں جنہیں میں بقدر ضرورت اس کے قبل وعظ میں جو اسی مکان کے دوسرے حصہ میں ہوا تھا، بیان کر چکا ہوں۔

لہو ولعب کی تشریح

حق تعالیٰ نے اس آیت مقصود بالبیان میں بھی دار آخرت کے مقابلہ میں حیات دنیا کو بیان کیا ہے اور مقصود یہ ہے کہ دار آخرت پر حیات دنیا کو ترجیح نہ ہونی چاہیے تو لفظی مناسبت تو اس مضمون کے اختیار کرنے کی ظاہر ہی ہے کہ افتتاح دار کے لیے یہ وعظ ہوا ہے اور ان آیات میں بھی دار آخرت کا تذکرہ ہے مگر معنی کے اعتبار سے ان میں ایک عام مضمون کی طرف توجہ دلائی گئی ہے کہ آخرت سے بے فکری نہ ہونی چاہیے اور گو اس کے لیے یوں بھی فرما سکتے تھے کہ "اطلبوا الاخرۃ وترکوا الدنیا" کہ (آخرت کی جستجو کرو اور دنیا کو چھوڑ دو) مگر اس طرح نہیں بیان کیا کیونکہ حق تعالیٰ کو اس مضمون کے ساتھ ساتھ دونوں کی حالت کا دکھلانا بھی مقصود ہے جس سے اشارہ اس امر کی طرف بھی کرنا ہے کہ اس حالت کے بعد ہر شخص خود ہی فیصلہ کر لے کہ دونوں میں کون توجہ کے قابل ہے اور کون ترک کے قابل۔ اسی لیے امر ونہی کے صیغہ سے نہیں بیان کیا بلکہ بصورت اخبار یوں فرمایا کہ " وَمَا هٰذِهِ الْحَيٰوةُ الدُّنْيَآ اِلَّا لَهْوٌ وَّلَعِبٌ " (اور نہیں ہے حیات دنیا مگر لہو ولعب)

یہاں حق تعالیٰ نے دنیا کے لیے دو لفظ اختیار کیے ہیں۔ ایک لہو اور ایک لعب اور دونوں کے مفہوم میں لغۃً کچھ فرق ہے وہ یہ کہ لہو کہتے ہیں شغل کو اور لعب کہتے ہیں عبث کو اس سے معلوم ہوا

کہ دنیا ایسی چیز ہے کہ اس میں دو صفتیں ہیں۔ ایک تو لہو ہونے کی کہ یہ لوگوں کو اپنی طرف لبھاتی ہے، مشغول کرتی ہے اور دوسرے لعب یعنی عبث ہونے کی اس میں مشغول ہونا عبث یعنی بے نتیجہ ہے۔ اس پر کوئی معتد بہ ثمرہ مرتب نہیں ہوتا جیسا بچوں کا کھیل کہ اس پر بھی کوئی ثمرہ مرتب نہیں ہوتا۔ اس سے ایک اور دقیق علم کی طرف بھی اشارہ ہے وہ یہ کہ تمام حیات دنیا مذموم نہیں بلکہ وہ حیات دنیا مذموم ہے جس میں محض لہو ولعب ہو یعنی جو بے نتیجہ ہو اور اس کا کوئی معتد بہ ثمرہ نہ ہو۔ اس سے معلوم ہوا کہ دنیائے صوری کی دو قسمیں ہیں۔ ایک وہ جس پر ثمرہ مرتب ہو اور ایک وہ کہ جس پر ثمرہ مرتب نہ ہو وہ مذموم ہے اور جس پر ثمرہ مرتب ہو وہ واقع میں دنیا ہی نہیں۔

یہاں سے اصلاح ہے "غالی فی الزہد" (زہد میں غلو کرنے والا) اور زاہد خشک کی۔ وہ یہ سمجھتا ہے کہ دنیا کی ہر چیز مذموم ہے، عمدہ کپڑا، اچھا کھانا، ٹھنڈا پانی سب مذموم ہے۔ بعض لوگ اسی خیال سے نکاح بھی نہیں کرتے کہ عورت بھی دنیا ہے اور بعض کر بھی لیتے ہیں تو نان نفقہ نہیں دیتے اور اس کے حقوق ادا نہیں کرتے کیونکہ وہ بیوی کی طرف التفات کرنے کو التفات الی الدنیا (دنیا کی طرف توجہ کرنا) سمجھتے ہیں۔

میں ایک مرتبہ گھر میں کے معالجہ کے لیے میرٹھ گیا تو وہاں ایک عورت نے مجھ سے بیعت کی درخواست کی تو ایک دوسری عورت نے اس عورت کو یہ رائے دی کہ ہمارے پیر سے بیعت کرنا جو ایسے بزرگ ہیں کہ پچاس برس سے بیوی سے بولے بھی نہیں اور جس مولوی سے تو مرید ہونا چاہتی ہے وہ تو بیوی کو علاج کے لیے ساتھ ساتھ لیے پھرتا ہے اور جاہل نے یہ خیال نہ کیا کہ پیر صاحب نے تو پچاس برس سے حقوق العباد تلف کرنے کی وجہ سے خدا کی نافرمانی میں گرفتار ہو رہے ہیں، یہ بزرگ کیسے ہو سکتے ہیں۔

غرض اس آیت سے ایسے زاہدان خشک کی بھی اصلاح ہوگئی کہ دنیا اسے ہی نہیں کہتے جسے تم دنیا سمجھے ہو، یعنی روپیہ پیسہ وغیرہ۔ بلکہ دنیا تو درحقیقت لہو ولعب کا نام ہے جہاں یہ نہ ہو وہاں دنیا بھی نہ ہوگی اور جہاں یہ ہو وہاں دنیا ہوگی۔ گو ظاہری سامان کچھ نہ ہو اور اصل بات یہ ہے کہ دنیا مقابل آخرت کے ہے اور دنیا کا اطلاق دو معنی پر آیا ہے ایک تو دین کے مقابلہ پر دنیا بولی جاتی ہے جس کے معنی بے دینی کے ہوتے ہیں اور ایک آخرت کے مقابلہ میں بولی جاتی ہے جس کے معنی حیات دنیا کے ہوتے ہیں اور قرآن وحدیث میں دنیا کا استعمال دونوں معنی میں آیا ہے۔

سو آیت میں دو قسمیں ہیں۔ مذموم یعنی لہو ولعب وغیر مذموم یعنی اموال متاع وغیرہ۔ پس

وہ علی الاطلاق مذموم نہیں اور مذموم وہ ہے جو دین کے مقابلہ میں ہو جیسے "حب الدنیا راس کل خطیئة" کہ (دنیا کی محبت ہر گناہ کی جڑ ہے) یہاں دنیا مقابلہ میں دین کے بولی گئی ہے اور مطلب یہ ہے کہ بے دینی کی باتوں سے محبت کرنا چاہیے اور یہ معنی نہیں کہ بیوی بچوں سے بھی محبت نہ کرے کیونکہ یہ بے دینی کی چیزیں تھوڑا ہی ہیں بلکہ یہ تو نکاح کا نتیجہ ہیں جو دین ہے، غرض دنیا وہ مذموم ہے جو دین میں مضر ہو۔

چیست دنیا از خدا غافل بدن | نے قماش و نقرہ فرزند و زن

(یعنی دنیا کسے کہتے ہیں خدا سے غافل ہونے کو نہ کہ مال، دولت اور بیوی بچوں کو آگے ایسی ہی دنیا والوں کو کہتے ہیں۔

اہل دنیا چہ کہین وچہ مہین لعنۃ اللہ علیہم اجمعین

(دنیا دار خواہ بڑے ہوں یا چھوٹے سب پر اللہ کی لعنت ہو)

یہاں پر ایک سوال ہے وہ یہ کہ سب اہل دنیا پر لعنت کیسے کردی؟ جواب یہ ہے کہ اصل میں یہ ترجمہ ہے ایک حدیث کا جس میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں:

"الدنیا ملعون وملعون ما فیها الا ذکر اللہ وما والاہ او عالم او متعلم". (سنن ابی ماجه: ۲/ ۴۱۲، اتحاف السادة ۸: ۸۰، ۸۱)

(یعنی خدا کی رحمت سے دنیا دور ہے اور جو کچھ دنیا میں ہے وہ بھی خدا کی رحمت سے دور ہے مگر خدا کا ذکر اور اس کے ساتھ تعلق رکھنے والی چیز اور عالم یا متعلم)

یعنی ذکر اللہ اور اس کے مقدمات و متعلقات اور عالم و متعلم کو تو خدا کی رحمت سے بعد نہیں ہے۔ باقی سب رحمت سے بعید ہیں اور واقعی میں یہ استثناء منقطع ہے متصل نہیں ہے کیونکہ دنیا کے مفہوم میں ذکر اللہ اور عالم و متعلم پہلے ہی سے داخل نہیں تو لعنت یعنی بعد عن الرحمۃ (رحمت سے دوری) کا حکم خاص ان پر کر رہے ہیں جن کو دین سے تعلق نہ ہو۔ چنانچہ قرینہ اس کا وہ شعر ہے جو بعد میں کہتے ہیں

اہل دنیا کافران مطلق اند | روز و شب در زق زق و در بق بق اند

(صرف کفار اہل دنیا ہیں، رات دن زق زق بق بق میں گرفتار رہتے ہیں)

اس پر کوئی یہ شبہ نہ کرے کہ یہ تو لعنت سے بھی بڑھ کر ہے کہ یہاں سب اہل دنیا کو کافر ہی کہہ دیا مگر ایک بزرگ نے اس کی خوب توجیہ فرمائی جس کے بعد یہ قرینہ ہو گیا بعد عن الرحمۃ کے محل کا۔ وہ توجیہ

یہ فرمائی کہ اہل دنیا مبتدا اور کافران مطلق خبر نہیں ہے بلکہ اہل دنیا خبر مقدم ہے اور کافران مطلق مبتدائے مؤخر ہے۔ یعنی جو کافران مطلق ہیں وہی اہل دنیا ہیں، مومن اہل دنیا ہے ہی نہیں کیونکہ ابھی حدیث سے معلوم ہو گیا ہے کہ خدا کے ذکر کے ساتھ تعلق رکھنے والے ملعون نہیں ہیں تو کون مومن ایسا ہوگا جو خدا کے ذکر سے کچھ بھی علاقہ نہ رکھتا ہوگا۔ غرض وہی دنیا مذموم ہے جو آخرت بمعنی دین کے مقابلہ میں ہو۔

باقی اسباب دنیا تو اس میں حدیث سے دو قسمیں کر دی ہیں۔ ایک وہ جو آخرت میں کچھ دخل اور اس سے تعلق رکھتی ہوں اور ایک وہ جو آخرت میں اصلا دخل نہ رکھتی ہوں تو جو دنیا آخرت میں دخل نہیں رکھتی یہ حقیقت میں دنیا محضہ اور مذموم ہے اور اسی کو لہو و لعب فرمایا گیا ہے تو حق تعالیٰ نے اس مقام پر فیصلہ فرما دیا ہے کہ ایسی دنیا متوجہ ہونے کے قابل نہیں بلکہ توجہ کے قابل تو آخرت ہے۔ اسی کو ارشاد فرماتے ہیں:

"وَاِنَّ الدَّارَ الْاٰخِرَةَ لَهِيَ الْحَيَوَانُ" کہ حیات آخرت ہی سراپا حیات ہے جس میں حصر کا صیغہ استعمال کیا گیا ہے۔ بہر حال یہ مرض تھا ہمارے اندر جس کا حق تعالیٰ نے کس خوبی سے فیصلہ فرما دیا ہے کہ دنیا و آخرت دونوں کے حالات یعنی لہو و لعب ہونا اور حیات کاملہ ہونا بتا دیئے تا کہ دونوں کے حالات سننے کے بعد ہر عاقل نہایت آسانی سے خود ہی فیصلہ کر سکے کہ ان میں سے کون توجہ کے قابل ہے اور کون عدم توجہ کے قابل اور یہ حالت بتلا کر یہ بھی بتلا دیا کہ جس طرح بعض کام جن کی صورت دنیا ہے اور وہ دخل رکھتے ہیں، آخرت میں واقع میں دنیا نہیں ہیں کیونکہ وہ لہو و لعب نہیں۔

نمائش دریا کا اثر

اسی طرح اس کے مقابلہ میں آخرت کا کام جو صورت میں آخرت کے ہیں اور واقع میں دنیا کے لیے ہیں وہ آخرت نہیں ہیں۔

کلید در دوزخ است آں نماز　　　　که در چشم مردم گزاری دراز

یعنی وہ نماز دوزخ کی کنجی ہے جس سے دوزخ کا دروازہ کھل جائے گا جو ریا اور شہرت کے واسطے پڑھی جاوے کیونکہ لہو و لعب کے معنی اوپر معلوم ہو چکے ہیں کہ لعب وہ شغل ہے جو ثمرہ سے خالی ہو اور یہ نماز بھی فی الواقع ثمرہ سے خالی ہے تو یہ دنیا ہوئی، آخرت بمعنی دین نہیں ہوئی۔ حدیث شریف میں ہے کہ قیامت کے دن حق تعالیٰ ایک شہید کو بلائیں گے۔

"فيسئل عنه ماذا قدمت فيقول قاتلت في سبيلک حتى استشهدت فيقال لا بل

انما قاتلت لیقال انک لجری فقد قیل فیومر بہ فیلقی فی النار او کمال قال۔"

(اس سے پوچھیں گے کہ تم نے ہمارے لیے کیا کام کیا، وہ کہے گا اے میرے رب! میں نے آپ کے راستہ میں جہاد کیا تھا، یہاں تک کہ شہید ہو گیا۔ ارشاد ہوگا نہیں، جہاد اس لیے نہیں کیا تھا بلکہ اس لیے کیا تھا لوگ یوں کہیں کہ بھئی بڑا ہی بہادر ہے تو یہ کہہ دیا گیا۔ یعنی جس کے لیے تم نے جہاد کیا وہ تمہیں حاصل ہو چکا۔ پس اس کا فیصلہ کر دیا جائے گا اور وہ دوزخ میں ڈال دیا جائے گا)

اسی طرح ایک سخی کو بلائیں گے اور اس کا بھی یہی حشر ہوگا کہ ہمارے لیے تم نے سخاوت نہیں کی بلکہ اس لیے تم نے سخاوت کی تھی "لیقال انک جواد فقد قیل" تاکہ لوگ یہ کہیں کہ بڑا سخی ہے تو بہت تعریف ہو چکی۔

اسی طرح ایک عالم کو بلائیں گے۔ سوال ہوگا تم نے کیا کیا؟ عرض کرے گا کہ میں نے آپ کی رضا کے لیے وعظ کیا اور یہ کیا وہ کیا۔ ارشاد ہوگا! نہیں اس لیے یہ کام نہیں کیا بلکہ اس لیے "لیقال انک لقاری" کہ یہ کہا جاوے کہ یہ بڑے عالم ہیں تو آپ کی بھی بہت تعریف ہو چکی، اب یہاں کیا رکھا ہے۔

تو دیکھئے شہادت، سخاوت، علم دین کی خدمت جو اس طریقہ مذکور فی الحدیث (حدیث میں مذکور) سے ہو وہ بھی دنیا ہی ہے۔ اگرچہ صورت اس کی آخرت کی ہے۔ چنانچہ ایک خرچ کرنا کفار کا تھا کہ اپنے نزدیک نیک کام سمجھ کر کرتے تھے مگر پھر بھی ان کی مذمت کی گئی کیونکہ وہ محض صورت دین تھی اور حقیقت میں وہ انفاق دین نہ تھا۔ چنانچہ ارشاد ہے:

اِنَّ الَّذِیْنَ کَفَرُوْا یُنْفِقُوْنَ اَمْوَالَهُمْ لِیَصُدُّوْا عَنْ سَبِیْلِ اللّٰهِ.

(یعنی کفار اپنے اموال اس لیے خرچ کرتے ہیں تاکہ لوگوں کو خدا کے راستہ سے باز رکھیں) اور ایک خرچ اہل ایمان کا تھا کہ "لتکون کلمة الله هی العلیاء" تاکہ خدا ہی کا نام بلند ہو۔ جیسے ارشاد ہے:

مَثَلُ الَّذِیْنَ یُنْفِقُوْنَ اَمْوَالَهُمْ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ کَمَثَلِ حَبَّةٍ اَنْۢبَتَتْ سَبْعَ سَنَابِلَ فِیْ کُلِّ سُنْۢبُلَةٍ مِّائَةُ حَبَّةٍ.

(کہ جو لوگ خدا کے راستہ میں خرچ کرتے ہیں ان کے خرچ کی ایسی مثال ہے جیسے ایک دانہ زمین میں ڈالا گیا ہو، جس سے سات بالیاں اُگی ہوں اور ہر بالی میں سو دانے ہوں)

گویا ایک سے سات سو ہو گئے۔ دیکھئے حالانکہ اہل ایمان اور اہل کفر دونوں خرچ کرتے ہیں اور دونوں کا انفاق بھی حیات دنیا ہی میں ہوتا ہے اور دونوں کا مقصد بھی بزعم منفق اعانت دین ہی ہوتا ہے جس سے بظاہر معلوم ہوتا ہے کہ دونوں فعل میں اشتراک ہے مگر چونکہ یہ دین مقبول ہے اس لیے اس کے لیے انفاق بھی دین ہے اور وہ دین باطل ہے اس لیے انفاق دنیا ہوا۔ گو صورۃ اتحاد و اشتراک ہے مگر حقیقتاً دونوں میں بڑا فرق ہے اور اسی فرق کی وجہ سے ایک دنیا ہے اور ایک دین۔

اسی طرح ہر عمل کی یہی کیفیت ہے کہ محض صورۃً دین ہونے سے وہ دین نہیں بن سکتا اور نہ صورۃً دنیا ہونے سے دنیا بنتا ہے۔ پس اس کی بڑی ضرورت ہے کہ نظر و غور کر کے دیکھا جائے کہ ہم جو کچھ کر رہے ہیں آیا وہ دین کے لیے خلوص اور خوش نیتی سے کر رہے ہیں یا ایسا نہیں۔ اگر خلوص سے کر رہے ہیں تو وہ مقبول ہے ورنہ کچھ بھی نہیں۔

خلوص کی ضرورت

اب اس کے بعد دو قسم کی طبیعت کے لوگ ہیں۔ ایک تو وہ ہیں جو دین کے واسطے کام کرتے ہیں جس کا مذموم ہونا ظاہر ہے اور ایک وہ جو دین کا کام اس لیے بالکل چھوڑے بیٹھے ہیں کہ نیت تو آخرت کی ہے ہی نہیں پھر بلا نیت کر کے کیا کریں چنانچہ یہی سمجھ کر بہت سے جاہل لوگوں نے نماز چھوڑ دی کہ جیسی مطلوب ہے ویسی تو ہو ہی نہیں سکتی تو پڑھنے سے کیا فائدہ، بعض نے روزہ چھوڑ دیا کہ جیسا ہونا چاہیے ویسا تو ہو نہیں سکتا پھر رکھنے سے کیا فائدہ۔

اے صاحبو! یہ بڑی غلطی ہے۔ روزہ و نماز حقیقی کے حاصل کرنے کی تدبیر بھی یہی ہے کہ پہلے روزہ و نماز صوری کو اختیار کرو گو خلوص نہ ہو مگر شرط یہ ہے کہ اس کی ضد بھی نہ ہو، خلو کا درجہ ہو، اسی سے خلوص ہو جاتا ہے اور کرتے کرتے نیت بھی درست ہو جاتی ہے اور یہ نفس کا حیلہ و بہانہ ہے کہ جب کامل عمل نہیں ہوتا تو ناقص کیوں کریں۔

سبحان اللہ! کیا دنیا کے جتنے کامل کام ہوتے ہیں وہ اول ہی دن سے کامل ہو جاتے ہیں ہرگز نہیں بلکہ مدت کے بعد عمدہ کام کرنا آتا ہے۔ یہی حال اعمال آخرت کا بھی ہے کہ کرتے کرتے ہی کمال حاصل ہو جائے گا۔ پس ناقص عمل بھی بے کار نہیں بلکہ یہ ذریعہ ہے کامل کا۔ پس اعمال صالح میں خلوص کا قصد تو کرو لیکن اگر آج حاصل نہ ہو تو عمل نہ چھوڑ بلکہ کیے جاؤ اور قصد بھی

برابر رکھو، ان شاء اللہ ایک دن ضرور حاصل ہو جائے گا۔

اس کے بعد کوتاہی اعمال کے اعتبار سے ایک اور تقسیم ہے وہ یہ کہ ایک کوتاہی تو یہ تھی کہ اعمال میں نفس کے حیلہ و بہانہ سے خود ہی مشغول نہیں ہوتے اور دوسری کوتاہی یہ ہے کہ جو لوگ خود اعمال میں مشغول بھی ہیں انہیں دوسروں کی فکر نہیں ہے وہ اپنے نوکروں، اپنے متعلقین کو بلکہ اپنے بچوں کو نماز پر مجبور نہیں کرتے۔ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر (نیکیوں کا حکم کرنا اور برائیوں سے روکنا) کا باب ہی آج کل مفقود ہے۔ یاد رکھو جیسے طاعت خود واجب ہے ویسے ہی دوسروں کی طاعت کی سعی بھی واجب ہے۔ مگر یہ سعی بقدر استطاعت واجب ہے جہاں زبان کی استطاعت ہو وہاں زبان سے کرے جہاں ہاتھ پاؤں سے کر سکے ہاتھ پاؤں سے کرے، روپے پیسے سے کرے، خلاصہ یہ ہے کہ محض اپنا عمل درست کر لینا کافی نہیں ہے۔

فکر اصلاح

دیکھئے قرآن میں جہاں اس امت کے فضائل بیان کیے گئے ہیں ان میں بطور خصوصیت کے اصلاح غیر کو بھی ذکر کیا گیا ہے۔ چنانچہ ارشاد ہے:

"كُنْتُمْ خَيْرَ اُمَّةٍ اُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَتَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَتُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ"

(تم بہترین اُمت ہو جو لوگوں کے لیے پیدا کی گئی ہے، حکم کرتے ہو نیکیوں کا اور برائی سے روکتے ہو اور اللہ تعالیٰ پر ایمان لائے ہو)

اس آیت میں اس امت کی تین فضیلتیں بیان فرمائی ہیں جن میں فضیلت ایمان باللہ کی تو ہر شخص کے پاس اپنے لیے ہے اور باقی دو فضیلتیں امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کی۔ یہ دوسروں کے نفع کے لیے ہیں کیونکہ اس سے دوسرے پر نفع کا اثر پہنچتا ہے اور مقتضاء قواعد کا یہ تھا کہ یہاں تو مومن باللہ کو مقدم فرماتے کیونکہ وہ اساس اعمال ہے مگر مؤخر کرنے میں غالباً یہ نکتہ ہے کہ عوارض پر نظر کر کے اصلاح غیر کا اہتمام زیادہ مقصود ہے کیونکہ اپنی ضرورت کا اہتمام تو ہر شخص خود ہی کر لے گا ورنہ فی نفسہ اپنی اصلاح غیر کی اصلاح سے مقدم ہے مگر اس تقدیم کے یہ معنی نہیں کہ اگر اپنی اصلاح نہ کرے تو دوسرے کی اصلاح بھی واجب نہیں بلکہ یہ تو محض عمل ترتیب ہے کہ پہلے اپنی اصلاح کرنا چاہیے پھر دوسرے کی کرے، یہ نہیں کہ اگر مقدم کام نہ کیا ہو تو مؤخر کو بھی نہ کرے

کیونکہ دراصل یہ دو کام الگ الگ ہیں اور ایک دوسرے کا موقوف علیہ نہیں۔ ایک کو بھی ترک کرے گا تو اس ایک کے ترک کا گناہ ہوگا اور دوسرے کو ترک کرے گا تو دوسرے کے ترک کا گناہ ہوگا اور دونوں کو ترک کرے گا تو دونوں کے ترک کا گناہ ہوگا۔

تو یہ غلطی ہے کہ اپنی اصلاح نہ ہوئی تو دوسروں کو بھی تنبیہ نہ کرے۔ بعض اس آیت سے استدلال کرتے ہیں:

اَتَامُرُوْنَ النَّاسَ بِالْبِرِّ وَتَنْسَوْنَ اَنْفُسَكُمْ.

(لوگوں کو نیکی کا حکم کرتے ہو اور اپنے نفسوں کو بھلاتے ہو)

وہ اس سے یہی سمجھے گا کہ اگر اپنی اصلاح نہ کرے تو دوسرے کی اصلاح بھی نہ کرے کیونکہ ہمزہ تامرون پر انکار کے لیے داخل ہوا ہے تو امر بالبر (نیکی کا حکم) منکر ہوا۔ یعنی جس حالت میں تم اپنے نفسوں کو بھولے ہوئے ہو لوگوں کو امر بالبر کیوں کرتے ہو مگر یہ محض غلط ہے بلکہ ہمزہ مجموعہ پر داخل ہوا ہے اور انکار مجموعہ کے دوسرے جزو کے اعتبار سے ہے کہ اپنے کو اصلاح میں بھلانا نہیں چاہیے۔ اس آیت کا تو یہ جواب ہوگیا۔

اب ایک دوسری آیت کا مطلب بھی سنیئے جس سے ان لوگوں نے اس پر استدلال کیا ہے کہ بےعمل کو وعظ ونصیحت کرنا چاہیے۔ وہ یہ ہے کہ

"لِمَ تَقُوْلُوْنَ مَا لَا تَفْعَلُوْنَ (۲) كَبُرَ مَقْتًا عِنْدَ اللّٰهِ اَنْ تَقُوْلُوْا مَا لَا تَفْعَلُوْنَ"

(کہ تم وہ باتیں کیوں کہتے ہو جو کرتے نہیں، خدا کے نزدیک نہایت مبغوض ہے کہ جو کام خود نہ کرو اسے کہو)

دراصل یہ لوگ محض ترجمہ دیکھنے سے دھوکے میں پڑ گئے۔ ترجمہ سے یہ سمجھے کہ مطلب یہ ہے کہ جو کام خود نہ کرے وہ دوسروں کو بھی کرنے کو نہ کہے۔ حالانکہ یہ سراسر غلط ہے۔ تفسیر میں اسباب نزول سے آیات کے صحیح مطلب کا پتہ چلتا ہے۔ چنانچہ اس کا سبب نزول یہ ہے کہ بعض لوگوں نے یہ دعویٰ کیا ہے کہ اگر ہمیں یہ معلوم ہو جائے کہ کون سی عبادت سب سے زیادہ خدا کو پسند ہے تو ہم دل وجان سے اس کو خوب بجا لائیں۔ اس پر ارشاد ہوا کہ "جهاد في سبيل الله" (اللہ تعالیٰ کی راہ میں جہاد کرنا) خدا کو بہت پسند ہے۔ بس یہ سن کر بعض لوگوں کا خون خشک ہوگیا، ان لوگوں کے بارہ میں یہ آیتیں نازل ہوئیں کہ ایسی باتوں کا دعویٰ یا وعدہ کیوں کرتے ہو جنہیں تم پورا نہیں کر سکتے

تو یہاں پر "لم تقولون" (کیوں کہتے ہو تم) سے "لم تنصحون غیر کم" (کس لیے نصیحت کرتے ہو اپنے غیر کو یا قول امری و انشائی مراد نہیں ہے بلکہ قول خبری و دعائی مراد ہے۔

حاصل یہ ہے کہ آیت دعویٰ کے باب میں ہے دعوت کے باب میں نہیں، اس کے شان نزول معلوم ہو جانے کے بعد سمجھ میں آ گیا ہوگا کہ اس آیت کا امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کی ممانعت سے کچھ بھی مس نہیں۔ غرض واجب تو دوسرے کی اصلاح ہے مگر اپنی اصلاح اس پر ضرورت میں مقدم ہے اور باوجود اس کے حق تعالیٰ نے اصلاح غیر کو مہمل نہیں چھوڑا بلکہ جا بجا نہایت اہتمام سے بلا تقدیم اصلاح خود کے اس کا امر فرمایا ہے اور وجہ اس کے اہتمام کی یہ ہے کہ اپنی اصلاح کو تو ہر شخص ضروری سمجھتا ہے اور دوسرے کی اصلاح کا کچھ ایسا اہتمام نہیں کرتا اس لیے دوسرے کی اصلاح کے لیے زیادہ اس کے اہتمام کی ضرورت ہوئی اور اسی لیے آیت "کنتم خیر امۃ" (تم بہترین اُمت ہو) میں اس کو اصلاح نفس سے پہلے ذکر کیا تاکہ اپنی اصلاح کے بعد دوسرے کی اصلاح سے بے فکر نہ ہو جاویں۔

اصلاح غیر کے مدارج

البتہ اصلاح غیر کے بقدر استطاعت مدارج ہیں۔ چنانچہ ایک درجہ یہ ہے کہ "یٰاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا قُوْٓا اَنْفُسَکُمْ وَاَھْلِیْکُمْ نَارًا" (اے ایمان والو! اپنے آپ کو اور اپنے اہل وعیال کو دوزخ سے بچاؤ) اس درجہ کا حاصل اپنے خاص متعلقین کی اصلاح ہے۔ افسوس اس باب میں بھی ہم سے کتنی کوتاہی ہو رہی ہے خود تو نماز پڑھ بھی لیتے ہیں مگر کبھی بیوی کو، بچوں کو، نوکروں کو اور متعلقین کو نہیں کہتے، بچے اگر امتحان میں فیل ہو جائیں تو رنج ہوتا ہے مگر نماز قضاء کر دیں تو کچھ بھی پروا نہیں ہوتی۔ حالانکہ حدیث شریف میں ہے کہ سات برس کے بچے کو نماز پڑھنے کا حکم دو اور دس برس کے بچے کو اگر کہنے سے نہ پڑھے تو مار کے پڑھاؤ، اگر کوئی دس برس کا بچہ سرپرست کی غفلت کی وجہ سے بے نمازی ہوگا تو اس کا سرپرست گنہگار ہوگا تو اگر اصلاح غیر کی ضرورت نہ ہوتی تو "قُوْٓا اَنْفُسَکُمْ وَاَھْلِیْکُمْ" (آپ کو اور اپنے اہل وعیال کو دوزخ سے بچاؤ) میں اھلیکم کے کیا معنی ہوں گے۔ دوسرا درجہ یہ ہے:

"وَلْتَکُنْ مِّنْکُمْ اُمَّۃٌ یَّدْعُوْنَ اِلَی الْخَیْرِ وَیَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَیَنْھَوْنَ عَنِ الْمُنْکَرِ"

(کہ تم میں سے ایک جماعت ایسی ہونی چاہیے جس کا کام صرف یہی ہو کہ لوگوں کو امر

بالمعروف اور نہی عن المنکر کرے) اس درجہ کا حاصل تبلیغ عام ہے اور ایک جگہ ہے کہ "وَتَوَاصَوْا بِالْحَقِّ وَتَوَاصَوْا بِالصَّبْرِ" (ایک دوسرے کے حق کی فرمائش کرتے رہتے ہیں اور ایک دوسرے کو پابندی کی فرمائش کرتے رہتے ہیں) اس میں بھی تخصیص نہیں اہل وعیال کی۔ یہ تو قرآن میں اس امرونہی کی تاکید ہے۔ اسی طرح حدیث میں تاکید ہے۔ ارشاد ہے: "کلکم راع وکلکم مسئول عن رعیته" (یعنی ہر ایک تم میں سے نگہبان ہے اور ہر ایک تم میں سے اپنی رعیت کے بارے میں پوچھا جاوے گا) اس سے بھی معلوم ہوا کہ دوسرے کی اصلاح بھی ضروری ہے، اگر دوسرے کی اصلاح ضروری نہیں ہے تو پھر ان آیات اور احادیث کے کیا معنی ہیں۔

غرض یہ مسئلہ اتنا بدیہی ہے کہ اب زیادہ تفصیل سے شرم آتی ہے مگر کیا کروں۔ اس وقت ایک ایسا واقعہ پیش آیا ہے جس کی خبریں اخباروں میں آپ کو بھی معلوم ہیں کہ ہمارے مسلمان بھائیوں کو دوسری قومیں مرتد بنا رہی ہیں۔ اس کے متعلق مجھے ایک آیت یاد آئی:

"وَدُّوْا لَوْ تَكْفُرُوْنَ كَمَا كَفَرُوْا فَتَكُوْنُوْنَ سَوَآءً فَلَا تَتَّخِذُوْا مِنْهُمْ اَوْلِيَآءَ حَتّٰى يُهَاجِرُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ"

اس کے ترجمہ سے اس وقت کی حالت کا اندازہ کر کے آپ کو عبرت ہوگی۔ ترجمہ یہ ہے (کہ کفار تو دل سے پسند کرتے ہیں کہ تم بھی کافر ہو جاؤ تاکہ سب برابر ہو جاویں غرض جیسے ایک کبڑے سے کسی نے پوچھا تھا کہ تو اپنا اچھا ہونا چاہتا ہے یا دوسروں کو کبڑا ہونا، کہنے لگا کہ دوسروں کا کبڑا ہونا تاکہ میں بھی دوسروں کو اس نظر سے دیکھ لوں جس نظر سے لوگوں نے مجھ کو دیکھا ہے۔

تو کفار تو یہ چاہتے ہیں کہ تم سب ان کے برابر ہو جاؤ۔ آگے مسلمانوں کو ارشاد ہے کہ "فلا تتخذوا منهم اولياء" (ان سے دوستی اور اتحاد مت کرو) کیونکہ جب ان کی یہ حالت ہے کہ وہ دل سے تمہارا کافر ہونا پسند کرتے ہیں تو لامحالہ وہ تم سے مل کر اسی کی کوشش کریں گے۔ افسوس مسلمانوں کو تو ان سے ملتے ہوئے اس کا خطرہ بھی نہیں ہوتا کہ ان کو مسلمان بنا دیں اور وہ ہر وقت دل میں یہی خیال رکھتے ہیں کہ مسلمانوں کو کافر بنا دیں۔

صاحبو! برائے خدا تم ان سے دوستی اور اتحاد مت کرو۔ ہاں تھوڑی سی اتنی رعایت کر دیا کرو کہ وہ تمہارے اخلاق کے گرویدہ ہو کر اسلام کا اثر قبول کریں مگر افسوس وہ تو رات دن اس کوشش میں منہمک ہیں کہ پرانے مسلمانوں کو بھی کافر بنا دیں اور ہمیں اس کی بھی پروا نہیں کہ ہمارے جو

بھائی پہلے سے مسلمان ہیں ان کو ہی اسلام کے اندر رکھنے کی کوشش کریں۔ صحابہ رضی اللہ تعالیٰ عنہم نے تو کس جانفشانی سے اسلام پھیلایا تھا آج ہم اپنی غفلت سے اسے مٹا رہے ہیں۔

بعض اہل کفر کا مسلمانوں پر یہ بھی اعتراض ہے کہ اسلام بزور شمشیر پھیلا ہے۔ اب ہمارا زور ہے ہم اس زور سے کام لے رہے ہیں مگر یہ بالکل ہی غلط ہے دراصل شمشیر کا استعمال مزاحمت کے روکنے اور مدافعت کے واسطے تھا یعنی حفاظت اسلام کے لیے تھا نہ کہ اشاعت اسلام کے لیے۔

حضرت مولانا محمد قاسم صاحب نے اس کا خوب ہی جواب دیا ہے کہ بزور شمشیر اسلام پھیلانے کے لئے شمشیر زنوں کی بھی تو ضرورت ہے تو وہ شمشیر زن کس شمشیر کے زور سے جمع ہوئے جنہوں نے بزور شمشیر اسلام پھیلایا۔ دراصل اسلام پھیلا ہے اخلاق سے جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اور اخلاق سے صحابہ رضی اللہ تعالیٰ عنہم کے۔ چنانچہ سیر و تواریخ اس پر شاہد ہیں۔ اگر ہم بھی ویسے ہی پکے مسلمان ہو جائیں تو سچ جانئے کہ کفار ہمیں بھی دیکھ دیکھ کر مسلمان ہونے لگیں۔

مسلمان اور کافر کا فرق

مگر اب تو ہمارے اخلاق اس درجہ گر گئے ہیں کہ انہیں مثال میں پیش کر کے کفار کو نفرت دلائی جاتی ہے۔ ایک شخص نے کسی کافر سے کہا تھا کہ مسلمان ہو جاؤ، اس نے کہا کہ میں ایسا مسلمان تو نہیں ہو سکتا جیسے بایزید ہیں کیونکہ اس پر قدرت نہیں اور ایسا مسلمان ہونا جیسے تم ہو، میں پسند نہیں کرتا اس سے تو میں کافر ہی اچھا۔

صاحبو! اس کافر کا یہ کہنا تو بالکل ہی لغو ہے، کافر تو مسلمان سے کسی طرح اچھا ہو ہی نہیں سکتا۔ حتیٰ کہ ظالم مسلمان رحم دل کافر سے بھی بدرجہا یقیناً بہتر ہے اور رحم دل کافر کو مسلمان سے بہتر وہی کہے گا جسے دنیا کا بھی قانون معلوم نہیں۔

میں کہتا ہوں کہ فرض کرو ایک شخص اعلیٰ درجہ کا ڈگری یافتہ ہے اور نہایت مہذب ہے مگر ہے حکومت کا باغی اور ایک جاہل جرائم پیشہ اور چور ہے کہ سزا بھی پاتا ہے اور پکڑا بھی جاتا ہے مگر حکومت کا باغی نہیں بلکہ مطیع اور فرمانبردار ہے۔ میں اہل تمدن سے پوچھتا ہوں کہ بتلائیں قانون کے اعتبار سے اور گورنمنٹ کی نظر میں کون شخص بڑھا ہوا ہے اور کون گھٹا ہوا ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ جاہل گو اس میں سارے عیب ہیں مگر ایک وصف فرمانبرداری اس میں ایسا ہے کہ تھوڑے دنوں

میں وہ سزا کے بعد پھر ویسا کا ویسا ہی مقبول و مقرب ہو جاوے گا جیسا کہ جرم سے پہلے تھا اور یہ تعلیم یافتہ جس میں ہزاروں خوبیاں ہیں، بغاوت کی وجہ سے ہیچ در ہیچ ہے کیونکہ یہ ایسا عیب ہے کہ سب خوبیاں اس کے سامنے ہیچ ہیں۔ اسی لیے یہ ہمیشہ مبغوض اور معتوب رہے گا۔

پس یہی فرق ظالم مسلمان اور رحم دل کافر میں، خدا کے نزدیک ہے تو اب اگر کوئی شخص مسلمان ہو کر ایسا کہے کہ ظالم مسلمان سے رحم دل کافر اچھا ہے تو معلوم ہوتا ہے کہ وہ اسلام کو حق نہیں سمجھتا۔ حیرت کی بات ہے کہ اسلام کو حق سمجھنے کے بعد یہ شبہ کرے کہ مسلمان سے کفر افضل ہو سکتا ہے۔ بہر حال یہ مسلمان خدا کے نزدیک افضل ہے تو اس کافر کی یہ غلطی تھی جو اس نے اپنے کفر کو اس کے اسلام پر ترجیح دی مگر میں یہ کہتا ہوں کہ ہماری حالت ایسی کیوں ہے کہ دوسرا شخص ہمارے متعلق زبان پر یہ حرف لا سکے۔ غرض ہماری حالت ایسی گری ہوئی ہے کہ کفار بھی ہم پر طعن کرتے ہیں۔

چنانچہ اس حالت کا حاصل یہ ہے کہ اگر اخلاق بھی سیکھیں گے تو وہ بھی کفار سے لیے ہوئے جیسے حریت، مساوات، ایثار، ہمدردی یہ سب الفاظ یورپ ہی سے سیکھے ہیں۔ باقی جو دراصل ہمارے اخلاق ہیں ان کی تو گویا ضرورت ہی نہیں کہ داڑھی رکھیں، نماز پڑھیں، روزہ رکھیں، استطاعت ہو تو زکوٰۃ دیں اور حج کریں اور معاملات و معاشرات کو درست کریں۔

اس پر مجھے اکبر الٰہ آبادی کا ایک شعر یاد آیا جو اس واقعہ پر کہا گیا ہے کہ جب انگریزی پڑھنے کو منع کیا گیا تھا تو جواب میں یہ کہا گیا تھا کہ وہ اس میں تو اسلام کی شان بڑھے گی کہ مسجد کے دروازہ پر جج اور کلکٹر دکھائی دیں گے حالانکہ یہ سب حساب شیخ چلی کا سا تھا جس کو ایک بقال نے مزدوری پر گھی کا گھڑا سپرد کیا۔ اب وہ گھڑا سر پر رکھ کر اس کے ساتھ ہو لئے اور یہ سوچنے لگے کہ مزدوری کا پیسہ ملے گا تو اس سے ایک انڈا خریدوں گا اور کسی کی مرغی کے نیچے رکھ دوں گا، اس سے بچہ نکلے گا پھر اس سے انڈے حاصل ہوں گے، پھر اس کو ان انڈوں پر بٹھا دوں گا تو بہت سے بچے نکلیں گے۔ تین چار بار ایسا ہی کروں گا، جب زیادہ ہو جاویں گے تو سب کو بیچ کر بکریاں خریدوں گا۔ پھر گھوڑا، پھر ہاتھی لوں گا اور پھر شادی کروں گا اور بچے ہوں گے، جب بچہ پیسہ مانگے تو میں کہوں گا ہشت! آخر کا فقرہ آپ نے اتنے زور سے سوچا کہ گردن کو جھٹکا لگا اور گھی کا گھڑا سر سے گر گیا۔ مالک نے کہا یہ کیا کیا؟ آپ کہتے ہیں میاں جی میرا تو سارا کنبہ تباہ ہو گیا، تمہیں اتنے سے گھی کی پڑی ہے۔

تو بہر حال اسی طرح انگریزی سے انہوں نے حساب لگایا تھا مگر نتیجہ یہ نکلا کہ اسلام سے اور

بعد ہو گیا۔ سو اس معنی میں انہوں نے یہ شعر کہا ہے۔

نہ نماز ہے نہ روزہ نہ زکوٰۃ ہے نہ حج ہے ۔۔۔۔ تو خوشی پھر اس کی کیا ہے کوئی جنٹ کوئی جج ہے

غرض یہ سب یورپ کی تقلید ہے کہ ایثار، ہمدردی، مساوات وغیرہ الفاظ یاد کر لیے اور وہ بھی محض نقل ہی نقل ہے۔ ان جیسے وہ بھی نہیں اور نماز، روزہ، حج، زکوٰۃ اور داڑھی کی تو کچھ فکر ہی نہیں۔

اے صاحبو! اسلام پر اسلام کے طور سے نظر کرو۔ واللہ! اگر ہم ویسے ہی مسلمان ہوئے جیسا اسلام چاہتا ہے تو ہمارے اقوال، افعال اور احوال ہی کفار کے لیے ہادی ہو جاتے اور اگر ہادی نہ بھی ہوتے تو کم از کم ان کی عداوت تو ہم سے کم ہو جاتی، ہمارے اسلاف کے تو یہ کارنامے تھے کہ غیر قومیں ان میں خود بخود جذب ہوتی تھیں اگر تم غیر قوموں کو اپنے اندر جذب نہیں کر سکتے تو کم از کم اپنے بھائیوں کو تو ان میں جذب ہونے اور گرنے سے تھام لو، بس اب تو وہ حالت ہے۔

اے آنکہ باقبال تو درعالم نیست ۔۔۔۔ گیرم کہ غمت نیست غم ماہم نیست

(اے شخص! دنیا میں تیرے اقبال کے مقابلہ میں کسی کا اقبال نہیں ہے، فرض کیا کہ تجھ کو فکر نہیں ہے، کیا ہماری فکر بھی نہیں ہے)

تبلیغ کی ضرورت

ہم نے مانا کہ تمہیں غیر قوموں سے خود اپنا اندیشہ نہیں مگر اپنے بھائیوں کا تو غم ہونا چاہیے کہ غیر قومیں ان کو تباہ کر رہی ہیں، اس معاملہ میں ایک بڑی کوتاہی یہ بھی معلوم ہوئی کہ برسوں سے حق بات اپنے بھائیوں تک پہنچائی ہی نہیں گئی چنانچہ سننے میں آیا ہے کہ جب مبلغین محل ارتداد میں پہنچے تو ان لوگوں نے یہ کہا کہ ہم نے دس بارہ برس میں آج عالم کی صورت دیکھی ہے اگرچہ ہم ساری دنیا کی اصلاح کے ذمہ دار نہیں مگر پھر بھی ہمیں چاہیے کہ جتنا ہم سے ہو سکے کوشش تو کریں کیونکہ اس کی ہم سے پوچھ ہو گی اور کامیابی یا ناکامی پر ہمیں توجہ نہ کرنا چاہیے کیونکہ ہم سے اس کی پوچھ نہیں ہو گی۔

جناب رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم بھی چاہتے تھے کہ دنیا میں ایک بھی کافر نہ رہے اور حق تعالیٰ نے آپ کو خاص طور پر اسی کام کے لیے بھیجا تھا۔

اِنَّا اَرْسَلْنٰکَ بِالْحَقِّ بَشِیْرًا وَّنَذِیْرًا۔ (اور ہم نے آپ کو حق کے ساتھ بشیر (بشارت دینے والا اور نذیر (ڈرنے والا) بنا کر بھیجا ہے)

مگر باوجود اس کے صاف فرمادیا گیا کہ آپ سے یہ سوال نہیں ہوگا کہ تمہارے زمانہ کے کچھ لوگ دوزخی کیوں ہوئے۔ ایک جگہ فرمایا گیا ہے کہ "لَعَلَّکَ بَاخِعٌ نَّفْسَکَ" شاید آپ (ان کفار کے پیچھے) اپنی جان کھپادیں گے اور ایک جگہ "لَا یَحْزُنْکَ الَّذِیْنَ یُسَارِعُوْنَ فِی الْکُفْرِ" حاصل یہ ہے کہ آپ ان کے ایمان نہ لانے پر غمگین نہ ہوں۔

اس سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ گو آپ کا یہ فرض منصبی نہ تھا کہ آپ اس قدر بلیغ کوشش فرماویں۔ مگر آپ اپنی طبعی رحمت وشفقت کے تقاضا سے یہ چاہتے تھے کہ ایک بھی دوزخی نہ رہے اور جب اس میں کامیابی نہیں ہوتی تھی تو آپ کو صدمہ ہوتا تھا کہ اس صدمہ کے دفع کرنے کے لیے یہ ارشاد ہوا ہے کہ آپ اس کی فکر نہ کریں نہ آپ اپنی جان کھپائیں۔

وَلَوْ شَآءَ رَبُّکَ لَاٰمَنَ مَنْ فِی الْاَرْضِ کُلُّهُمْ جَمِیْعًا

(اگر آپ کا رب چاہتا تو سب کو ہدایت ہوجاتی)

وَلَوْ شَآءَ رَبُّکَ لَاٰمَنَ مَنْ فِی الْاَرْضِ کُلُّهُمْ جَمِیْعًا

(کیا آپ لوگوں کو ایمان لانے پر مجبور کرسکتے ہیں؟) استفہام انکار کے لیے ہے۔ یعنی آپ کا کام کوشش کرنا ہے اور کوشش پر پھر خدا جسے توفیق دے گا ایمان لے آوے گا۔ آپ مجبور کیوں کرتے ہیں، کوئی شخص بغیر خدا کے حکم کے مومن نہیں ہوسکتا۔)

اس سے معلوم ہوا کہ کوشش کے معنی یہ نہیں کہ ثمرہ ضرور مرتب ہو۔ مثلاً مرتدین کو تبلیغ کریں تو وہ ارتداد سے بچ ہی جاویں بلکہ کوشش کے معنی یہ ہیں کہ جو کام تمہارے قبضہ میں ہے وہ کر ڈالو۔ ان کو سمجھاؤ بجھاؤ اسلام کے محاسن بتلاؤ۔ بس اس طرح کوشش کرو اگر خدانخواستہ پھر بھی ناکامی ہو تو رنج مت کرو۔ کیونکہ تم اپنے فرض سے سبکدوش ہوچکے، یہ بھی ایک مرض ہے نفس کا کہ اس کو اپنی بات کا رائیگاں جانا ناگوار ہوتا ہے اس وقت میں اسی کا علاج کررہا ہوں اور ان آیتوں کا حاصل بھی یہی ہے۔ خلاصہ یہ کہ کوشش کے اعتبار سے تین حالتیں ہیں۔ ایک تو یہ کہ کوشش ہی نہ کرے۔ ایک یہ کہ ایسی کوشش کرے کہ اگر ناکامی ہو تو گھل گھل کر جان دے دے۔

یہ دونوں درجے غیر محمود اور ناپسندیدہ ہیں اس میں دو راز ہیں۔ ایک یہ کہ دوسرے کے فعل پر قدرت نہیں اس پر رنجیدہ ہونے کے یہ معنی ہوئے کہ یہ ہمارے قبضہ کی بات تھی مگر نہیں ہوئی اور دوسرا امر ذرا باریک ہے وہ یہ کہ بتاؤ کہ دین کس کا ہے خدا کا! تو اس کی حفاظت خدا کا وعدہ ہے پھر

تمہارے رنج کا منشا یہ ہے کہ اگر ناکامی کی یہی رفتار رہی تو خدانخواستہ ایک دن اسلام مٹ جاوے گا اور وعدہ صحیح نہ رہے گا تو یہ منشاء ہی غلط ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ تم کو

"انا نحن نزلنا الذکر وانا له لحافظون."

(ہم نے ذکر یعنی قرآن کو نازل کیا اور ہم ہی اس کے محافظ ہیں)

پر اعتماد نہیں رہا۔ یادرکھو کہ یہ کبھی مٹ نہیں سکتا کیونکہ اسکے محافظ تو وہ خود ہیں جو تمہارے بھی محافظ ہیں۔

اب شاید یہ کہو گے کہ پھر ہمیں کوشش کرنے کو کیوں کہا گیا سو اس لیے کہا گیا تا کہ تم کو ثواب ہوا اور اجر ملے، تمہارا تعلق دین سے ظاہر ہو، محبت کے آثار نمایاں ہوں، یہ تو ان کی کمال عنایت و رحمت ہے کہ انہوں نے تمہارے ثواب کے لیے ایک بہانہ بتلا دیا ہے۔ باقی ثمرہ تو ان ہی کا تصرف ہے۔

کار زلف تست مشک افشانی اما عاشقاں　　مصلحت را تہمتے برآ ہوئے چیں بستہ اند

(مشک افشانی محبوب کے زلف کا فعل ہے لیکن عشاق نے مصلحت کی بناء پر چین کے ہرنوں کی طرف منسوب کردی ہے)

بس تمہاری نیک نامی کے واسطے بظاہر تمہارے متعلق یہ کام کر دیا ہے کہ تم ذرا سی کوشش کر کے مقبول ہو جاؤ گے ورنہ کام تو وہ خود کرتے ہیں، وہی محافظ ہیں اس لیے غم کبھی نہ کرنا چاہیے۔

ان دورازوں کے علاوہ تیسری خرابی اس کاوش میں یہ ہے کہ اس غم کی وجہ سے طبیعت سست ہو جاتی ہے اور اس کی رفتہ رفتہ کوشش سے معطل و بیکار ہو جاتا ہے تو منشاء تھا غم کا یعنی ناکافی، وہ اور اچھی طرح واقع ہوتی ہے اور شریعت کا مقتضا یہ ہے کہ مسلمان سست نہ ہونے پائیں۔ اس لیے زیادہ رنج مناسب نہیں اور گو رنج کے موقع پر رنج کو منع کرنے سے ظاہر میں شبہ ہوتا ہے کہ یہ تو شفقت کی کمی کی تعلیم معلوم ہوتی ہے مگر راز اس میں یہ ہے کہ جب ایسی چیزوں کا غم کرو گے جو تمہارے قبضہ میں نہیں ہیں تو خواہ مخواہ سست ہو جاؤ گے اور اس سے اصل کام میں خلل واقع ہوگا تو خلل کو گوارہ کرنا یہ ہے شفقت کی کمی اور کام کو جاری رکھنا تو عین شفقت ہے۔ غرض اعتدال کے ساتھ کام کیے جاؤ۔

طریق تبلیغ

اس کام کو اللہ تعالیٰ نے اس آیت میں اس طرح بیان فرمایا ہے۔ "اُدْعُ اِلٰی سَبِیْلِ رَبِّکَ بِالْحِکْمَةِ وَالْمَوْعِظَةِ الْحَسَنَةِ" سبحان اللہ! کام بھی بتلا دیا اور کام کرنے کا طریقہ

بھی بتا دیا کہ لوگوں کو خوبصورتی اور نرمی و لطافت سے اللہ کی سبیل کی طرف بلاؤ اور راست پر لاؤ۔ یہ ہے وہ کام جو بذریعہ وعظ کے یا مکاتب و مدارس کے ذریعے سے ہونا چاہیے۔ یعنی مبلغین ان ناواقف مسلمانوں کو اسلام کے محاسن اور احکام جا کر سنائیں اور رفتہ رفتہ کچھ مکاتب و مدارس وہاں پر قائم کر دیئے جائیں ان میں سے جو طریقہ زیادہ مفید معلوم ہو اسے اختیار کرنا چاہیے۔ بس یہ تو ہمارا کام ہے اسے پورا کرنے کے بعد نتیجہ خدا کے سپرد کر دو۔

ناکامی کے متعلق تو کہہ چکا، اب کامیابی کے متعلق بھی کہتا ہوں کہ اگر خوش قسمتی سے کامیاب ہو جاؤ تو نازمت کرو، جیسے ہم سے یہ غلطی بھی ہوتی ہے اور اس وقت ہماری حالت اس شعر کے مصداق ہوتی ہے۔

اگر غفلت سے باز آیا جفا کی — تلافی کی بھی ظالم نے تو کیا کی

یعنی ہماری جو حالت ہے وہ اعتدال سے باہر ہے نہ ناکامی کی حدود پر رہتے ہیں نہ کامیابی میں، پس سنئے کہ قرآن مجید میں مطلق کامیابی کی حالت کے متعلق دو ارشاد ہیں۔ "قُلْ بِفَضْلِ اللّٰهِ وَبِرَحْمَتِهٖ فَبِذٰلِكَ فَلْيَفْرَحُوْا" (کہہ دیجئے اللہ تعالیٰ کے فضل و رحمت سے خوش ہونا چاہیے) اس سے تو معلوم ہوتا ہے کہ خدا کے فضل پر خوش ہونا چاہیے۔

اور ایک جگہ یہ ارشاد ہے۔ "لَا تَفْرَحْ اِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ الْفَرِحِيْنَ" (بہت مت خوش ہو، خدا پسند نہیں کرتا، زیادہ خوش ہونیوالوں کو) اس سے معلوم ہوتا ہے کہ خوش نہ ہونا چاہیے، پس ان دونوں میں بظاہر تعارض معلوم ہوتا ہے مگر دراصل اس میں تعارض نہیں بلکہ یہ دو حالتیں جدا جدا ہیں جنکے متعلق تنبیہ کی گئی ہے۔

ایک خوشی اضطراری ہے جس کی صورت یہ ہے کہ مثلاً تمہاری ایک ہمیانی روپے اور اشرفیوں کی کھوئی جس سے آپ بہت پریشان ہیں۔ ڈھونڈتے ڈھونڈتے بہت دق ہو چکے ہیں کہیں پتہ نہیں چلتا کہ دفعتاً کسی نے ہاتھ میں لا کر دے دی۔ ایک خوشی تو اس وقت ہے یہ اضطراری اور بے اختیاری خوشی ہوگی۔

ایک صورت ہے کہ ہمیانی گم ہونے پر تم نے نوکروں کو خوب مارا پیٹا۔ اب خدا جانے وہ ان کو ملی یا نہیں مگر بے چاروں نے ڈر کے مارے لا کر دیدی۔ ایک خوشی اسی پر ہے یہ اختیاری خوشی ہے اور ان دونوں میں بڑا فرق ہے۔ پہلی خوشی جو آپ کو ہوگی وہ اترانے کی نہ ہوگی اور دوسری خوشی اترانے کی اور ناز و تکبر کی ہوگی کہ دیکھا ہم نے کیسی اچھی تدبیر کی ورنہ ہمیانی کیسے ملتی تو ان دونوں میں پہلی خوشی محمود

ہے اور دوسری مذموم، اسی طرح تبلیغ کی کامیابی پر اضطراری خوشی کا تو مضائقہ نہیں۔ باقی اپنی تدابیر اور مساعی کو سوچ سوچ کر خوش ہونا کہ ہم نے یوں کیا تو اچھا اثر ہوا۔ یہ مذموم ہے بہر حال ہم کو کوشش کرنی چاہیے اور نتیجہ خدا کے سپرد کرنا چاہیے اور ناکامی پر مغموم نہ ہونا چاہیے اور کامیابی پر اترانا نہیں چاہیے، کام شروع کر دو، اس کے سب راستے خود کھل جاویں گے۔ بقول مولانا رومی

گرچہ رخنہ نیست عالم را پدید　　　خیرہ یوسف وار می باید دوید

(اگرچہ عالم میں نکلنے کا کوئی راستہ نہیں ہے مگر یوسف علیہ السلام کی طرح دوڑنا یعنی کوشش تو کرنی چاہیے)

یعنی جب زلیخا نے یوسف علیہ السلام کو قصر مسبع میں بند کیا تھا تو اس وقت وہ زلیخا کے پاس سے بھاگے تھے حالانکہ محل کے سات دروازے تھے اور ساتوں دروازوں میں زلیخا نے قفل ڈلوا دیئے تھے اور یہ بھی آپ کو معلوم تھا مگر چونکہ نبی تھے اس لیے آپ نے یہ سمجھا کہ گو دروازے مقفل ہیں مگر جتنا میرا کام ہے وہ تو میں کروں، کم سے کم دروازے تک تو بھاگوں۔ چنانچہ بھاگے اب جس دروازے کے پاس پہنچتے تھے قفل خود بخود ٹوٹ کر گر پڑتا تھا۔ اسی طرح ساتوں دروازے کھل گئے اور یہ بچ گئے۔ مولانا اسی کو یاد دلاتے ہیں۔

گرچہ رخنہ نیست عالم را پدید　　　خیرہ یوسف وار می باید دوید

(اگرچہ عالم میں نکلنے کی کوئی راہ نہیں ہے مگر یوسف علیہ السلام کی طرح کوشش تو کرنی چاہیے)

تو بس تم بھی دوڑو اور یوں سمجھو کہ نتیجہ خدا کے ہاتھ میں ہے۔ اسی کے فضل سے سب کچھ ہو گا۔ پھر اگر کوشش کی اور تمہاری کوشش سے لوگ ارتداد سے بچ گئے تو نازمت کرنا بلکہ شکر کرنا۔

غرض یہ دونوں درجے مطلوب نہیں یعنی ایک یہ کہ کوشش ہی نہ کرے۔ دوسرا یہ کہ کوشش پر کامیابی کو لازماً مرتب سمجھے۔ جیسے سودا نے خطاب کرتے ہوئے کہا ہے کہ خود بھی کام نہیں کرتے اور کام کرنے والوں کو یہ الزام دیتے ہیں کہ میاں تم نے کیسا کام کیا جو نتیجہ مفید نہ نکلا۔

سودا قمار عشق میں شیریں سے کوہ کن　　　بازی اگرچہ پا نہ سکا سر تو کھو سکا
کس منہ سے اپنے آپ کو کہتا ہے عشق باز　　　اے روسیاہ تجھ سے تو یہ بھی نہ ہو سکا

قدرت و استطاعت

مگر اس کوشش کے لیے ایک شرط بھی ہے یعنی استطاعت اور یہ سب کچھ انہی کاموں کے لیے

بیانِ کر رہا ہوں جو اسباب ظاہرہ کی رو سے اپنی قدرت میں ہوں۔ یہ سب کوشش اور کوشش پر اجر اور دوسرے کام ایسے ہی کاموں کے لیے ہیں اور ایک وہ کام ہیں جو اسباب ظاہرہ کی رو سے اپنی قدرت واستطاعت سے باہر ہیں ان کے لیے کوشش کرنا فضول ہے، نہ مامور بہ اور نہ ایسی کوشش پر کچھ اجر۔

مثلاً کوئی شخص سورج کو قبضہ میں کرنے کے لیے آسمان کی طرف کودا کرے اور یہ سمجھے کہ اگر کبھی گر کے مروں گا تو شہید مروں گا تو یہ محض خبط ہے کیونکہ یہ فعل اس کی قدرت واستطاعت سے باہر ہے اس لیے اس سے بجائے اجر کے باز پرس ہوگی۔

حدیث شریف میں ہے کہ "**لاینبغی للمؤمن ان یذل نفسه**" (یعنی مومن کو مناسب نہیں کہ اپنے نفس کو ذلیل کرے) صحابہؓ نے پوچھا یا رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) مومن اپنے آپ کو کس طرح ذلیل کرتا ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "**یتحمل من البلاء مالا یطیقه**" (ایسی بلا اپنے ذمے لے جس کے تحمل کی طاقت نہیں ہے)

اب میں پوچھتا ہوں کہ جہاں جہاں خطرہ ارتداد رونما ہے کوشش سے پہلے یہ دیکھے کہ وہاں جانا اور تبلیغ کرنا حساً وقانوناً آپ کی قدرت میں ہے یا نہیں۔ اسی طرح یہ بھی دیکھو کہ اس میں چندہ دینا حساً یا قانوناً کوئی جرم تو نہیں۔ جب ان باتوں کا اطمینان ہو جاوے تو یہ متعارف تدبیر اختیار کرنی چاہئیں اور اس کے بعد نتیجہ سے کچھ بحث نہ کرنا چاہیے کیونکہ وہ دوسرے کا فعل ہے اور قادر بقدرت غیر قادر نہیں ہوتا۔ ایسی غیر مقدور چیز کے پیچھے پڑنا محض غلو ہے جس کی اسلام کو حاجت نہیں۔ اب دو چار ہزار کے ارتداد کی خبر ہے میں کہتا ہوں کہ اگر پندرہ بیس لاکھ بھی خدانخواستہ مرتد ہو جاویں تو اسلام میں کچھ کمی نہیں آسکتی ہے۔

چراغے را کہ ایزد برفروزد   ہر آنکہ تف زند ریشش بسوزد

(جو چراغ اللہ تعالیٰ روشن کریں جو شخص اس کو پھونک سے بجھائے اس کی داڑھی جلے)

اگر کوئی کوشش کے متعلق یہ کہے کہ جب اللہ تعالیٰ ہی دین کی حفاظت کریں گے تو ہمیں کوشش کرنے کی کیا ضرورت......؟ ہاں تو پھر قرآن بھی حفظ مت کیا کرو کیونکہ انہوں نے اس کی حفاظت کا تو خاص طور پر وعدہ کیا ہے۔ اللہ تعالیٰ کی حفاظت کا مطلب یہی تو ہے کہ ہمیں حفظ کرنے کا حکم دیا ہے تو ہمیں اس پر عمل کرنا چاہیے۔ پس یہ سب حفاظت میں داخل ہے۔

اس حفظ کرنے پر ایک لطیفہ یاد آیا۔ بعض فرقوں میں حفظ قرآن کی توفیق نہیں ہوتی، ان میں سے کان پور میں ایک شخص کا یہ مقولہ سنا تھا کہ ہم اس واسطے قرآن حفظ نہیں کرتے تا کہ ہم اور

اللہ تعالیٰ برابر نہ ہو جائیں۔ میں نے کہا کہ وہ تمہارا ہی خدا ہوگا جس کے برابر ہر حافظ ہو سکے۔ ہمارے خدا کے برابر تو کوئی نہیں ہو سکتا چاہے کوئی کتنا ہی کمال حاصل کر لے پھر اگر اس خیال سے حفظ قرآن ترک کیا گیا ہے تو علم کو بھی ترک کیا ہوتا تا کہ مساوات لازم نہ آئے۔ مہمل اور لغو باتیں...... اس کے تو یہ معنی ہوئے کہ (نعوذ باللہ) اللہ تعالیٰ ہمارے بڑا بنانے سے بڑے بنے ہوئے ہیں بلکہ حق تعالیٰ کی اس صفت پر نظر کر کے تو اس سے زیادہ حفظ کا اہتمام کرنا چاہیے تا کہ تخلق باخلاق الٰہیہ (اللہ تعالیٰ جیسی عادتیں اختیار کرنا) نصیب ہو۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے اپنی تقلید و اتباع کا بعض افعال میں حکم بھی دیا ہے۔ فرماتے ہیں:

"اِنَّ اللّٰهَ وَمَلٰٓئِكَتَهٗ يُصَلُّوْنَ عَلَى النَّبِيِّ. يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا صَلُّوْا عَلَيْهِ وَسَلِّمُوْا تَسْلِيْمًا"
(یعنی اللہ اور اس کے فرشتے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر درود بھیجتے ہیں، پس اے مومنو! تم بھی درود بھیجو)

اب یہاں کہو کیا کہتے ہو کیا تم یہ کہہ سکتے ہو کہ جب اللہ تعالیٰ دُرود بھیجتے ہیں تو ہم کیوں بھیجیں۔ اس میں تو برابری ہوگی بلکہ یہی کہو گے کہ اب تو ہمیں اور زیادہ صلوٰۃ وسلام کا ورد کرنا چاہیے۔ جب اللہ تعالیٰ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اتنی عظمت فرماتے ہیں تو ہم کس شمار میں ہیں۔

اس پر مجھے وطن کا اپنے بچپن کا ایک قصہ یاد آیا۔ ہمارے والد باوجود ثروت و دولت کے منکسر المزاج بہت تھے۔ ایک مرتبہ برسات میں کھرپا لے کر خود ہی چھت پر گھاس کو چھیلنے کو جانے لگے، اور مجھ سے فرمایا تم بھی چلو، تائی صاحبہ نے فرمایا، جوان بیٹے سے ایسا کام نہیں لیا کرتے۔ انہوں نے مان لیا اور تنہا خود چھت پر چڑھ گئے۔ اس وقت تائی صاحبہ نے کہا کہ جب تمہارے باپ گھاس چھیلنے گئے ہیں تو اب تمہیں بھی جانا چاہیے۔

تو اسی طرح یہاں سمجھو کہ محافظت اسلام کا کام جب اللہ تعالیٰ خود کرتے ہیں تو بندہ کو ضرور کرنا چاہیے اور اگر اس شخص کی بے ہودہ بات مان لی جائے تو لازم آوے گا کہ کوئی اچھی بات نہ کریں کیونکہ وہ تو اللہ تعالیٰ بھی کرتے ہیں بس سب برائیاں ہی برائیں کرنا چاہیں کیونکہ وہ اللہ تعالیٰ نہیں کرتے۔ (نعوذ باللہ) خدا کی پناہ ہے ایسی جہالت سے بس یہ تو بندہ کو سمجھنا چاہیے کہ جب ہمارا کام وہ خود بھی کرتے ہیں تو ہم خود کیوں نہ کریں مگر یہ نہ سمجھنا چاہیے کہ ہم نہ کریں گے تو یہ کام اٹکا پڑا رہے گا، ہرگز نہیں وہ فرماتے ہیں:

"وَاِنْ تَتَوَلَّوْا یَسْتَبْدِلْ قَوْمًا غَیْرَکُمْ ثُمَّ لَا یَکُوْنُوْا اَمْثَالَکُمْ."
(یعنی اگر تم اسلام کی حفاظت وخدمت نہ کروگے تو وہ تمہاری جگہ ایک دوسری قوم کو قائم کر دیں گے جو تمہاری سی (نافرمان) نہ ہوگی) (نعوذ باللہ) حق تعالیٰ کسی کے محتاج نہیں۔

ہماری کوتاہیاں

باقی اس عالم امتحان میں اس کی عادت یہ ہے کہ وہ ہمارے کام کسی ظاہری واسطہ سے کیا کرتے ہیں اور یہ ہماری سعادت ہے کہ ہم ان کے کاموں کا واسطہ بنیں۔

بہرحال اس وقت یہ قصے اسلام کے مٹانے کے دوسری قوموں کی طرف سے پیش آرہے ہیں جس کی سب مسلمانوں کو مجتمع ہو کر مدافعت کی کوشش کرنا چاہیے۔ یہاں کان پور میں چند باحمیت مسلمانوں نے اس کام کا ارادہ کیا ہے مگر اس کے لیے سامان وسرمایہ کی ضرورت ہے تاکہ مبلغین اس سرمایہ سے وہاں جاویں اور اسلام سے اعدائے دین کی تہمتوں کو ہٹادیں اور چونکہ اس قسم کے کام میں عادۃ اللہ یہ ہے کہ اکثر غرباء ہی کے ہاتھوں کی برکت سے انجام پاتے ہیں اس لیے ضروری ہے کہ اگر چندہ کیا جاوے تو اس میں ان کو بھی شریک کریں۔ نیز جو لوگ خود جاکر تبلیغ نہیں کرسکتے وہ اپنے پیسے ہی کو اپنا قائم مقام کردیں اور اس سے قلیل وکثیر سے مت شرماؤ۔ اللہ تعالیٰ کے یہاں اس کی دیکھ بھال نہیں ہے کہ کس کے روپے زیادہ ہیں۔ وہاں تو نیت اور خلوص کی دیکھ بھال ہے ممکن ہے کہ تمہارے خلوص کی بدولت ایسی کامیابی ہو جاوے کہ آئندہ اس کوشش ہی کی ضرورت نہ رہے مگر میرے نزدیک یہ کام اتنا ضروری ہے کہ بطور حفظ ماتقدم کے اسے ہمیشہ جاری رکھنا چاہیے کیونکہ مسلمانوں میں بعض جگہ اس قدر جہالت بڑھی ہوئی ہے کہ مردے تک بلا نماز جنازہ کے دفن کردیتے ہیں حالانکہ وہ ایسے نام کے مسلمان نہیں ہوتے جیسے یہ لوگ ہیں جن میں ارتداد کا اندیشہ ہے تاہم احکام کی تبلیغ اور تعلیم نہ ہونے سے انہیں بھی کچھ خبر نہیں۔

مجھے نام کے مسلمانوں پر یہیں نواح کان پور میں موضع گھنیر کا ایک واقعہ یاد آیا، میں نے وہاں جا کر خود دیکھا کہ وہ برائے نام ہی مسلمان ہیں۔ میں نے ان سے پوچھا کہ میاں تم کون لوگ ہو، مسلمان ہو؟ کہنے لگے ہم کیوں ہوتے مسلمان میں نے کہا، اچھا تو ہندو ہو؟ کہنے لگے ہم کیوں ہوتے ہندو۔

از مذہب من گبر و مسلماں گلہ دارند

(میرے مذہب سے گبرو مسلمان گلہ رکھتے ہیں) میں نے کہا آخر پھر کیا ہو کہنے لگے، ہم نو مسلم ہیں، گویا ان کے خیال میں نومسلم ہندو اور مسلمان کے درمیان میں تیسری قسم ہے۔

ایک مرتبہ ہم لوگ وہاں کے زمیندار سے ملے اور انہیں شربت دیا گیا تو نہیں پیا کہ مسلمان کے ہاتھ کا شربت پینے میں ہم اپنی برادری میں بدنام ہو جاویں گے۔

ایک مرتبہ ایک مبلغ کو وہاں ایک گاؤں میں بھیجا چونکہ ان لوگوں سے روٹی دینے تک کی امید نہ تھی اس لیے ان مبلغ سے کہا گیا کہ بھئی ستو باندھ کرلے جاؤ تو ان لوگوں نے ستو گھولنے کے لیے اپنے برتن تک نہ دیئے۔ ان بے چاروں نے رومال پر ستو رکھ کر اس پر پانی چھڑک کرتب کھایا۔

دراصل یہ ہماری کوتاہی ہی ہے کہ ہم لوگوں کو نومسلموں کی تعلیم کا اہتمام ہی نہیں ہے، شہروں میں مدرسے بھی ہیں، یتیم خانے بھی ہیں، سب کچھ ہے مگر کوئی نومسلم خانہ نہیں ہے۔ اگر کبھی کسی کو مسلمان بھی کیا تو بڑی بڑائی یہ کہا سے ایک پرچہ لکھ کر دے دیا کہ بھئی مانگ اور کھا، اگر ایسا ہوتا کہ کم از کم چھ مہینے تو اس کو اپنے پاس رکھتے اور ضروری عقائد اور ضروری اعمال نماز، روزہ وغیرہ سکھاتے تو کیسا اچھا ہوتا مگر اس کا ذرا بھی اہتمام نہیں۔ اب تو مسلمان بنا کر سانڈ کی طرح چھوڑ دیتے ہیں۔ اسی طرح کے یہ لوگ بھی معلوم ہوتے ہیں کہ ان کو بھی کسی نے یوں ہی مسلمان بنا کر چھوڑ دیا ہے۔ ان کو کبھی تعلیم و تلقین نہیں کی گئی اور نہ اس کے بعد پھر کوئی ان کا پرسان حال ہوا نہ کوئی واعظ ان کے پاس گیا کیونکہ ہم لوگ جہاں پلاؤ قورمہ کی امید ہوتی ہے وہاں تو خوب دوڑ کر جاتے ہیں اور ایسی جگہ جہاں ستو گھول کر کھانا پڑ جانے کی ہماری ہمت نہیں ہوتی۔

بہر حال انتظام کے ساتھ ایک جماعت قائم کر کے وہاں ہم کو جانا چاہیے اور کام کرنا چاہیے۔ اگر یہ طریقہ تبلیغ و اشاعت کا ہندوستان میں جاری ہو جاوے تو پھر اسے امریکہ و یورپ تک وسعت دینی چاہیے اور وہاں بھی اپنے مبلغین بھیجنے چاہئیں مگر پہلے ہی دن اونچے نہ اڑو، اول ہندوستان کی تو خبر لو، بہر حال یہ بہت ضروری کام ہے۔

اب اس میں چند کوتاہیاں اور بھی ہوتی ہیں ان کا مختصر بیان کیا جاتا ہے ایک یہ کہ بسا اوقات جو مبلغ ہوتے ہیں خود ان کی حالت درست نہیں ہوتی اور اس سے بھی بڑے نقصان کا اندیشہ ہوتا ہے کیونکہ جب استاد ہی ناقص ہوگا تو شاگرد تو اور بھی انقص ہوگا تو سب سے پہلے مبلغ کو اپنے عمل کی اصلاح ضروری ہے تا کہ ان پر اچھا اثر پڑے۔

یہ خطاء تو اہل علم کی تھی اب ایک خطاء اور کوتاہی عوام کی ہے وہ یہ کہ ان کا کام سرمایہ جمع کرنا تھا پھر مولوی اس سرمایہ سے سفر کرتے اور پھر چونکہ ان کے ساتھ اپنی ضروریات بھی تھیں۔ مثلاً وہاں تبلیغ کے لیے جائیں تو اپنے پیٹ کو کہاں رکھ کر آویں، بیوی بچوں کو کیا کریں، اس لیے ضرورت تھی سرمایہ سے ان کی مدد کی جاتی تاکہ یہ بے فکری سے کام کر سکیں مگر عوام کو اس کا احساس ہی نہیں۔

ایک صاحب مجھ سے ملے اور کہنے لگے ارے صاحب یہ ساری خطاء مولویوں کی ہے کہ انہوں نے ان لوگوں کی کبھی خبر نہ لی۔ میں نے کہا پہلے تو تمہاری خطاء ہے کہ تم نے سرمایہ جمع کر کے ان کو نہیں دیا۔ آخر مولوی کام کریں تو بے چارے کہاں سے کریں، اس میں سرمایہ ہی تو بلی کی میاؤں ہے لیکن عوام کے ساتھ اس میں تھوڑا سا قصور مبلغین کا بھی ہے وہ یہ کہ جہاں سرمایہ کا انتظام بھی ہوا ہے وہاں بے دریغ روپیہ اڑا دیتے ہیں۔ مثلاً خود اپنے پیسے سے چاہے تھرڈ میں بھی سفر نہ کریں گے مگر چندہ کا پیسہ ایسا مفت کا ہے کہ اب سیکنڈ سے کم میں نہیں بیٹھ سکتے۔

بہر حال ان سب کوتاہیوں سے احتیاط کر کے سرمایہ ضروری جمع کرنا چاہیے۔ سرمایہ ہی اصلی چیز ہے، بدوں اس کے نری تجویز ایسی بے کار ہے جیسے ایک دفعہ بہت سے چوہے جمع ہوئے۔ انہوں نے سوچنا شروع کیا کہ کوئی تدبیر ایسی ہو سکتی ہے کہ بلی کو پکڑ لیں کیونکہ یہ ہم کو بہت جانی نقصان پہنچاتی ہے۔ چنانچہ مشورہ ہونے لگا، انہوں نے کہا کہ سب مل کر ایک ایک عضو کو پکڑ لیں، ایک نے کہا کہ میں ہاتھ پکڑ لوں گا، ایک بولا میں ٹانگ پکڑ لوں گا، کسی نے گردن پکڑنے کو کہا، وعلیٰ ہذا وہاں ایک بڈھا چوہا بھی تھا وہ کچھ نہیں بولا، جب اس سے پوچھا گیا کہ تم کیوں نہیں بولتے اس نے کہا کہ میں یہ سوچ رہا ہوں کہ سب کچھ تو تم پکڑ لوگے مگر اس کی میاؤں کو کون پکڑے گا، جس وقت وہ میاؤں کرے گی تم سب بھاگ جاؤ گے، چنانچہ ایسا ہی ہوا۔

ایک اور قصہ ہے کہ ایک قصائی مر گیا تھا۔ اس کی بیوی برادری کے سامنے اپنے خاوند کو یاد کر کے رونے لگی کہ ہائے اب اس کی دکان کون چلائے گا تو ایک صاحب بولے میں چلاؤں گا میں، ہائے اس کے کپڑوں کو کون پہنے گا، وہی بولا میں پہنوں گا میں، کہا اس کی چھریاں کون لے گا، وہ بولا میں لوں گا میں، اس نے کہا ہائے اس کا قرضہ کون ادا کرے گا تو کہنے لگا بولو بھئی! اب کس کی باری ہے، کیا سب کام میں اکیلا ہی کروں۔

نیز مثال ہے کہ دو رفیق سفر میں ہمراہ ہوئے، کہیں منزل پر ٹھہرے تو ایک رفیق نے کہا کہ

بھی کنویں سے پانی میں بھروں، لکڑی تم جنگل سے لے آؤ، اس نے کہا کہ بھائی مجھ سے کچھ نہ ہو گا۔ خیر اس نے خود ہی دونوں کام کر لیے، اب کہا مسالہ تم پیس لو کھانا میں پکا لوں گا، کہنے لگا یہ بھی مجھ سے نہ ہو گا، اس نے یہ بھی کر لیا، اب جب کھانا پک گیا تو اس نے کہا اچھا آؤ کھا تو لو، کہنے لگے اب ہر بات میں تمہاری کہاں تک مخالفت کروں، لاؤ کھا تو لوں۔

تو ایسے ہی جنٹلمین بھی چاہتے ہیں کہ سب کام تو مولوی کر لائیں اور یہ خالی حکومت کرنے کو بیٹھے رہیں۔ دیکھو سارا کام سرمایہ کا ہے اور سرمایہ جمع کرنا مولویوں کا کام نہیں بلکہ اس شخص کا کام ہے جو پچاس روپے اپنے پاس سے دے، تب پانچ روپے چندے کی تحریک دوسروں سے کریں، غرض مولویوں کا کام سرمایہ جمع کرنا نہیں، مولویوں کا کام وعظ کہنا ہے اور روسا کا کام ہے چندہ جمع کرنا۔ پھر دونوں مل کر کام میں لگیں، کام تو اسی طرح ہوتا ہے، باقی باتیں بنانا سب کو آتی ہیں۔

سب سے پہلے بڑے لوگوں کو سرمایہ جمع کرنے کے لیے اٹھنا چاہیے لیکن ان کے چندہ جمع کرنے میں ایک مصیبت ہے وہ یہ کہ چندہ جمع کرنے کون کھڑا ہو۔ منصب صاحب، جج صاحب، ڈپٹی کلکٹر صاحب، تحصیلدار صاحب، تھانے دار صاحب تو لوگ انہیں مارے ڈر کے چندہ دیں گے کہ کہیں یہ عدالت میں کسر نہ نکالیں، مقدمہ نہ خراب کر دیں، کبھی یہ ہوتا ہے کہ جتنا آزادی میں خوشی سے دیتے ہیں ان کے دباؤ سے بہت زیادہ دیں گے۔ یاد رکھو! اس طرح سے چندہ لینا بالکل حرام ہے، مناسب یہ ہے کہ روسا میں جو اہل حکومت ہیں وہ چندہ نہ کریں بلکہ ذی وجاہت لوگ جن کا حکومت میں بالکل دخل نہیں ہے، چندہ کریں ہاں اگر ایسا ہو کہ کوئی شخص ان اہل حکومت سے ایسا بے تکلف ہو کر صاف انکار بھی کر سکے تو ایسے لوگوں کا چندہ اہل حکومت بھی لے لیں تو کوئی مضائقہ نہیں۔

ایک کوتاہی بعض مبلغین کی (جیسا اوپر مذکور ہوا اور اب مکرر ایک اور مضمون کی تمہید کے لیے بیان کرتا ہوں) یہ ہے کہ وہ چندہ میں اسراف بہت کرتے ہیں۔ سیکنڈ کلاس میں سفر کرتے ہیں اور جو کام خط سے نکل سکتا ہے اس کے لئے تار پر تار جا رہے ہیں، اسٹیشن پر برف لیمنیڈ پی رہے ہیں، چائے بسکٹ بھی اڑ رہا ہے، چاہے اپنے پاس سے ایک دفعہ بھی ایسے کاموں میں پیسہ خرچ نہ کرتے مگر چندہ کا پیسہ ایسی بیدردی سے تباہ کرتے ہیں۔ واللہ! مولویوں کی نسبت ایسے واقعات سن کر بہت رنج ہوتا ہے کہ یا اللہ ان پر علم کا کیسا اُلٹا اثر ہوا، علماء کو اس سے بہت ہی احتراز کرنا چاہیے۔ یہ طریقے تو لیڈروں کے ہی واسطے چھوڑ دینے چاہئیں۔

اب اس پر ایک تفریع کرتا ہوں کہ جب یہ معلوم ہو گیا کہ بعض لوگ ایسے بھی ہیں جو چندہ کے روپے کا درد نہیں رکھتے تو اب مسلمانوں کو دو کام اور بھی کرنا چاہئیں۔ ایک تو یہ کہ چندہ ایسے شخص کے پاس جمع کرنا چاہیے جس پر خیانت کا احتمال نہ ہو۔ دوسرے یہ کہ چندہ کا صرف ایسے شخص کے مشورہ سے ہونا چاہیے جو متقی اور عالم ہو۔ مسائل فقہیہ شرعیہ کا ماہر ہو اور وہ ایسا ہو کہ سب اسی کے تابع ہوں۔

یہ بات اصول شرع و اسلام سے ہے کہ کام دراصل ایک ہی شخص کی رائے سے ہوتا ہے اور اپنی اعانت کے لیے وہ دوسروں کی رائے بھی لے لیتا ہے۔ اس مشورہ سے یہ فائدہ ہوتا ہے کہ معاملہ کے سب پہلو اسے مستحضر ہو جاتے ہیں جب سب پہلو نظر میں آ جاویں تو اس کا کام یہ ہے کہ ان میں سے جو پہلو خود انتخاب کرے اسی کا حکم دے دے یہی طریقہ مشروع و معقول ہے۔

مگر اب یہ حالت ہو رہی ہے کہ اگر کسی کام کے لیے انتخاب کریں گے تو اسے جو مالدار ہو اور اس کے ذریعے سے خوب ہو سکتا ہو، ایسے شخص کو چندہ جمع کرنے کے کام پر مقرر کرنا تو مضائقہ نہیں مگر سارے کام اسی کے سپرد کر دینا خواہ وہ نرا جاہل ہو، حماقت اور بیوقوفی ہے۔ انتخاب اس شخص کا کرنا چاہیے جو طامع نہ ہو، کسی سے ڈرتا نہ ہو، عالم ہو متقی ہو۔

چنانچہ میں نے اس جماعت کے یہاں کام کرنے کے لیے آمادہ ہوئی ہے۔ یہی رائے دی ہے۔ اب ان میں آپس میں میرا یہ مشورہ پیش ہو گا پھر جیسے طے ہو عمل کیا جاویگا لیکن جب تک کوئی مستقل تحویلدار منتخب نہ ہو کام تو نہ بند رکھنا چاہیے۔ اس کے متعلق میں نے یہ رائے پیش کی ہے کہ اس وقت تک کے لیے ڈاکٹر عبدالصمد صاحب کو تحویلدار مقرر کر دیا جاوے۔ چنانچہ انہوں نے چندہ جمع کرنے کا اہتمام شروع کر دیا ہے۔ میں نے ان سے یہ بھی کہہ دیا ہے کہ رسیدیں بھی چھپوا لی جاویں اور جب تک رسیدیں چھپ کر تیار ہوں، محصل چندہ سادہ کاغذ پر یادداشت لکھ کر اہل عطا کو دے دیا کریں اور کہہ دے کہ فلاں تاریخ تک باقاعدہ چھپی ہوئی رسیدیں آ جائیں گی۔ اس وقت آ کر اسے بدل لے جانا، یہ سب تو میری تنہا رائے ہے۔ اب یہاں کارکنوں کی جو مرضی ہو وہ کریں پھر اس کے بعد جو کام جتنا جس سے ہو سکے وہ اس کام میں شرکت کرے۔ اگر کسی کے پاس علم اور روپیہ بھی نہیں ہے تو زبان تو ہے اسی سے کام لو۔ یعنی لوگوں کو اس کام کی رغبت دلاؤ۔

لا خیل عندک تهدیها ولا مال　　　فلیسعد النطق ان لم یسعد الحال

(گھوڑے اور مال تو تمہارے پاس نہیں ہیں کہ انکو ہدیہ میں پیش کیا جا سکے تو زبان ہی سے خدمت کرو)

غرض پہلے تو جان سے خدمت کرو، یعنی وہاں جا کر تبلیغ کرو، اگر یہ نہ کر سکو تو روپیہ پیسہ کو اپنا قائم مقام بنا کر مال سے خدمت کرو۔ اگر اس کی بھی وسعت نہ ہو تو زبان سے خدمت کرو، وہ یہ کہ اپنے اہل وسعت دوستوں اور عزیزوں سے کہو، اگر ان سے بھی کہنے کی ہمت نہ ہو تو پھر اللہ تعالیٰ سے کہو یعنی دعا کرو کہ اے اللہ! مسلمانوں پر فضل فرمایئے اور اسلام کی نصرت فرمایئے، حق کو حق اور باطل کو باطل ظاہر کر دیجئے۔

اگر چہ میں نے یہ کام بتایا سب مضامین سے آخر میں ہے، مگر ہے یہ سب سے بڑا اور یہ نہ سمجھنا کہ جب یہ سب سے بڑا ہے تو پھر اس کے ہوتے ہوئے اور سب کام چھوڑ دیئے جائیں۔ جیسے بعض جوشیلے لوگ ایک ہی طرف چل دیتے ہیں۔ سو میں کہتا ہوں کہ اگر یہی بات ہے تو ایک جاہل شاہ صاحب کی بات بھی ماننا پڑے گی جو نماز نہ پڑھتے تھے اور دلیل میں یہ آیت پیش کرتے تھے ”ولذکر اللہ اکبر“ (اور البتہ اللہ کا ذکر بہت بڑا ہے) تو بس کہنے لگے کہ اب ہم اللہ اللہ ہی کیا کریں گے، نہ نماز کی ضرورت رہی نہ روزہ کی۔ میں نے کہا کہ کسی کام کے بڑا ہونے کے یہ معنی نہیں ہیں کہ اور چھوٹے کاموں سے پہلو تہی کر لو۔

دیکھو تمہارے تین بیٹوں میں سے ایک اگر زیادہ کام کا ہے تو کیا دو کا گلا گھونٹ دو گے، ہرگز نہیں۔ پس ولذکر اللہ اکبر کے معنی یہ ہیں کہ اس سے قرآن نماز کی فضیلت ثابت کی گئی ہے ”لانہ ذکر اللہ“ اس لیے کہ وہ اللہ کا ذکر ہے) اس لیے کہ یہ بھی ذکر اللہ ہیں۔ ولذکر اللہ اکبر (اور اللہ کا ذکر سب سے بڑا ہے) تو نماز سب سے بڑی چیز ہوئی۔ بس اب آگے شاہ صاحب کے چلنے کی جگہ ہی نہیں رہی کیونکہ اب تو اس کی تفسیر میں دو احتمال ہو گئے۔ ایک یہ کہ ذکر اللہ سے مراد نماز ہی ہو جیسا اوپر ذکر ہوا۔ دوسرے یہ کہ محض ذکر متعارف یعنی اللہ اللہ کرنا مراد ہو۔ اب ذکر اللہ سے مراد جزماً صرف اللہ اللہ ہی کرنا نہیں رہا بلکہ اس میں نماز کا احتمال بھی پیدا ہو گیا اور دوسرے دلائل سے صرف احتمال ہی نہیں رہا بلکہ واقع میں بھی ایسا ہی ہے۔

دعا اور تدبیر

اس طرح دعا کے متعلق بعضوں کو ایسی ہی غلطی ہو رہی ہے سو اس کو بھی سمجھو۔ اس کے بڑا ہونے کے معنی بھی یہی ہیں کہ اور تدابیر سے مانع نہیں ہے کیونکہ دعا میں وہ تدابیر بھی داخل ہیں۔ ایک دعائے قولی ہے ایک دعائے فعلی ہے اور اگر واقع میں یہی معنی ہیں جو تم سمجھتے ہو تو پھر نکاح بھی نہ کرو

اور کہہ دو ہم کو شاہ صاحب کی دعا پر اعتماد ہے، اولاد کی تو ہم کو بڑی تمنا ہے مگر نکاح نہیں کریں گے۔ بس یوں ہی کسی طرح دعا سے اولاد ہو جاوے گی کیونکہ اگر نکاح سے اولاد ہوئی تو پھر خدا کی قدرت ہی کیا ہوئی۔ صاحب اپنی دعا کے بھروسہ سے کبھی تم نے ایسا بھی کیا ہے کہ جتنی تدبیریں ہو سکیں سب کرو اور پھر دعا بھی کرو اور محض تدبیر پر بھروسہ نہ کرو، بھروسہ دعا ہی پر کرو اس کی نظیر میں مولانا فرماتے ہیں:

گفت پیغمبر باآوازے بلند   بر توکل زانوائے اشتر بہ بند
گر توکل می کنی در کار کن   کسب کن پس تکیہ بر جبار کن

(پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک شخص کو (جو اونٹ پر سوار ہو کر آیا تھا اور دروازہ مسجد پر اس کو بٹھایا تھا) باآواز بلند فرمایا (صرف توکل مت کرو) بلکہ توکل کے ساتھ اونٹ کا زانو بھی رسی سے باندھ دو۔ پس اگر توکل کرو تو کام کے اندر توکل کرو پھر (اسباب کے اندر اثر بخشنے میں اور ان پر مسبب ہونے پر) اللہ تعالیٰ پر اعتماد کرو)

یہ مضمون مذکور حدیث شریف کا ہے کہ ایک اعرابی نے پوچھا جناب رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم سے کہ اونٹ باندھ کر توکل کروں یا خدا کے بھروسہ پر کھلا رہنے دوں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اعقل ثم توکل" (موارد الظمآن للہیثمی: ۲۵۴۹، حلیۃ الاولیاء ۸: ۳۹۰) (کہ باندھ پھر خدا پر بھروسہ کر) تو یہ ہے توکل اب اس میں رسی پر نظر کرنا الحاد اور بددینی ہے اور محض خدا کے بھروسہ پر اسباب کا قطع کرنا حماقت و جہل ہے اور دونوں کا جمع کرنا عقل اور توکل ہے۔ یہ حقیقت توکل کی ہے۔

اب خلاصہ وعظ کا ذکر کر کے ختم کرتا ہوں۔ وہ خلاصہ یہ ہے کہ حق تعالیٰ نے جہاں دنیا کی مذمت اور آخرت کی فضیلت بیان فرمائی ہے اس کا مقصود یہ ہے کہ اپنی آخرت کی فکر کرو اور آخرت کی فکر یہ ہے کہ اپنے اور اپنے اہل و عیال کی اور اپنے بھائیوں کی سب کی اصلاح کرو۔ اب میں ختم کرتا ہوں، حق تعالیٰ سے دعا فرمایئے کہ وہ ہمیں فہم و عقل کی توفیق عطا فرمائیں۔ (آمین ثم آمین)

وصلی اللہ تعالیٰ وسلم علی سیدنا و مولانا محمد وعلی الہ واصحابہ اجمعین واخر دعوانا ان الحمد للہ رب العالمین۔

العُشر

وجوب عشر کے متعلق یہ وعظ ۲۰ رجب ۱۳۳۱ھ کو جامع مسجد تھانہ بھون میں ہوا جو اڑھائی گھنٹہ میں ختم ہوا، حاضری ۷۰ کے قریب تھی۔ مولانا ظفر احمد صاحب تھانوی نے اسے قلمبند کیا۔

خطبہ ماثورہ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

الحمدللہ نحمدہ ونستعینہ ونستغفرہ ونؤمن بہ ونتوکل علیہ ونعوذ باللہ من شرور انفسنا ومن سیئات اعمالنا من یھدہ اللہ فلا مضل لہ ومن یضللہ فلا ھادی لہ ونشھدان لا الہ الا اللہ وحدہ لا شریک لہ ونشھدان سیدنا ومولانا محمداً عبدہ ورسولہ صلی اللہ تعالٰی علیہ وعلٰی وآلہٖ واصحابہ وبارک وسلم۔

اما بعد فاعوذ باللہ من الشیطان الرجیم، بسم اللہ الرحمٰن الرحیم، وَهُوَ الَّذِیٓ اَنْشَاَ جَنّٰتٍ مَّعْرُوْشَاتٍ وَّغَیْرَ مَعْرُوْشَاتٍ وَّالنَّخْلَ وَالزَّرْعَ مُخْتَلِفًا اُكُلُهٗ وَالزَّيْتُوْنَ وَالرُّمَّانَ مُتَشَابِهًا وَّغَيْرَ مُتَشَابِهٍ كُلُوْا مِنْ ثَمَرِهٖٓ اِذَآ اَثْمَرَ وَاٰتُوْا حَقَّهٗ يَوْمَ حَصَادِهٖ وَلَا تُسْرِفُوْا اِنَّهٗ لَا يُحِبُّ الْمُسْرِفِيْنَ. (الانعام آیت نمبر ۱۴۱)

''اور وہی ہے جس نے باغات پیدا کیے، وہ بھی جو ٹٹیوں پر چڑھائے جاتے ہیں، کھجور کے درخت اور کھیتی جن میں کھانے کی چیزیں مختلف طور کی ہوتی ہیں اور زیتون اور انار جو باہم ایک دوسرے کے مشابہ بھی ہوتے ہیں اور ایک دوسرے کے نہیں بھی ہوتے، ان سب کی پیداوار جب نکل آئے تو کھاؤ اور اس میں جو حق واجب ہے وہ کاٹنے کے دن دیا کرو اور حد سے نہ گزرو، یقیناً وہ حد سے گزرنے والوں کو ناپسند کرتے ہیں۔''

شرعی قیود

مجھ کو اس وقت بہت مختصر اور ضروری بیان کرنا ہے ہر چند کہ مضمون دو ہیں مگر گویا ایک ہی ہیں کیونکہ ایک دوسرے کے ساتھ ارتباط و مناسبت ہے پس دونوں مل کر واحد کے حکم میں ہیں۔

حاصل مضمون کا یہ ہے کہ اس وقت اکثر لوگ زمین کی پیداوار اور غلہ اور اناج اپنے گھر میں

لے آئے ہیں اور لوگ اس سے منتفع ہو رہے ہیں اور ان کے متعلق کچھ شرعی احکام ہیں جن کا معلوم کرنا اور علم کے بعد عمل کرنا ہر مسلمان کے ذمہ جو ان کا مخاطب ہو ضروری ہے۔ دوسرے اس وقت باغوں میں پھل آ رہا ہے اور اس کے متعلق بھی احکام شرعی ہیں کیونکہ شرعی احکام ایسے وسیع ہیں کہ ان کے احاطہ سے کوئی حالت اور کوئی کام باہر نہیں، کوئی بڑا کام ہو یا چھوٹا ہر ایک کے متعلق شریعت کا کوئی حکم ضرور ہے، خواہ اباحت ہو یا کراہت، حلت ہو یا حرمت، وجوب ہو یا فرضیت، غرض انسان آزاد نہیں کیا گیا کہ اپنے رائے سے جو چاہے کرے یا جو چاہے سمجھ لے۔

اَیَحۡسَبُ الۡاِنۡسَانُ اَنۡ یُّتۡرَکَ سُدًی.

کیا انسان یہ سمجھتا ہے کہ اس کو آزاد چھوڑ دیا جائے گا) نہیں نہیں! بلکہ وہ علم اور عمل دونوں کے لحاظ سے مقید ہے خواہ وہ قید اطلاق ہی ہو مگر قید ضرور ہے اور یہ میں نے اس لیے کہہ دیا (کہ خواہ وہ قید اطلاق ہی ہو) تاکہ لوگ ڈریں نہیں کہ ہمارا بال بال بندھا ہوا ہے تو ہم کو کیا خاک راحت ہوسکتی ہے۔ اس لیے میں کہتا ہوں کہ شرعی قیود سے آپ کی راحت سلب نہیں ہوتی کیونکہ بجز فواحش اور معاصی کے دیگر امور شرعی میں حکم اباحت و اطلاق ہی ہے، فرائض و واجبات معدودے چند ہیں، زیادہ حصہ مباحات کا ہے اس لیے میں نے کہہ دیا کہ خواہ وہ قید اطلاق ہی ہو تاکہ سامعین کو ضیق نہ ہو۔ اگر زیادہ احکام میں حرکت و وجوب کا حکم ہوتا ہے تو واقعی ضیق ہوتی مگر جاننے والے جانتے ہیں کہ شریعت میں زیادہ حصہ مباحات و مندوبات و مستحبات کا ہے جن کا حاصل اطلاق ہے۔ شریعت کا مقصود بندوں کو ضیق میں ڈالنا نہیں ہے بلکہ مقصود یہ ہے کہ خدا کے بندے اور غلام بن کر رہو جہاں وہ آزادی دیں، آزاد رہو اور جہاں پابند کریں پابند ہو جاؤ۔ مثلاً کھانے پینے میں چند چیزوں کی ممانعت ہے غیر کا مال نہ کھاؤ، رشوت و سود نہ لو، مردار اور خبیث چیزیں نہ کھاؤ، اس کے بعد طیبات سب حلال ہیں جو قاعدے کے موافق حاصل کی جائیں اور استعمال میں لائی جائیں اگر موازانہ نہ کیا جائے تو وسعت کا حصہ زیادہ ملے گا۔

اسی طرح لباس میں حریر مردوں کو حرام ہے اور کفار و فساق اور عورتوں کے ساتھ تشبہ ممنوع ہے اس کے بعد سب قسم کے لباس جائز ہیں بشرطیکہ اسراف اور تکبر کو دخل نہ دیا جائے۔ اسی طرح حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما کا مقولہ ہے۔ ''کل ما شئت والبس ماشئت ما اخطاک اثنتان الاسراف والمخیلت'' (جو چاہے کھاؤ اور جو چاہے پہنو، تیری خطا دو

چیزیں ہیں اسراف اور تکبر) اسراف میں سب ممنوع لباس آگئے ہیں کیونکہ ان سب میں حد سے تجاوز ہے یہی قید ترک اسراف وخیلاء کی سب جگہ ہے مگر بعض لوگ شیخ سعدی کے شعر

در عمل کوش ہرچہ خواہی پوش تاج برسر نہ و علم بر دوش

(عمل میں کوشش کرو اور جو چاہے پہنو، نہ سر پر تاج اور نہ کندھوں پر علم)

کو عام لیتے ہیں کہ جو چاہو پہنو، یہ بالکل غلط ہے یہ ہرگز مراد نہیں کیونکہ اس مطلب سے تو خود سعدیؒ متروک ہو جائیں گے نہ کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے احکام جس شخص کا کلام رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے احکام کے خلاف ہو خود اس کو لینے کے دینے پڑ جائیں گے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے احکام باطل نہیں ہو سکتے، اس لیے سعدی کے شعر کو عموم پر محمول کرنا غلط ہے بلکہ مطلب یہ ہے کہ عمل کی درستی کے ساتھ خواہ لباس فقیری ہو یا لباس امیری سب جائز ہے۔ بشرطیکہ شرعاً مباح ہو۔ پس سعدی کا مقصود مباحات میں وسعت دینا ہے نہ کہ محرمات میں چنانچہ آگے دوسرے مصرعہ میں اس کی تفسیر موجود ہے کہ خواہ امیرانہ لباس پہنو یا غریبانہ دونوں جائز ہیں۔ اب اس شعر کا حاصل وہی ہے جو ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے قول کا حاصل ہے۔ "ما اخطاک اثنتان الاسراف والمخیلة" (تیری خطا دو چیزیں ہیں اسراف اور تکبر)

بہر حال میرا مقصود یہ ہے کہ عبداللہ بن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما کے اثر سے معلوم ہوتا ہے کہ شریعت میں آزادی کے احکام زیادہ ہیں مگر وہ آزادی بھی شریعت ہی کی طرف سے ہے، ہماری اپنی طرف سے نہیں کیونکہ واقعہ میں انسان اپنی فہم وعمل میں آزاد نہیں ہے بلکہ شریعت کے احکام کا مقید ہے اگرچہ وہ قید اطلاق ہی ہو۔

اصلاحات شرعیہ ودلالت لفظیہ

پس اس وقت جو دو حالتیں درپیش ہیں، ایک کھیتی سے انتفاع، دوسرے باغ سے انتفاع، ان کے متعلق بھی شریعت کے کچھ احکام ہیں۔ اس وقت میں وہ احکام بیان کرنا چاہتا ہوں اور سہولت و اختصار کے لیے میں اس مضمون کا وہ عنوان بھی بتلا دینا چاہتا ہوں جو شریعت میں اس کے لیے موضوع ہے کیونکہ شریعت نے مختلف احکام کے لیے اپنی اصطلاح میں خاص خاص نام مقرر کیے ہیں جن کا فائدہ یہ ہے کہ اگر یہ اصطلاح نہ ہوتی تو نماز کے بتلانے کے لیے ایک لمبی عبارت بولنا پڑتی۔

مثلاً یوں کہتے کہ وہ عبادت کرو جس کے لیے وضو شرط ہے اور قبلہ کی طرف منہ کر کے اللہ اکبر کہنے سے شروع ہوتی ہے اور قیام و رکوع و سجود و قعود خاص طریقہ سے ادا کر کے السلام علیکم ورحمۃ اللہ پر ختم ہوتی ہے، پس شریعت کا یہی بڑا احسان ہے کہ اس نے احکام کے واسطے اصطلاحات مقرر کر دیں کہ اب لمبی عبارت بولنا نہیں پڑتی۔ اتنا کہہ دینا کافی ہے کہ نماز پڑھو وقت جا رہا ہے۔

مجھ کو اس مختصر عنوان اور مطول عنوان پر ایک واقعہ یاد آیا، ہمارے استاد مولانا فتح محمد صاحب رحمۃ اللہ علیہ جن سے میں نے ابتدائی کتابیں پڑھی تھیں، وہ ایک مرتبہ مظفر نگر تشریف لے گئے اور ایک بیمار طالب علم کے متعلق اپنے نائب مدرس کو وصیت کر گئے کہ ان کا خیال رکھنا۔ پھر مولانا نے بذریعہ خط کے ان صاحب سے پوچھا کہ ان طالب علم کے دردِ سر کا کیا حال ہے۔ اس پر ان صاحب نے پوچھا تمہارے دردِ سر کا کیا حال ہے، اس نے ہاتھ کی انگلیاں دو تین بار ملا کر کھول کر کہہ دیا کہ میرا سر اس طرح کرتا ہے، اب آپ خط میں لکھتے ہیں کہ اس کے دردِ سر کا یہ حال ہے کہ رؤس اصابع خمسہ کو ملایئے پھر ان کو حالت انبساط کی طرف لے جایئے پھر حالت انقباض کی طرف لایئے اور اسی طرح کئی بار کیجئے مگر لکھ کر کچھ خوش نہ ہوئے۔ ایک ظریف شاعر کو مشورہ کے لیے سنایا۔ انہوں نے کہا کہ حضرت اتنا لکھ دیا ہوتا کہ اس کا سر پلر پلر کرتا ہے۔

واقعی غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ وضع الفاظ بھی اللہ تعالیٰ کی ایک رحمت ہے اور بہت بڑا انعام ہے۔ اگر دلالت لفظیہ نہ ہوتی تو مصیبت ہو جاتی ہے۔

چنانچہ ایک شخص کی حکایت مشہور ہے کہ اس کو الفاظ کی آمد کم تھی۔ اکثر باتوں کو اشارہ سے بتلایا کرتا تھا، اتفاق سے ایک دن وہ ہرن گیارہ درہم کا خرید کر لایا، کسی نے پوچھا کتنے میں لائے تو عدد کے الفاظ تو یاد نہ رہے اپنے ہرن کا رسہ بائیں ہاتھ میں پکڑ کر دائیں ہاتھ کی پانچ انگلیاں کھڑی کیں، پھر منہ میں رسہ تھام کر پانچ انگلیاں وہ کھڑی کیں، اب ایک رہ گیا اس کے لیے زبان باہر نکال دی، وہ ہرن بھاگ گیا۔

اگر الفاظ موضوع نہ ہوتے تو بڑی مصیبت ہوتی، دور کیوں جایئے اگر شہروں کے اور آدمیوں کے نام مقرر نہ ہوتے اور کسی آدمی کے آنے کی خبر دینا چاہتے تو اس کا سارا حلیہ بیان کرنا پڑتا اور اگر حلیہ کے الفاظ بھی موضوع نہ ہوتے تو کچھ بھی نہ کہہ سکتے۔ پس لغات و الفاظ بھی اللہ تعالیٰ کی بڑی نعمت ہے اور یہ انعام ہمارے اوپر ہر وقت ہے جس سے ہم بالکل غافل ہیں۔ شاید

ہی کوئی شخص ہوگا جس کو اس نعمت پر شکر کرنے کی توفیق ہوتی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے قرآن میں اس نعمت پر ہم کو متوجہ فرمایا ہے۔ چنانچہ ارشاد ہے:

اَلرَّحْمٰنُ عَلَّمَ الْقُرْاٰنَ خَلَقَ الْاِنْسَانَ عَلَّمَهُ الْبَيَانَ

(رحمٰن جس نے قرآن سکھایا اور انسان کو پیدا کیا اور اسے بولنا سکھایا)

اسی طرح شرعی الفاظ بھی ہیں کہ ان میں بھی اللہ تعالیٰ کی نعمت کا ظہور ہے بلکہ دوسرے الفاظ سے ان میں رحمت کا ظہور زیادہ ہے کیونکہ ہم اگر کسی آدمی کو نماز یا روزہ یا زکوٰۃ کی ترغیب دیں تو ہم کو ثواب ملتا ہے مگر یہ ترغیب الفاظ ہی پر تو موقوف ہے اگر الفاظ نہ ہوتے تو بتانا اور رغبت دلانا دشوار ہو جاتا، پھر ثواب کیسے ملتا۔ دوسرے الفاظ کے نہ ہونے سے تو صرف دنیوی تکلیف ہوتی اور الفاظ شرعیہ کے نہ ہونے سے ثواب آخرت سے محرومی ہو جاتی۔ اس لیے ان میں رحمت کا ظہور زیادہ ہے۔ اسی لیے جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اکثر احکام شرعیہ کیلئے خاص خاص اصطلاح مقرر فرما دیں تاکہ فہم و تفہیم میں آسانی ہو۔ چنانچہ اس مضمون کے لیے بھی جس کا اس وقت بیان ہوگا۔ شریعت نے ایک اصطلاح مقرر کی ہے اس کو یاد رکھو کیونکہ اب میں اسی عنوان کو اختیار کر کے احکام بیان کروں گا۔

عقل اور روزی

پس سنئے کہ شریعت میں اس حق کو جو پیداوار زمین پر مقرر کیا گیا ہے عشر کہتے ہیں۔ اگرچہ یہ لفظ اصطلاح شرع میں دسویں حصہ اور بیسویں حصہ دونوں کو شامل ہے مگر یہ اصطلاح و لغت کا فرق ہے کہ جو لفظ لغۃً خاص تھا اور اصطلاح شریعت میں اس کو عام کر دیا گیا جیسے حضرات چشتیہ کی اصطلاح میں ایک وظیفہ کا نام بارہ تسبیح ہے حالانکہ اس میں تیرہ تسبیحیں ہیں ممکن ہے کہ شروع میں بارہ ہی تسبیحیں ہوں مگر اب تیرہ ہیں اور نام وہی ہے۔

اب سمجھئے کہ زکوٰۃ مال کی طرح زمین کی پیداوار میں عشر واجب ہے جس کے دو محل ہیں۔ ایک حبوب دوسرے ثمرات، ان کے علاوہ بعض اشیاء اور بھی ہیں جن میں عشر واجب ہے جیسے دواؤں کی کھیتی جبکہ استقلالاً آمدنی کے لیے بطور کھیت کے بویا ہو ورنہ قدرے قلیل میں نہیں مگر دواؤں کی مستقل کاشت ہمارے دیار میں بہت کم ہے۔ یہاں محل عشر عادۃً دو ہی ہیں۔ ایک تو حبات دوسرے جنات ہیں یعنی باغات اس کے متعلق حکم یہ ہے "واتوا حقه یوم حصاده" اللہ

تعالیٰ کا حق ادا کرو، ان کے کاٹنے اور پھل توڑنے کے وقت۔

مقصود تو مجھے صرف اسی جملہ کا بیان کرنا تھا مگر پوری آیت میں نے تبرکاً پڑھ دی ہے کیونکہ آیت کو ناقص پڑھنا خلاف اولیٰ ہے، بے ادبی ہے۔ بہرحال اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے ایک تو ان نباتات کی فہرست شمار فرمائی ہے جن میں عشر واجب ہے۔ پھر ادائے عشر کا حکم فرمایا ہے اور اس کو شروع اس عنوان سے کیا ہے کہ اللہ تعالیٰ ہی نے ان چیزوں کو پیدا کیا ہے۔ پھر خدا کے نام پر خرچ کرتے ہوئے اور اس کا حق نکالتے ہوئے جان کیوں نکلتی ہے۔ حبوب وثمرات کی پیداوار ایسی ہے کہ اس میں تو آدمی کو مجازاً بھی پیدا کرنے والا نہیں کہتے۔ نقود و جائیداد و مال واسباب میں تو مجازاً انسان کو پیدا کرنے والا کہتے ہیں۔ مثلاً یوں کہتے ہیں کہ فلاں شخص نے بہت جائیداد پیدا کی ہے اس میں تو زکوٰۃ نکالتے ہوئے اس لیے جان نکلتی ہے کہ آدمی اپنے کو اس کا گویا پیدا کرنے والا سمجھتا ہے۔

چنانچہ قارون ملعون کو بھی یہی شبہ ہوا تھا جب مسلمانوں نے اس سے کہا ''واحسن کما احسن اللہ الیک'' کہ (جیسا خدا تعالیٰ نے تجھ پر احسان کیا ہے تو بھی مخلوق پر احسان کر اور مال کی زکوٰۃ دے) تو وہ جواب میں کہتا ہے ''انما اوتیتہ علی علم عندی'' (کہ اس مال کو تو نے اپنے سلیقہ سے پیدا کیا ہے۔

بعض لوگوں نے اس علم کی تفسیر کیمیا سے کی ہے مگر اس کی ضرورت نہیں کیونکہ بعض آدمیوں کو اپنی تدبیر وسلیقہ سے بھی تجارت میں نفع ہوتا ہے مگر کبھی وہ تدبیر الٹی بھی ہو جاتی ہے۔ انسان کی تدبیر وسلیقہ مؤثر حقیقی کسی طرح نہیں ہے محض امارت وعلامت ہے اس سے غرور میں پڑ جانا حماقت ہی حماقت ہے چنانچہ اللہ تعالیٰ قارون کے جواب میں فرماتے ہیں:

اَوَلَمْ یَعْلَمْ اَنَّ اللّٰہَ قَدْ اَھْلَکَ مِنْ قَبْلِہٖ مِنَ الْقُرُوْنِ مَنْ ھُوَ اَشَدُّ مِنْہُ قُوَّۃً وَّاَکْثَرُ جَمْعًا.

(یعنی یہ جو اپنے علم وغیرہ پر غرہ کرتا ہے پاگل ہوا ہے)

کیا اس کو خبر نہیں کہ ہم نے اس سے پہلے کتنے مالدار و مضبوط اور قوی لوگ ہلاک کر دیئے ہیں۔ جواب کا حاصل یہ ہوا کہ اگر یہ مال کے پیدا کرنے پر قادر ہے تو اس کے تھامنے اور روکنے پر بھی قادر ہونا چاہیے مگر تھامنے پر کوئی قادر نہیں۔ مال کو تو کیا تھامتے خود اپنے کو نہیں تھام سکتے اور اس کے لیے ہمارے پاس بڑی دلیل ہے۔ وہ یہ کہ قارون سے زیادہ قوی اور مضبوط لوگ اپنے مال کو تھامنے پر قادر نہیں تھے بلکہ اپنی جان کو بھی نہ تھام سکے۔ جب موت کا وقت آیا سارا جمع کیا

ہوا مال دوسروں کے لیے چھوڑ کر چلے دیئے۔ پس قارون کی حماقت ہے کہ وہ اپنے مال وغیرہ کو اپنی لیاقت وسلیقہ کا ثمرہ سمجھتا ہے۔ درحقیقت دینے والا خدا ہے اور یہ اللہ تعالیٰ کی حکمت ہے کہ جب انسان کسب کرتا ہے تو اس میں اللہ تعالیٰ اثر دے دیتے ہیں۔ اس کے کسب کو بالذات کوئی دخل نہیں۔ اگر خدا تعالیٰ کی مشیت مساعد نہ ہو تو پھر انسان کچھ نہیں کرسکتا۔ چنانچہ رات دن کا مشاہدہ ہے کہ بڑے بڑے علم وعقل والے تنگدست ہوتے ہیں اور جاہل، بیوقوف تجارت و زراعت میں کامیاب ہوجاتے ہیں۔ اسی کے متعلق شیخ سعدیؒ فرماتے ہیں۔

اگر روزی بدانش در فزودے　　　　زناداں تنگ تر روزی نبودے

بناداں آنچناں روزی رساند　　　　کہ دانا اندراں حیراں بماند

(یعنی اگر عقل پر روزی کا مدار ہوتا تو بیوقوف تو بھوکوں مرجاتے مگر مشاہدہ یہ ہے کہ بعض دفعہ بلکہ زیادہ تر نادانوں کو اس قدر مال ودولت مل جاتا ہے کہ عقلمند کو اس سے حیرت ہوجاتی ہے) خود اپنے یہاں دیکھ لو کہ جو قصبہ عقلاء کا مشہور ہے، جیسے تھانہ بھون وہاں زیادہ لوگ غریب، مفلس ہیں اور جن قصبوں کو بیوقوفوں کی بستی کہا جاتا ہے وہاں اکثر لوگ دنیا میں خوشحال اور بڑے بڑے عہدوں پر ہیں۔

مولانا نے مثنوی میں ایک حکایت لکھی ہے کہ ایک بدوی اونٹ پر سوار تھا، تجارت کا مال لا رہا تھا مگر اتنا بیوقوف تھا کہ ایک گون خالی ہوگیا تو آپ نے وزن برابر کرنے کے لیے اس کے مقابل دوسرے گون کو ریت سے بھر دیا۔ ایک شخص نے راستہ میں اس کی یہ حرکت دیکھ کر کہا کہ میاں اونٹ کو بوجھ سے کیوں مارتے ہو، ایک گون کا سامان دونوں گونوں میں بھر لو، اونٹ کو بھی راحت ہوگی اور تمہاری منزل بھی جلد قطع ہوجائے گی۔ یہ تدبیر سن کر آپ بہت خوش ہوئے اور تدبیر بتانے والے کا بہت شکریہ ادا کیا اور بالو کو پھینک کر ایک گون کے سامان کو دو گونوں میں تقسیم کیا۔ اس کے بعد مشورہ دینے والے کے حال پر رحم کیا، اس کو پیادہ پا دیکھ کر اپنے ساتھ اونٹ پر سوار کیا۔ مگر اس کی حالت دیکھ کر بہت افسوس ہوا کہ پھٹے پرانے کپڑے پہنے ہوئے ہے، جوتا بھی ٹوٹا ہوا ہے، بدوی کو حیرت ہوئی کہ میں تو بیوقوف اور مالدار اور یہ شخص اتنے عاقل اور تنگ دست۔ پھر خیال ہوا کہ شاید سفر میں کپڑے ساتھ نہ ہوں گے، گھر سے نکلے ہوئے مدت زیادہ ہوگئی ہوگی اس واسطے یہ حال ہے اور اپنے گھر پر یہ بھی میری طرح بلکہ مجھ سے زیادہ مالدار ہوگا۔ دریافت کرنا چاہیے۔

چنانچہ گفتگو شروع ہوئی، ادھر اُدھر کی باتیں کرکے بدوی نے مسافر سے دریافت کیا کہ تمہاری

مالی حالت کیسی ہے؟ کتنے اونٹ ہیں، کتنے گھوڑے ہیں، نقد کتنا ہے؟ مسافر نے ہر بات کا نفی میں جواب دیا کہ میرے پاس تو کچھ بھی نہیں، یہ سن کر بدوی بولا کہ معلوم ہوتا ہے تیری عقل منحوس ہے کہ تجھ کو افلاس میں مبتلا کر رکھا ہے، میں ایسے منحوس کو اپنے اونٹ پر بھی بٹھلانا نہیں چاہتا کہ کہیں وہ نحوست مجھ کو نہ لگ جائے، یہ کہہ کر اونٹ پر سے اتار دیا، پھر کہنے لگا کہ ایسے منحوس کی رائے پر عمل بھی کرنا پسند کرتا کہیں تمہاری عقلی تدبیر میرے حق میں منحوس نہ ہو جائے، مجھے میری حماقت ہی مبارک رہے۔ یہ کہہ کر دونوں گونوں کا سامان ایک میں کر لیا اور دوسرے کو بالو سے بھر کر اونٹ پر سوار ہو گیا۔

حضرت اس معاملہ کو دیکھ کر بہت سے عاقل پریشان ہو گئے اور بعضوں نے ایمان تک کھو دیا ہے کہ یہ کیا بات ہے کہ احمق مالدار اور عاقل تنگدست۔ اسی کو ایک شاعر کہتا ہے۔

کم عاقل عاقل اعیت مذاھبہ　　　وجاھل جاھل تلقاہ مرزوقا

ھذا الذی ترک الاوھام حائرۃ　　　وصیر العالم النحریر زندیقا

(بہت سے عاقل ہیں جو رائے و تدابیر سوچتے سوچتے عاجز آ گئے اور بہت سے جاہل ہیں جو آسانی سے روزی حاصل کر لیتے ہیں۔ بعض جاہل وہ ہیں کہ تمام اوہام کو جنہوں نے ترک کر دیا اور بہت سے تجربہ کار عالم زندیق ہو گئے)

مگر جو صاحب بصیرت ہیں وہ اس پر راضی ہیں۔ چنانچہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کا ارشاد ہے۔

رضینا قسمۃ الجبار فینا　　　لنا علم وللجھال مال

فان المال یفنٰی عنقریب　　　وان العلم باق لایزال

(ہم اللہ تعالیٰ کی اس تقسیم سے جو اس نے ہمارے لیے کی ہے راضی ہیں کہ ہمارے لیے علم اور جاہلوں کے لیے مال کیونکہ مال بہت جلد ختم ہو جانے والی شے اور علم کبھی زائل نہ ہو گا)

اہمیت علم و معرفت

حق تعالیٰ کی بڑی حکمت ہے کہ کسی کو عقل دی، کسی کو مال، جن لوگوں کو عقل کی قدر نہیں وہ اس تقسیم سے راضی نہیں اور جن کو اس کی قدر ہے وہ دل و جان سے اس تقسیم پر راضی ہیں۔

ایک بزرگ کی حکایت ہے جس کو اس لیے بیان کرتا ہوں تاکہ اندازہ ہو جائے کہ بعض لوگوں کو اس اپنے علم و معرفت اور عقل کی اس لیے قدر نہیں ہوتی کہ نعمت مفت میں حاصل ہے۔

اگر یہ نعمت سلب کر لی جائے تو قدر عافیت معلوم ہو جائے۔ اسی لیے مشہور ہے ''قدر عافیت بعد زوال'' ایک بزرگ تھے بڑے عارف بڑے کامل مگر تنگدست تھے، فقر و فاقہ بہت تھا۔

اس پر مجھے شیخ عبدالقدوس رحمۃ اللہ علیہ کا فقرہ یاد آ گیا کہ شیخ کا خرقہ جو زیارت کے لیے ہر سال نکلتا ہے وہ ان کے شیخ کا عطیہ تھا، چالیس سال تک شیخ کے بدن پر رہا، چالیس سال تک دوسرا خرقہ نہیں پہنا کیونکہ میسر نہ تھا۔ بس اسی کو دھو کر پہن لیا، کہیں سے پھٹ گیا تو پیوند لگا لیا، آج اس میں نہ معلوم کتنے پیوند لگے ہوئے ہیں۔ ایک بزرگ نے شیخ پر تعریض کی تھی کہ ایسے ہوتے ہیں کہ اپنا زہد ظاہر کرنے کے لیے ایک ہی کپڑا برسوں پہنتے رہتے ہیں اور پیوند پر پیوند لگاتے رہتے ہیں اس پر شیخ نے جواب دیا کہ خدا تعالیٰ کی قسم مجھے دوسرا کپڑا میسر نہیں آتا اس لیے اس کو نہیں بدلا۔

شاید آپ لوگوں کو تعجب ہوا ہوگا کہ اس زمانہ کے مرید کیسے تھے جنھوں نے اپنے پیر کی خدمت نہ کی کہ ایک خرقہ کے سوا ان کو دوسرا خرقہ میسر نہیں آیا مگر صاحبو! بات یہ ہے کہ اس زمانے کے پیر آج کل کے پیروں جیسے نہ تھے۔ حضرت شیخ سے سلطان ابراہیم لودھی اور ان کی ہمشیرہ بیعت تھیں مگر شرط کر لی تھی کہ بادشاہ کبھی ہدیہ نہ دے گا اور کبھی میری زیارت کو نہ آئے، کبھی میں خود دہلی آ جاؤں تو ملاقات کا مضائقہ نہیں۔ شیخ تارک الدنیا تھے، متروک الدنیا نہ تھے، دنیا ان کے قدموں کو لپٹتی تھی اور وہ اس کو دھکے دیتے تھے۔

الحمدللہ آج کل بھی ایسے بزرگ ہوئے ہیں۔ مولانا گنگوہیؒ سے بیگم بھوپال نے بیعت کی درخواست کی تو مولانا نے اس شرط سے درخواست منظور کی تھی کہ کبھی ہدیہ نہ دیں اور کبھی گنگوہ نہ آئیں۔ طالب دنیا پیر تو بڑا خوش ہوتا کہ سونے کی چڑیا پھنسی مگر یہ حضرات دنیا پر لات مارتے تھے۔

غرض وہ بزرگ عارف تھے مگر فقر و فاقہ سے تنگ تھے۔ اسی حالت میں ایک دن آپ کا گزر ایک شہر پر ہوا جس کا دروازہ شہر پناہ دن دہاڑے بند تھا اور پہرہ چوکی لگا ہوا تھا۔ آپ نے اس کا سبب پوچھا تو معلوم ہوا کہ بادشاہ کا باز اُڑ گیا ہے اس لیے حکم دیا کہ شہر پناہ کے سب دروازے بند کر دیئے جائیں تا کہ باز نکل نہ جائے، یہ بزرگ بہت ہنسے کہ عجب بیوقوف بادشاہ ہے، بھلا باز کو دروازے سے نکلنے کی کیا ضرورت ہے پھر آپ نے ناز میں آ کر اللہ تعالیٰ کی جناب میں عرض کیا کہ اچھے بیوقوف کو بادشاہی دی اور ایک ہم ہیں کہ باوجود علم معرفت کے جوتیاں چٹخاتے پھرتے ہیں۔

'' پھرتے ہیں میر خوار کوئی پوچھتا نہیں ۔۔۔ اس عاشقی میں عزت سادات بھی گئی

وہاں سے بطور جواب کے الہام ہوا کہ بہت اچھا کیا تبدیلی پر راضی ہو کر اس بادشاہ کو تمہارا فقر مع علم و معرفت کے دیدیا جائے اور تم کو اس کی بادشاہی مع حماقت و غفلت کے دیدی جائے۔ یہ سن کر کانپ ہی تو گئے اور فوراً سجدہ میں گر پڑے کہ میں اس پر ہرگز راضی نہیں۔ میں اپنی دولت معرفت کو سلطنت ہفت اقلیم کے عوض بھی دینا نہیں چاہتا۔ ارشاد ہوا کہ اس غریب کی ذراسی برائے نام نعمت پر آپ کو کیوں رشک آیا۔

صاحبو! یہ علم معرفت واللہ ثم واللہ وہ چیز ہے کہ

قیمت خود ہر دو عالم گفتہ　　نرخ بالا کن کہ ارزانی ہنوز

(تو نے اپنی قیمت دونوں جہاں بتلائی، نرخ ذرا اونچا کرو کہ ابھی سستا سودا ہے)

مگر یہاں اس کی قیمت اس لیے ظاہر نہیں ہوتی کہ یہاں اس کا بازار نہیں ہے، ہر چیز کا الگ بازار ہے، اناج منڈی میں اناج کی قیمت ملتی ہے اور صراف خانہ میں چاندی سونے کی اور جوہری بازار میں ہیرے جواہرات کی۔ اگر کوئی اناج کی منڈی میں ہیرے جواہرات لے کر جائے تو اسے ایک سیر اناج بھی نہ ملے گا بلکہ اس کو جوہری بازار میں جانا چاہیے۔

اس پر مجھے ایک حکایت یاد آئی کہ دہلی میں ایک لڑکا ایک شاعر سے شعر گوئی سیکھتا تھا، کبھی کبھی استاد اس کو اپنی کوئی غزل یا قصیدہ لکھواتا اور یہ کہہ دیتا کہ اس غزل کا فلاں شعر ایک ہزار روپے کا ہے، اس قصیدہ کا مطلع ایک لاکھ روپے کا ہے، شاگرد بڑا خوش ہوتا اور شوق سے استاد کے اشعار لکھتا رہتا۔ ایک دن اس کی ماں نے کہا کہ اتنا بڑا ہو گیا، کیا کرتا ہے نہ کچھ کماتا ہے نہ کام کرتا ہے، لڑکے نے کہا، اماں جان! تم بے فکر رہو، میرے پاس بڑا خزانہ جمع ہو گیا ہے، استاد نے مجھے ایسے اشعار لکھوائے جن میں کوئی ایک ہزار روپے کا ہے، کوئی لاکھ روپے کا ہے، ماں نے کہا اچھا ہم کو ہزار لاکھ کی ضرورت نہیں آج سالن پکانے کے لیے ترکاری کی ضرورت ہے، دو پیسے کے آلو لادے، لڑکے نے کہا یہ کونسی بڑی بات ہے، ابھی لاتا ہوں، یہ کہہ کر وہ بازار گیا اور کنجڑے سے دو پیسے کے آلو مانگے، اس نے پیسے مانگے آپ نے کہا کہ پیسے تو نہیں ہیں، ہم تم کو سو روپے کا ایک شعر دیتے ہیں۔ کنجڑا ہنسنے لگا اور کہا جاؤ شعر تو شاعروں کو سناؤ، ہمارے پاس تو پیسہ لاؤ گے تو آلو ملیں گے۔ لڑکا بہت مایوس ہوا اور غصہ میں بھرا ہوا استاد کے پاس پہنچا، لیجئے اپنی بیاض مجھے آپ کی شاگردی کی ضرورت نہیں، آپ نے مجھے بہت دھوکہ دیا کہ یہ شعر ہزار کا ہے، دو ہزار کا ہے،

لاکھ روپے کا ہے، بازار میں تو کوئی اس کو دو پیسہ میں بھی قبول نہیں کرتا، استاد ہنسا اور کہنے لگا، صاحبزادے تم کون سے بازار میں گئے تھے، کہاترکاری کی منڈی میں، استاد نے کہا یہی تو تمہاری غلطی ہے وہ بازار اس کی قیمت دینے والا نہیں، اس کا بازار دوسرا ہے۔ اچھا آج بادشاہ کے ہاں مشاعرہ ہے، بڑے بڑے شعراء قصائد لکھ کر لے جائیں گے تم ہمارا افلاں قصیدہ لے کر جاؤ اور کہہ دو کہ میں نے یہ قصیدہ بنایا ہے، پھر دیکھو اس کی قیمت کیا ملتی ہے۔

چنانچہ لڑکا استاد کے کہنے سے دربار شاہی میں پہنچا، بڑے بڑے شعراء کے مجمع میں ایک نو عمر بچے کو دیکھ کر بادشاہ نے دریافت کیا کہ یہ بچہ کس لیے آیا ہے، لڑکے نے عرض کیا کہ حضور میں بھی ایک قصیدہ لکھ کر لایا ہوں جس کو بارگاہ عالی میں پیش کرنا چاہتا ہوں۔ بادشاہ نے اجازت دی کہ بہت اچھا پہلے تم ہی اپنا قصیدہ سناؤ۔ اس نے قصیدہ پڑھنا شروع کیا تو اس کی فصاحت و بلاغت سے بادشاہ اور تمام درباری دنگ رہ گئے کہ یہ عمر اور یہ کلام۔ جب ہر شعر پر خوب داد مل چکی تو بادشاہ نے دس ہزار روپیہ نقد اور بیش قیمت جوڑا اور ایک قیمتی گھوڑا مع ساز و سامان کے انعام دیا۔ اب اس کی آنکھیں کھلیں کہ واقعی استاد سچا تھا، میری ہی نادانی تھی کہ ان جواہرات کو ترکاری کے بازار میں لے گیا، دیہاتی گنوار ان کی قدر کیا جانیں۔

صاحبو! یہی مثال ان لوگوں کی ہے جو اپنی باطنی دولت اور علم و معرفت کی قیمت دنیا کے بازار میں ڈھونڈتے ہیں اور جب اہل دنیا کے بازار میں ان کے کمال کی قدر نہیں ہوتی تو دل گیر و رنجیدہ ہونے لگتے ہیں۔ ارے ذرا ٹھہرو، ایک دوسرا بازار آنے والا ہے وہاں تمہارے ان جوہر کی قیمت ملے گی اور بخدا تمام سلاطین اس وقت تمہاری غلامی کے بھی لائق نہ ہوں گے۔

"الا من امن وعمل صالحا منهم".

(مگر ان میں سے جو ایمان لائے اور نیک عمل کرتے)

پس حق تعالیٰ کی یہ تقسیم عین حکمت ہے کہ اہل عقل کو مال کم دیا اور کم عقلوں کو مالدار بنا دیا کیونکہ کم عقل جب اتنی بڑی دولت سے محروم ہیں تو کیا وہ چند روز دنیا میں بھی بہار نہ دیکھ لیں۔ پس قارون کے خیال کی غلطی آپ کو معلوم ہوگئی کہ اس نے مال و دولت کو اپنی سعی سے پیدا کیا ہوا سمجھا حالانکہ نہ یہ سعی پر ہے، نہ علم و سلیقہ پر بلکہ خدا کی عطاء پر ہے اور نقد میں تو کسب کے سبب کچھ دھوکہ بھی ہے، زمین کی پیداوار کو تو عام طور پر کوئی بھی اپنا پیدا کیا ہوا نہیں سمجھتا۔ اس کے اسباب تو

ظاہراً بھی غیر اختیاری ہیں۔

حقوق اللہ: اسی کو اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ جو چیز ہماری دی ہوئی ہماری پیدا کی ہوئی ہے اس کو ہمارے نام پر خرچ کرتے ہوئے کیوں جان نکلتی ہے۔ پس ارشاد ہے:

"وَهُوَ الَّذِيْٓ اَنْشَاَ جَنّٰتٍ مَّعْرُوْشٰتٍ وَّغَيْرَ مَعْرُوْشٰتٍ وَّالنَّخْلَ وَالزَّرْعَ مُخْتَلِفًا اُكُلُهٗ وَالزَّيْتُوْنَ وَالرُّمَّانَ مُتَشَابِهًا وَّغَيْرَ مُتَشَابِهٍ."

(خدا ہی تو ہے جس نے باغات پیدا کیے دو قسم کے بعض وہ جو بیلوں پر نہیں پھیلتے بلکہ تنے پر کھڑے ہوتے ہیں اور کھیتی کو پیدا کیا اور کھجور کو جس کے مزے مختلف ہوتے ہیں اور زیتون اور انار کو پیدا کیا جن میں بعضے ملتے جلتے نہیں ہیں)

اس کی تفسیر میں اختلاف ہے بعض مفسرین نے کہا ہے کہ یہ مجموعہ کے اعتبار سے فرمایا ہے کہ کیونکہ زیتون اور انار کے پتے تو یکساں ہیں مگر پھل مختلف ہیں اور بعض کا یہ قول ہے کہ یہ ہر واحد کے اعتبار سے فرمایا کہ زیتون زیتون میں بھی تشابہ اور اختلاف ہوتا ہے اور انار انار میں بھی اس کے بعد ارشاد ہے کہ جب پھل آ جائے تو اس کو کھاؤ، کام میں لاؤ اور اللہ تعالیٰ کا حق بھی ادا کرو، پھل کاٹنے کے وقت کیونکہ جب سب کچھ خدا کا پیدا کیا ہوا ہے تو پھر اس کے نام پر خرچ کرتے ہوئے کیوں جان نکلتی ہے۔

ارے بے وقوف! اگر یہ کھیتی اور پھل پیدا ہی نہ ہوتا تو کیا ہوتا؟ اس وقت تم اپنے گھر میں کیا لے آتے؟ ابھی کا قصہ ہے کہ ایک گاؤں میں آگ لگ گئی تو ساری کھیتی جل کر خاک سیاہ ہو گئی۔ اسی لیے اسی کو اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

"اَفَرَءَيْتُمْ مَّا تَحْرُثُوْنَ ءَ اَنْتُمْ تَزْرَعُوْنَهٗٓ اَمْ نَحْنُ الزّٰرِعُوْنَ لَوْ نَشَآءُ لَجَعَلْنٰهُ حُطَامًا فَظَلْتُمْ تَفَكَّهُوْنَ اِنَّا لَمُغْرَمُوْنَ بَلْ نَحْنُ مَحْرُوْمُوْنَ"

(بتلاؤ جو کھیتی کرتے ہو کیا تم اس کو پیدا کرتے ہو یا ہم پیدا کرنے والے ہیں، اگر ہم چاہیں تو اس کو (جلا پھونک کر سکھا کر) ریزہ ریزہ کر دیں۔ پھر حیرت زدہ ہو کر کہنے لگو کہ اب کے تو بڑے خسارے میں رہے بلکہ محروم ہی رہ گئے)

واقعی آدمی کیا کر سکتا ہے؟ کچھ بھی نہیں، خصوصاً زراعت میں کہ اس کا معاملہ تو بالکل توکل پر ہے۔ آدمی روپیہ جمع کر سکتا ہے، بیج کا انتظام کر سکتا ہے، بالدی کو ہیرے اگا سکتا ہے مگر ٹڈیوں کا کیا انتظام کر سکتا ہے، پالے اور اولے کا کیا بندوبست کر سکتا ہے۔ اسی طرح باغ کا کہ کبھی اندھا ہو

جاتا ہے اس کا کیا انتظام کرسکتا ہے، غرض کھیت اور باغ کا معاملہ اور مدار بالکل توکل پر ہے اگر تم خدا کے حق میں کوتاہی کروگے تو ڈرتے رہو کہیں خدا تعالیٰ بھی تمہارے حق میں کمی نہ کردیں اور کچھ صدقہ زکوٰۃ تم دیتے ہو وہ تو مجازاً خدا کا حق کہلاتا ہے ورنہ حقیقت میں وہ تمہارے ہی نفع کے واسطے مقرر کیا گیا ہے تاکہ دنیا میں تمہارے مال میں برکت ہو اور آخرت میں ثواب ملے۔ قرآن کریم میں ایک واقعہ بھی ایسے لوگوں کا مذکور ہے جو خدا کا حق ادا کرنے میں جان چراتے تھے۔

قصہ یہ ہے کہ ایک شخص کھیتی باڑی اور باغ والا تھا۔ اس کی یہ عادت تھی کہ جب کھیت کاٹتا یا باغ کا پھل توڑتا غریبوں کے واسطے ایک حصہ الگ کردیتا جو اللہ تعالیٰ کے واسطے تقسیم کیا جاتا۔ جب غریبوں کو اس کی یہ عادت معلوم ہوگئی تو وقت پر خود ہی اس کے کھیت اور باغ پر جمع ہوجاتے اور وہ خوشی کے ساتھ ان کا حق نکال کردے دیتا۔ ایک عرصہ بعد اس کا انتقال ہوگیا تو اس کے لڑکوں نے کہا کہ ہمارا باپ بیوقوف تھا جو مسکینوں کو اپنی محنت کی پیداوار میں سے ایک معقول حصہ دے دیا کرتا تھا، ہم ایسا نہیں کریں گے، بھلا یہ بھی کوئی بات ہے کہ ہم تو محنت کریں، مشقت کریں اور بڑی مصیبت کے بعد محنت کا پھل دیکھیں اور یہ غریب لوگ بیٹھے بیٹھائے ہمارے مال میں حق دار بن جائیں۔

مگر اس زمانہ میں کچھ آنکھ میں شرم و لحاظ بہت تھا۔ اس لیے ان لڑکوں کو یہ خیال بھی پیدا ہوا کہ اگر غرباء حسب عادت جمع ہوگئے، منہ توڑ کے جواب دینا بھی ممکن نہیں، اس لیے کوئی ایسی صورت کرنا چاہیے کہ غریبوں کے آنے سے پہلے ہی باغ اور کھیت کے کاٹنے سے فراغت ہو جائے۔ بالآخر یہ طے پایا کہ صبح کو سویرے چلیں گے تاکہ غریبوں کے آنے سے پہلے خفیہ طور پر غلہ کاٹ کرلے آئیں۔ اس رائے پر سب کا اتفاق ہوگیا مگر ایک لڑکے نے اختلاف کیا، اس نے کہا کہ باپ کے طریقہ کو نہ بدلنا چاہیے کیونکہ غرباء کو خیرات دینے سے اپنا ہی بھلا ہے اور اسے کچھ کمی نہیں آتی، آخر ہمارا باپ بھی تو خیرات ہمیشہ کرتا رہا اور کبھی اس کو پریشانی کا سامنا نہیں ہوا لیکن اس ایک کی رائے نہ چلی۔ کثرت رائے پر یہی فیصلہ ہوا کہ سویرے چل کر غریبوں کے آنے سے پہلے باغ اور کھیت کاٹ لینا چاہیے۔ یہ رائے طے کرکے چلے گئے مگر وہاں یہ معاملہ ہوا کہ نیت بدلتے ہی خدا تعالیٰ کا معاملہ بدل گیا اور راتوں رات باغ اور کھیت پر عذاب نازل ہوا کہ ایک آگ آئی اور ساری کھیتی اور باغات کو جلا پھونک کر رکھ گئی۔ جب یہ لوگ وہاں پہنچے اور باغ اور کھیت کو جلا ہوا پایا تو اول تو خیال کیا شاید راستہ بھول کر کسی دوسرے کھیت پر آگئے، ہمارا کھیت یہ نہیں ہے مگر جب صبح کی

روشنی پھیل گئی تو معلوم ہوا کہ اپنا ہی کھیت اور اپنا ہی باغ ہے مگر جلا ہوا ہے۔

اب کہنے لگے کہ ہماری قسمت ہی پھوٹ گئی، پھر ایک دوسرے کو ملامت کرنے لگا کہ تیری برائی کا نتیجہ ہے، دوسرے نے کہا تیرے مشورہ کا ثمرہ ہے۔ اب وہ لڑکا بولا جس نے اس تدبیر سے مخالفت کی تھی اور کہنے لگا کہ آپس میں ایک دوسرے کو برا بھلا کہنے سے کیا نفع، اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع کرو تو امید ہے کہ خدا اس سے بہتر کھیت اور باغ ہم کو دے دے، اب سب نے توبہ کی اور آئندہ کے لئے باپ کے طریقہ پر چلنے کا عہد کیا تو دفعتاً سارا باغ کھیت ہرا بھرا ہو گیا۔

صاحبو! صدقہ خیرات سے مال کم نہیں ہوتا، اس کی بالکل ایسی مثال ہے جیسے کنواں کہ اگر اس میں سے پانی نکلتا رہے، بھرائی ہوتی رہے تو پانی کی آمد ہوتی رہتی ہے اور اگر بھرائی نہ ہو تو کچھ دنوں کے بعد سوت بند ہو جاتا ہے اور کنواں سوکھ جاتا ہے۔

حدیث میں ہے: "مانقص المال من صدقة قط او كما قال". (مجمع الزوائد للہیثمی ۳: ۱۱۰)

(صدقہ سے مال کبھی کم نہیں ہوتا) اس کا یہ مطلب نہیں کہ دس روپے میں سے اگر دو روپے دے دو تو وہ آٹھ نہ رہیں گے دس ہی رہیں گے یا اسی وقت بیس ہو جائیں گے بلکہ مطلب یہ ہے کہ مال میں برکت ہوگی اور کچھ دنوں کے بعد مال بڑھ جائے گا۔ ایک طریقہ برکت کا یہ بھی ہے کہ مال چوری سے اور دوسری آفتوں سے محفوظ رہتا ہے۔ یہ کیا تھوڑی بات ہے اور اگر کچھ بھی نہ ہوتا تو مسلمان کے لیے یہ کیا کم ہے کہ صدقہ سے اللہ تعالیٰ کی خوشنودی حاصل ہوتی ہے۔ مسلمان کی شان سے نفع دنیا کی طلب بعید ہے۔ اس کو صدقہ خیرات سے اللہ تعالیٰ کی خوشنودی طلب کرنا چاہیے۔ حکام دنیا کے لیے لوگ کتنا خرچ کرتے ہیں، پھر خدا کے لیے خرچ کرنا کیوں مشکل ہے۔ پھر خدا تعالیٰ کے حقوق جو شرعاً مقرر ہیں کچھ زیادہ نہیں ہیں بلکہ بہت تھوڑے سے ہیں جن کا ادا کرنا بہت سہل ہے پھر جس عنوان سے اللہ تعالیٰ نے اپنے حقوق کا اس آیت میں ذکر فرمایا ہے اس نے تو اور بھی سہل کر دیا۔ چنانچہ اول تو یہ ارشاد ہوا کہ ان باغات اور زراعات کو اللہ تعالیٰ نے بھی پیدا کیا ہے۔ انشاء...... الخ میں اس طرف اشارہ ہے کہ جب یہ خدا کا دیا ہوا، اسی کا پیدا کیا ہوا ہے تو اللہ کے نام پر خرچ کرنا دشوار کیوں ہے۔

آں کہ جاں بخشد اگر بکشد رواست

(جس نے جان عطا کی اگر وہ اسے لے لیں تو جائز ہے)

دوسرے اس میں ایک اور نکتہ بھی ہے وہ یہ کہ نعمت کے بیان سے منعم کے ساتھ مخاطب کو

محبت ہو جاتی ہے اور محبت کے بعد محبوب کے نام کے دو مقتضی ہیں۔ایک یہ کہ سب کچھ اللہ کا دیا ہوا ہے تو بڑے شرم کی بات ہے کہ اس کے نام پر خرچ نہ کیا جائے اور اس کا شکر نہ ادا کیا جائے۔ دوسرے اس عنوان کو محبت پیدا کرنے میں بڑا دخل ہے اور محبت بھی اسباب یسر سے ہے۔

پھر انشاء......الخ کو مقدم کر کے فوراً ہی اپنے حقوق کا ذکر نہیں فرمایا بلکہ پہلے فرمایا ''کلو من ثمرہ اذا اثمر '' (کہ جب پھل آ جاوے تو پہلے تم کھاؤ پیو کیونکہ تم ضعیف ہو، تم سے یہ نہیں ہو سکتا کہ پہلے دوسروں کو دو، اس لیے اول خود کھاؤ پیو) ہم دیکھتے ہیں کہ بعض دفعہ لذیذ چیز کسی کے دینے کو طبیعت نہیں مانتی بلکہ جب آدمی اچھی طرح خود کھالیتا ہے تو بعد میں دوسروں کا خیال آتا ہے تو بھائی کو دو، بہن کو دو چونکہ اللہ تعالیٰ نے ہمارے نفس کو پیدا کیا ہے تو وہ اس کے خاصہ سے بھی خوب واقف ہیں اس لیے یہ فرمایا کہ پہلے تم کھالو، پھر ہمارے نام کا دو، یعنی حصاد سے قبل تمہیں کھانے پینے کی اجازت ہے، خوب کھاؤ پیو اور حصاد کے بعد پھر عشر واجب ہو جائے گا، اس وقت ادا کرو۔

اس کے بعد ایک اور سہولت کی رعایت ہے۔وہ یہ کہ ہمارے لئے تو پھر آتے ہی کھانا جائز کر دیا اور اپنے حقوق کے بارے میں فرماتے ہیں ''واتوا حقه یوم حصادہ'' کہ اللہ کا حق اس وقت ادا کرو جب اس کے حصاد کا وقت آجائے یہاں یہ حکم نہیں دیا کہ پھر آتے ہی خدا کا حق ادا کرو۔

سبحان اللہ......! کس قدر رعایت ہے اور ان رعایات سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ خدا تعالیٰ کا کلام ہے، بشر کی یہ طاقت نہیں کہ اتنی رعایت کر سکے، پھر ہمارا علم ہی کیا ہے، بہت قلیل، اس لیے محدود رعایات تک ذہن پہنچ جاتا ہے ورنہ خدا کے کلام کے محاسن و کمالات کا احاطہ ہم سے کہاں ہو سکتا ہے نہ معلوم اس میں اور کس قدر نکات ہوں گے، غرض یہاں پر چار طریقوں سے اللہ تعالیٰ نے اپنے حقوق کو آسان کر دیا۔

اول یہ فرما کر سب کچھ ہمارا ہی تو پیدا کیا ہوا ہے۔

دوسرے یہ جتلایا کہ ہم منعم ہیں، محسن ہیں اور منعم کے ساتھ محبت کرنا انسان کی فطرت ہے تو ہم محبوب بھی ہیں اور محبوب کے لیے مال و جان فدا کرنا بھی آسان ہے۔

تیسرے یہ فرما کر کہ جب پھل آجاوے تو پہلے تم خود کھانا شروع کر دو۔

چوتھے یہ بتلا کر کہ ہمارا حق حصاد کے بعد ادا کرو، پھل جاتے ہی ادا کرنا ضروری نہیں۔

عشر کی ادائیگی کی ذمہ داری

البتہ ''واتوا حقه یوم حصادہ'' (اور کھیتی کاٹنے کے دن اس کا حق ادا کرو) کے متعلق مجھے

ایک بات عرض کرنا ہے۔ وہ یہ کہ ہم اس کی تفسیر میں فقہاء کے محتاج ہیں۔ بعض فقہاء فرماتے ہیں کہ حصاد سے مراد حصاد بالفعل نہیں بلکہ بالقوہ مراد ہے۔ مطلب یہ ہے کہ جب پھل آفات سے محفوظ ہو جائے تو عشر واجب ہو گیا۔ یہ امام صاحب کا قول ہے، اگر مالک نے ایسی حالت کے بعد بیع کیا تو عشر بائع کے ذمہ ہوگا، مشتری کے ذمہ نہ ہوگا اور محض پھل آ جانے کے بعد اس حصاد کے قبل اگر بیع کر دیا تو مشتری کے ذمہ عشر ہے، بائع کے ذمہ نہیں اور صاحبین کے نزدیک حصاد بالفعل مراد ہے مگر یہاں ایک نازک مسئلہ اور ہے وہ یہ کہ بعض لوگ کھر آتے ہی بیع کر دیتے ہیں تو اس کا عشر کس کے ذمہ ہے کھیتو ں میں تو بیع میں کوئی خرابی نہیں جب چاہو بیچ دو کیونکہ وہ تو جڑ سمیت بکتے ہیں۔ گو اس کے عشر میں تفصیل ہے کہ اگر تیاری سے پہلے بیچ دی تو عشر مشتری کے ذمہ ہے اور اگر تیاری کے بعد بیچ دی تو بائع کے ذمہ ہے مگر ہر حال میں بیع جائز ہے بخلاف پھلوں کے کیونکہ یہاں باغ کے درخت نہیں بکتے ہیں اور پھل موجود نہیں ہے تو بیع کس چیز کی؟ کیا معدوم کی بیع ہے۔ سو بیع معدوم باطل ہے۔

مجھے اس وقت اس بیع کا عدم جواز بیان کرنا نہیں ہے کیونکہ یہ تو سب کو معلوم ہو چکا ہے اور ہمیشہ بیان کیا جاتا ہے بلکہ اس وقت مجھے دو باتیں بتلانا ہیں۔ ایک یہ کہ اس صورت میں عشر کس کے ذمہ ہے شاید بیع کرنے کے بعد بائع کو شبہ ہو کہ جب میں نے پھل آنے سے پہلے بیع کر دی تو میرے ذمہ عشر نہ ہوگا کیونکہ پھل میری ملکیت میں نہیں نمتا بلکہ مشتری کی ملکیت میں نمتا ہے تو سمجھ لو کہ یہ خیال غلط ہے بلکہ اس صورت میں عشر بائع ہی کے ذمہ ہے، مشتری کے ذمہ نہیں کیونکہ یہ بیع تو باطل ہے جس سے نہ بائع کی ملک زائل ہوئی نہ مشتری کی اثانیت ہوئی، پھل باغ والے کا ہی ہے اور اسی کے ذمے فقراء کا حق ہے۔ یہ نازک مسئلہ ہے جس کی طرف شاید کسی نے توجہ نہ کی ہو۔ علماء فتویٰ دیتے ہوئے اس بیع کا ناجائز و باطل ہونا ہی ظاہر کرتے ہیں۔ عشر کا سوال نہ کوئی کرتا ہے نہ وہ جواب دیتے ہیں۔ اس لیے عام طور سے لوگ اس سے غافل ہیں۔

دوسری بات یہ بتلانا ہے کہ جو لوگ پھل آنے سے پہلے بیع کرتے ہیں چونکہ یہ بیع باطل ہے اس لیے وہ خود بھی حرام کھاتے ہیں اور دوسروں کو بھی حرام کھلاتے ہیں۔ اس میں ''تبدل ملک تبدل عین'' کا حکم نہیں ہے۔ اس لیے جہاں تک بیع و شراء کا سلسلہ چلے گا سب حرام کھانے میں مبتلا ہوں گے جو لوگ جان بوجھ کر کھاتے ہیں وہ تو حرام کھانے کے ساتھ گنہگار بھی ہوتے ہیں اور جو لوگ بغیر علم کے کھاتے ہیں ان کو گناہ تو نہیں ہوگا مگر ایسا نقصان ہوتا ہے کہ ہمیشہ کو یاد رہتا ہے جیسے زہر بے خبری میں کھا جائے تو گناہ تو نہ ہوگا مگر نقصان تو پہنچے گا اور وہ نقصان قلب کی ظلمت ہے۔

بیع باطل کے اثرات

اب ایک اور طبقہ رہا جس کو یہ تو علم ہے کہ اس شہر میں باغ کثرت سے پھل نمودار ہونے سے پہلے فروخت ہوتے ہیں مگر یہ علم نہیں کہ بازار میں جو پھل بک رہا ہے وہ کیسے باغ کا ہے تو ان لوگوں پر تحقیق واجب ہے یا نہیں۔

سو اس کا حکم یہ ہے کہ جہاں غالب حالب بیع باطل کی ہو وہاں تحقیق واجب ہے۔

(قلت وفیه اختلاف الفقهاء فقد قال بعضهم ان الورع لا حتراز ان اشتری یطیب له اذا لم یعلم حرمة المشتری بعینه واللہ اعلم)

(میں کہتا ہوں اس میں فقہاء کا اختلاف ہے بعض نے کہا ہے کہ ایسی پسند خاطر چیز جس کی بیع کے حرام ہونے کا علم نہ ہو کہ خریدنے سے بچنے اور احتیاط کرنے والے کو ورع کہتے ہیں)

حرام مال سے باطن کو جو نقصان ہوتا ہے اس کو اہل بصیرت خوب جانتے ہیں۔ عبدالرحمٰن خان صاحب نے مولانا ابوالحسن صاحب لکھنوی کی حکایت مجھ سے بیان کی تھی کہ ایک مرتبہ ان پر اور ان کے خدام و متعلقین پر کئی روز کا فاقہ ہوا۔ پھر ایک دن ایک شخص آپ کے لئے بہت عمدہ بریانی لایا، آپ کو کشف سے معلوم ہو گیا کہ یہ بریانی حرام مال سے تیار ہوئی ہے، آپ نے خادم کو حکم دیا کہ اس کو کوئی نہ کھائے بلکہ زمین میں دفن کر دیا جائے۔ بعضے مریدوں کے دل میں یہ وسوسہ پیدا ہوا کہ شیخ کے دماغ میں ذکر سے خشکی پیدا ہو گئی ہے، بھلا کئی روز کے فاقہ کے بعد تو خدا نے رزق دیا آپ نے اس کو دفن کرا دیا۔ مولانا کو اس خطرہ کا کشف ہو گیا تو حکم دیا کہ اچھا اس بریانی کو کھود کر دیکھو، دیکھا گیا تو برتن کیڑوں سے بھرا ہوا تھا، آپ نے فرمایا کہ میں نے اس کو اس لیے دفن کرایا تھا کہ تمہارے پیٹ میں جا کر اس بریانی سے یہ بلائیں پیدا ہو جاتی اور تم کو تکلیف ہوتی۔

اسی طرح حضرت مولانا نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ سے شاہجہاں پور کے ایک بزرگ نے بیان کیا۔ مولانا میں تو سور کے بچے لوگوں کے پیٹ میں بولتے ہوئے دیکھتا ہوں، پھر کیوں کر ہر ایک کی چیز لے لوں۔

صاحبو! آج کل بیع باطل آم میں بکثرت ہو رہی ہے اور بازار میں ایسے ہی آم فروخت ہو رہے ہیں جن سے بہت کم لوگ احتیاط کرتے ہیں، بعضے خود تو متقی ہوتے ہیں مگر اپنی معصوم اولاد

کے لیے خرید کرتے ہیں مگر یہ بڑی غلطی ہے جس چیز کا خود کھانا حرام ہے اس کا اولاد کو کھلانا بھی حرام ہے بلکہ جانوروں کو بھی حرام ہے، جانوروں کو خود نہ کھلاؤ بلکہ ایسی جگہ رکھ دو کہ وہ خود آ کر کھالیں، پھر یادرکھو کہ جو شخص اپنی اولاد کو حرام مال کھلاتا ہے وہ ان کے اندر شرارت کا مادہ پیدا کرتا ہے۔

چنانچہ ایک بزرگ کا لڑکا بہت شریر تھا۔ کسی نے اس کی وجہ پوچھی تو فرمایا یہ اسی رات کا نطفہ ہے جس رات میں بادشاہ کے باورچی نے میری دعوت کی تھی اور شاہی باورچی خانہ کا کھانا کھلایا تھا، یہ اس کا نتیجہ ہے۔

غرض اس کی ظلمت بہت سخت ہوتی ہے اس لیے اپنے بچوں کو بھی حرام سے بچانا چاہیے۔

(قلت وفی الحدیث من حقوق الاھل والعیال ان لا یطعمھم الحرام)

(میں کہتا ہوں کہ حقوق اہل وعیال میں سے یہ بھی ہیں کہ ان کو حرام نہ کھلائے)

حرام سے بچنے کی ترکیب

میں اس بلوہ عام سے بچنے کی ایک آسان تدبیر بتلاتا ہوں جس سے دوسروں کو تو یہ خریدے ہوئے آم حلال ہو جائیں اور حرام کا سلسلہ نہ چلے وہ یہ کہ جو لوگ پھل آنے سے پہلے باغ فروخت کر چکے ہیں وہ اب پھل آنے کے بعد دو جملے کہہ دیں یا یہ کہہ دیں کہ میں قیمت معلومہ پر باغ کا پھل اب بیچتا ہوں۔ مشتری کہہ دے کہ میں خریدتا ہوں، صرف دو لفظوں کی بات ہے۔ اس سے یہ ہوگا کہ پہلے جو گناہ ہوا سو ہوا لیکن آئندہ تمام مخلوق کو حرام کھلانے کا تو گناہ نہ ہوگا پہلے گناہ سے اب توبہ کرلیں اور آئندہ گناہ سے بچنے کے لیے یہ دو لفظ کہہ دیں تو بہت کچھ گناہ کم ہو جائے۔

مگر افسوس کہ ہمارے بھائی مسلمانوں کو دوزخ میں جانا منظور ہے مگر یہ دو جملے کہنا منظور نہیں۔ ظالمو! یہ تو کچھ کہنا دشوار نہیں، بہت آسان ہے مگر جس کو خدا کا خوف ہو وہی اس تدبیر پر عمل کرے گا، عام لوگ تو یہ کہیں گے کہ بھلا یہ بھی کوئی بات ہوئی، ان دو دو جملوں سے کیا ہو جائے گا اور ان کے نہ کہنے سے کیا حرج ہوگا۔ میں کہتا ہوں بے شک معاملہ کی صورت تو ظاہر میں وہی رہے گی اور اسی لیے میں اس تدبیر کو آسان کہہ رہا ہوں کہ اس سے تمہارے معاملے پر کوئی اثر نہ پڑے گا صرف زبان ہلانا پڑے گی مگر اس سے جو گناہ کا پہاڑ سر سے اترے گا اس کی قدر قیامت میں ہوگی۔

لوگ کہتے ہیں کہ شریعت پر عمل کرنا مشکل ہے۔ اسی معاملہ کو لے لو جو تدبیر میں بتلا رہا ہوں اس میں کیا دشواری ہے، ہاں کسی کو عمل کی فکر نہ ہو تو اس کا علاج نہیں۔

صاحبو! شریعت آپ کو پریشان نہیں کرنا چاہتی، صرف یہ چاہتی ہے کہ آپ آزاد ہو کر کام نہ کریں بلکہ شریعت سے پوچھ کر عمل کریں پھر آپ کو معلوم ہوگا کہ احکام شرعیہ کس قدر سہل و آسان ہیں۔

عشر کے احکام

اب میں عشر کے احکام بیان کرنا چاہتا ہوں۔ سو اول تو یہ مسئلہ معلوم کرنے کا ہے کہ عشر اسی کے ذمہ ہے جس کے پاس کھیت تیار قابل حصاد ہو۔ اسی طرح جس کا باغ نمٹ گیا ہو اور اگر کھیت پر آفت آ گئی ہو یا باغ کا پھول پھل برباد ہو گیا تو عشر واجب نہیں۔ دوسرے یہ کہ بعضے لوگ تو اپنا کھیت خود کاشت کرتے ہیں اور بعضے دوسروں کو کاشت کے لیے دیتے ہیں جو لوگ خود اپنے کھیت کو بوتے ہیں ان پر تو عشر کا واجب ہونا ظاہر ہے جبکہ زمین عشری ہو اور جو لوگ دوسروں کو دیتے ہیں ان کی چند صورتیں ہیں۔ ایک یہ کہ زمین بٹائی پر دیں، اس صورت میں اپنے اپنے حصہ کا عشر دونوں کے ذمہ ہے۔ کاشت کار کے بھی اور زمیندار کے بھی۔

دوسری صورت یہ ہے کہ زمین ٹھیکہ پر دی جائے۔ مثلاً فی بیگھہ من بھر غلہ لیں گے یا فی بیگھہ دو روپیہ، اس صورت میں علماء کا اختلاف ہے کہ عشر کس کے ذمہ ہوگا مگر ہم لوگ یہ فتویٰ دیتے ہیں کہ عشر کاشت کار کے ذمہ ہے کیونکہ کاشت کا وہی مالک ہے۔ اب ایک مسئلہ قابل غور یہ ہے کہ عشر کس زمین میں ہے تو یاد رکھو کہ عشر زمین عشری میں ہے اور یہ وہ زمین ہے کہ جب سے مسلمانوں نے اس کو فتح کیا ہے تو وہ زمین کسی کافر کے قبضہ میں نہ آئی ہو، اب زمین کی تین حالتیں ہوں گی۔

ایک یہ کہ معلوم ہو جائے کہ یہ زمین مسلمانوں کے ہاتھوں میں آتی رہی ہے اس میں تو عشر کا وجوب ظاہر ہے۔

دوسرے یہ کہ معلوم ہو جائے کہ یہ زمین کافروں کے ہاتھ سے آئی ہے اس میں عشر نہیں ہے۔

تیسرے یہ کہ معلوم نہ ہو کہ یہ کافروں کے ہاتھ سے آئی ہے یا مسلمانوں کے مگر اس وقت وہ مسلمان کے ہاتھ میں ہے۔ یہ بھی باستصحاب حال قسم اول کے حکم میں ہے۔

ایک بات یہ معلوم کرنا چاہیے کہ عشر کی مقدار کیا ہے؟ سو اس کا مدار پانی کے اوپر ہے تو جس زمین کو کنویں سے پانی دیا جائے یا جس میں سرکاری نہر سے پانی دیا جائے اس میں پیداوار کا بیسواں حصہ ہے اور جو بارانی ہو اس میں دسواں حصہ ہے۔

ایک بات یہ جاننا چاہیے کہ لوگ عام طور سے کھیت ہی کو محل عشر سمجھتے ہیں، باغات میں عشر کو لازم نہیں سمجھتے حالانکہ باغات میں عشر واجب ہے جبکہ زمین عشری ہو اور اس کی مقدار کا مدار بھی پانی پر ہے۔

عشر کا مصرف

ایک بات یہ جاننا چاہیے کہ عشر کا مصرف کیا ہے تو سمجھ لیجئے کہ اس کا مصرف وہی ہے جو زکوٰۃ کا مصرف ہے کہ اس میں بھی تملیک فقراء واجب ہے اور اس کا مصرف فقراء مسلمین ہیں۔ اگر مردہ پر کفن ڈال دیا یا مسجد میں لوٹے منگا دیئے یا فرش بنا دیا یا کافر کو دے دیا تو عشر ادا نہیں ہوا۔

ایک بات اور ہے جس کے بیان کرنے کو جی نہیں چاہتا تھا مگر ضرورت کی وجہ سے بیان کرتا ہوں وہ یہ کہ بعض لوگ جو مولوی ہوتے ہیں وہ زکوٰۃ وعشر کے مصرف میں ایک حیلہ کرتے ہیں۔ مثلاً ان کو زکوٰۃ کا روپیہ یا عشر کا غلہ مدرسہ کی عمارت میں یا مدرسین کی تنخواہ میں لگانا ہے تو ایک غریب طالب علم کو بلاتے ہیں اور اس سے کہتے ہیں کہ ہم تم کو کچھ روپیہ زکوٰۃ کا دیں گے تو اس کو لے کر مدرسہ میں ہبہ کر دینا وہ کہتا ہے بہت اچھا، اب انہوں نے اس کو روپیہ دیدیا اور اس نے مدرسہ میں دیدیا۔ مولوی صاحب خوش ہیں کہ زکوٰۃ بھی ادا ہوگئی اور رقم مدرسہ کی عمارت میں یا تنخواہوں میں بھی لگ گئی مگر یاد رکھو کہ یہ حیلہ محض لغو ہے۔

اہل علم وہ گناہ تو نہیں کرتے جو عوام کرتے ہیں مگر علم کے پردہ میں یہ بھی گناہ کرتے ہیں، مولویوں کا گناہ بھی مولوی ہوتا ہے۔ اسی طرح صوفیوں کا گناہ صوفی ہوتا ہے۔ صوفیوں کا گناہ یہ ہے کہ تسبیح ہاتھ میں لیے بیٹھے ہیں جس سے معلوم ہوتا ہے کہ بڑے عابد، ذاکر، شاغل ہیں مگر باطن کا یہ حال ہے کہ

از بروں چوں گور کافر پر حلل — واندروں قہر خدائے عزوجل

از بروں طعنہ زنی بر بایزیدؒ — وز درونت ننگ میدارد یزید

(باہر سے کافر کی قبر پر شکوہ اور شاندار ہے اور اسکے اندر خدائے عزوجل کا قہر برس رہا ہے، اپنی ظاہری حالت کی بنا پر تو حضرت بایزید بسطامیؒ پر طعنہ زنی کرتا ہے اور تیری باطنی حالت سے یزید بھی شرماتا ہے)

یہ بڑا گناہ ہے کہ لوگوں کو دکھانے کے لیے تسبیح ہاتھ میں رکھے یا گلے میں موٹے موٹے دانوں کی تسبیح ڈال لے۔ عارف اسی کو فرماتے ہیں۔

ریا حلال شمارند و جام بادہ حرام — زہے شریعت وملت زہے طریقت وکیش

(ریا کو جائز سمجھتے ہیں اور شراب کے جام کو حرام، یہی انکی شریعت وملت اور طریقت ومذہب ہے)

ایک دفعہ جب کہ میں تفسیر لکھا کرتا تھا ایک سائل دروازہ پر آیا اور سوال کیا تو گھر سے آٹا بھیج دیا گیا، اس نے رد کر دیا اور کہا ہم تو نقد لیں گے اور شور کیا۔ اس شور کی وجہ سے میں اوپر سے اترا

کیونکہ اس شور کی وجہ سے میرے کام کا حرج ہوتا تھا، میں نیچے اترا اور ان کی صورت دیکھی تو میں شرما گیا کیونکہ ان حضرت کی لمبی داڑھی تھی اور کمبل اوڑھے لنگی باندھے عصا ہاتھ میں تسبیحیں گلے میں ڈالے ہوئے تھے۔ میں نے اول تو ان کی داڑھی کا لحاظ کر کے نرمی کے ساتھ کلام کیا کہ شاہ صاحب جتنی کسی کو توفیق تھی اس نے پیش کر دیا۔ اگر منظور نہیں ہے تو یہ شور وشغب کیسا ہے، شاہ صاحب نے وہی ایک مرغی کی ٹانگ ہانکی کہ ہم تو نقد لے کر جائیں گے۔ اب مجھے غصہ آ گیا اور میں نے ڈانٹا کہ بہت بک بک نہ لگاؤ، اگر نہیں لینا ہے تو سیدھے چلے جاؤ۔ اس پر شاہ صاحب فرماتے ہیں۔

ہر بیشہ گماں مبر کہ خالیست　　　　شاید کہ پلنگ خفتہ باشد

(ہر جنگل کو خالی نہ سمجھو، شاید کوئی شیر چھپا ہوا ہو)

وہ مجھ کو ڈرانا چاہتے تھے مگر جو تبع شریعت نہ ہو اس سے میں کیوں ڈرتا، میں نے ڈانٹ کر کہا کہ شاہ صاحب! آپ کو بھی یہی سمجھنا چاہیے۔

ہر بیشہ گماں مبر کہ خالیست　　　　(ہر جنگل کو خالی گمان نہ کرو)

گو میں کوئی چیز نہیں مگر آپ کو تو یہ احتمال ہونا چاہیے۔ اس کی کیا وجہ کہ آپ دوسروں کو ڈراتے ہیں اور خود نہیں ڈرتے۔

بس آج کل ان جاہل فقیروں نے دو چار الٹی پلٹی یاد کر لی ہیں جن سے عوام پر رعب جماتے ہیں مگر علم کی یہ حالت ہے کہ ایک فقیر نے "والضحیٰ واللیل اذا سجیٰ" کی تفسیر یہ کہ (اے نفس تیری یہی سجا (سزا) غرض صورت تو یہ ہے کہ شاہ صاحب معلوم ہوں دل میں یہ حالت ہے کہ امراض بھرے ہوئے ہیں، سو ہم بھی ایسے ہی ہیں، پس ان شاہ صاحبوں کا گناہ شاہ صاحب ہوتا ہے ہم مولویوں کا گناہ مولوی ہوتا ہے۔ ظاہر عمامہ چوغا اور نہایت مہذب اور باطن میں وہ گڑبڑ کہ خدا کی پناہ۔

میں زمانہ طالب علمی میں ایک بار میرٹھ گیا۔ وہ زمانہ نوچندی کے میلہ کا تھا، میرا بچپن تھا، اس لیے میں بھی میلہ دیکھنے چلا گیا۔ جب میلہ سے واپس آیا تو حافظ عبدالکریم صاحب رئیس کے صاحبزادہ غلام محی الدین مرحوم نے مجھ سے پوچھا کہ مولوی صاحب نوچندی کے میلہ میں جانا کیسا ہے۔ میں نے کہا جائز نہیں ہے ہاں اگر کوئی اس غرض سے جائے کہ اس کو فتویٰ دینے کے لیے تحقیق کی ضرورت ہے تاکہ عوام کے سامنے اس کے مفاسد بیان کر سکے تو ایسے شخص کو جانا جائز ہے۔ صاحبزادہ صاحب بہت ہنسے اور کہنے لگے کہ مولوی گناہ بھی کرتے ہیں تو اس کو جائز کر لیتے ہیں۔

مجھے اس تاویل کے بعد تاویل سے ایسی نفرت ہوگئی ہے کہ اس سے زیادہ نفرت کسی چیز سے بھی نہیں اور اس تاویل سے مراد وہ تاویل ہے جس سے اپنے نفس کی نصرت مقصود ہو۔ عارف شیرازی اسی کو فرماتے ہیں۔

ترسم کہ صرفہ بزد روز باز خواست ‎ ‎ ‎ ‎ نان حلال شیخ بہ نان حرام ما

(یعنی اندیشہ ہے کہ کہیں قیامت میں ہمارا نان حرام شیخ کے نان حلال پر غالب نہ آ جائے کیونکہ ہم تو حرام کو حرام جانتے ہیں اور وہ حرام کو تاویل سے حلال بنا کر کھاتے ہیں)

عشر و زکوٰۃ میں حیلہ سازی

اب تمہید کے بعد میں کہتا ہوں کہ بعضے اہل علم جو عشر و زکوٰۃ کے مال میں یہ حیلہ کرتے ہیں یہ بالکل واہیات ہے اور اس سے کچھ تبدل کا حکم نہیں ہوتا ان اللہ کے بندوں سے کوئی پوچھے کہ یہ تملیک ہے یا ہیرا پھیری؟ کیا خدا کو بھی دھوکہ دینا چاہتے ہو۔ اللہ تعالیٰ تو دلوں کے حال کو خوب جانتے ہیں ان سے ایک ذرہ بھی پوشیدہ نہیں، بھلا تم ہی انصاف کرو، جب تم نے غریب طالب علم سے یہ کہہ دیا کہ ہم تم کو زکوٰۃ کا روپیہ دیں گے اس کو مدرسہ میں دے دینا تو یقیناً وہ روپیہ ہاتھ میں لینے کے بعد اپنے کو اس کے رکھنے کا مجاز نہیں سمجھتا بلکہ واپسی کو اپنے اوپر لازم سمجھتا ہے پھر تملیک کیا خاک ہوئی۔

زنہار ازاں قوم نباشی کہ فریبند ‎ ‎ ‎ ‎ حق را بسجودے و نبیؐ را بہ درودے

(ان لوگوں میں سے ہرگز نہ ہو جو حق سبحانہ وتعالیٰ کو ایک سجدہ سے اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو ایک درود سے دھوکہ دیتے ہیں)

ایک جگہ ایک رئیس نے ایسی ہی غلطی کی کہ ان کو ایک سید مولوی صاحب کو دو سو روپیہ زکوٰۃ کے دینے تھے۔ انہوں نے ایک غریب طالب علم کو بلایا کہ ہم تم کو ایک ثواب کا کام بتلاتے ہیں، کرو گے؟ اس نے کہا ثواب کے کام سے کیا انکار ہے، فرمایئے کہا فلاں مولوی صاحب کو یہ کتابیں زکوٰۃ میں دینا ہے مگر سید ہونے کی وجہ سے ان کو دے نہیں سکتے ہیں تم کو یہ کتابیں اور روپے دیئے دیتا ہوں تاکہ زکوٰۃ ادا ہو جائے پھر تم ان مولوی صاحب کو دے دو تم کو بہت ثواب ہوگا۔ اس نے کہا نیک کام سے کیا انکار ہے، لایئے! رئیس صاحب نے وہ کتابیں اس کو دے دیں، وہ لے کر چلتا ہوا۔ رئیس صاحب نے کہا میاں کہاں چلے؟ کہا اپنے گھر کو، رئیس صاحب نے کہا تم سے وعدہ کیا ہوا تھا، کہا جناب آپ نے ثواب کا طریقہ بتلایا تھا مگر مجھ کو خود ضرورت ہے، میں کسی کو نہیں دیتا، اب رئیس صاحب بہت چپ ہوئے، اس نے کہا جناب! فرمایئے کہ یہ رقم میری ملک ہوگئی یا نہیں، کہاں ہاں ملک تو ہوگئی کہا پھر آپ

تورنج کیوں ہے؟ آپ کے ذمہ زکوٰۃ کا ادا کرنا تھا آپ اس سے بری ہو گئے آپ کا کیا نقصان ہوا۔

میں نے یہ حکایت سنی تو بڑا خوش ہوا کہ یہ شخص سمجھ دار نکلا جس نے تملیک کی حقیقت پر عمل کیا اور واقعی جب تک لینے والا اپنے کو مالک نہ سمجھ لے اس وقت تک تملیک کا تحقق ہی کہاں ہو سکتا ہے؟ مگر اسی واقعہ سے آپ کو معلوم ہو گیا ہو گا کہ جو لوگ تملیک کے لیے حیلہ کرتے ہیں ان کے ذہن میں تملیک کی حقیقت نہیں ہوتی وہ محض ہیرا پھیری ہی سمجھ کر ایسا کرتے ہیں۔ اگر ان کے ذہن میں تملیک کی حقیقت ہوتی تو لینے والا اگر آزادی کے ساتھ عمل کرے اور اس رقم کو اپنے خرچ میں لائے تو اس سے ان کو رنج و ملال نہ ہونا چاہیے کیونکہ جب وہ مالک بن گیا تو شرعاً اس کو پورا اختیار ہے وہ اس رقم کو جو چاہے کرے، خواہ مدرسہ میں دے یا نہ دے، مسجد میں لگائے یا نہ لگائے، یہ رنج کرنے والے کون ہیں مگر مشاہدہ یہ ہے کہ لینے والا غریب اگر اس رقم کو معطی کی مرضی کے خلاف اپنے خرچ میں لے آئے ان کو رنج ہوتا ہے اور اس شخص کو برا بھلا، دغا باز، فریبی کہنے لگتے ہیں۔ اس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ ان کا مقصود صرف ہیرا پھیری ہے، تملیک نہیں اور لینے والا اگر ان کی مرضی کے موافق رقم لے کر مسجد یا مدرسہ کے لیے واپس دے دے تو غالب یہ ہے کہ وہ محض شرم و لحاظ سے یا بدنامی کے اندیشہ سے دیتا ہے۔ اگر اس کا اطمینان ہو جائے کہ میں اس کا مالک بن چکا ہوں اور اپنے خرچ میں لانے سے بدنام نہ ہوں گا نہ مولوی صاحب کا منہ چڑھے گا تو یقیناً بہت سے غریب واپس دینے پر راضی نہ ہوں گے کیونکہ غریب آدمی کو سب سے پہلے اپنی اور اپنی اولاد کی راحت کا خیال ہوتا ہے۔ جس کے گھر میں فاقہ ہوتا ہے وہ بے چارہ مدرسہ یا مسجد میں روپیہ دینے کی کیا ہمت کر سکتا ہے اور ہمت بھی کرے گا تو دو چار روپیہ دے گا۔ پانچ روپیہ دینے کی غریب آدمی کو ہمت نہیں ہو سکتی جبکہ وہ سمجھ جائے کہ میں اس رقم کا مالک بن گیا ہوں اور جو کوئی ہمت کرے گا سمجھ لو کہ اس نے اپنے کو اس رقم کا مالک نہیں سمجھا بلکہ وہ اپنے اوپر اس رقم کا واپس کرنا ضروری سمجھتا ہے اس لیے دے رہا ہے۔ اب بتلاؤ یہ تملیک کدھر سے ہوئی۔

اس لیے ہی حیلہ محض لغو و بیہودہ ہے اور اس سے زکوٰۃ کا ادا ہونا میری سمجھ سے باہر ہے مگر میں جانتا ہوں کہ لوگ حیلہ سے باز نہ آئیں گے، اس لیے میں ایک اور تدبیر بتلاتا ہوں جو حقیقت میں حیلہ نہیں بلکہ حقیقت ہے اور اس میں بھی وہ مقصود حاصل ہو جاتا ہے جو حیلہ مذکور سے مقصود ہوتا ہے۔ اس تدبیر کو ہم نے چندہ بلقان میں استعمال بھی کیا ہے۔ عوام تو تقلیداً مان لیں کہ یہ حیلہ نہیں اور علماء کو کچھ شبہ ہو تو وہ تسلی کر لیں۔

بحمد اللہ تعالیٰ